
اردو ڈائجسٹ
کتاب نمبر

اُردو ڈائجسٹ

محراب

دہلی

کتاب نمبر

دنیا کی ۱۹ مشہور اور نایاب کتابوں کی تلخیص

ایڈیٹر :

سلامت علی مہدی

کتاب نمبر

تین روپے

ایک سال کیلئے محراب کی قیمت

۳۵ روپے

جس میں پانچ روپے کا سالنامہ مفت دیا جائے گا
اور ہر شمارہ رجسٹری سے بھیجا جائے گا۔

صاحبِ کار: —— رئیس

پروڈکشن انچارج: —— احمد کریم صدیقی

پرنٹر پبلشر: —— سید شبیر الدین اشرف

مطبوعہ: —— پنجاب نیشنل پریس دہلی

سرورق: —— انڈین فائن آرٹ دہلی

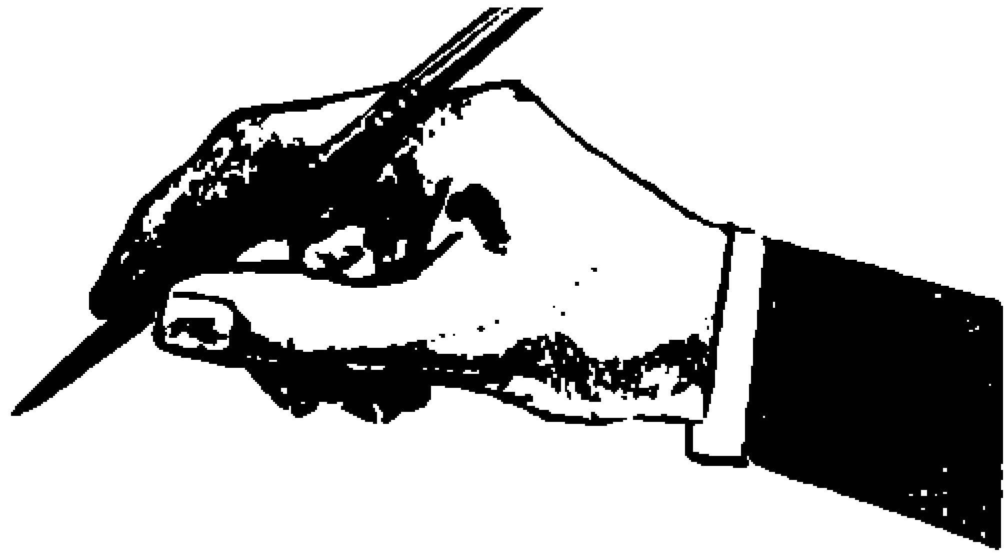
مقامِ اشاعت: —— اُردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶

پروسیسنگ: —— رنگ محل پھاٹک حبش خاں دہلی ۶

محراب کتاب نمبر

کتابیں

فہرست



ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
فیض

پہلا صفحہ

میں نے محراب کے پہلے شمارے کے پہلے صفحہ پر
بارگاہِ ربّ العزّت میں سر جھکانے کے بعد لکھا تھا ——
اے میرے اللہ
محراب اُردو ڈائجسٹ میں نے تیرے ہی سہارے نکالا ہے' اس کا پہلا شمارہ تیری بارگاہ میں حاضر ہے' اب میں اس کا مستقبل بھی تیری ہی رحمتوں کے حوالے کر رہا ہوں کیونکہ تو ہی جسے چاہتا ہے عزّت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلّت دیتا ہے ——

اور خدا نے میری دعا قبول کر لی ——— . وہ مجھ بے سہارا کا سب سے بڑا سہارا بن گیا. اس نے محراب کی ترقی کے سارے دروازے کھول دیئے ... . دریائے رحمت میں سیلاب آ گیا، اور نصرت و کامرانی کی راہ کے تمام کانٹے دُور ہو گئے ——— .

میں اعلان کرتا ہوں کہ اگر میرے عزائم کو تائیدِ غیبی حاصل نہ ہوتی تو محراب ترقی کی ان رفعتوں پر نہ ہوتا جہاں وہ آج نظر آ رہا ہے. اور اسی لئے میں ایک مرتبہ پھر بارگاہِ خداوندی میں سجدہ ریز ہونے کے بعد اپنے خالق سے یہ التجا کرتا ہوں کہ وہ محراب کے اس کتاب نمبر کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے. کیونکہ اس کتاب نمبر کے صفحات میں اس کی بنائی ہوئی دُنیا کی تاریخ ہے' اس میں اُس کے برگزیدہ بندوں کے لہو کی سُرخی جھلک رہی ہے. اس میں ان شیطانوں کی کہانیاں ہیں جو انسان سمجھے جاتے تھے. اور اس میں ایسی سچی داستانیں ہیں جو مردِ مومن کے دل کو گرما دیتی ہیں اور رُوح کو تڑپا دیتی ہیں ——— .

سلامت علی مہدی



محمد علی جناح

مصنف:
کانجی دوارکاداس

مترجم:
سید شہاب الدین دسنوی

تلخیص:
ظل عباس عباسی

اس کتاب کی تلخیص مشہور جرنلسٹ و ادیب جناب ظلِ عباس عباسی صاحب نے کی ہے، انھوں نے کتاب کے مصنف مسٹر کانجی دوارکاداس کے بارے میں لکھا ہے " اس داستانِ حیات کا مصنف وہ غیر مسلم ہے جو ۲۲ سال تک قائدِ اعظم محمد علی جناح کا گہرا اور قریبی دوست رہا، جو برسہا برس تک ان کے ایک رفیق اور ساتھی کی طرح کام کرتا رہا، جو ان کی پرائیویٹ اور پبلک زندگی کو اتنے قریب سے دیکھ پایا کہ کوئی اور نہ دیکھ پایا، جو بدلے ہوئے مخالفانہ ماحول میں بھی اپنے دوستانہ تعلقات کی شمع جلائے رہا ——— اس لئے بجا طور پر یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ یہ داستان نہیں دستاویز ہے"۔

اس کتاب کا ترجمہ مشہور ماہرِ تعلیم جناب سید شہاب الدین دسنوی صاحب نے کیا ہے اور وہی اس کے مرتب بھی ہیں ——— انھوں نے اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے :

" برصغیر ہندستان کی تقسیم کے بعد بھارت اور پاکستان دو آزاد مملکتوں کے وجود میں آنے کی کئی روداد یں انگریزی اور اُردو میں لکھی جاچکی ہیں اور نہ جانے کتنی لکھی جائیں گی۔ اس سیاسی ڈرامے کے کچھ ناظرین ابھی زندہ ہیں اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جنھوں نے اِس میں خود بھی چھوٹا بڑا پارٹ ادا کیا ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جنھوں نے سارا ڈراما تنقیدی نظروں سے دیکھا ہے۔ ان لوگوں کے قلم سے نکلی ہوئی داستانیں، سیاسی شخصیتوں کے سوانح نگاری کے لئے نہیں بلکہ ایک مورخ کے لئے بھی بیش قیمت دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھیں میں ایک دل چسپ اور اہم داستان کانجی دوارکاداس کی لکھی ہوئی : ———

"INDIA'S FIGHT FOR FREEDOM" ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔ اس پر برطانیہ کے سابق وزیرِ اعظم لارڈ ایٹلی نے مقدمہ لکھا ہے۔ اسی موضوع سے متعلق مصنف کی دوسری کتاب : ———

"TEN. YEARS TO FREEDOM" ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی۔ پہلی کتاب میں ۱۹۱۳ء سے ۱۹۳۷ء تک اور دوسری میں ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے واقعات قلم بند کئے گئے ہیں۔

میں نے پہلی کتاب پڑھنی شروع کی تو اس وقت اس کے مصنف کانجی دوارکاداس اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کے گہرے ذاتی تعلقات کا مجھے علم نہ تھا۔ کانجی دوارکاداس، قائدِ اعظم کے نہایت عزیز دوست تھے۔ انھوں نے قائدِ اعظم کو بہت قریب سے دیکھا تھا، اس لئے جو باتیں انھوں نے لکھی ہیں ان میں سے، بہت سے لوگوں کے لئے، بعض باتیں بالکل نئی ہوں گی۔ اسی بنا پر مجھے خیال آیا کہ اگر اُن ساری باتوں کو جو قائدِ اعظم کے بارے میں ان دو کتابوں کے صفحوں پر پھیلی ہوئی ہیں، یکجا کر کے مرتب کر لیا جائے تو قائدِ اعظم کی شخصیت کے کچھ نئے زاویے سامنے آجائیں گے اور یہ مواد مستقبل کے سوانح نگار کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ چنانچہ مصنف سے ملاقات کر کے میں نے یہ خیال اُن کے سامنے پیش کیا۔ وہ خوش ہوئے، اور ترجمہ اور ترتیب دونوں کی اجازت دے دی۔ اُس وقت تک ان کی دوسری کتاب شائع نہیں ہوئی تھی، اس کے باوجود انھوں نے اس کا مسودہ میرے حوالے کر دیا تاکہ میں اُس میں سے بھی مواد حاصل کرسکوں کانجی دوارکاداس نے قائدِ اعظم اور مہاتما گاندھی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کے کچھ حصوں سے بعض لوگوں کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن جیسا کہ ایک تبصرہ نگار کا کہنا ہے :

" ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے ماضی قریب کا جائزہ، تاریخی انداز اور تنقیدی شعور کے ساتھ لیا کریں یعنی

واقعات کو واقعات کی شکل میں پیش کریں۔ اس لحاظ سے مصنف نے دیانت داری اور بے باکی سے کام لیا ہے۔" خود مصنف کا کہنا ہے: "میں ہر بات صاف صاف لکھتا ہوں۔ نہ کسی کو خوش کرنے کی خاطر نہ کسی کو ناراض کرنے کے لئے۔" اپنی کتابوں کے لئے مصنف کو وہ یادداشتیں اور نوٹ بہت کام آئے جو وہ اپنی عادت کے مطابق ہر ہفتے لکھتے رہے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے مجھے بتایا، اُن کے پاس ایسے کاغذات کی تقریباً تین سو فائلیں تھیں جو انھوں نے امریکہ کی پن سلوینیا یونی ورسٹی کے کتب خانے کو دے دی ہیں۔

کانجی دوارکاداس مشہور سوشل ورکر رہ چکے ہیں۔ انھوں نے قومی معاملات میں بھی گہری دلچسپی لی ہے۔ ان کی کوششوں سے بمبئی اسمبلی ایں مزدوروں کی فلاح اور پیشہ ور عورتوں، بے گھر اور آوارہ گرد بچوں کی خاطر کئی قانون منظور ہوئے۔ ۱۹۲۱ سے ۱۹۲۳ء تک وہ بمبئی لیجس لیٹو کونسل کے رکن اور ۱۹۱۷ء سے ۱۹۱۹ء تک آل انڈیا ہوم رول لیگ کے جنرل سکریٹری اور خازن رہے پھر ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۳ء تک نیشنل ہوم رول لیگ کے بانی اور جنرل سکریٹری رہے۔ وہ آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے جنرل

میں ایں۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۵ء تک بمبئی میونسپل کارپوریشن کے ممبر اور ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۰ء تک بمبئی ہاؤسنگ بورڈ کے رکن تھے، رفاہِ اطفال کے کئی اداروں سے بھی متعلق رہے۔

کانجی دوارکاداس نے یورپ، امریکہ اور مشرقی افریقہ کے سفر کئے، اُن ملکوں میں مقامات پر تقریریں کیں۔ ان کے مضامین مؤقر اخباروں اور رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کی پیدائش یکم مئی ۱۸۹۳ء کی ہے۔

کانجی دوارکاداس نے اپنی کتابوں میں "قائداعظم" کو صرف "جناح" لکھا ہے۔ انگریزی رواج کے علاوہ اُن کو ایسا لکھنے کا حق بھی پہنچتا ہے۔ ترجمے میں بھی اس بے تکلف طریقۂ تخاطب کو برقرار رکھا گیا ہے۔

جناب دسنوی صاحب اور جناب عباسی صاحب نے کتاب کے بارے میں جو دعویٰ کیا ہے اس سے میں اتفاق کرتا ہوں، واقعی یہ کتاب ایک قیمتی دستاویز ہے چنانچہ اسی لئے میں بھی اس کی تلخیص شائع کر رہا ہوں تاکہ اس کتاب کے ذریعے محراب کا عدیم المثال کتاب نمبر بھی ایک قیمتی دستاویز بن جائے ــــــ۔

ــــــــــ سلامت علی مہدی

جس سن میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی تھی اُسی سال دسمبر میں "بمبئی پریسیڈنسی ایسوسی ایشن" کا قیام بھی عمل میں آیا۔ جون ۱۹۱۶ء میں اِس ایسوسی ایشن کا ایک جلسہ ہو رہا تھا جس میں حاضرین کی کل تعداد پچیس تھی، دو تین تقریریں ہو چکیں تو چھریرے بدن کا ایک مقرر کھڑا ہوا ــ چیک ڈیزائن کی پتلون اور سیاہ رنگ کا کوٹ پہنے، ایک طرف کو مانگ نکلی ہوئی، چہرے پر مونچھیں ــــــ جب تک یہ شخص بولتا رہا، سب ہمہ تن گوش ہو کر اُس کا ایک ایک

لفظ سنتے رہے۔ اُس کے اندازِ بیان میں خوش مزاجی تھی، لہجہ صلح کن تھا، مسئلے کو مختلف زاویوں سے پیش کر کے وہ درمیانی راہ نکالنا جانتا تھا۔

میں حیران ہو کر سوچنے لگا یہ شخص کون ہے ــــ؟ پی۔ کے۔ تیلنگ میرے پاس بیٹھے تھے۔ میں نے اُن سے دریافت کیا۔ وہ تعجب سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے:

"تم جناح کو نہیں جانتے؟"

میں نے جناح کا نام تو سنا تھا لیکن دیکھا کبھی نہ تھا۔

آن کی عمر اس وقت ۴۲ سال تھی اور بمبئی کے قانونی حلقے میں نام پیدا کر چکے تھے۔ اُن کی جرح اور بحث، دونوں کی دھوم مچی تھی۔ اس کے سوا وہ مرکزی اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے بھی کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ سیاسی دُنیا میں وہ سروجنی نائیڈو کے دیئے ہوئے خطاب "ہندو مسلم اتحاد کی علامت" سے پہچانے جاتے تھے۔ اور بعض لوگ انھیں "مسلمانوں کے گوکھلے" بھی کہا کرتے تھے۔ اس طرح دیکھا جائے تو گاندھی "یگ" شروع ہونے سے بہت پہلے، یعنی ۱۹۱۶ء میں، جناح اپنا مقام پیدا کر چکے تھے۔

تعارف

جلسہ ختم ہوا تو تیلنگ نے آن سے یہ کہہ کر میرا تعارف کرایا کہ میں مسز اینی بیسنٹ کی تھیا سوفی تحریک سے وابستہ ہوں اور سیاست میں دل چسپی رکھتا ہوں۔ جناح نے بڑے دلآویز انداز سے جھکتے ہوئے، دوستانہ لہجے میں مشورہ دیا کہ اگر سیاست میں حصہ لینا ہو تو مجھے پورے انہماک اور خلوص کے ساتھ اس میں کام کرنا چاہیے۔ نصیحت کے اِس فقرے کے ساتھ جناح سے میری دوستی کا آغاز ہوا۔ اُس وقت میری عمر صرف ۲۴ سال تھی۔ ہماری یہ دوستی ستمبر ۱۹۴۸ء تک جاری رہی جب کہ وہ اِس جہانِ فانی سے رُخصت ہوئے!

جس جلسے کا میں نے ذکر کیا اس میں جناح غیر معمولی طور پر مسرور نظر آرہے تھے۔ اس مسرت کا سبب بعد کو یہ معلوم ہوا کہ وہ گرمی کی دو مہینوں کی چھٹیاں دارجلنگ میں سر ڈنشا پیٹٹ اور لیڈی پیٹٹ کے ساتھ گزار کر لوٹے تھے اور وہ میں اپنے میزبان کی سولہ سال عمر کی بیٹی، رتی کے دامِ الفت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ جناح کی واپسی پر یہ بات بمبئی میں مشہور ہو گئی۔ دونوں شادی کرنا چاہتے تھے لیکن لڑکی کے والدین رضامند نہ تھے۔ رتی اُس عمر کو نہیں پہنچی تھی کہ قانونی طور پر اپنی مرضی سے بیاہ کر لیتی۔ وَلی کی حیثیت سے اس کے والدین نے ہائی کورٹ سے ایک امتناعی حکم بھی حاصل کر لیا تھا جس کی رُو سے جناح اور رتی کا ملنا ممنوع تھا۔

ایسی صورت میں ان کو انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جس روز رتی کی عمر ۱۸ سال ہوئی، اُسی دن اس نے اپنے والدین کے گھر کو خیرباد کہا، اسلام قبول کر لیا اور اُس کے بعد جناح سے اس کا نکاح ہو گیا۔ اُن دنوں سِوِل میرج کے قانون کے تحت یہ ضروری تھا کہ فریقین پہلے یہ اقرار کریں کہ وہ کسی مذہب کے پیرو نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بات اور قابلِ لحاظ تھی ——— جناح مرکزی اسمبلی کی ایک "مسلم نشست" کے ممبر بھی تھے۔

جناح ایک غریب گھرانے میں ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ پندرہ سال کے تھے کہ ان کا بیاہ ایک کمسن لڑکی سے کر دیا گیا جس کے فوراً بعد ہی ۱۸۹۲ء میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے وہ انگلستان روانہ ہو گئے۔ لندن میں وہ اکثر پارلیمنٹ کی کارروائی سننے چلے جاتے تھے۔ ۱۸۹۶ء میں بیس سال کی عمر میں بیرسٹر بن کر کراچی لوٹے لیکن کچھ دنوں بعد بمبئی چلے آئے۔ یہاں اُنھیں مقدموں کے لئے تین سال اور انتظار کرنا پڑا۔ ۱۹۰۰ء میں وہ عارضی طور پر پریسیڈنسی مجسٹریٹ مقرر کئے گئے۔

اب انھوں نے اپنی چھوٹی بہن، فاطمہ کو بھی بمبئی بلا لیا اور باندرہ کے ایک کونونٹ اسکول میں داخل کرا دیا ——— جماعت کی طرف سے اِس کی بڑی مخالفت ہوئی لیکن انھوں نے پروا نہ کی۔ ہر اتوار کو گھوڑے پر بیٹھ کر جناح اپنی بہن کو ملنے باندرہ جایا کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد انھیں مستقل پریسیڈنسی مجسٹریٹی کا پیش کش کیا گیا تو انھوں نے اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ کسی سرکاری ملازمت سے ہمیشہ کیلئے وابستہ

رہنا نہیں چاہتے تھے۔ انھیں اپنی صلاحیتوں پر اعتماد، اور کامیابی کا یقین تھا۔ وہ ایک ہزار روپے ماہانہ پر بمبئی میونسپل کارپوریشن کے قانونی مشیر بھی رہے۔

جناح کی بے مثال ایمان داری کا ہر شخص معترف تھا۔ اور ان کی اس نیک نامی کی شہرت آخر وقت تک قائم رہی، اُن کی غیر معمولی ذہانت سے انھیں اپنے قانونی پیشے کے علاوہ سیاسی زندگی میں بھی بے حد مدد ملی۔ اُن کا ذہن مسائل کو صاف اور واضح ڈھنگ سے سوچنا جانتا تھا، اُن کی طبیعت انصاف پسند تھی۔ اپنے مخالفوں سے مقابلہ کرنے میں اُن کی یہ دونوں خصوصیتیں بہت کام آئیں۔ سیاست کے میدان میں جہاں وہ گاندھی جی کی بدلتی ہوئی پالیسیوں کا سدّباب کر سکے تو دوسری طرف جواہرلال نہرو کی سیماب مزاجی پر بھی قابو پانے میں کامیاب ہوئے۔

۱۹۰۴ء میں کانگریس کے اجلاس میں ایک تجویز منظور کی گئی کہ ہندستان کے بارے میں برطانوی رائے عامہ کو ہموار کرنے کی خاطر ایک وفد انگلستان روانہ کیا جائے۔ سر ولیم ویڈر برن نے، جو انگلستان سے خاص طور پر کانگریس کے اجلاس میں شریک ہونے آئے تھے، اس تجویز کا خیر مقدم کیا، انھوں نے وفد کی کامیابی کی تمنا کرتے ہوئے خواہش ظاہر کی کہ اس کی قیادت سر فیروز شاہ مہتا کریں۔ لیکن وہ نہ جا سکے اور فیصلہ ہوا کہ ہندستانی وفد میں بمبئی کی نمائندگی گوکھلے اور جناح کریں۔

جناح پر کبھی یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ وہ درشت مزاج واقع ہوئے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کی ظاہرا سخت مزاجی اُن کی بے پناہ ایمان داری اور کھری طبیعت کا نتیجہ تھی۔ مسز چمن لال سیتلواد اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"وکالت کے پیشے میں جناح ۱۸۹۵ء میں داخل ہوئے۔ میں اُس زمانے میں مرافعے کے مقدمے لیا کرتا تھا، لیکن جب میں اوریجنل سائڈ پر آیا تو اُن سے زیادہ قُرب پیدا ہوا۔ پھر تو کئی مقدموں میں اُن کے ساتھ بھی کام کیا اور اُن کا آمنا سامنا بھی ہوا۔ جناح نے ابتدا ہی سے اپنی بے باکی قائم رکھی تھی۔ وہ کسی بڑے سے بڑے جج یا حریف بیرسٹر سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ ایک بار اسٹرینگ مین اور جناح ایک مقدمے میں ساتھ پیروی کر رہے تھے۔ جناح مشورے کے لئے اسٹرینگ مین کے چیمبر میں گئے تو اُس ملاقات کے دوران مین اسٹرینگ مین نے کچھ اس طرح گفتگو کی کہ جس سے جناح کی ہتک ہوتی تھی پھر اُس کے بعد جناح، اسٹرینگ مین کے چیمبر میں کبھی نہیں گئے۔

مسز سروجنی نائیڈو پہلی بار جناح سے اُس وقت ملیں جبکہ بیرسٹری کے پیشے میں کامیابی جناح کے قدم چوم رہی تھی ـــــ وہ لکھتی ہیں:

"کسی اور شخص کے ظاہری اور باطنی خصوصیات میں اتنا بڑا تضاد نہیں دیکھا گیا جتنا محمد علی جناح کی شخصیت میں تھا۔ بلند قامت، نازک، چھریرا جسم، اُن کے جُثّے کو دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے اندر کتنا غیر معمولی جذبہ اور کس بلا کا عزم پوشیدہ ہے۔ بہ ظاہر آئین اور دستور کے پابند اور سختی سے اُن پر کاربند، ایک حد تک الگ تھلگ، سنجیدہ اور شائستہ ـــــ مگر جو لوگ اُن سے واقف تھے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جناح کے سینے میں عورت کے دل کی نرمی اور بچّے کی معصومی پوشیدہ ہے، وہ ایک عملی اور عقلیت پسند آدمی تھے۔"

دسمبر ۱۹۰۶ء میں جناح پہلی بار کلکتہ کانگریس کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ اُس وقت وہ دادا بھائی نوروزجی، صدر کانگریس کے پرائیوٹ سکریٹری تھے۔ اس موقع پر خطبۂ صدارت میں "سیلف گورنمنٹ" یا "سوراج" کا مطالبہ پیش کیا گیا تھا۔

جناح بمبئی اور برنٹ کلب کے ممبر تھے اور وہاں بلیرڈ

یا شطرنج کھیلا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شطرنج اچھی کھیل لیا کرتے تھے لیکن تاش یا کسی اور قسم کی قمار بازی سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

لکھنؤ کانگریس کے بعد، مسز بیسنٹ کی گرفتاری تک یعنی ۱۶ جون ۱۹۱۷ء تک، سکون تھا۔ جناح خود بھی ہوم رول لیگ میں شریک ہوئے اور اپنے بے شمار ہم پیشہ اشخاص کو بھی اس میں شریک کیا۔

گرگام میں ہر پندرھویں دن شانتارام چال میں بڑے بڑے جلسے ہوتے، جن میں جناح، تلک، کھاپرڈے، کھاڈیلکر، کیلکر اور ہارنی مین تقریریں کرتے تھے۔ شانتارام چال کے جلسوں کی خبریں سن سن کر گورنر، لارڈ ولینگڈن کی نیند حرام ہوئی جاتی تھی۔

گجراتی میں تقریر

عمر سوبانی، شنکر لال بینکر اور میں، تینوں مل کر تقریباً ہر روز ہی جناح کے چیمبر میں سیاسی پروپیگنڈے کا پروگرام بنایا کرتے تھے۔

جولائی ۱۹۱۷ء میں گجرات سبھا کی دعوت پر گودھرا میں صوبائی پولیٹیکل کانفرنس ہوئی تھی، جس کے صدر گاندھی جی اور سکریٹری ولبھ بھائی پٹیل تھے۔ اس جلسے میں چوٹی کے جن لیڈروں نے شرکت کی ان میں لوکمانیہ تلک، محمد علی جناح، کھاپرڈے، وٹھل بھائی پٹیل، جہانگیر پیٹٹ اور پی کے تیلنگ تھے۔ ان دنوں ولبھ بھائی پٹیل کا شمار لیڈروں میں نہیں ہوتا تھا۔ جلسے میں جب جناح تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو گاندھی جی نے اصرار کیا کہ جناح گجراتی میں بولیں۔ ان کی بات مانتے ہوئے جناح نے اپنی تقریر یہ کہہ کر گجراتی میں شروع کی:

"صاحبو، گاندھی جی کے حکم سے میں گجراتی میں بول رہا ہوں۔ تقریر کا پہلا حصہ گجراتی میں ہوگا لیکن اپنی تقریر میں انگریزی میں پورا کروں گا۔"

اس پر بڑا قہقہہ لگا جس کے بعد جناح نہایت شستہ انگریزی میں چالیس منٹ تک بولتے رہے۔

٭ ٭ ٭

ستمبر ۱۹۱۷ء میں مرکزی اسمبلی کا اجلاس شملے میں ہوا۔ جناح اس میں شریک ہوئے۔ وہاں انھوں نے تیج بہادر سپرو کے ساتھ مل کر مسز اینی بیسنٹ کی رہائی کی بڑی کوشش کی مگر اس میں انھیں کامیابی نہ ہوئی۔

شادی کے بعد مسز جناح شملہ پہنچیں جہاں ان کے شوہر مرکزی اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہونے گئے تھے۔ ایک دن میاں بیوی وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ کے یہاں ڈنر پر مدعو تھے۔ وہاں ان سے رتی کا تعارف کرایا گیا۔ ان سے ہاتھ ملانے کے بعد رتی نے یورپی دستور کے مطابق جھک کر کورنش بجا لانے کی جگہ، ہندستانی رواج سے نمستے کرتی ہوئی کھڑی ہو گئیں۔ ڈنر کے فوراً بعد وائسرائے نے انھیں پاس بلا کر کہا:

"ایک بات کہوں مسز جناح، تمھارے شوہر کا مستقبل بڑا تابناک ہے۔ تمھارے لئے کسی طرح یہ مناسب نہیں کہ اسے نقصان پہنچاؤ۔ روم میں رہو تو روم کے آداب برتو۔"

"یور ایکسیلنسی۔ میں نے وہی تو کیا۔ ہندستان میں رہ کر میں نے آپ کو ہندستانی رواج کے مطابق سلام کیا۔" مسز جناح نے ترت سے جواب دیا۔ مسز جناح اور لارڈ چیمسفورڈ کی یہ پہلی اور آخری ملاقات ثابت ہوئی۔

۱۹۲۱ء میں مسز جناح، نئی دلّی میں ایک لنچ کے موقع پر لارڈ ریڈنگ کے ساتھ بیٹھی تھیں، جو وائسرائے تھے۔ ان کے سامنے لارڈ ریڈنگ بار بار اپنا دکھڑا رو رہے تھے: "ہائے مسز جناح، کیا بتاؤں مجھے جرمنی جانے کی کتنی تمنا ہے! میں وہاں جانے کے لئے کس قدر بے قرار ہوں! لیکن افسوس، جا نہیں سکتا۔"

مسز جناح نے پوچھا: "یور ایکسیلنسی، آخر آپ وہاں کیوں نہیں جا سکتے؟"

لارڈ ریڈنگ بولے: "بات یہ ہے کہ جرمن، ہم برطانوی لوگوں کو پسند نہیں کرتے ہیں۔"

مسز جناح کہاں چوکنے والی تھیں، بولیں: "تو پھر آپ ہندستان کیسے چلے آئے؟"

لارڈ ریڈنگ تلملا کر رہ گئے اور گفتگو کا رُخ بدل دیا۔

۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ کی بنا پر جب بل پیش ہوا، تو ہندستان کی مخالفت کی لہر سی دوڑ گئی۔ لیجسلیٹو کونسل میں شرینِدر ناتھ بنرجی، سری نواس شاستری، سرتیج بہادر سپرو، محمد علی جناح اور وٹھل بھائی پٹیل نے اس کے خلاف سخت تقریریں کیں۔ جناح نے اپنی تقریر میں یہاں تک کہہ دیا کہ جو حکومت اس قسم کے قوانین نافذ کرتی ہے اُسے مہذب کہلانے کا حق حاصل نہیں۔

اس ایکٹ کی مخالفت کی تحریک کے سلسلے میں برطانوی حکومت، جن آٹھ ہندستانیوں کو دیس نکالا دینا چاہتی تھی، اُن میں جناح کا نام بھی شامل تھا۔ لیکن بعد میں یہ مصیبت صرف بی۔ جی ہارنی مین کے سر گئی۔ ہارنی مین بیمار تھے اس لئے انگلستان بھیج دیئے گئے۔ اس کے کچھ ہی دن بعد بمبئی کے ایمپائر تھیٹر میں پہلی آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کا جلسہ ہوا جس کے صدر لالہ لاجپت رائے تھے۔ اسٹیج پر این۔ ایم۔ جوشی، بی۔ پی۔ واڈیا، دیوان چمن لال، سید عبداللہ بریلوی بیٹھے تھے۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ مسز جناح تھیٹر کے ایک باکس میں سے کارروائی دیکھ رہی تھیں۔ ہارنی مین کے ملک بدر کئے جانے پر احتجاجی تجویز رتی ہی نے پیش کی۔ اپنی باکس کی نشست سے پانچ منٹ کی نہایت فصیح و بلیغ تقریر میں انھوں نے اپنی بات کہہ دی اور یہی ان کی ایک پبلک تقریر تھی۔

مسز اینی بیسنٹ ۱۹۱۹ء کے شروع ہی سے اس کوشش میں لگی ہوئی تھیں کہ ہوم رول لیگ کا ایک وفد برطانیہ جا کر پارلیمنٹ کی جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے سامنے شہادت دے۔ اس وفد کے لیے مسز بیسنٹ نے جناح، سی۔ پی راما سوامی آئر، بی۔ پی واڈیا اور تلنگ کے نام تجویز کیے۔ ۲۹ جنوری کو مسز بیسنٹ، گاندھی جی سے ملیں اور انھیں بھی ایک آزاد ممبر کی حیثیت سے شریک ہونے کی دعوت دی۔ مگر یہ نہ ہو سکا۔ گاندھی جی کی حکمت عملی سے بعد کے واقعات نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی کہ مسز بیسنٹ کو ہوم رول لیگ کی صدارت ہی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ مسز بیسنٹ' جس جلسے میں سازشی اور ناگوار حالات میں استعفا دینے پر مجبور ہوئیں، اُس میں جناح موجود تھے۔

گاندھی جی مسز بیسنٹ سے ہوم رول لیگ کا پلیٹ فارم چھین لینے پر اڑے ہوئے تھے۔ کیونکہ ان کا سیاسی فلسفہ یہ تھا کہ "مجھ سے اتفاق کرو ورنہ سیاست میں تمھاری کوئی جگہ نہیں۔"

۱۹۱۸ء میں مانٹیگ چیمسفورڈ رپورٹ شائع ہوئی جس میں ہندستان کی خودمختاری کی طرف قدم بڑھانے کی ایک اسکیم پیش کی گئی تھی۔ ہندستان کے سیاسی حلقوں میں اس کی بڑی مخالفت ہوئی۔ البتہ گاندھی جی کا خیال تھا کہ رپورٹ میں ہندستان کو اتنا ہی کچھ دیا گیا ہے جتنا ہضم کرنا اُس کے لئے ممکن ہے۔ مسز بیسنٹ نے رپورٹ پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ سفارشات نہ تو اس لائق ہیں کہ برطانیہ انھیں پیش کرتا اور نہ اس قابل ہیں کہ ہندستان انھیں قبول کرے، پھر بھی وہ انھیں کلی طور پر رد نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ جناح اس رپورٹ سے بہت مایوس ہوئے لیکن وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ سفارشات کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے سوچا کہ مسز بیسنٹ سیاسی طاقت رکھتی ہیں، اس لئے انھیں اپنا ہم خیال

بنانا چاہیے۔ چنانچہ ان کی دعوت پر مسز بیسنٹ بمبئی آئیں اور دونوں کی دو گھنٹوں تک بات چیت ہوتی رہی۔ جناح چاہتے تھے کہ مسز بیسنٹ سفارشات پر کڑی تنقید کرنے سے اجتناب کریں۔ بات چیت کے بعد تھکے ماندے جناح کمرے سے باہر نکلے تو میں نے اُن سے پوچھا:

"کہو بمبئی، کیا ہوا؟"

وہ اپنا سر پکڑے ہوئے بولے: "ہو گیا! یاد رکھو کبھی عورت سے بحث نہ کرنا۔"

۱۹۱۸ء میں دلّی میں "وار کانفرنس" منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں لوک مانیہ تلک کو شرکت کی دعوت نہیں دی گئی تھی۔ اس کے بعد ایسی ہی ایک کانفرنس بمبئی میں بھی کی گئی جس میں ہوم رول لیگ کو مدعو کیا گیا تھا۔ جناح، لوکمانیہ تلک، کیلکر، ہارنی مین وغیرہ اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ جلسہ شروع ہوا تو تلک ایک تجویز پیش کرنے کھڑے ہوئے۔ ابھی اُن کے مُنہ سے ایک لفظ بھی نکلنے نہ پایا تھا کہ لارڈ ولینگڈن نے (جو صوبہ بمبئی کے گورنر اور جلسے کے صدر تھے۔) انھیں "آؤٹ آف آرڈر" کہہ کر بولنے سے روک دیا اور بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ پھر کیا تھا۔ ہوم رول لیگ کے جتنے لیڈر وہاں جمع تھے سب کے سب جلسہ گاہ سے احتجاجاً اٹھ کر چلے گئے لیکن جناح بیٹھے رہے۔ پھر انھوں نے اپنی تقریر میں تلک کی اہانت پر لارڈ ولینگڈن کے رویّے کی سخت مذمت کی۔ جناح کی انتہائی شرربار تقریر حاضرین دم بخود ہو کر سنتے رہے۔ تقریر ختم کر کے جناح بھی جلسہ گاہ سے باہر نکل آئے۔

اوائل نومبر میں لارڈ اور لیڈی ولینگڈن کے بعض وفادار دوستوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ گورنری کے عہدے سے سبکدوش ہونے پر بمبئی کے شہریوں کی جانب سے اُن کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کیا جائے۔ ہوم رول لیگ کے ارکان اور جناح نے اس کی مخالفت کی۔ ہم سب کا کہنا تھا کہ جن لوگوں کو سپاس نامہ دینا ہو وہ بڑے شوق سے لارڈ ولینگڈن کے دوستوں اور مدّاحوں کی حیثیت سے دیں لیکن بمبئی کے شہریوں کے نام پر یہ تقریب منعقد نہ کی جائے۔ یہ مشورہ قبول نہیں کیا گیا اور شیرف آف بمبئی کو بمبئی کے شہریوں کی طرف سے جلسہ طلب کرنے کے لئے خط بھیج دیا گیا۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے اس تجویز کی مخالفت بڑھتی گئی۔ اُن دنوں گاندھی جی تقریباً ہر ہفتہ بمبئی آیا کرتے تھے۔ ایک دن ہم لوگ اُن کے پاس پہنچے اور اُن سے درخواست کی کہ وہ بھی ہماری تحریک کی تائید کریں لیکن جس طرح مسز اینی بیسنٹ کے شہر بدر کئے جانے کے معاملے میں انھوں نے مایوس کیا تھا۔ اس موقع پر بھی انھوں نے وہی کیا۔ عذر یہ پیش کیا کہ وہ تو احمد آباد کے شہری ہیں۔ ہماری تحریک کی تائید کیسے کر سکتے ہیں۔ ہم نے اُن کو ہزار سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ اصولی بات ہے، اس کا تعلق شہریت سے کچھ نہیں ہے، لیکن وہ برابر انکار کرتے رہے۔

شیرف آف بمبئی کا طلب کیا ہوا جلسہ ٹاؤن ہال میں ۱۰ دسمبر ۱۹۱۸ء کو ہونے والا تھا اور اس میں لارڈ ولینگڈن کو ایڈریس پیش کیا جانے والا تھا۔ ہم تین سو آدمی جناح کی رہنمائی میں ایک دن پہلے رات کے دس بجے ٹاؤن ہال پہنچ گئے تا کہ صبح دروازہ کھلتے ہی سب سے پہلے ہال میں گھس جائیں۔ اگلے دن واقعی ہم سب آٹھ بجے صبح ہال میں داخل ہو گئے اور چھ بجے شام تک وہاں جمے رہے۔ پھر پولیس آئی، ہنگامہ ہوا اور ہم وہاں سے نکال دیئے گئے۔ شام کے پانچ بجے کے قریب مسز جناح بھی ٹاؤن ہال کی سیڑھیاں چڑھتی دکھائی دیں۔ خطرے کے باوجود وہ بڑی جرأت کے ساتھ آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ مزے کی بات یہ تھی کہ رتی کے والد سر ڈنشا پیٹٹ مخالف پارٹی میں تھے۔ ہنگامے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلسہ درہم برہم ہو گیا اور ایڈریس

پیش نہ کیا جا سکا۔ یہ جناح کی بہت بڑی کامیابی تھی۔

جناح کی شاندار کامیابی سے لوگ اتنے خوش ہوئے کہ عمر سوبانی نے "جناح میموریل ہال" کی شکل میں ایک مستقل یادگار قائم کرنے کی تجویز پیش کی اور لوگوں سے ایک ایک روپیہ چندہ دینے کی اپیل کی۔ ایک ہی مہینے کے اندر ۶۵ ہزار روپے جمع ہو گئے جس سے کانگریس ہاؤس کے احاطے میں ہال بنوایا گیا۔ اس ہال کے افتتاح کی رسم ادا کرنے کی خاطر مسز بیسنٹ خاص طور سے بمبئی آئیں۔

فروری ۱۹۱۹ء میں مسز بیسنٹ کے ساتھ ساتھ میں بھی ہوم رول لیگ سے مستعفی ہو کر مسز بیسنٹ کی نیشنل ہوم رول لیگ میں اعزازی سکریٹری کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ اس وقت ملک میں دو جماعتیں ہوم رول لیگ کے نام سے کام کر رہی تھیں، ایک نیشنل ہوم رول لیگ اور دوسری آل انڈیا ہوم رول لیگ، جناح آل انڈیا ہوم رول لیگ کی شاخ کے صدر تھے۔ فروری ۱۹۲۰ء میں انھوں نے مجھے آل انڈیا ہوم رول لیگ میں شریک ہونے کو کہا لیکن میں نے مشورہ دیا کہ دونوں لیگیں مل جل کر کام کریں تو بہتر ہوگا۔ میں اور عمر سوبانی اس اتحادِ عمل کے لئے بڑے بے چین تھے۔ چنانچہ ہم تینوں نے اپنی تجویز مسز بیسنٹ کو بھیج دی۔ وہ بمبئی آئیں اور اس مسئلے پر انھوں نے ڈھائی گھنٹے بات چیت کی۔ اس کے بعد مجھے آل انڈیا ہوم رول لیگ کی کونسل میں شریک ہونے کی اجازت دے دی۔

جناح چاہتے تھے کہ مانٹیگ چیمسفورڈ ریفارم پر مؤثر طریقے سے عمل کرنے کی خاطر ایک متحدہ محاذ قائم کیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی سوچا کہ اگر وہ گاندھی جی کو ہوم رول میں شریک کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ریفارم پر عمل کرنے میں گاندھی جی پر قابو پایا جا سکے گا۔ چنانچہ جیکر کی مخالفت کے باوجود جناح نے گاندھی جی کا نام آل انڈیا ہوم رول لیگ کی صدارت کے لئے پیش کر دیا۔ اس پیش کش پر گاندھی جی نے ۱۰ مارچ ۱۹۲۰ء کو جو خط سری نواس شاستری کو لکھا تھا وہ آج بھی پڑھنے کے قابل ہے۔

سری نواس شاستری نے اس خط کا کیا جواب دیا، یہ تو معلوم نہ ہو سکا لیکن گاندھی جی ہوم رول لیگ کے صدر بن گئے۔ اور اسی وقت سے گویا انھوں نے آگ سے کھیلنا بھی شروع کر دیا۔ ۱۰ مارچ کو انھوں نے اعلان کیا کہ اگر ان کے مطالبات تسلیم نہ کئے گئے تو وہ عدم تعاون کی تحریک شروع کر دیں گے۔ یہی وہ ہتھیار تھا جس سے وہ تشدد کے بغیر لڑ سکتے تھے۔

یکم اگست ۱۹۲۰ء کو تلک کا انتقال ہو گیا۔ اس کے چھ ہفتے بعد کلکتے میں کانگریس کا خصوصی اجلاس ہوا۔ لالہ لاجپت رائے صدر تھے۔ جب گاندھی جی نے عدم تعاون کی تجویز پیش کی تو مسز بیسنٹ، جناح، سی۔ آر۔ داس اور بہار اور تلک کے ساتھیوں نے تجویز کی مخالفت کی۔ جناح، ان کی بیوی، جیکر، عمر سوبانی، جمنا داس اور شنکر لال "کانگریس اسپیشل" ٹرین سے کلکتہ گئے تھے۔ ہوڑہ اسٹیشن پر موتی لال نہرو جناح سے ملے۔ اس وقت میں بھی موجود تھا۔ موتی لال نہرو نے جناح کو بتایا کہ گاندھی جی عدم تعاون کی تجویز پیش کرنے والے ہیں جس کے معنی یہ ہوں گے کہ کونسل، اسمبلی وغیرہ کا بائیکاٹ کیا جائے۔ موتی لال نے جناح کو مشورہ دیا کہ وہ مسز بیسنٹ، سی۔ آر۔ داس، لالہ لاجپت رائے اور مالویہ کے ساتھ مل کر اس تجویز کو نامنظور کرائیں۔ لیکن اس کے دس بارہ دن بعد جب تجویز پر ووٹ لینے کا وقت آیا تو اپنے بیٹے، جواہر لال نہرو کے اثر میں آ کر خود موتی لال نے گاندھی جی کے ساتھ اس تجویز کی موافقت میں ووٹ دیا۔ ووٹوں کی گنتی شروع ہوئی تو ایسا گمان ہونے لگا کہ تجویز نامنظور ہو جائے گی، چنانچہ نہایت

ہوشیاری سے رائے شماری کا کام اگلے دن پر اٹھا رکھا گیا۔ دوسرے دن عمر سوبانی اور شنکر لال ادھر اُدھر سے کوئی سو آدمی جلسے میں پکڑ لائے اور اُن سب نے گاندھی جی کی تجویز کے حق میں ووٹ دے دیا۔ تجویز معمولی اکثریت سے منظور ہو گئی۔ یہ ساری داستان اب تک ڈاکٹر امبیڈکر کے سوا اور کسی نے بیان نہیں کی ہے۔

ہم لوگوں کو کلکتہ سے بمبئی لوٹے پندرہ روز بھی نہیں ہوئے تھے کہ گاندھی جی نے جناح پر گویا بم کا گولہ مارا۔ بات یہ ہوئی کہ گاندھی جی نے علی برادران سے مل کر تحریکِ خلافت کی جو حمایت کی تھی وہ جناح کو بالکل ناپسند تھی اور یہ بات گاندھی جی کو سخت ناگوار گذری۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گاندھی جی نے مسلم لیڈروں سے جن میں علماء اور مذہبی پیشوا بھی تھے، ایک سمجھوتا کیا جس کی شرط یہ تھی کہ اگر مسلمان لیڈر انڈین ہوم رول لیگ میں اپنے تعاون کا اعلان کر دیں اور گلے کا ذبیحہ بند کر دینے کا وعدہ کر لیں تو گاندھی جی ہندوؤں کو خلافت تحریک کی حمایت پر آمادہ کر لیں گے۔ اُس وقت جناح اور عمر سوبانی دونوں نے گاندھی جی کو اس سودے بازی سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے گاندھی جی کو متنبہ کیا کہ ملکی سیاست میں مذہبی رعایت مناسب نہیں ہے مگر ان دنوں علی برادران اور گاندھی جی، دونوں کا نعرہ تھا:

"جو ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارا مخالف ہے۔ جو گاندھی جی کے ساتھ نہیں وہ غدار اور ٹوڈی ہے، برطانوی ایجنٹ ہے، ملک کے مفاد کے خلاف ہے۔"

اس قسم کی نعرہ بازی اور پروپیگنڈے کے جو لوگ شکار ہوئے اُن میں جناح کی شخصیت سب سے نمایاں اور اہم تھی۔ بمبئی ہوم رول لیگ کے صدر کی حیثیت سے جناح کی طاقت بے پناہ تھی۔ ۲۰ اپریل ۱۹۲۰ء کو عدم تعاون کی تجویز کے منظور کیے جانے کے بعد عمر سوبانی اور شنکر لال اس کے سکریٹری کے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ اُن کی جگہ میں اور کنہیا لال منشی مقرر کیے گئے۔ ستمبر ۱۹۲۰ء کے کلکتہ اجلاس اور دسمبر ۱۹۲۰ء کے ناگپور کانگریس کے درمیان گاندھی جی نے جناح کی سیاسی طاقت کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی۔ اس کے بعد جو واقعات ملک میں رونما ہوئے اُن کا اثر آزادی کے ۱۸ سال بعد بھی برابر محسوس ہوتا رہا ہے۔

گاندھی جی کے مشورے سے اُن کے ساتھیوں نے ہوم رول لیگ کے نام اور دستور میں ترمیم اور تنسیخ کرنے کے لئے، لیگ کا ایک جلسہ طلب کیا۔ تجویز یہ تھی کہ ڈومینین اسٹیٹس (DOMINION STATUS) کے بجائے مکمل آزادی ——— "پورن سوراج" کو نصب العین بنایا جائے۔ آئینی احتجاج کے بجائے پُرامن احتجاج کا طریقہ اپنایا جائے جس میں عدم تعاون اور عام قانون شکنی بھی شامل ہو۔ یہ بھی کہا گیا کہ ہوم رول لیگ کا نام بدل کر "سوراج سبھا" کر دیا جائے۔ جناح اور ان کے ساتھی ان بنیادی تبدیلیوں کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ چنانچہ جناح، جیکر، منشی، میں اور ہمارے پندرہ ساتھیوں نے ہوم رول لیگ یعنی سوراج سبھا سے استعفیٰ دے دیا۔ اس طرح ہوم رول لیگ پر غاصبانہ قبضہ کر کے گاندھی جی نے جناح اور ان کے ساتھیوں کو الگ کر دیا اور اس کے بعد "سوراج سبھا" بھی ختم کر دی گئی۔

دسمبر میں کانگریس کا اجلاس ناگپور میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کا میدان گاندھی جی کے ہاتھ رہا۔ اس موقع پر کانگریس نے برطانیہ سے اپنا ناتا توڑا اور آئینی احتجاج کے طریقۂ کار کو خیرباد کہہ دیا۔ عدم تعاون کی تجویز منظور ہوتے ہی کانگریس کی ہیئت بدل گئی۔ پنڈت مالویہ، جناح اور کھاپرڈے نے گاندھی جی کے نظریے کی سخت مخالفت میں زبان کھولی لیکن لوگوں نے

آنا ہنگامہ بپا کیا کہ وہ تقریر بھی نہ کر سکے۔ جناح نے ملک کو عدم تعاون کے منفی رویے سے باز رکھنے کی ایک اور کوشش کی۔ انھوں نے گاندھی جی کے خیالات کی مخالفت کرتے ہوئے ایک نہایت بے باک تقریر کی لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس اجلاس میں ہندستان کو لسانی ریاستوں میں تقسیم کرنے کی تجویز بھی منظور کی گئی۔ اس تجویز کی مصلحت اور انگریزی زبان کو ترک کر دینے کا فائدہ ابھی تک نہ ہندستان سمجھ سکا نہ دنیا۔ ناگپور اجلاس میں گاندھی جی نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ وہ ایک برس میں یعنی ۳۱ دسمبر ۱۹۲۱ء تک ہندستان کو سوراج دلا دیں گے۔

دسمبر ۱۹۲۱ء میں ہندستان کے وائسرائے لارڈ ریڈنگ تھے۔ انھوں نے چترنجن داس اور مدن موہن مالویہ کے ذریعے ایک گول میز کانفرنس کی تجویز پیش کی۔ اس کانفرنس میں برطانوی حکومت کی نمائندگی وہ خود کرنے والے تھے۔ جن ہندستانی لیڈروں کو شرکت کی دعوت دی جانے والی تھی اُن میں گاندھی جی اور اُن کے رفقا کے بھی نام تھے۔ گاندھی جی نے اس میں شریک ہونا منظور کر لیا۔ اس کے بعد جب میں ایک روز ان سے ملنے گیا تو وہ ولبھ بھائی پٹیل اور بعض مسلمان علما سے گفتگو کرنے میں مصروف تھے۔ اُن لوگوں کا کہنا تھا کہ جب تک حکومت علی برادران کو قید سے رہا نہ کر دے اُس وقت تک گاندھی جی کو گول میز کانفرنس میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ اس گفتگو کے تقریباً ایک گھنٹے بعد سر تیج بہادر سپرو کو تار بھجوا دیا گیا کہ گاندھی جی نے لارڈ ریڈنگ کی دعوت رد کر دی ہے۔

۲ جنوری ۱۹۲۲ء کی شام کو میں جناح سے ملا۔ رتی انھی کے پاس بیٹھی تھیں۔ ہم لوگ چار بجے صبح تک یعنی مسلسل سات گھنٹے بیٹھے رہے۔ جناح یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ گاندھی جی کے انکار کا رد عمل مسز بیسنٹ اور سر تیج بہادر سپرو پر کیا ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ (جناح) ایک کانفرنس بمبئی میں بلانے والے ہیں جس میں اُمبالال سارا بھائی، پنڈت مدن موہن مالویہ، جیکر، پرشوتم داس، ٹھاکر داس، نٹراجن اور بھور گری کے علاوہ گاندھی جی کو شرکت کی دعوت دی جائے گی۔ اس کانفرنس کے ذریعے وہ لارڈ ریڈنگ کو گول میز کانفرنس کی دعوت کی تجدید پر رضامند کرنا چاہتے تھے تاکہ گاندھی جی کو اپنے فیصلے پر نظرثانی کرنے کا موقع ملے۔ جناح نے مجھے اُمبالال کے مکان پر بلایا۔ وہیں کانفرنس کے انتظامات کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ جناح چاہتے تھے کہ میں اس کام میں اُن کی مدد کروں۔ مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ مسز بیسنٹ کو شرکت کی دعوت دوں۔ چنانچہ ہم نے اُنھیں تار کے ذریعے صورت حال کی اطلاع دی۔ مسز بیسنٹ کا جواب آیا کہ اُن کا بمبئی جانا بے سود ہوگا کیونکہ گاندھی جی تعاون کے لیے ہرگز تیار نہ ہوں گے۔ یہ کانفرنس تو ہوئی لیکن گاندھی جی نے اس میں واقعی بڑا منفی رویہ اختیار کیا جس کی وجہ سے معاملات کو سلجھانے میں مدد ملنے کے بجائے اچھی خاصی رکاوٹ پیدا ہوگئی۔ یہاں تک کہ جلسے کے صدر سر شنکرن نائر، تنگ آکر جلسہ گاہ سے باہر نکل آئے۔ کانفرنس قطعی ناکام رہی۔ اس کے ذمے دار بڑی حد تک گاندھی جی تھے۔ وائسرائے نے دیکھا کہ جس نفسیاتی مقصد کی خاطر وہ گول میز کانفرنس کی پیش کش کر رہے تھے وہ باقی نہیں رہا۔ کلکتے میں پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ ہو چکا تھا حالانکہ لارڈ ریڈنگ اُسی کو روکنا چاہتے تھے۔ اس واقعے کا اُنھیں بڑا صدمہ تھا۔ انھوں نے گول میز کانفرنس کی دعوت کی تجدید فضول سمجھی۔ جناح بھی بے حد مغموم تھے۔ اُنھیں حکومت اور گاندھی جی دونوں نے صدمہ پہنچایا تھا۔ جناح نے بڑے عزم کے ساتھ ایک نئی پارٹی بنانے کی کوشش کی لیکن اس معاملے میں جیکر اور نٹراجن اُن کی مدد پر آمادہ نہیں ہوئے۔ اس کے بعد جناح سیاسی میدان سے ہٹ گئے اور ہائی کورٹ میں پریکٹس

کرنے لگے۔

مزدور تحریک اور سماجی اصلاح کے سلسلے میں جناح اور رتی دونوں نے میرے کام میں بڑی دل چسپی لی تھی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ مسز بیسنٹ کے بعد اس سلسلے میں مجھے سب سے زیادہ مدد مسز جناح سے ملی۔ اپنے شوہر کی طرح وہ بھی اس مسئلے کو حقیقت پسندی اور عملی زاویۂ نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ جسم فروشی کو قطعی طور پر ختم کرنا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ اس اخلاق سوز تجارت میں بے رحمی اور انسانیت سوزی کی جو واردا تیں ہوتی ہیں، ہماری کوششیں اُنھیں کے تدارک یا انسداد تک محدود تھیں۔ مسز رتی جناح کو میرے ان کاموں میں کتنی گہری دل چسپی تھی، اس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے ۱۸/اگست ۱۹۲۷ء کو مجھے لکھا تھا:

"... آپ (اُن علاقوں میں) مجھے کب اپنے ساتھ لے چلیں گے تاکہ میں بذاتِ خود اُن حالات کا مطالعہ کرسکوں جن میں وہ بدنصیب عورتیں زندگی بسر کرتی ہیں۔ میں اُن جگہوں کو دیکھنا چاہتی ہوں جو "اڈا" کہلاتی ہیں۔"

اِن علاقوں میں رتی اور مس ڈیوس کے ساتھ گھنٹوں گھوم کر میں نے اُن کو وہاں کے حالات دکھائے۔

دسمبر ۱۹۲۳ء میں گیا میں کانگریس کا اجلاس 'سی۔ آر۔ داس کی صدارت میں ہوا۔ اس اجلاس میں کونسل جانے کے خلاف فیصلہ ہوا تو سی۔ آر۔ داس' کانگریس کی صدارت سے مستعفی ہوگئے۔ اُنھوں نے موتی لال نہرو کے ساتھ "سوراج پارٹی" بنائی۔ اس پارٹی نے کانگریس ہی کا سارا پروگرام، یہاں تک کہ عدم تعاون کا اصول تک اپنا لیا، صرف کونسل جانے کی حمایت کی حد تک اس کی پالیسی کانگریس سے مختلف تھی۔ جب انتخابات ہوئے تو مرکزی اسمبلی کی ایک سو نشستوں میں سے ۴۳ نشستیں سوراج پارٹی نے حاصل کیں۔ یہ خاصی کامیابی کی دلیل تھی۔ پارٹی کے لیڈر موتی لال نہرو منتخب ہوئے۔

نئی مرکزی اسمبلی میں موتی لال نہرو، اپنے ۴۰ رفقا کے ساتھ جناح اور مالویہ جی کے گہرے تعاون سے کام کرنے لگے۔ اس طرح حزبِ مخالف میں تیس ارکان کا اور اضافہ ہوگیا۔ یہ سب مل کر "نیشنلسٹ پارٹی" کہلاتے تھے۔ اُن دنوں اسمبلی میں سر پرشوتم داس ٹھاکر داس، جی۔ ڈی۔ برلا، کے۔ سی۔ نیوگی، شان مکھم چیٹی، سری نواس آئنگر، لالہ لاجپت رائے، وِٹھل بھائی پٹیل جیسے چوٹی کے لیڈر دکھائی دیتے تھے۔ اسمبلی کا سب سے شاندار اور نمایاں پہلو جناح اور موتی لال نہرو کی رفاقت اور اُن کا شانہ بہ شانہ کام کرنا تھا۔

ستمبر ۱۹۲۴ء کے اجلاس کے دوران میں مرکزی اسمبلی کے آزاد ممبروں میں سے ۲۸ نے ایک مستقل پارٹی بنالی جس کے لیڈر جناح منتخب ہوئے۔ اس طرح سوراج پارٹی اور آزاد ممبروں سے مل کر نیشنلسٹ پارٹی خاصی مستحکم ہوگئی۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ سوراج پارٹی کی اسمبلی میں شرکت کا مقصد ریفارم یعنی ۱۹۱۹ء ایکٹ کو ختم کرنا اور حکومت سے عدم تعاون تھا لیکن ایسے منفی پروگرام پر عمل کرنا موتی لال نہرو کے تدبر اور فراست کے خلاف ہوتا۔ چنانچہ انھوں نے ٹھوس تجویزیں پیش کیں۔ ایک تجویز یہ تھی کہ گورنمنٹ ایک گول میز کانفرنس بلائے جس میں حکومت کے دستور پر بحث ہو۔ اس کی خاطر اُنھوں نے اپنے تعاون کا وعدہ بھی کیا لیکن افسوس، گورنمنٹ نے اس پیش کش کو ٹھکرادیا ورنہ آج ہندستان کی تاریخ شاید کچھ اور ہی ہوتی۔

مئی ۱۹۲۴ء میں اسمبلی کا اجلاس شملے میں ہوا۔ اس موقع پر لوہے اور فولاد کی صنعت کو مضبوط کرنے کی تجویز

پیش ہوئی۔ اس کی رُو سے جمشید پور میں ٹاٹا کے کارخانے کو خاصی امداد ملنے والی تھی۔ اسمبلی کے بعض ممبر بل کے مخالف تھے۔ مگر ایک طرف موتی لال نہرو اور جناح کا باہمی تعاون تھا اور دوسری طرف ان دونوں کا حکومت سے بھی تعاون تھا۔ چنانچہ بل مخالفت کے باوجود منظور ہوگیا۔ اس موقع پر ایک دل چسپ واقعہ پیش آیا جس کا انکشاف تین سال بعد ہوا۔ جناح کے بنگلے پر ایک رات ڈنر تھا۔ موتی لال نہرو، ڈی۔ آر۔ ٹاٹا اور میں شریک تھے۔ وہاں اُس بل کا تذکرہ چھڑا۔ جناح اُن دنوں کی اسمبلی کی چٹ پٹی باتیں سنانے لگے جن پر خوب قہقہے لگے۔ جناح نے کہا جس روز بل پر ووٹ لیے جانے والے تھے، اُس سے ایک دن پہلے رات کے وقت رتن ٹاٹا بھاگے بھاگے ہوئے سیسل ہوٹل میں آن کے (جناح کے) کمرے میں پہنچے اور بڑی گھبراہٹ میں چلّا کر کہنے لگے:

"جناح! کچھ سنا تم نے؟ غضب ہوگیا، اسمبلی کے ممبر صاحب کہتے ہیں کہ اگر میں نے ایک بڑی بھاری رقم انھیں نہ دی تو وہ اس بل کے خلاف ووٹ دیں گے۔"

یہ ممبر موتی لال کی پارٹی کے آدمی تھے۔ رات زیادہ آگئی تھی پھر بھی جناح نے اُن صاحب کو جنھوں نے رقم کا مطالبہ کیا تھا اور اسی ہوٹل میں مقیم تھے بلوا بھیجا۔ جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئے، جناح نے ڈانٹ کر کہا:

"رتن ٹاٹا مجھ سے شکایت کر رہے ہیں کہ آپ نے اُن سے اپنے ووٹ کی قیمت دس ہزار روپے طلب کی ہے۔ اطمینان رکھیے، یہ رقم آپ کو ہرگز نہیں ملے گی۔ آپ جہنم میں جائیں اور سر دست اس کمرے سے باہر تشریف لے جائیں۔"

یہ صاحب منہ لٹکائے وہاں سے چلے آئے اور مزے کی بات یہ کہ اگلے دن انھوں نے بل کے حق میں ووٹ دیا۔ رتی اور موتی لال کے ساتھ میں بھی اس دل چسپ واقعے سے خوب لطف اندوز ہوا۔ رتن ٹاٹا نے، جو وہاں موجود تھے، اس کی تصدیق کی۔ موتی لال کو اس کا پہلے سے علم ہو چکا تھا۔

یہ جناح اور موتی لال کے اُسی باہمی تعاون کا نتیجہ ہے کہ آج ہندستان میں لوہے اور فولاد کی صنعتیں مستحکم بنیادوں پر قائم ہیں۔ موتی لال کے دل میں جناح کی بے حد عزت تھی اور وہ ان پر اعتماد کرتے تھے۔ بالکل یہی معاملہ جناح کا موتی لال کے ساتھ تھا۔

جنوری ۱۹۲۱ء کی گول میز کانفرنس کی ناکام کوشش کے بعد جناح مایوس ہو کر سیاست سے کنارہ کش ہوگئے اور اپنی پریکٹس کی طرف توجہ کرنے لگے۔ انھوں نے دیکھا کہ کانفرنس اور حکومت، دونوں نے غیر مناسب رویہ اختیار کر لیا ہے تو پھر اُن کا سیاسی مسائل میں اُلجھنا تضیعِ اوقات کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جناح نے وقت کا انتظار کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ جب عدم تعاون اور خلافت، دونوں تحریکیں ناکام ہوئیں تو وہ نومبر ۲۳ میں مرکزی اسمبلی میں داخل ہوئے، وہاں ۲۸ آزاد ممبروں کے گروپ لیڈر کی حیثیت سے انھوں نے موتی لال نہرو کے ۴۲ ممبروں پر مشتمل سوراج پارٹی سے تعاون کیا۔ جناح بلاشبہ ایک عظیم نیشنلسٹ تھے جن کی قیادت کا اعتراف صرف مسلمانوں کے ترقی پسند طبقے ہی کو نہیں بلکہ ہندوؤں کی بڑی تعداد بھی تسلیم کرتی تھی۔

نان کوآپریشن اور خلافت تحریک کے زمانے میں یعنی ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۴ء تک مسلم لیگ ساکت اور بے جان سی رہی لیکن جیسے ہی یہ تحریکیں ڈھیلی پڑیں، مسلم لیگ میں زندگی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ۱۹۲۴ء میں مسلم لیگ کا پندرھواں اجلاس لاہور میں ہوا۔ اس موقع پر جناح نے لوگوں کو بتایا کہ اگرچہ نان کوآپریشن تحریک ناکام رہی، اس سے کافی نقصان پہنچا لیکن کچھ فائدے بھی ہوئے۔ عوام بیدار

ہو گئے ہیں اور اب وہ سوراج کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ فوری طور پر ان کی مانگ "ذمہ دار ڈومنین" حکومت کی ہے۔ اس مطالبے کے حصول کی خاطر اُن میں ایک طرح کی بے خوفی آ چکی ہے۔ ہندستان کے عام آدمی میں سیاسی شعور پیدا ہو چلا ہے چنانچہ اب وہ سمجھنے لگا ہے کہ اس کی خودداری اور عزت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس ملک کی باگ ڈور غیروں کے بجائے خود ملک کے لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔

جناح نے یہ بھی بتایا کہ لیگ اعلان کر چکی ہے کہ اس کا مقصد ملک کے لئے سوراج حاصل کرنا ہے۔ اب تک ملک میں بدیسی حکومت اس لئے جمی ہوئی تھی کہ ہندو اور مسلمان آپس میں متحد نہیں تھے۔ جس دن ان میں اتحاد ہو جائے گا اسی روز ہندستان کو ذمہ دار ڈومینین حکومت مل جائے گی۔ ہندستان کے دستور کے لئے جناح نے دو بنیادی اصول پیش کئے ہیں جن کی بدولت، دستور (ان کے خیال میں) مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول ہو سکے گا۔

(الف) دستور وفاقی (فیڈرل) طرز کا ہو جس کی رُو سے صوبوں کو خود مختاری حاصل ہو۔ مرکزی حکومت کا تعلق صرف عام مسائل تک باقی رہے۔

(ب) ہر صوبے میں اقلیتوں کو معقول اور مؤثر نمائندگی دی جائے اور جو سر دست جداگانہ انتخابات کے ذریعے ہو۔

جناح نے ۱۹۱۹ء کے مانٹیگ ایکٹ پر رائے کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ یہ ایکٹ ناکافی اور قطعی تسلی بخش نہیں ہے۔ اس لئے پوری کوشش کی جانی چاہیئے کہ ملک میں مکمل ذمہ دار حکومت قائم ہو۔

۱۹۲۶ء میں کلکتہ سے ایک کتاب چھپی تھی جس میں ہندستان کی مشہور کمپنیوں کے نام اور اُن کے بڑے بڑے حصے داروں کے نام تھے۔ جناح کا نام تین کمپنیوں کے تحت درج تھا: ٹاٹا اسٹیل، بمبئی ڈائنگ اور ٹراموے کمپنی۔ ان تینوں میں اُن کے چودہ لاکھ روپے کے حصے تھے۔ یہ سرمایہ اُس وقت کی قیمتوں کے لحاظ سے ہے۔ ظاہر ہے کہ پچھلے برسوں میں یہ سرمایہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہوگا۔ جناح سٹے یا قسمت آزمائی کے بیوپار یا مشغلے کے بالکل قائل نہ تھے۔ وہ اپنا سرمایہ بڑی احتیاط کے ساتھ اور کافی سوچ بچار کے بعد کہیں لگاتے تھے۔ اُن کی وفات کے وقت ان کے ذاتی اثاثے کی قیمت کروڑوں تک پہنچ گئی ہوگی۔

وفات کے بعد جب جناح کی وصیت پڑھی گئی تو معلوم ہوا کہ انھوں نے چھ لاکھ روپے علی گڑھ یونی ورسٹی کے لئے چھوڑے ہیں، جس کے بارے میں اُن کے سوانح نگار ہیکٹر بولی تھو نے بتایا کہ آج تک اس رقم کا مطالبہ نہ تو علی گڑھ نے کیا اور نہ حکومتِ ہند نے۔ واضح رہے کہ جناح کی وصیت قیامِ پاکستان سے پہلے لکھی گئی تھی۔ کیا اس وصیت نامے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ جناح کو ہندستان کے بھارت اور پاکستان میں تقسیم ہونے کی ہرگز توقع نہ تھی؟

فروری ۱۹۲۵ء میں حکومت نے ایک کمیٹی مقرر کی جس کا مقصد افواج میں زیادہ سے زیادہ ہندستانی عنصر داخل کرنے اور سینڈھرسٹ اکیڈمی کے نمونے پر فوجی کالج قائم کرنے کی سفارشات پیش کرنی تھیں۔ جناح اور موتی لال نہرو اس کمیٹی کے ارکان مقرر کئے گئے تھے لیکن کچھ مہینوں کے بعد موتی لال نہرو مستعفی ہو گئے۔ جناح نے کمیٹی کی طرف سے شہادتیں جمع کرنے میں قانونی جرح کے وہ سارے گُر استعمال کئے جن کے وہ ماہر تھے۔ اُن کی جرح جن انگریز فوجی افسروں کو بہت ناگوار گزری، اُن میں ڈگلس گریسی بھی تھے، لیکن اس کے باوجود اس کام میں کہیں بھی کسی قسم کی تلخی پیدا نہ ہونے پائی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ۱۹۴۸ء میں پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت

سے جناح نے مسٹر ڈگلس گریسی جی کو پاکستانی افواج کا کمانڈر انچیف مقرر کیا۔

۱۹۲۶ء میں جناح اسکین (سینڈھرسٹ) کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے یورپ اور امریکہ بھی گئے تھے۔ رتی اُن کے ساتھ تھیں۔ دہرہ دون کا فوجی کالج اِسی کمیٹی کی سفارشات کا نتیجہ ہے۔

ملک کے مختلف مسائل کے بارے میں جناح کا رویہ ہمیشہ ترقی پسندانہ اور اصلاحی رہا ہے۔ لیبر اور سماجی اصلاح (سوشل ریفارم) پر اسمبلی میں جتنے بل پیش ہوئے اُن سب کی جناح تائید کرتے رہے۔ انھوں نے ایّام زچگی میں اجرت دیئے جانے کی حمایت کی اور شادی کی رضامندی کی عمر بڑھانے کی تجویز کی تائید کی۔ واقعہ یہ ہے کہ جناح نہ تو سیاست میں رجعت پسند رہے اور نہ معاشرتی اصلاح کے معاملے میں کبھی کسی سے پیچھے رہے۔

۱۹۲۶ء میں مرکزی اسمبلی کی مسلم نشست کے لیے جناح بمبئی سے کھڑے ہوئے۔ انھیں اپنی کامیابی کا اس قدر یقین تھا کہ انھوں نے کوئی انتخابی مہم شروع نہیں کی۔ اس سے ہم تینوں ـــــ رتی، مسر پرشوتم داس ٹھاکر داس اور میں ـــــ سخت پریشان تھے۔ ہم کبھی جناح کو اس کی ضرورت محسوس کرانے کی کوشش کرتے، وہ بڑی بے نیازی سے جواب دیتے: "بمبئی، یہ تو اصل میں ووٹروں کی آزمائش ہے۔ میں کیوں فکر کروں؟" اس خود اعتمادی پر ہم لوگوں کو ہنسی آجاتی مگر میں الیکشن کے دن جو سماں دیکھنے میں آیا وہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ جناح کے کچھ کہے سُنے بغیر، اُن کے ہندو دوستوں نے تقریباً ایک سو موٹریں بھیج دیں تاکہ اُن میں ووٹر شاؤن ہال اور گرکھا ٹری کے پولنگ اسٹیشن تک پہنچ جائیں۔ جناح کے اُن ہندو دوستوں نے انھیں خطوط بھی لکھے جن میں کہا گیا تھا کہ چونکہ انتخابات فرقہ وارانہ بنیاد پر ہو رہا ہے، اس لیے وہ ووٹ تو نہیں دے سکتے۔ لیکن اپنی گاڑیاں بھیج کر اگر وہ جناح کو کامیاب کرانے میں مدد دے سکتے ہیں تو یقیناً یہ مادرِ وطن کی ایک خدمت ہوگی۔ اس داستان کا بقیہ حصہ "بمبئی کرانیکل" کی اشاعت مورخہ ۰ نومبر ۱۹۴۵ء میں یوں بیان ہوا ہے:

"بمبئی کرانیکل کی اشاعت مورخہ ۳ نومبر میں "بیربل" کے نوٹ میں کچھ غلط باتیں چھپی ہیں جن کی تصحیح چاہتا ہوں ـــ بیربل نے لکھا ہے کہ تقریباً بیس سال ہوئے کہ حسین بھائی لالجی نے جو جناح صاحب کے مقابلے میں مرکزی اسمبلی کے لیے کھڑے ہوئے تھے، اپنی امیدواری واپس لے لی تھی حالانکہ وہ کامیاب ہو رہے تھے۔ یہ سراسر غلط ہے، واقعہ یہ ہے کہ اُس موقع پر تین امیدوار تھے ـــــ مسٹر جناح، مسٹر صالح بھائی بڑودہ والا اور مسٹر حسین بھائی لالجی۔ پولنگ کے دن دس بجتے بجتے صاف ظاہر ہونے لگا کہ میدان کس کے ہاتھ رہے گا، کیونکہ جہاں جناح صاحب کو دس ووٹ مل رہے تھے، بقیہ دو اُمیدواروں کو چار ملتے تھے۔ دوپہر کے قریب مسٹر بڑودہ والا نے جناح صاحب سے کہا کہ اگر وہ (جناح صاحب) اُن سے اپنی امیدواری واپس لینے کو کہیں تو وہ بڑی آسانی سے اُن کی بات مان لیں گے ـــ جناح صاحب نے نہایت نرمی سے جواب دیا کہ اُن کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ بڑودہ والا سے نام واپس لینے کی درخواست کریں۔ اگر بڑودہ والا آخری لمحے تک بھی مقابلہ جاری رکھنا چاہتے ہیں تو وہ شوق سے ایسا کر سکتے ہیں۔ اس جواب کے آدھ گھنٹے بعد بڑودہ والا انتخاب سے دستبردار ہو گئے۔ کچھ دیر بعد جب دوسرے فریق یعنی مسٹر حسین بھائی لالجی نے دیکھا کہ جناح صاحب کو کہیں زیادہ ووٹ مل رہے ہیں تو انھوں نے بھی خواہش ظاہر کی۔ جناح صاحب نے صاف انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ مقابلہ جاری رکھیں۔ سہ پہر تک ووٹ پڑتے

رہے۔ آخر جناح صاحب اپنے دونوں حریفوں کے مقابلے میں بھاری اکثریت سے جیت گئے۔"

جناح ایک سچے اور عظیم نیشنلسٹ تھے۔ انھوں نے مختلف الخیال مسلم لیڈروں کو ہموار کرکے ہندو مسلم فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کرنے کی نہایت مخلصانہ اور جان توڑ کوشش کی۔ ان کوششوں کی خاطر نہ صرف ہندوستان کی بہبودگی کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ کامیاب ہوتے۔ دشواریوں کے باوجود امید کی کرن دکھائی دینے لگی۔ ٹھوس تجویز سامنے تھی۔ لیکن افسوس کہ بعض شر پسند قوتوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔

"ٹائمز آف انڈیا" میں ایک ہفتہ وار فیچر مضمون "مسلمانوں کی نظر سے" کے عنوان سے نکلا کرتا تھا۔ اس فیچر میں جناح کی کوششوں کے بارے میں بعض نہایت غیر معروف اور گھٹیا قسم کے اردو اخباروں کے مضامین کے حوالے چھاپے جاتے تھے۔ اگرچہ ان اردو اخباروں کی عوام میں کوئی وقعت نہ تھی لیکن ان کے مضامین گورنمنٹ کے اورنٹیل ٹرانسلیٹر کے محکمے سے ترجمہ کرا کے ٹائمز آف انڈیا کو بھیجے جاتے۔ ذاتی علم کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اس سے گورنمنٹ کا مقصد مذہبی عناد پیدا کرنا اور فرقہ وارانہ منافرت کو ہوا دینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ دوسری طرف کانگریسی اخبار "بمبئی کرانیکل" نے جناح کے خلاف یہ لکھ کر الگ محاذ قائم کیا کہ وہ پکے فرقہ پرست ہیں۔ میں نہایت وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جناح ہرگز فرقہ پرست نہیں تھے۔ کرانیکل کے ایڈیٹر سید عبداللہ بریلوی بڑے نرم طبیعت اور مرنجان و مرنج انسان تھے لیکن کانگریس ہائی کمان کی خوشنودی کی خاطر انھوں نے جناح پر رکیک حملے کیے اور ایسے ذلیل الزامات لگائے جن سے جناح کی شخصیت صرف مشتبہ ہی نہیں بلکہ مکروہ نظر آنے لگی۔ میں جانتا ہوں کہ ان جھوٹے الزاموں سے جناح کو کتنا سخت صدمہ پہنچا تھا اور ان کا رنجیدہ ہونا بالکل درست بھی تھا۔ ان سب کا نتیجہ وہی نکلا جو رجعت پسند طبقہ چاہتا تھا اور جو حکومت چاہتی تھی۔

۸ نومبر ۱۹۲۷ء کو وائسرائے نے اعلان کیا کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان میں آئینی اصلاحات کی سفارش پیش کرنے کی غرض سے ایک کمیشن مقرر کیا ہے جس کے چیرمین سر جان سائمن ہوں گے۔ اس کمیشن کے سب ارکان انگریز تھے۔ اس نوعیت کے کمیشن کے بارے میں ہندوستان کا جو رویّہ ہونا چاہیئے تھا وہ ظاہر ہے۔ میں مسز بیسنٹ کے ایما پر جناح سے ملا۔ انھوں نے ایک مختصر سا بیان تیار کرکے سارے ملک میں دوستوں کے پاس بھیج دیا۔ ایک نقل مجھے دے کر بولے کہ اس پر بمبئی کے بارہ مشہور لیڈروں کے دستخط چاہئیں۔ اگلے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر میں نے مطلوبہ دستخط حاصل کرکے شام تک ان کے پاس پہنچا دیا۔ ۱۶ کو وہ بیان جناح نے اخباروں میں شائع کرا دیا۔

لالہ لاجپت رائے اور جیکر نے علیحدہ بیان کے ذریعہ اور اسی طرح دوسرے کانگریسی لیڈروں نے کمیشن کے بائیکاٹ کا اعلان کیا۔

مدراس میں کانگریس کا اجلاس ہوا اور کلکتہ میں مسلم لیگ کا، دونوں میں سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی قراردادیں منظور ہوئیں۔

رتی کی علیحدگی

جنوری ۱۹۲۸ء میں کلکتہ مسلم لیگ کے اجلاس سے واپسی پر رتی اور جناح میں علیحدگی ہو گئی۔ میں اس کا ذمہ دار ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی قرار نہیں دے سکتا۔ اگر کوئی سبب تھا تو وہ صرف مزاج اور عمر کا فرق تھا۔ رتی کو انتقال کیے ہوئے ۴۵ سال گزر گئے لیکن میں ذاتی علم کی بنا پر آج بھی یہی کہوں گا کہ وہ آخری دم تک جناح سے محبت کرتی رہیں۔ ۳ اپریل ۱۹۲۸ء

کو جناح انگلستان گئے۔ اس کے ایک ہفتے بعد رتی بھی پہنچ گئیں۔ اُس سال، سنت اور ستمبر کے درمیان رتی پیرس میں سخت بیمار پڑیں۔ اُس وقت میاں بیوی میں مفاہمت ہو چکی تھی۔ چناں چہ جب جناح کو رتی کے نرسنگ ہوم میں داخل ہونے کی خبر ملی تو وہ فوراً پیرس پہنچے اور اُسی نرسنگ ہوم میں مقیم ہوئے۔ بعد میں مجھے رتی نے بتایا کہ جناح وہیں بیٹھ کر کھانا کھاتے اور وہی پرہیزی غذا کھاتے جو رتی کے لئے پکائی جاتی۔ اس کے بعد رتی اپنی ماں کے ساتھ ہندوستان لوٹیں، جناح بھی واپس آگئے۔ رتی پوری طرح اچھی نہ ہو پائیں اور ۲۰ فروری ۱۹۲۹ء کو اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ میں اُن دنوں اُن سے تقریباً روزانہ ملتا تھا۔

نہرو کمیٹی دسمبر، ۱۹۲۷ء کے مدراس سیشن کے بعد کانگریس نے موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک سب کمیٹی مقرر کی جس کا مقصد ہندوستانی دستور کے بنیادی اصول طے کرنا تھا۔ اس کے ارکان میں مسلمانوں میں سے سر علی امام اور شعیب قریشی تھے۔ ہندو سبھا سے اَنے اور جیکر، سکھ لیگ کے منگل سنگھ تھے اور ان سب کے علاوہ سر تیج بہادر سپرو، این۔ ایم۔ جوشی اور جی۔ آر۔ پردھان تھے۔ کمیٹی کے سکریٹری جواہر لال تھے۔ چوں کہ جناح اپریل کے اوائل ہی میں انگلستان چلے گئے تھے اس لئے ان کی شمولیت کا سوال ہی نہ تھا۔

نہرو کمیٹی کے سامنے سب سے اہم مسئلہ اقلیت کا تھا۔ جمہوری خود مختار ہندوستان میں اقلیت اور بالخصوص مسلمانوں کی حیثیت کیا ہونی چاہئے؟ ملک میں ہندوؤں کی غالب اکثریت تھی۔ ایسی صورت میں اس بات کا تحفظ ضروری معلوم ہوتا تھا کہ برطانوی سامراج کی جگہ ہندوستانی جمہوریت قائم ہو جانے پر ہندوؤں کی مستقل اکثریت کہیں مسلم اقلیت کے مفاد کے خلاف کام نہ کرے۔ ایسے تحفظ کا ایک ممکن طریقہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے لئے جُداگانہ انتخاب کا اصول قائم رکھا جائے۔ لیکن یہ کوئی مستقل حل نہیں تھا۔ اس لئے دوسرے طریقوں پر بھی غور کرنا ضروری تھا۔

نہرو رپورٹ نہرو کمیٹی نے جب اپنی رپورٹ مرتب کر لی تو اس پر غور کرنے کے لئے اگست ۱۹۲۹ء لکھنؤ میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں کانگریس کے علاوہ آل انڈیا مسلم لیگ، مرکزی خلافت کمیٹی، ہندو مہا سبھا اور بہت سی سیاسی اور اقلیتی جماعتیں شریک ہوئیں۔

ڈاکٹر انصاری کانفرنس کے صدر تھے۔ جناح کے رفیق کار راجہ صاحب محمود آباد نے اپنی تقریر میں ۱۹۱۶ء کے کانگریس اور لیگ کے معاہدے کا ذکر کیا اور اُمید ظاہر کی کہ اس کانفرنس میں بھی وہی جذبہ کار فرما ہوگا اور نہرو رپورٹ کو ہر جماعت کی تائید حاصل ہو جائے گی۔ اس کانفرنس میں پنڈت مالویہ نے یہ تجویز پیش کر دی کہ حکومتِ برطانیہ سے ہندوستان کو فوراً ڈومینین کا مرتبہ دے کر ذمہ دار حکومت بنانے کا مطالبہ کیا جائے۔ اس تجویز میں جواہر لال اور ان کے کچھ دوسرے ساتھی ڈومینین کے بجائے مکمل آزادی کا لفظ چاہتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے اختلافی تقریر کی۔

۲۲ دسمبر ۱۹۲۸ء کو کلکتے میں آل انڈیا کنونشن ہوا۔ اس میں نہرو رپورٹ کو آخری شکل دی جانے والی تھی۔ اجلاس میں مختلف سیاسی اور فرقہ وارانہ جماعتوں کے نمائندے شامل ہوئے۔ جس فرقہ وارانہ مسئلے کا حل نہرو رپورٹ نے تلاش کیا تھا، اسی کو دوبارہ تازہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ آغا خان اِس رپورٹ کے مخالف تھے۔ جناح چوں کہ اپریل سے اکتوبر تک ہندوستان سے باہر رہے

اس لئے رپورٹ میں ان کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ دراصل رپورٹ موتی لال نہرو اور سرتیج بہادر سپرو کی تیار کی ہوئی تھی جناح کلکتہ کے اجلاس میں موجود تھے۔ وہیں اُنھوں نے مسلم لیگ کی طرف سے فرقہ وارانہ مسئلے کو اُٹھایا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ مرکزی اسمبلی میں ایک تہائی نشستیں مسلمانوں کے لئے ہوں اور صوبوں کو مابقی اختیارات حاصل ہوں۔

اس مطالبے پر غور کرتے ہوئے یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اُن دنوں مسلم لیگ کا رویّہ کانگریس سے مخالفانہ نہیں بلکہ دوستانہ تھا۔ مسلم لیگ رجعت پسند نہیں تھی۔ سرتیج بہادر سپرو نے باہمی اتحاد کی ضرورت پر ایک زبردست تقریر کی جس میں انھوں نے کہا کہ وہ جناح کے ایک تہائی کا مطالبہ منظور کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن جیکر نے جناح کی ترمیم کی مخالفت کی جس کا اثر بالآخر یہ ہوا کہ آخری ووٹنگ میں جناح کی ترمیم رد ہو گئی۔

اپنی ترمیم کی تائید میں جناح نے بڑی مصالحانہ اور موثر جوابی تقریر کی جس میں اُنھوں نے کہا تھا:

"اس مسئلے پر میں آپ کے سامنے ایک مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے تقریر کر رہا ہوں۔ آپ کو یہ حقیقت نظرانداز نہیں کرنی چاہیے کہ ہندوستان میں دو اہم فرقے بستے ہیں۔ ہندو اور مسلمان۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ان دونوں میں اتحاد اور مفاہمت ہونی چاہیے، جس کی خاطر انھیں یہ محسوس کرانا ضروری ہے کہ اُن کے مفاد مشترک ہیں اور انھیں شانہ بہ شانہ آگے بڑھنا ہے۔"

جناح اقلیت کے لئے ضمانت چاہتے تھے اُنھوں نے کہا:

"ہم سب اِسی زمین کی اولاد ہیں، ہمیں ایک ساتھ رہنا ہے، ہمیں ایک ساتھ کام کرنا ہے، ہمارے آپس کے اختلافات کیسے بھی ہوں، اُن سے دشمنی پیدا نہیں ہونی چاہیے۔ مجھے اس سے زیادہ اور کسی بات سے خوشی نہیں ہو سکتی کہ میں ہندو اور مسلمانوں کو متحد دیکھوں"

آل پارٹیز کنونشن کے فوراً بعد کانگریس کا اجلاس موتی لال نہرو کی صدارت میں ہوا جس نے نہرو رپورٹ کے سارے اچھے پہلوؤں پر پانی پھیر دیا۔ کانگریس نے اپنے آپ کو دوسری پارٹیوں سے بے نیاز کر لیا اور اس طرح باہمی تعاون کے لئے کانگریس کے دسمبر ۱۹۲ء کے مدراس سیشن میں مسلم لیگ نے جو ہاتھ بڑھایا تھا وہ جھٹک دیا گیا۔

ہندوستان کی تاریخ میں گاندھی جی، ولبھ بھائی پٹیل اور جواہر لال نہرو کے ساتھ ساتھ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۷ء تک محمد علی جناح کا بھی بڑا اہم رول رہا ہے اس لئے چاہتا ہوں کہ یہاں اُن کے کچھ ذاتی حالات بھی بیان کروں۔

جنوری اور فروری ۱۹۲۹ء میں رتّی بیمار رہیں جس کی وجہ سے وہ بڑی پژمردہ رہا کرتی تھیں۔ جناح ہر روز شام کے وقت اُن سے ملنے جایا کرتے تھے۔ اور جب میں ان دونوں کے ساتھ ہوتا تو بیتے دنوں کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ اب جناح اور رتّی باہمی مفاہمت کی طرف آ رہے تھے۔ گو آل پارٹیز کانفرنس، فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کرنے میں ناکام رہی تھی لیکن جناح کو اس سے زیادہ تردد نہیں ہوا، کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ ایک نہ ایک دن مسلم لیگ اور کانگریس میں سمجھوتہ ہو جائے گا۔

۱۷ فروری کی صبح کو میں مسز بیسنٹ کے استقبال کے لئے اسٹیشن گیا، دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھا کر گھر پہنچا

تو رتی آ گئیں یہ بے حد ملول اور بجھی بجھی سی تھیں۔ تقریباً چار گھنٹے میرے گھر رہیں۔ میں نے اُن کے لئے چائے بنائی۔ اُن کی حالت دیکھتے ہوئے انھیں تنہا چھوڑنا مناسب نہ تھا، اس لئے شام کی چائے کے لئے میں مسز بیسنٹ کے یہاں بھی نہ جا سکا۔ سات بجے کے قریب میں نے رتی کو اُن کے گھر چھوڑا اور وعدہ کیا کہ مسز بیسنٹ سے ملنے کے بعد ساڑھے دس بجے رات تک اُن کے پاس آ جاؤں گا۔ لیکن جب میں وہاں رات کو پہنچا تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ رتی بے ہوش پڑی تھیں۔ کچھ دیر بعد انھیں ہوش آیا۔ دوسرے دن یعنی ۱۸ فروری کی صبح کو فون ملا کہ دفتر جاتے ہوئے اُن سے ملتا جاؤں۔ اُس دن وہ بے حد افسردہ نظر آئیں۔ کچھ تو اُن کی دلبستگی کی خاطر اور کچھ انھیں خوش کرنے کے لئے میں نے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور "اچھا اب میں رات کو پھر ملوں گا" کہہ کر ان سے رخصت ہونے لگا تو انھوں نے بڑی افسردگی سے جواب دیا: "اگر زندہ رہی تو! ورنہ دیکھو میری ان بلیّوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنا۔ کسی اور کو نہ دے دینا۔" رتی کے یہ آخری الفاظ تھے جو میں نے سُنے۔ میں رات کے کھانے پر اندھیری میں ایک جگہ مدعو تھا۔ وہاں سے سوا گیارہ بجے لوٹا تو سیدھا رتی کے گھر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ وہ گہری نیند سو رہی ہیں۔ میں بھی دو راتوں سے سو نہیں پایا تھا، اپنے گھر چلا آیا۔

اگلے دن سہ پہر کو فون پر اطلاع ملی کہ رتی پھر بے ہوش ہو گئی ہیں اور جینے کی کوئی امید باقی نہیں ہے۔ میں اُسی وقت اُن کے گھر گیا لیکن انھیں دیکھ نہ سکا۔۔۔۔ ۲۰ فروری کو رتی کی سال گرہ تھی لیکن ٹھیک اُسی تاریخ کو وہ اس دُنیا سے چل بسیں۔ جناح اُن دنوں دلّی میں مرکزی اسمبلی کے بجٹ سیشن میں مصروف تھے۔ بڑی مشکل سے ۲۲ فروری کو بمبئی پہنچ پائے۔ گرانٹ روڈ پر کرنل سوکھے، اُن کی بیوی اور میں جناح کو لینے گئے۔ اس وقت سے لے کر تجہیز و تکفین تک، یعنی پورے پانچ گھنٹے میں جناح کے ساتھ رہا۔ میرا خیال تھا کہ خود رتی دفن کئے جانے کے بجائے (ہندوؤں کے طریقے سے) جلائی جانا پسند کرتیں۔ یہ بات میں نے جناح سے بھی کہی لیکن وہ نہ مانے اور اسلامی طریقے سے تدفین کا انتظام کیا گیا۔ سارا وقت جناح بڑے ضبط اور ہمت سے کام لیتے رہے۔ کچھ دیر تو خاموش رہے پھر وہ یکایک بڑی روانی کے ساتھ اسمبلی کی کارروائیوں کا ذکر کرنے لگے۔ وہ اسمبلی کے اسپیکر وٹھل بھائی پٹیل کا ذکر کر کے کہنے لگے کہ کس طرح وہ حکومت کے خلاف ایک پیچیدگی میں پڑ گئے تھے اور پھر کیسے انھوں نے وٹھل بھائی کی دستگیری کی۔ اور دوسری باتوں کا بھی ذکر کرنے لگے لیکن یہ بات چھپ نہیں رہی تھی کہ جناح کا دل رو رہا ہے اور وہ بے محل گفتگو چھیڑ کر اپنے جذبات کو چھپانے کی انتہائی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ سب اسی وقت تک ہوتا رہا جب تک جنازہ قبر کے پاس رکھا تھا، لیکن جونہی رتی کی لاش قبر میں اُتاری گئی اور جناح سے مٹی دینے کو کہا گیا تو ضبط کا دامن اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ دیر تک بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے رہے۔ میں نے بھی اُن کا ساتھ دیا اور رُندھتے ہوئے آنسوؤں اور بوجھل دل کے ساتھ رتی کی حسین روح کے بے جان جسم کا دیدار کیا۔ میں نے رتی سے وعدہ کیا تھا کہ ایک دن اُس کی پوری کہانی لکھوں گا، وہ وعدہ میں تیس برس کے بعد پورا کر رہا ہوں۔

رتی کی وفات کے بعد میں نے جتنی تلخی اور افسردگی جناح کی زندگی میں دیکھی اس سے پہلے کسی اور شخص

میں نہیں پائی تھی۔ میرے سامنے انھوں نے گویا اپنا دل نکال کر رکھ دیا۔ دو گھنٹے تک وہ مسلسل بولتے رہے اور میں سنتا گیا۔ بیچ میں کبھی دو ایک لفظ ہمدردی کے کہہ دیتا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے جناح کی کمر ٹوٹ گئی ہو۔ جناح کے لئے بیوی کی موت صرف ایک المناک سانحہ یا مرضیِ مولا کا کرشمہ ہی نہیں تھا بلکہ اس میں انھیں اپنی ناکامی کی جھلک نظر آتی تھی، زندگی میں ذاتی شکست محسوس ہونے لگی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس صدمے کو اپنی زندگی کے آخری لمحے تک بھلا نہ سکے۔

جناح کی ذاتی اور سیاسی زندگی ممکن حد تک صاف ستھری، پاکیزہ اور ہر طرح سے بے لوث رہی۔ انھوں نے ۱۹۲۰ میں ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ پر انیسویں صدی کے طرز کا بنا ہوا بنگلہ "ساؤتھ کورٹ" خریدا تھا۔ ان کی شادی کے بعد یہ مکان میرے لئے بھی اپنا ہی گھر بن چکا تھا۔ اس کی چھتوں کے نیچے مجھے رتی اور جناح کی دوستی اور اعتماد ملا۔ بمبئی میں جناح میرے لئے سیاسی لیڈر بھی تھے اور دوست بھی۔ میرے دل میں اُن کی انتہائی عزت تھی ۱۹۱۸ میں شادی کے بعد جناح کی ازدواجی زندگی بڑی دلنواز رہی۔ وہ رتی سے بڑی حد تک انسپیریشن حاصل کرتے تھے۔ اُن کی ذاتی اور سوشل زندگی ہی نہیں بلکہ سیاسی زندگی بھی رتی کے ساتھ ساتھ گذری۔ رتی اُن کے ساتھ رہا کرتی تھیں اور اپنے شوہر کو ہر طرح سے بے فکر اور پُرکیف بنائے رکھتی تھیں۔ شادی کے بعد جناح نے اورینٹ کلب سے (جہاں وہ شطرنج اور بلیرڈس کھیلا کرتے تھے) استعفا دے دیا۔ انہیں تاش سے کبھی رغبت نہیں رہی۔ قسمت آزمائی کی تفریح سے انہیں سخت نفرت تھی۔ رتی کی موت نے انہیں بالکل تنہا کر دیا تھا۔ وہ اس تنہائی سے نکل نہ سکتے تھے۔ اس کیفیت نے اُن کی زندگی میں تلخی پیدا کر دی تھی اور مجھے یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کہ ان کے ذاتی نقصان سے پیدا شدہ یاس و حزن کی تلخی اُن کی سیاسی زندگی میں بھی داخل ہو گئی تھی۔ بیوی کی موت کے اُنیس برس تک یہ حالت باقی رہی اور اس نے اُن کی سیاست کو بھی متاثر کیا۔ یہ سارے واقعات ایک دردناک داستان کے افسوسناک باب ہیں۔

رتی کے بعد جناح تنہائی پسند ہو کر گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ ایک وقت تھا کہ وہ شگفتہ مزاجی اور شائستگی کے نمونہ تھے لیکن اب اُن کی شخصیت میں انانیت کے حلقے پڑنے لگے تھے، تنقید شاق گزرنے لگی، طنز، دشنام طرازی، غلط فہمی اور غلط بیانی برداشت سے باہر ہونے لگی۔ اگر کسی نے غلطی سے یا غیر ارادی طور پر کوئی ایسی بات کر دی تو انہوں نے اُسے کبھی معاف نہیں کیا۔ رتی کی موت کا اثر ان پر غیر معمولی حد تک پڑا تھا۔ اپنی زندگی کے بقیہ اُنیس سال میں انہوں نے اُس کا نہ کبھی نام لیا اور نہ اُس کا کوئی ذکر آنے دیا۔ یہاں تک کہ اُن کے گھر میں اس کی کوئی تصویر بھی نہ تھی۔ رتی نے بڑے شوق سے پشب کی بنی ہوئی چیزوں کے نایاب نمونے جمع کئے تھے۔ اس کے پاس کتابوں کے بعض نادر پہلے ایڈیشن تھے یہ سب چیزیں میوزیم کی زینت بن سکتی تھیں لیکن جناح نے اُن کو بڑے بڑے صندوقوں میں ہمیشہ کے لئے بند کر دیا

آج یہ قیاس کرنا دشوار ہے کہ رتی زندہ رہتیں تو جناح کے سیاسی عقیدے پر اُن کا اثر کس طرح اور کس حد تک پڑتا۔ رتی سخت قسم کی نیشنلسٹ تھیں۔ فرقہ واریت انہیں چھو تک نہیں گئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ کچھ دن

اور زندہ نہیں تو جناح انہیں اپنے گھر بلا لیتے اور دونوں کی زندگی انتہائی خوشگوار اور پُرلطف ہوتی۔ مجھ سے ہر روز رتی پوچھا کرتی تھیں، مرکزی اسمبلی میں جناح کیا کام کر رہے ہیں؟ کانگریسی اخبارات لکھ رہے ہیں کہ جناح پر فرقہ وارانہ رنگ چڑھ رہا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟ چونکہ رتی ایک کٹر نیشنلسٹ تھیں، ایسی خبریں سن کر ان کا بے چین ہو جانا قدرتی بات تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ کانگریسی پریس اور کانگریسی لیڈر بلا وجہ جناح کو بدنام کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ رتی گو عملی سیاست سے علاحدہ رہیں لیکن جناح کی زندگی میں بے حد معاون تھیں۔ جناح کو نیشنلسٹ رکھنے میں اُن کا بھی ہاتھ تھا۔

کیا جناح بد دماغ تھے؟ اس سوال کا جواب میں نے ایک واقعہ کے حوالے سے "ٹائمز آف انڈیا" کی ۲۰ نومبر ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں یوں دیا تھا:

"چونکہ جناح ریاست حیدرآباد میں سر مرزا اسمٰعیل کے وزیر اعظم بننے پر معترض ہوئے تھے اس لئے موخر الذکر نے ایک چھوٹی سی بات کو جناح اور نظام کے درمیان ہوئی، رائی کا پہاڑ بنا کر اپنی ذکی الحسی کا ثبوت دیا ہے۔ یقیناً جناح بجا طور پر بعض ایسے مسلم لیڈروں سے چڑے ہوئے تھے جو اپنے آپ "نیشنلسٹ مسلم" کہتے تھے اور جو کانگریس ہائی کمان کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر جناح کے خلاف سب وشتم سے کبھی نہ چوکتے تھے۔ بعد کے واقعات جن کا اختتام ستمبر ۱۹۴۸ کے پولیس ایکشن پر ہوا اور جن کا ذکر لارڈ مونٹ بیٹن کے سکریٹری کیمبل جانسن کی کتاب میں وضاحت کے ساتھ ہے، صاف ظاہر کرتے ہیں کہ نظام کا طریقہ کار دانشمندی اور دوراندیشی پر مبنی نہ تھا۔ جناح اگر نظام کے سامنے ٹانگیں پھیلائے سگار پیتے رہے تو اس سے نخوت کا اظہار مقصود نہیں تھا ــــــ یاد رہے کہ جناح دراز قد اور اپنی لمبی پتلی ٹانگوں کی وجہ سے ہمیشہ پیروں کو آگے کر کے بیٹھا کرتے تھے۔ وہ مسلسل سگریٹ پینے کے عادی تھے۔"

میں یہاں ایسے دو واقعات کا ذکر کروں گا جن میں ایک سے جناح کی شائستگی اور دوسرے سے ان کی جرأت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پہلا واقعہ یکم نومبر ۱۹۲۹ کو خود میرے گھر میں پیش آیا۔ مسز بیسنٹ میرے یہاں مہمان تھیں۔ اس کا ذکر میں نے جناح سے کیا۔ انہوں نے مسز بیسنٹ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ طے پایا کہ اگلے روز ہائی کورٹ جاتے ہوئے دس بجے دن کو وہ میرے یہاں آجائیں گے۔ حسب معمول وہ ٹھیک وقت آ گئے۔ جب میں انہیں مسز بیسنٹ کے کمرے کی طرف لے جا رہا تھا تو میری نظر اُن کے سگریٹ پر پڑی۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ مسز بیسنٹ تمباکو نوشی کو بہت ناپسند کرتی ہیں۔ یکایک مجھے اس کا دھیان آگیا اور میں نے زور سے کہا: "جناح سگریٹ پھینک دو۔" وہ فوراً سمجھ گئے۔ سگریٹ پھینکتے ہوئے بولے: "معاف کرنا کانجی، مجھے یاد نہ رہا۔ تمہارا شکریہ!" پھر ہم مسز بیسنٹ کے کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ہماری گفتگو سن لی تھی۔ جناح کی طرف دیکھ کر بولیں: "کوئی بات نہیں ہے، تم شوق سے سگریٹ پی سکتے ہو۔" جناح نے کہا: "نہیں نہیں، مسز بیسنٹ، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا ہے۔ اچھا ہوا کانجی نے مجھے ٹوک دیا۔ میں معذرت چاہتا ہوں۔"

دوسرا واقعہ ۱۰ اگست ۱۹۴۰ کو بمبئی کے گورنمنٹ ہاؤس میں پیش آیا۔ ۸ اگست کی تجویزوں کے بعد جناح کو وائسرائے نے بمبئی میں ملنے کی دعوت دی تھی۔ اس سے ٹھیک ایک ہفتہ پہلے لارڈ لنلتھگو (وائسرائے) ایک

"وار انڈین نمائندی کونسل" تشکیل دے کر اس کا اعلان کر چکے تھے۔ اس کونسل میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خاں کا نام بھی شامل تھا۔ مسلم لیگ نے وار کونسل کا بائیکاٹ کرنا طے کیا تھا۔ اس کے باوجود سر سکندر حیات خاں (جو مسلم لیگ کے اہم رُکن تھے) کونسل میں شریک ہو گئے۔ جناح کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ انہوں نے اخباروں میں یہ بیان دیا کہ لارڈ لنلتھگو کی یہ حرکت نہایت نامعقول ہے۔ اب ہوا یوں کہ وائسرائے سے ملاقات کا وقت گیارہ بجے دن کو مقرر تھا لیکن اُس وقت تک جناح وہاں نہیں پہنچے۔ ہر شخص جناح کی طبیعت سے واقف تھا کہ وہ وقت کے کتنے پابند تھے۔ ٹیلی فون پر ٹیلی فون ہوتے رہے۔ آخر سوا گیارہ بجے جناح گورنمنٹ ہاؤس پہنچے۔ وائسرائے کو انتظار کی زحمت دینا خود جناح کے اخلاق سے بعید تھا۔ لیکن اس موقع پر جناح نے کوئی معذرت نہیں کی۔ ہاتھ ملانے کے بعد جب دونوں بیٹھے تو وائسرائے نے اُن کے اخباری بیان کا ذکر کیا اور کہا شاید جناح کو اُن کے (وائسرائے کے) طریقہ کار سے کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے جسے وہ دُور کرنا چاہتے تھے۔ یہ سُنتے ہی جناح اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے: "جو کچھ ہوا اس کے لئے مجھے وائسرائے سے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔" اتنا کہا اور وائسرے کو ہکا بکا چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ جو لوگ لنلتھگو کے دبدبے سے واقف ہیں وہی اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت ہندوستان کے وائسرائے کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ ہمیں اس واقعے پر فخر ہوتا ہے۔ کیونکہ جب دوسرے ہندوستانی لیڈر جن میں کانگریسی ہائی کمان کے لوگ شامل تھے، اس برطانوی وائسرائے کے لئے "شریف ترین انگریز" اور "شریف ترین کرسچین" کی توصیفی صفتیں استعمال کر رہے تھے، کم از کم ایک ہندوستانی تو ایسا تھا جو حق گوئی اور بے باکی سے کام لے کر اُس کے منہ پر کھری کھری سنا دینے کی جرأت رکھتا تھا۔

جناح کے اخلاق کے سلسلے میں ایک یہ بھی شکایت کی جاتی ہے کہ وہ اتنے مغرور تھے کہ خود گاندھی جی کی قیام گاہ پر جانے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہوتے بلکہ اس پر اصرار کرتے رہے کہ گاندھی جی اُن کے یہاں آئیں لیکن اس کا اصلی سبب خود جناح نے مجھے بتایا تھا کہ جب کبھی وہ گاندھی جی کے یہاں ملنے گئے تو گاندھی جی کا کوئی نہ کوئی سکریٹری یا خادم ان دونوں کی بات چیت میں مخل ہو جاتا۔ بعض اوقات اس قسم کی مداخلت کا سبب نہایت مضحکہ خیز ہوتا ——— آرٹیکل پر نظر ثانی کرنی ہے! کچھ کاغذات کی تصحیح فوری ضروری ہے! اُن کی کوئی بہو، ساس کی بدسلوکی کی شکایت لے کر آئی ہے ——— غرض ان حالات میں کوئی سنجیدہ گفتگو ممکن ہی نہیں تھی۔ جناح نے گاندھی جی سے شکایت بھی کی کہ اگر ان کے رفقا نہیں چاہتے کہ وہ اُن سے صفائی کے ساتھ گفتگو کریں تو وہ (جناح) اُن کے یہاں آنا چھوڑ دیں گے۔ جناح کی اس صاف گوئی اور شکایت کو گاندھی جی نے بھی تسلیم کیا تھا۔

جناح بڑے ٹیپ ٹاپ کے آدمی تھے۔ انہیں صحیح طور پر "ہندوستانی سیاسی لیڈروں میں سب سے زیادہ خوش پوش جنٹلمین" کہا گیا ہے۔ ان کی اس خوش پوشی کی عادت میں اُن کی بیوی رتی کو کتنا دخل تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے۔ ۱۹۴۳ میں "ڈیلی ہیرالڈ" کے جنگی نمائندے کیپٹن وکٹر ٹامسن نے جناح کے بارے میں لکھا تھا: "مسٹر جناح اپنے گھر ہی کی طرح نفاست کا نمونہ ہیں۔ ان کے چھریرے جسم پر بھورے رنگ کا سوٹ خوب جچتا ہے۔ ان کی ٹائی

اور باتاہوں سے شوخ رنگ کے باوجود معصومیت ٹپکتی ہے۔ عقابی چہرے پر لگی ہوئی یک چشمی عینک، عمیق نگاہوں اور بھورے سوٹ میں تو وہ بالکل جارج آرلیس کے چھوٹے بھائی معلوم ہوتے ہیں۔ برسوں کی وکالت کے تجربے نے اُن کی گفتگو میں بڑی صفائی پیدا کردی ہے۔"

۱۹۲۹ء کے اخیر میں جواہر لال کے زیرِ صدارت کانگریس نے لاہور اجلاس میں گاندھی جی کی پیش کی ہوئی "مکمل آزادی" کی تجویز منظور کرلی اور گول میز کانفرنس میں حصّہ نہ لینے کا بھی فیصلہ کرلیا۔

سپرو اور جیکر کی ناکام کوششوں کے بعد ۱۲ستمبر ۱۹۳۰ء کو گول میز کانفرنس کے مندوبین کے ناموں کا اعلان ہوگیا۔ ۱۲ نومبر کو لندن میں اس کانفرنس کا افتتاح ہز مجسٹی شاہ جارج پنجم کی مصاحبتی تقریر سے ہوا۔ کانگریس کے سوا ہندوستان کی دوسری سیاسی جماعتوں اور مختلف مفاد کے نمائندوں نے شرکت کی۔ دیسی ریاستوں کے بھی کئی نمائندے شریک ہوئے۔ بیکانیر کے مہاراجہ گنگا سنگھ اور نواب صاحب بھوپال نے دیسی ریاستوں کی طرف سے سمجھوتے اور تعاون کی جو پیش کش کی اس سے سیاسی دنیا ششدر رہ گئی۔

کانفرنس کے دوران میں جناح نے دونوں جانب کے رجعت پسندوں کے خلاف اپنا رویہ کھلم کھلا ایک پکے نیشنلسٹ کا رکھا۔ انہوں نے برطانوی کنزرویٹو پارٹی پر یہ کہہ کر بڑا سخت حملہ کیا کہ ہندوستان میں اُن کا مقصد صرف اتنا تھا کہ ان کے تجارتی مفاد محفوظ رہیں۔ اس بیان سے کنزرویٹو پارٹی کے ارکان بہت برہم ہوئے۔ انہوں نے آغا خاں کے ذریعہ جناح پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی کہ وہ اپنے مقام سے ذرا بھی نہیں ہٹے اور ہندوستانیوں کے مقاصد اور ان کے مفاد کے لئے ڈٹے رہے۔ برطانیہ کے وزیرِ اعظم ریمزے میکڈونلڈ نے جناح کو بلا کر سمجھایا کہ حالات جس طرح پلٹنے والے ہیں اُن کے پیشِ نظر برطانوی وزیرِ اعظم کو ایسے ہندوستانیوں کی ضرورت ہوگی جو صوبوں کے گورنر بن سکیں گے۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ اگر جناح نے "نیک بختی" کا ثبوت دیا تو انہیں بھی گورنری کے عہدے سے سرفراز کیا جا سکتا تھا۔ جناح نے جواب میں ریمزے میکڈونلڈ سے پوچھا کیا برطانوی تجارتی مفاد کو محفوظ کرانے کی خاطر انہیں رشوت دی جارہی ہے؟

آغا خاں نے جناح پر پورا دباؤ ڈالنے کی کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ایک روز جب رات کے بارہ بج رہے تھے، آغا خاں نے جناح کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ اگر وہ (جناح) برطانوی تجارتی مفاد کی مخالفت کرتے رہیں گے اور سپرو، شاستری اور سیتلواد کے ساتھ مل کر ہندو مسلم سمجھوتے پر رضامند ہوجائیں گے تو یہ بات یقینی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو برطانیہ کی کنزرویٹو پارٹی کی مدد کبھی حاصل نہ ہوگی۔

۱۹ جنوری کو پہلی گول میز کانفرنس ملتوی کردی گئی اور مندوبین ہندوستان واپس چلے آئے۔ ۲۵ جنوری کو چوٹی کے قومی رہنما قید سے رہا کردیئے گئے۔ ۹ فروری کو موتی لال نہرو کا انتقال ہوگیا۔ گاندھی جی نے سپرو اور سیتلواد کی زبانی گول میز کانفرنس کی روئداد سنی۔ اس کے بعد انہوں نے وائسرائے سے ملاقات کی۔ گاندھی جی اور لارڈ ارون سے آٹھ بار ملاقاتیں ہوئیں جس کے بعد ۵ مارچ کو "گاندھی، ارون پیکٹ" تیار ہوا۔ اس معاہدے کی رُو سے سول نافرمانی کی تحریک

روک دی گئی۔ سارے سیاسی قیدی چھوڑ دیئے گئے۔ انسدادی قانون اور امتناعی حکمنامے واپس لے لیئے گئے۔ کانفرنس نے دوسری گول میز کانفرنس میں حصہ لینے کا بھی فیصلہ کیا۔ اس بار کانفرنس کے مندوبین میں گاندھی جی، سپرو، شاستری، سیتلواد، جیکر، امبیڈکر اور آغا خان بھی تھے۔ جناح لندن ہی میں تھے۔ لیکن وہ بحث میں کوئی اہم حصہ نہ لے سکے کیوں کہ وہ کانگریس کو کسی معقول سمجھوتے پر رضا مند کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کانفرنس کے سب سے اہم ڈیلیگیٹ گاندھی جی تھے۔ جو تنہا کانگریس کی نمائندگی کر رہے تھے۔

سیتلواد نے اپنی کتاب میں اور شاستری نے دوسری گول میز کانفرنس کے متعلق اپنے خطوط میں جو کچھ لکھا ہے، انھیں پڑھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ وفاق (فیڈریشن) اور اقلیتوں۔ بالخصوص مسلمانوں اور اچھوتوں کے متعلق —— گاندھی جی نے کتنی بڑی سیاسی غلطی کی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر گاندھی جی، پنڈت مالویہ، جیکر اور جی۔ ڈی۔ برلا جیسے فرقہ پرست ہندوؤں کے اثر میں نہ آئے ہوتے تو فرقہ وارانہ مسئلہ اور پست قوم کا مسئلہ اس کانفرنس میں طے ہو جاتے۔

دوسری گول میز کانفرنس کے بعد یعنی دسمبر ۱۹۳۱ء ہی سے جناح لندن میں مقیم ہو گئے تھے۔ میں وہاں کئی بار ان سے ملا، ہیمپ اسٹیڈ میں ایک مکان خریدنے کے بعد وہ مستقل طور پر لندن میں رہ کر پریکٹس کر رہے تھے۔ کنگز بنچ واک میں اُن کا چیمبر تھا۔ چونکہ انھوں نے اپنے آپ کو ہندوستانی سیاست سے ایک حد تک بے تعلق کر لیا تھا اس لیے برطانوی حکومت نے انھیں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت نہیں دی اور نہ انھیں مئی ۱۹۳۲ء میں جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے کاموں میں شریک کیا۔

پانچ سال بعد ۱۹۳۸ء میں تقریر کرتے ہوئے خود عائد کردہ جلاوطنی کا سبب جناح نے ان الفاظ میں بیان کیا:

"گول میز کانفرنس کے موقع پر مجھے اپنی زندگی کا سب سے بڑا دھکا لگا۔ خطرے کو سامنے دیکھتے ہوئے بھی مجھے ہندو جذبات، ہندو ذہنیت اور ہندو مزاج نے اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ اب اتحاد کی کوئی امید باقی نہیں ہے میں اپنے ملک کی طرف سے مایوس ہو گیا۔ صورت حال بے حد افسوسناک تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مسلمان بے وطن ہیں، اُنھیں یا تو برطانوی حکومت کے حکام ہنکاتے پھرتے تھے یا پھر کانگریس کے پٹھو بھی کام کرتے تھے جب کبھی مسلمانوں کی تنظیم کی کوشش کی گئی، ایک طرف ٹوڈی اور دوسری طرف کانگریسی حلقے کے بعض غدار ان کوششوں کو ناکام کر دیتے تھے۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ نہ میں ہندوستان کی مدد کر پاتا ہوں نہ ہندو ذہنیت کو

بدلنے کی سکت رکھتا ہوں اور نہ ہی
مسلمانوں کو صورت حال کی نزاکت سمجھانے
میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔ میں اس حد
تک پژمردہ اور مایوس ہو گیا کہ لندن ہی
میں سکونت اختیار کر لینے کا تہیہ کر لیا۔
یہ بات نہیں تھی کہ ہندوستان سے
محبت نہیں تھی ــــ میں اپنے آپ کو
مجبور محض پاتا تھا۔"

میں جب جناح سے لندن میں ملا تو مجھے محسوس ہوا کہ ہندوستان سے اٹھارہ مہینوں کی غیر حاضری کے دوران میں وہ ملک کے حالات سے بڑی حد تک بے خبر ہو چکے تھے۔ لندن میں جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کی کارروائی تک سے ناواقف تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ اس زمانے میں نہ تو وہ کسی ہندوستانی لیڈر سے ملنے گئے اور نہ کوئی اُن سے ملنے آیا۔ اُن کو اس کا علم نہیں تھا کہ مجوزہ دستور کی ہیئت کیا ہونے والی تھی لیکن اس بے خبری کے باوجود انھیں یہ جاننے کا شوق تھا کہ کیا ہو رہا ہے وہ مجھ سے بے شمار گہرے گہرے سوالات کرتے رہے۔ ان کی باتوں سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ اس شخص کے دل سے نہ تو ہندوستان سے دلچسپی گئی ہے اور نہ اس کی محبت کم ہوئی ہے۔

ایک روز جناح کے ساتھ لنچ کھانے کے بعد سہ پہر میں پھر ان کے چیمبر میں ملنے گیا۔ وہاں اس عظیم لیڈر بانیٔ پاکستان نے کیتلی میں میرے لئے اپنے ہاتھ سے پانی گرم کیا اور چائے بنائی۔ اُس دن میں ان کے ساتھ تقریباً پانچ گھنٹے رہا۔

لندن میں بس جانے کے بعد بھی ایک نہ ایک دن واپس ہندوستان آنے کی تمنا جناح کے دل میں ہمیشہ مچلتی رہی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس کے لئے ان کے ذہن میں کوئی خاص نقشہ یا پلان نہ تھا۔ انھوں نے یہ ضرور سوچا ہوگا کہ ان کا ہندوستان واپس آنا اس وقت تک بے سود ہے جب تک ان کی کھوئی ہوئی پوزیشن دوبارہ نہ مل جائے اور انھیں سیاسی لیڈرشپ حاصل نہ ہو جائے۔ یہ موقع لیاقت علی خاں نے فراہم کیا۔ لیاقت علی خاں، جو جناح کے گورنر جنرل بننے پر پاکستان کے پہلے وزیر اعظم بنے، ان کے بڑے دوست اور رفیق کار رہے تھے۔ میرے یورپ پہنچنے کے کچھ دنوں ہی بعد وہ جناح سے ملے سب سے پہلے لیاقت علی خاں کی جناح سے ملاقات کلکتہ میں، آل انڈیا پارٹیز کانفرنس کے بعد ۱۹۲۸ء کے مسلم لیگ کے اجلاس میں ہوئی تھی۔ اس موقع پر لیاقت علی خاں نے جناح کے نقطۂ نظر کی تائید کی تھی۔ اس وقت سے وہ جناح کے دوست اور شریک کار بن گئے تھے۔ لندن کی ملاقات میں لیاقت علی نے جناح کو سمجھایا کہ اب اُن کے ہندوستان کو مراجعت کرنے کا وقت آگیا ہے۔ لیاقت علی نے انھیں بتایا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ایک ایسے لیڈر کی ضرورت ہے جسے کسی قیمت پر خریدا نہ جاسکے۔ لیاقت علی اور مسز لیاقت علی، دونوں نے جناح کی بڑی منت سماجت کی کہ وہ مسلم لیگ کی قیادت کو قبول کرلیں۔ جناح راضی ہو گئے۔ دسمبر ۱۹۳۳ء میں مجھے جناح کا یہ خط ملا:

" ڈیئر کانجی۔
تمہارے خط مورخہ ۲ر نومبر کا شکریہ۔
میں ۲۲ر دسمبر ۱۹۳۳ء کو مارسیلز سے

"ملوجا" نامی جہاز سے روانہ ہو رہا ہوں اور امید کہ ۴ر جنوری ۱۹۳۴ء کو بمبئی پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بعد تم سے اور دوسرے احباب سے مدت کے بعد دوبارہ ملنے کا اشتیاق رہے گا۔

محبت کے ساتھ ۔ تمہارا مخلص

ایم۔ اے۔ جناح"

مارچ ۱۹۳۴ء کی ایک شام جناح نے مجھے فون کیا کہ اگلے دن ساڑھے دس بجے میں ان کے ہائیکورٹ چیمبر میں ملوں۔ چنانچہ میں وہاں وقت پر پہنچ گیا، مگر جناح کا پتہ نہ تھا۔ یہ بڑی غیر معمولی بات تھی کیونکہ وُہ ہمیشہ ٹھیک ساڑھے دس بجے ہائیکورٹ پہنچ جایا کرتے تھے۔ اُن کے بنگلے پر فون کیا تو ملازم نے بتایا کہ وہ گزشتہ رات کو بہت بیمار ہو گئے تھے۔ پانچ دن مسٹر جناح پر غشی رہی اور وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے جس روز انھیں ہوش آیا میں ان کے گھر پہنچا۔ انہوں نے پاس بلایا۔ تیمار داروں کی ناگواری کے باوجود نصف گھنٹہ تک باتیں کرتے رہے۔

جولائی ۱۹۳۵ء میں برطانوی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس کیا۔ یہ دستور جوائنٹ سیلکٹ کمیٹی کی رپورٹ کا نتیجہ تھا جو لارڈ لنلتھگو کی صدارت میں مقرر کی گئی تھی۔

سر سموئل ہور نے اس کمیٹی کے سامنے جو شہادت دی تھی اس کے سلسلے میں وہ اپنی کتاب 'Nine Troubledyears' میں لکھتے ہیں:

"پارلیمنٹ کے ۳۲ ممبر اور ۲۷ ہندستانی اسیسروں نے مجھ پر جو جرح کی اس کا سلسلہ ۱۹ دن تک جاری رہا۔ میں نے اس دوران میں کوئی دہزار اصلی اور ضمنی سوالوں کے جواب دیئے۔ گو ان سوالات کے بارے میں صوبائی خود مختاری اور کُل ہند وفاق کے متعلق ہر طرح کے سوالات پوچھے گئے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ کسی برطانوی یا ہندوستانی نے ہندستان کی تقسیم کے امکان کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں کیا۔ اُس وقت تک پاکستان کی حیثیت ایک مسلم شاعر کے رومانی دماغ کے تصور سے زیادہ نہ تھی۔ لفظ "پاکستان" بھی تقریباً غیر معروف تھا۔"

گورنمنٹ آف انڈیا بل جب پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو اس پر بحث کے دوران میں پندرہ ملین الفاظ بولے گئے جو کو الفِ پارلیمنٹ کے چار ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ لیکن اس میں کہیں بھی "پاکستان" کے امکانی وجود کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

اپریل ۱۹۳۶ء میں جناح نے مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے بمبئی کے جلسوں میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اس ایکٹ کے ذریعے ہندوستان کو ذمہ داری تو صرف "دو فیصدی" دی گئی ہے لیکن گورنر جنرل کے اختیارات خصوصی اور تحفظات کا حصہ ۹۸ فی صدی رکھا گیا ہے۔ پھر وہ دو فی صدی ذمہ داری بھی دو وفاقی اسمبلیوں کے درمیان پھنس کر گم ہو جاتی ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ کانگریس اپنے مقصد میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جب تک وہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ نہ لے۔ مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہوئے جناح نے کہا کانگریس ان کے حقوق نہ بھی تسلیم کرے تب بھی اپنی قوم اپنے ملک کے مفاد کی خاطر اُنھیں اپنے آپ کو منظم کرنا چاہیئے

اورحصولِ آزادی کی راہ پر گامزن ہوکر منزلِ مقصود تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ وہ اس طریقۂ کار میں کامیاب ہو گئے تو کانگریس خود ان کے پاس آنے پر مجبور ہوگی۔

لارڈ ولنگڈن کے بعد لارڈ لنلتھگو ہندوستان کے نئے وائسرائے مقرر ہوئے۔ اُن کی حکومت اور خود وہ، اگر چاہتے تو دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کا تعاون حاصل کرکے فیڈریشن (وفاق) کا اصول منوا لیتے لیکن وہ ہر راجہ اور نواب سے فرداً فرداً فیڈریشن کا اصول قبول کروانے لگے۔ دو سال گزر گئے، نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ موقع ہاتھ سے نکلتا گیا۔ اس تضیعِ اوقات کی ذمہ داری کانگریس پر بھی کچھ کم عاید نہیں ہوتی ہے۔ اگر جناح کا مشورہ قبول کرکے کانگریس اسمبلیوں کے اندر اور باہر آئینی جدوجہد رکھتی اور اگر کانگریس جناح اور مسلم لیگ کا تعاون حاصل کرکے فیڈریشن کے مطالبے پر برابر زور دیتی تو صورت حال بالکل دوسری ہوتی۔ خصوصاً اس حالت میں جبکہ ہر پارٹی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی مذمت پہلے ہی کرچکی تھی۔

مُلک میں ۱۹۳۷ء کے اوائل میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے۔ کانگریس نے اس سلسلے میں جو منشور شائع کیا اس میں دو باتیں متضاد تھیں۔ ایک طرف تو یہ کہا گیا تھا کہ کانگریس کے ممبر اسمبلیوں میں جاکر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر عمل کرنے کے بجائے اس کو ختم کرنے کے لئے لڑتے رہیں گے۔ دوسری طرف اسی منشور میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ عوام کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے کانگریسی ارکان اسمبلی کون کون سے تعمیری کام کریں گے۔ کانگریس کو یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ صوبائی انتخابات میں اُسے قطعی اکثریت حاصل ہوجائے گی۔ البتہ یہ اُمید تھی کہ انتخابات کے بعد وہ سب سے بڑی واحد پارٹی ہوگی۔ اور کسی دوسری کم تعداد کی پارٹی کے ساتھ مل کر اکثریت کی پارٹی بن سکے گی۔ اِسی امکان کے پیشِ نظر انتخابات سے قبل، کانگریس نے مسلم لیگ سے مفاہمت کرلی تھی۔ کوئی تحریری معاہدہ تو نہیں ہوا لیکن یو۔پی میں جواہر لال نہرو اور چودھری خلیق الزّماں کے درمیان یہ بات طے پا چکی تھی کہ بدیسی حکومت کی مخالفت میں دونوں مل کر کام کریں گے، کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان یہ کوئی نئے قسم کا سمجھوتا نہیں تھا۔ اس سے پہلے ۲۰ء میں موتی لال نہرو اور جناح کے درمیان اور اس کے بعد ۴۰ء میں بھولا بھائی ڈیسائی اور لیاقت علی خاں کے درمیان، اسمبلیوں میں اتحادِ عمل کا پیمان ہوچکا تھا۔ انتخابات کے نتیجے نکلے تو پانچ صوبوں میں کانگریس کو قطعی اکثریت حاصل ہوگئی۔ چار صوبوں، یعنی بمبئی، بنگال، آسام اور صوبہ سرحد میں کانگریس ہی سب سے بڑی واحد پارٹی ثابت ہوئی۔ بمبئی میں کانگریس کے ممبروں کی تعداد بقیہ دوسرے ممبروں کے مقابلے میں ایک کم تھی۔ پنجاب اور سندھ میں کانگریس اقلیت میں رہی۔ مسلم لیگ نے بھی خاصی کامیابی حاصل کی۔

مارچ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ دلی میں ہوا۔ جس میں فیصلہ کیا گیا کہ کانگریس اس شرط پر وزارتیں قبول کرے گی کہ صوبائی گورنر یقین دلائیں کہ وہ اپنے اختیاراتِ خصوصی سے کام نہیں لیں گے۔ بمبئی اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے لیڈر بی۔ جی۔ کھیر چنے گئے۔ لارڈ بریبورن نے، جو گورنر تھے، کھیر کو وزارت بنانے

کی دعوت دی۔ لیکن چونکہ گورنر، کانگریس کی شرط ماننے کے لئے تیار نہ تھے اس لئے انھوں نے انکار کر دیا۔ اس پر لارڈ بریبورن نے دوسری پارٹی یعنی مسلم لیگ کے لیڈر سر علی محمد خاں دہلوی کو وزارت بنانے کو کہا مگر جیسا کہ خود جناح نے مجھے بتایا، ان کی ہدایت کے ماتحت علی محمد دہلوی نے یہ کہہ کر معذرت پیش کردی کہ جمہوری نظام حکومت میں اقلیت وزارت بنانے کی مجاز نہیں ہے۔ لیکن جیسے ہی علی محمد دہلوی اپنے گھر پہنچے، بریبورن نے انھیں دوبارہ فون کیا کہ وہ سیاسی پارٹی کے رکن کی حیثیت سے نہ سہی اپنی انفرادی حیثیت میں عبوری حکومت میں شریک ہو جائیں۔ جناح کو اس کا علم ہوا تو لارڈ بریبورن کی اس غیر آئینی حرکت پر بہت برہم ہوئے۔ اور انھیں سخت احتجاجی خط لکھا، جس میں سیاسی جماعتوں میں انتشار پیدا کرنے کوشش پر کڑی نکتہ چینی کی گئی تھی۔ بہر حال بریبورن نے ایک عبوری حکومت بنا ڈالی جو صرف تین مہینے قائم رہی۔ اسی درمیان میں تعطل دور کرنے کی غرض سے کانگریس سے گفت و شنید کا سلسلہ پس پردہ جاری رہا۔ وائسرائے نے یقین دلایا کہ ہر ممکن کوشش کی جائے گی کہ گورنمنٹ اور وزارتوں میں ہم آہنگی قائم رہے۔ اور ایسی صورت پیدا نہ ہونے پائے جس کی وجہ سے وزارتوں کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے۔ اس طرح کانگریس کے مطالبے منظور نہ ہونے کے باوجود صوبوں میں وزارتیں قائم کرنے کا اعلان ، ۷ جولائی کو کر دیا گیا۔

بمبئی میں کھیر وزیر اعلیٰ چنے گئے۔ انھوں نے جناح سے اپنی وزارت میں شامل کرنے کے لئے دو مسلم لیگ ممبروں کے نام مانگے۔ جناح اس کے لئے بہ خوشی رضامند ہو گئے اور کانگریسی وزارت کو مسلم لیگ کے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا اس کی داستان خود بی۔ جی۔ کھیر نے مجھے سنائی اور جس کی تصدیق بعد میں جناح نے کی۔

قصہ یہ ہوا کہ کانگریس ہائی کمان اس کے لئے کسی طرح رضامند نہ تھا کہ جناح سے کسی قسم کا تعلق پیدا کیا جائے چنانچہ کھیر کی یہ خواہش رد کر دی گئی اور اس کی بدلی ہوئی شکل یوں پیش کی گئی کہ مسلم لیگ کے جن دو ممبروں کو لیا جائے گا وہ پہلے لیگ سے مستعفی ہوں اور کانگریس میں شریک ہو جائیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ شرط لیگ کے لئے انتہائی ہتک آمیز تھی۔ جناح بجا طور پر اس سے خفا ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے کانگریس کی تجویز ٹھکرا دی۔ وہ کانگریسی وزارت سے تعاون ضرور کرنا چاہتے تھے لیکن اپنی پارٹی کا گلا نہیں گھونٹنا چاہتے تھے۔

بمبئی ہی کی جیسی غلطی یو۔ پی میں نہرو نے کی کانگریس کی غیر متوقع کامیابی سے وہ پھولے نہیں سمائے اور اسی ترنگ میں خلیق الزماں سے کیا ہوا وعدہ بھلا بیٹھے جس کے تحت انہوں نے کانگریسی وزارت میں مسلم لیگ کے دو ممبر لینا منظور کیا تھا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ الیکشن میں کانگریس کے رفیع احمد قدوائی کی کامیابی خلیق الزماں کی مدد کی منت تھی۔

ان واقعات نے جناح کو بے حد ناراض اور خفا کر دیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچنے میں بالکل حق بجانب تھے کہ کانگریس ان کا تعاون صرف ان کی توہین کر کے ہی حاصل کرنا چاہتی تھی۔ سن ۱۹۳۹ میں کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔ وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے دستور کی دفعہ ۹۳ کے

تحت صوبوں کا سارا نظم ونسق گورنروں کے ہاتھ میں دے دیا۔ یہ صورت حال جناح کے حق میں مفید ثابت ہوئی ۔ کانگریس کے اس فیصلہ "خودکشی" پر انہوں نے ۲۲ دسمبر کو "یوم نجات" منانے کا اعلان کیا۔ اب جنگ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان چھڑ گئی مگر اس زمانے میں دونوں کے اختلافات کی خلیج کو کم کرنے کی کوشش ہوتی رہی۔ میرا خیال ہے کہ اگر کانگریس وزارتیں نہ چھوڑتی اور جناح اور مسلم لیگ کے ساتھ مصالحت کی کوشش کرتی تو فرقہ وارانہ امن قائم رکھنے میں کامیابی ہو سکتی تھی اور اس طرح برطانوی حکومت کو ڈومینین حیثیت کی حکومت کا مطالبہ پورا کرنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا ۔

میں ۱۹ دسمبر ۱۹۳۹ کو جناح سے ملا۔ سیاسی حالات کے بارے میں اُن کا اندازِ فکر معلوم کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے گفتگو کا آغاز براہِ راست اس سوال سے کیا: "موجودہ سیاسی حالات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" اُن کا جواب سُن کر میں سکتے میں آگیا۔ وہ میری طرف خشونت سے دیکھتے ہوئے بولے: "تمہارا مطلب کیا ہے؟ تم مجھ سے اس طرح کا سوال کیوں پوچھتے ہو؟ اگر برطانیہ کا وزیر اعظم اپنے کمرے میں بیٹھا ہو تو کیا کوئی فرانسیسی یا جرمن یا روسی سیدھا اُن کے کمرے میں گھس کر اس طرح کا سوال کرنے کی جسارت کرے گا؟ اور بالفرض ایسا ہو بھی تو کیا تم سمجھتے ہو کہ برطانوی وزیر اعظم ایسے سوال کا کوئی جواب دے گا؟" میں نے ان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس وقت نہ تو میں کوئی لیڈر تھا نہ ہندوؤں کا نمائندہ اور نہ ایک ہندو کی حیثیت سے بات کرنے آیا تھا۔ میری ملاقات اور گفتگو کی بنیاد تو ہماری بائیس سال کی دوستی تھی۔ اور پھر اس مسئلے پر اگر میں آپ سے تبادلۂ خیال کرنا چاہتا بھی تھا تو اس میں حرج ہی کیا تھا؟ اس بار جناح نے کہا کہ سیاسی معاملات کے بارے میں وہ کسی "ہندو سے بات کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ میں نے مشورہ دیا کہ اس سلسلے میں سر پرشوتم داس سے بات کریں لیکن انہوں نے اس سے بھی انکار کر دیا کیونکہ اُن کے خیال میں پرشوتم داس ہندوؤں کو متاثر نہیں کر سکتے تھے۔ مزید سوالات کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہندو قوم پر نہ تو جواہر لال کا اثر ہے نہ سبھاش بوس کا؛ البتہ گاندھی جی کا اثر ضرور ہے، ولبھ بھائی کا بھی اثر ہے مگر منفی کیونکہ وہ نقصان تو کر سکتے ہیں فائدہ نہیں پہنچا سکتے ہیں اور نہ پہنچانا چاہتے ہیں۔ اس دن میں نے محسوس کیا کہ جناح میں پہلی سی بات نہیں رہی۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنے دل میں اس قدر تلخی نہ پیدا ہونے دیں کیونکہ اس کا حاصل کچھ نہ ہوگا۔ اُن کی گفتگو سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کانگریس نے اُن کو بُری طرح جھنجھوڑ دیا ہے اور وہ اس بدسلوکی کو نہ تو بھلانے کے لئے تیار تھے اور نہ معاف کرنے پر آمادہ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ جناح بے حد دُکھی اور بیزار ہو گئے تھے ۔

واقعات تیزی سے بدلتے گئے۔ مسلم لیگ نے سن ۱۹۴۰ میں مطالبہ پاکستان پیش کر دیا۔ ۱۴ر جولائی کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تجویز منظور کی۔ اس تجویز کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ انگریزوں کے ہندوستان چھوڑ دینے کے بعد ملک کی اہم سیاسی جماعتیں مل کر ایک دستور ساز اسمبلی بنائیں گی۔ اس طرح گویا ایک حد تک مسلمانوں کے مطالبہ کا بھی لحاظ رکھا گیا تھا لیکن اس سلسلے میں گاندھی جی یا جواہر لال نہرو نے جناح سے ربط قائم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ یہی تجویز ۸ر اگست ۱۹۴۲

کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بمبئی کے اجلاس میں منظور ہوئی جس کے دوسرے ہی دن سارے کانگریسی لیڈر جیل بھیج دیئے گئے۔

۲۸ راگست ۱۹۴۲ کو جناح سے میری ۴۵ منٹ تک ملاقات رہی۔ میں نے اُن سے شکایت کی کہ بالفرض ان کے خیال کے مطابق کانگریس غلطی پر تھی پھر بھی اُن کی ضد اور لڑنے کا انداز میرے لئے ناقابلِ فہم ہے۔ جناح کے مجھ جیسے دوست اُن سے کانگریس کے ساتھ اشتراکِ عمل کی توقع رکھتے تھے۔ اس کے جواب میں جناح نے اُلٹی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ کانگریس جب کبھی اُن سے بات کرنا چاہتی ہے تو گاندھی جی کے مشورہ سے کسی غیر اہم شخصیت کو بھیجنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ جناح کا کہنا تھا کہ دراصل کانگریس کی ذہنیت ہی سراپا غلط تھی۔ وہ صورتِ حال کی حقیقتوں کو نہیں سمجھ رہی تھی اس لئے کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے مشترک فریقِ مقابل یعنی برطانیہ کو ہندوستان پر اپنا اقتدار جمائے رکھنے کا موقع ملتا جا رہا تھا۔ جناح نے بڑی شدّومد کے ساتھ کہا کہ حصولِ آزادی کی تمنّا میں وہ کسی سے کم نہیں ہیں؛ ملک میں برطانوی راج جاری رکھنے کی ذمہ داری کانگریس پر ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ کانگریس کے موجودہ رویئے سے یا تو برطانوی اقتدار کی مدّت بڑھتی جائے گی یا ان کی جگہ جاپانی لے لیں گے۔

جناح نے مجھے بتایا کہ تقریباً تین مہینے ہوئے راجا گوپال آچاریہ اُن سے دلّی میں ملے تھے۔ راجا جی کے بارے میں جناح کا خیال تھا کہ کانگریس میں وہ ایک بہترین فرد ہیں۔ ذہین ہیں، صلاحیت، لیاقت اور خدمات کا ریکارڈ رکھتے ہیں؛ وہ سمجھوتے کے لئے بے حد کوشاں ہیں۔ لیکن کانگریس نے انہیں کیا دیا؟ وہ (جناح) خود ہی جواب دیتے ہوئے بولے: "انہیں پارٹی سے نکال باہر کیا!" راجا جی بہت پُر امید ہو کر گاندھی جی سے ملنے وردھا گئے تھے۔ انہیں بھروسہ تھا کہ گاندھی جی جناح کی باتیں مان لیں گے لیکن گاندھی جی نے انکار کر دیا۔

جناح نے یہ بات زور دے کر کہی کہ ان کے پاکستان کا مقصد "پین اسلامزم" ہرگز نہیں ہے۔ وہ پاکستان کو ہندوستان کے جغرافیائی حدود کے اندر دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ امورِ خارجہ کے معاملے میں ہندوستان اور پاکستان مل جل کر کام کیا کریں۔ انہوں نے یہ دلچسپ بات بھی بتائی کہ صوبہ بمبئی میں تقسیم ہونے کی وجہ سے خود اُن کی حیثیت اقلیت کے ایک رکن کی ہوگی۔ حکومت کے نظم و نسق میں انہیں کوئی مقام حاصل نہ ہوگا۔ سوائے اس کے کہ اُن کے تجربے، علم اور تدبّر سے استفادہ کی غرض سے انہیں حکومت میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے ــــ حقیقت میں جناح نہ تو پاکستان جانا چاہتے تھے نہ وہاں مستقل سکونت اختیار کرنا چاہتے تھے اور نہ آزاد مملکتِ پاکستان کے سربراہ بننے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ انہیں پاکستان کے وجود میں آنے کا گمان بھی نہیں تھا۔

اس گفتگو کے دوران میں مجھے ایسا لگا کہ جناح مضمحل، رنجیدہ اور اپنے آپ کو بڑی حد تک تنہا محسوس کر رہے تھے۔ مجھے اُن کی صاف گوئی پسند آئی میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے پوچھا کہ انہوں نے بمبئی میں انگریزوں کے غیر سرکاری طبقے میں سے کبھی کسی سے ملاقات کی؟ جناح نے جواب میں بتایا کہ سرکاری یا غیر سرکاری انگریزوں میں سے نہ تو کوئی ان سے ملنے آیا اور نہ وہ اُن

یں سے کسی سے ربط قائم کر سکے۔

میں نے اور سوالات کئے کیونکہ میں مجوزہ پاکستان کی تفصیل جاننا چاہتا تھا۔ اس پر انہوں نے بڑی حسرت سے جواب دیا: "مائی ڈیر کانجی، میں کانگریس کی طرف سے ایک اشارا چاہتا تھا۔ صرف ایک دوستانہ اشارا! لیکن مجھے وہ بھی حاصل نہ ہوا۔ اگر یہ اشارا مل جاتا تو ہمارے مسائل کا حل ہو جاتا کوئی دشوار بات نہ تھی۔" میرا خیال ہے کہ جناح اپنے آپ کو کمزور اور متزلزل محسوس کرنے لگے تھے ـــــ اس لئے معقول اور مناسب شرطوں پر کانگریس سے سمجھوتا کرنے پر تیار نظر آتے تھے۔ مگر دقت یہ تھی کہ کانگریسی رہنما جیل میں بند تھے۔ چنانچہ اگلے تین برس تک کوئی ایسا موزوں شخص سامنے نہ آیا جو جناح اور کانگریس کے درمیان گفتگو شروع کرا سکتا۔ اس عرصہ میں جناح نے اپنی طاقت کو مضبوط کرنے پر توجہ دی۔

۹ر فروری ۱۹۴۳ء سے گاندھی جی نے آغا خان پیلس میں اکیس دنوں کا برت شروع کیا جس کا مقصد انھوں نے تزکیۂ نفس بتایا۔ برت کے خاتمے پر راجاجی اُن سے ملے اور جو فارمولا انھوں نے پیش کیا اُسے گاندھی جی نے قبول کر لیا۔

۲۴ر اپریل ۱۹۴۳ء کو نئی دلّی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا۔ خطبۂ صدارت میں جناح نے کہا کہ اگر گاندھی جی واقعی اب مسلم لیگ سے سمجھوتا کرنے پر رضامند ہیں تو وہ بھی اس کا بڑی خوشی سے خیر مقدم کریں گے۔ انھوں نے گاندھی جی کو یہ بھی مشورہ دیا کہ جس طرح وہ (گاندھی جی) وائسرائے سے خط و کتابت کر رہے تھے اُسی طرح اُن کو (جناح کو) بھی وہ اپنی تجویزیں لکھ بھیجیں۔

اِس مشورے کی تعمیل میں گاندھی جی نے حکومت کو لکھا کہ وہ اُن کے خطوط جناح کو بھی بھیج دیں۔ حکومت نے اس بات کی اطلاع تو جناح کو دے دی لیکن خطوط نہیں بھیجے۔

جناح جب دلّی سے لوٹے تو میں اُن سے ملنے گیا۔ اس موقع پر میں نے کہا کہ میرے خیال میں کانگریس کا رویّہ قطعی طور پر منفی ہو چکا ہے، جس سے ملک کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔ اِس طرح سوراج نہیں ملے گا۔ کیوں نہیں وہ صرف مسلمانوں کی قیادت کے بجائے کُل ہند پیمانے پر سب فرقوں کی قیادت کرنے کے لئے تیار ہو جائیں؟ میں نے انھیں یاد دلایا کہ ہوم رول لیگ کے زمانے میں اور اس سے قبل بھی فی الواقع وہ کل ہند سطح کے لیڈر رہ چکے ہیں اور آج بھی ہندو مسلمان اور دوسرے فرقوں کی غیر کانگریسی جماعتوں کو وہ اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ میں نے یہاں تک کہہ دیا کہ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے وہ جناح کی قیادت حاصل کرنے کے لئے اُنکی طرف آس لگائے بیٹھے ہیں۔ جناح نے کہا کہ انھوں نے بھی ہندوؤں کے رویّے میں خوشگوار تبدیلی محسوس کی ہے، پھر وہ بولے کہ راجاجی، جی۔ ڈی۔ برلا، سری رام اور سر پرشوتم داس ٹھاکر داس اُن سے دلّی میں ملے اور طے پایا کہ سب مل کر کام کریں گے۔ دوسرے روز جب میں سر پرشوتم داس اور جی۔ ڈی۔ برلا سے علیحدہ علیحدہ ملا تو دونوں کو اس بات پر حیرت ہوئی کہ میں اُن کی اور جناح کی مُلاقات سے واقف تھا۔ اُن لوگوں نے مجھے بتایا کہ جو باتیں ہوئیں وہ ایسی نہیں تھیں جنھیں ضبطِ تحریر میں لایا جا سکے۔ اس وقت جب کہ گاندھی جی اور کانگریسی لیڈر جیل میں بند تھے اور ان کے ساتھ معاملے کی بات بھی نہیں کی جا سکتی تھی، ان تجویزوں کو کوئی عملی شکل دینا ممکن نہ تھا۔

اُس روز کی گفتگو سے میری وضاحت کے بغیر وہ میرا مطلب سمجھ گئے۔ پھر میں نے اُن سے وہ سوال کیا جو مطالبہ پاکستان کے معاملے میں بار بار کیا جاتا تھا۔ اگر پاکستان بن گیا تو دفاع یا بیرونی حملے کی صورت میں اُس کی خارجہ پالیسی کیا ہوگی؟ اِس مرتبہ بھی اُن کا جواب وہی تھا جو پہلے دے چکے تھے۔ پھر بڑے درد بھرے انداز میں جناح نے مجھ سے پوچھا، "مائی ڈیئر کانجی، یہ تو بتاؤ آخر جناح کا قصور کیا ہے جس کی سزا میں اُس کے خلاف اتنا زہر اُگلا جا رہا ہے اور غلط بیانیوں سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں! ہندو پریس کیوں میرا دشمن ہوگیا ہے؟ تمہارے ہندو دوست کیوں میری نیت پر حملے کر رہے ہیں؟ کیوں وہ مجھے غدار بتا رہے ہیں؟ وہ میرے پچھلے کارناموں کا ریکارڈ کیوں فراموش کر رہے ہیں؟ وہ مجھے اتنا احمق کیوں سمجھ رہے ہیں کہ میں برطانوی حکومت کے ہاتھوں کھیل کر اس برِصغیر کو آزادی سے دُور دھکیل رہا ہوں؟ میں نے کیا مانگا؟ میرے مطالبے میں کون سی غیر معقول بات ہے؟ میں نے پاکستان مانگا لیکن یاد رکھو، میں تو پاکستان کا صرف اصول تسلیم کرانا چاہتا ہوں۔ کون سی بُرائی میں نے کی؟ کیا ہندو کانگریس اور ہندو اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ اگر وہ اور ہم ایک دوسرے سے تعاون کریں تو اپنے مشترک دشمن کو اپنے ملک سے باہر نکال سکتے ہیں؟ اگر ایک بار باہمی تعاون کے اُصول پر اتفاق کر کے ہم انگریزوں کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے تو پھر دوسری تفصیلات بھی آپس میں طے کر لیتے!"

اِس کے بعد جناح نے تفصیل کے ساتھ اُس خط کا ذکر کیا جو گاندھی جی نے اُن کو پچھلے سال لکھا تھا۔ پھر انھوں نے مسلم لیگ کے ۱۹۴۳ء کے اجلاس کے خطبۂ صدارت سے بعض اقتباسات پڑھ کر سُنائے اور کہا:

"ہاں یہ درست ہے کہ میں گاندھی جی کی طرف سے ایک تحریر چاہتا تھا، یہ بات میں نے اپنے خطبے میں بھی کہی تھی۔ اور اس کا مقصد یہ تھا کہ میں گاندھی جی کی قید سے رہائی کی کوشش کرتا۔ اگر وہ مجھے ایک تفصیلی خط اُس طرح کا لکھ دیتے جس کے اشارے میں نے اپنے خطبے میں کئے تھے تو اُس بنیاد پہ مجھے اُن کی رہائی کے لئے احتجاج کرنے کا موقع مِل جاتا۔ لیکن اس کے بجائے گاندھی جی نے میری دیانت دارانہ اور مخلصانہ پیش کش سے غلط فائدہ اُٹھانا چاہا مگر میں اُن کے جال میں پھنسنے کے لئے تیار نہ تھا۔"

جناح نے مجھے بتایا کہ ۱۹۲۴ء میں گاندھی جی کی جیل سے رہائی میں اُن کی کوششوں کو کتنا دخل تھا۔ یہاں لقمہ دیتے ہوئے میں نے کہا "اور ستمبر ۱۹۱۷ء میں مسز بیسنٹ کی نظر بندی سے رہائی بھی آپ ہی کی کوششوں کی رہینِ منّت تھی۔" اِس پر وہ بولے "لیکن مسز بیسنٹ تو میری لیڈر تھیں، میں اُن کا صرف ایک سپاہی تھا۔ سپاہی کی حیثیت سے یہ میرا فرض تھا کہ انھیں دوبارہ اپنے ساتھیوں کے درمیان لا کر اُن کی قیادت میں اپنا کام جاری رکھتا ——— وہ بڑی عظیم لیڈر تھیں! اُن کے ساتھ کام کرنے میں خوشی بھی ہوتی تھی اور فخر بھی۔ اُن دنوں ہم کیسے مِل جُل کر کام کیا کرتے تھے!"

اس کے بعد جناح نے ۱۹۲۶ء کی اُس بات چیت کا ذکر کیا جو بھولا بھائی ڈیسائی، ستیا مورتی اور گووند ولبھ پنت کے ساتھ ہوئی تھی۔ یہ سب مرکزی اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے ارکان تھے۔ جناح نے بتایا کہ اُس گفتگو میں یہ طے پایا تھا کہ گرچہ "کمیونل ایوارڈ" کو وہ سب ناپسند کرتے تھے لیکن اس کو بہتر بنانے کی کوشش

کرنی چاہئے۔ وہ سب کسی ایسے متفقہ سمجھوتے کے لئے کوشاں تھے، جو نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے حق میں منصفانہ ہو بلکہ جس کی وجہ سے آگے چل کر ان دو بڑے فرقوں میں مل کر کام کرنے کی صورت پیدا ہو سکے۔ بھولا بھائی، ستیا مورتی اور پنت نے یہ مسئلہ ورکنگ کمیٹی کے سامنے توثیق کے لئے پیش کیا لیکن گاندھی جی اور نہرو نے اس طرح کی باتیں سُننے تک سے انکار کر دیا۔

جناح نے مجھ سے کہا کہ وہ راجا جی کو ایک شریف، مخلص، ایماندار اور خوش اسلوب آدمی سمجھتے ہیں۔ ان کی بڑی تمنا تھی کہ کاش راجا جی جُرأت رندانہ سے کام لے کر گاندھی جی کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو سکتے۔ جناح کے الفاظ یہ تھے،

"راجا جی بڑے پیارے آدمی ہیں، میں انھیں بےحد پسند کرتا ہوں —— مجھے اُن پر افسوس بھی ہوتا ہے"۔ اُن کا خیال تھا کہ گاندھی جی کے مقابلے میں نہرو سے نپٹنا نسبتاً زیادہ آسان تھا۔

اس کے بعد میں نے جناح سے اُس کش مکش کا ذکر کیا جو اُن کی ذاتی مخاصمت کی بنیاد پر شروع ہو رہی تھی۔ مسلم لیگ میں مسلمان زمینداروں اور کسانوں اور بے روزگار نوجوانوں میں خاصا اختلاف شروع ہو چکا تھا۔ میں نے خاص طور پر پنجاب اور کراچی کا ذکر کیا تو انھوں نے جواب دیا، "تم مجھے سالہا سال سے جانتے ہو، کیا میں نے مفاد پرستوں کی کبھی پروا کی ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان زمینداروں کی مجھے ذرّہ برابر بھی پروا ہے؟ سُن لو، مسلم لیگ میں کوئی کش مکش نہیں ہے۔ مسلمان نوجوان طبقہ مجھ سے ہرگز بغاوت نہیں کرے گا۔ یہ سب باتیں ایک طرح کی خوش اندیشی پر مبنی ہیں۔ اِس طرح کی افواہیں پھیلا کر ہمارے دشمن ہمیں کمزور کر دینا چاہتے ہیں۔ اس سے اور تو کچھ نہیں اُن کا مسخرہ پن ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں فضول ہیں۔

پھر جناح نے مجھے بتایا کہ وہ کئی نامور ہندوؤں کی زبان سے سُنتے رہے ہیں کہ کانگریس سراسر غلطی پر تھی لیکن سب کے سامنے یہی بات کھُل کر کہنے کی ہمّت اُن میں نہیں تھی۔ جناح نے کہا: "اب بھی وقت نہیں گیا ہے۔ جیل سے باہر بہت سے کانگریسی لیڈر موجود ہیں، جو اس معاملہ کو آگے بڑھا کر مسلم لیگ سے سمجھوتا کر سکتے ہیں، صرف ہمّت کی ضرورت ہے۔ گاندھی جی کی تھوڑی سی مخالفت کرنے کی ہمّت!"

جناح کے نام خط

اگست ۱۹۴۴ء میں گاندھی، جناح بات چیت ہونے والی تھی، لیکن جناح کی علالت کے سبب ملتوی ہو گئی۔۔۔
۱۷ راگست کو میں نے جناح کو لکھا تھا،

"آپ کی توجہ ایک بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں:

کچھ دن ہوئے میں نے "ہندو" میں آپ کی سوانح حیات پر ایک تبصرہ پڑھا۔ اس میں اس بات کا اشارا تھا کہ رتی کے ساتھ شادی کے موقع پر آپ کو سسرال سے تیس لاکھ روپے ملے تھے۔ حالانکہ یہ ایک لغو اور سراسر بے بنیاد بات ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ "ہندو" اور تبصرہ نگار کے نام ایک تردیدی بیان دے دیں تو مناسب ہوگا"۔

ستمبر کے آخری ہفتے اور اکتوبر کے دو ہفتوں میں گاندھی جناح ملاقات ہوئی۔ بعد میں ان دونوں کی خط و کتابت بھی شائع ہوئی جس کے مطالعے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ پہلے دن ہی کی گفتگو میں ظاہر ہو گیا تھا

کہ ان دونوں میں سمجھوتے کا کوئی امکان نہ تھا۔ پھر بھی بے وجہ اور بے ضرورت ملک کو تین ہفتوں تک امید و بیم کی کیفیت میں رکھا گیا اور جب نتیجے کا اعلان ہوا تو چاروں طرف مایوسی اور افسردگی کی فضا چھا گئی۔ میں اس ناکامی پر جناح کا ردِ عمل معلوم کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۴۴ء کو اُن سے ملاقات کی اور اپنی عادت کے مطابق اس دن کی گفتگو گھر آکر نوٹ کر لی۔ میں نے جناح سے دریافت کیا کہ آئندہ وہ کون سا قدم اٹھائیں گے؟ برطانوی حکومت کے مقابلے میں ان کا رویہ کیا ہوگا؟ جناح جب بولنے لگے تو میں نے اُن میں ایک نئی چیز پائی وہ باتیں کرتے کرتے نچلے ہونٹ کو دباتے رہے۔ ان کے ہونٹوں میں ارتعاش تھا۔ یہ علامتیں تھیں انکی اعصابی بے چینی اور احساس تنہائی کی۔ میں اُن سے ڈھائی فٹ کے فاصلے پر بیٹھا تھا۔ پھر بھی اُن کی آواز سننے اور سمجھنے کے لئے کانوں کو معمول سے زیادہ متوجہ کرنا پڑتا تھا۔ وہ اتنا آہستہ بول رہے تھے کہ جیسے وہ اپنے آپ ہی سے بول رہے ہوں۔ بولتے وقت وہ میری طرف دیکھ بھی نہیں رہے تھے بلکہ اُن کی کھوئی کھوئی سی آنکھیں دُور ٹکٹکی لگائے تھیں۔ بات چیت کی ناکامی سے جناح کو جو رنج پہنچا تھا اس کے تکدر اور تکلیف کے آثار ان کے چہرے سے عیاں تھے۔ وہ تھوڑے ہی دن پہلے انفلوئنزا سے اچھے ہوئے تھے۔ دیکھنے میں صحت مند لگتے تھے لیکن بہت کمزوری محسوس کر رہے تھے۔ کافی دُبلے بھی ہو گئے تھے۔ دوران گفتگو میں بار بار میں دخل دیتا رہا لیکن اس کا انہوں نے بُرا نہ مانا۔ بیچ بیچ میں جو سوالات میں کر رہا تھا۔ ان کے الفاظ کے انتخاب میں کافی احتیاط برت رہا تھا تاکہ انہیں یہ گمان نہ گزرے کہ میں جرح کر رہا ہوں۔ میں اُن کے جذبات کو کسی طرح ٹھیس لگانا نہیں چاہتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ان دنوں میں بھی میں اُن چند مخصوص لوگوں میں تھا جو جناح سے مساوی سطح پر بالکل دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ دوسرے احباب یا تو انھیں رنج پہنچا کر یا پھر ان سے خفا ہو کر دُور ہٹ چکے تھے۔ جناح بہت ہلکی اور نحیف آواز میں بولے "گاندھی کیوں آئے تھے؟ جب وہ مجھے دینے کے لئے کچھ ساتھ نہیں لائے تھے، تو پھر میرے پاس کیوں آئے۔؟" ان کی آواز سے ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہ سوال اپنے آپ سے پوچھ رہے ہوں۔ انھوں نے یہ سوال کوئی دس بار سے کم نہیں دُہرایا۔

میں نے ان سے پوچھا "کیا آپ کے خیال میں گاندھی جی کوئی شاطرانہ چال چلنا چاہتے تھے؟ کیا آپ کو وہ ایسی پوزیشن میں ڈال دینا چاہتے تھے کہ جہاں رائے عامہ آپ کے خلاف ہو جاتی؟" جناح نے بڑی سنجیدگی اور متانت سے جواب دیا:

"نہیں، نہیں، ہرگز نہیں۔ میں یہ بات ہرگز نہیں کہہ سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جی نے بڑی صاف صاف بات کی۔ اس بارے میں مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔"

میں نے جناح سے پوچھا "اب کیا ہوگا؟" — جواب کا انتظار کئے بغیر میں نے اپنے خیال کا اظہار کر دیا کہ برطانوی حکومت، بات چیت کی ناکامی سے پورا پورا فائدہ اٹھائے گی۔ اس پر خوش ہوگی، بیرونی ممالک میں ہندوستان کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلائے گی۔ اور اس طرح اپنی استبدادی حکومت جمائے رکھے گی۔ جناح نے جواب دیا، "میں تم سے اتفاق کرتا

ہوں، لیکن تم مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو؟ کیا تم چاہتے ہو کہ چونکہ برطانوی حکومت صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے والی ہے، اس لیئے میں خودکشی کر لوں؟ یاد رکھو میں خودکشی کے مقابلے میں لڑتے ہوئے جان دینا زیادہ پسند کرتا ہوں۔"

میں نے اُنھیں نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی کہ خودکشی کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ بات صرف معاملے کو سلجھانے کی ہے۔ میری رائے ہے کہ جنگ کے خاتمے پر برطانیہ کی پوزیشن بین الاقوامی دنیا میں کمزور پڑ جائے گی۔ اور ہندوستان پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی۔ میرے پوچھنے پر کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ وہ بولے "سمجھاؤ، سمجھاؤ"۔

میں نے کہا "کیسے سمجھایا جائے۔؟"

انھوں نے جواب دیا "پہلے ہندوؤں کو سمجھاؤ پھر برطانیہ کو سمجھاؤ!"

اس پر میں نے پوچھا "کیا آپ کا مقصد یہ ہے کہ دُنیا کی رائے آپ کی موافقت میں ہو جائے؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ساری دُنیا مع امریکہ، آپ کے مطالبہ پاکستان کو برحق تسلیم کر لے۔؟"

جناح نے جواب دیا کہ انھیں اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ امریکہ کیا چاہتا ہے۔ اُن کی خواہش صرف اتنی ہے کہ ہندو اور برطانیہ ان کے مطمحِ نظر کو پوری طرح سمجھ لیں ۔۔ مجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اس مسئلے کا تسلی بخش حل نکلے گا۔ اس بارے میں جناح سے میں نے پوچھا تو وہ بولے "مجھے تم سے اتفاق ضرور ہے لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ وقت کتنی تیزی سے نکلا جا رہا ہے؟ کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس درمیان میں تلخی کتنی بڑھ رہی ہے؟

اگر سمجھوتا جلد نہ ہوا، مصالحت جلد نہ ہوئی تو پھر ایک ساتھ کام کرنے کے باوجود ہندوؤں اور مسلمانوں میں دوستی ختم ہو جائے گی، اور تلخی باقی رہ جائے گی۔ امریکہ کا حال دیکھو۔ آج بھی امریکہ کے لوگ انگریزوں کو شبہہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور ان میں تنقید نکتہ چینی اور ایک دوسرے کی عیب جوئی کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اس کا سبب صرف اتنا ہے کہ امریکیوں کا مطالبہ آزادی برطانیہ نے وقت پر تسلیم نہیں کیا تھا۔ امریکیوں کو لڑ کر آزادی حاصل کرنی پڑی اس لئے اتنی مدت گزر جانے پر بھی آج تک امریکن انگریزوں کو اچھا نہیں سمجھتے ہیں۔"

۵ر نومبر ۱۹۴۵ء کو دیوالی تھی۔ میں وقت مقرر کئے بغیر اپنے بیٹے کو ساتھ لیکر جناح کے ہاں دیوالی مبارک کہنے کے لئے پہنچ گیا۔ انھوں نے اپنے نئے نئے بنے ہوئے بنگلے کی پہلی منزل پر بُلا لیا۔ میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر واقعی وہ پاکستان چاہتے تھے اور اس کے حصول کا انہیں پورا یقین تھا تو پھر پُرانے مکان کی ازسرِنو تعمیر پر کئی لاکھ روپے خرچ کرنے کے کیا معنی تھے؟ مارچ ۱۹۴۴ء میں انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اس پُرانے مکان کو فروخت کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جتنی قیمت وہ چاہتے تھے اتنی نہیں ملی اس لئے انھوں نے خیال ترک کر دیا۔ اس کے بعد پھر اتنی بڑی رقم کا خرچ کرنا کیا اس بات کا اشارا نہیں تھا کہ وہ پاکستان کے وجود میں آجانے پر یقین کامل نہیں رکھتے تھے۔؟ نومبر ۱۹۴۴ء تک بھی جناح کا اس بنگلے کو چھوڑ کر کراچی میں جا بسنے کا قطعی ارادہ نہیں تھا۔

اُسی دن جناح سے ایک اور دلچسپ بات ہوئی۔ موتی لال سیتلواد سے (جو حال تک ہندوستان کے اٹارنی جنرل تھے) کانگریس نے چاہا کہ وہ لیجسلیٹو اسمبلی کے لئے

بمبئی کی دو نشستوں میں سے ایک کے لئے امیدوار ہوجائیں
ستلواد پہلے تو رضامند ہوگئے لیکن جب کانگریس نے
ان سے اپنے عہدنامے پر دستخط لینے چاہے تو انہوں
نے منظور نہیں کیا۔ میں نے اس کا ذکر جناح کے سامنے کیا
تو وہ بولے:

"کتنا اچھا ہوتا اگر وہ بھی اسمبلی کے ممبر ہوجاتے۔
مجھے ان کے ساتھ کام کرنے میں بڑی خوشی ہوتی"۔
ان الفاظ سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان دنوں وہ پاکستان
کے مطالبہ پر بہت زیادہ مصر نہ تھے۔ دوران گفتگو میں
انھوں نے شکایت کی کہ صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں
کے انتخابات میں کانگریس لاکھوں روپے ایسے مسلمانوں پر خرچ
کررہی ہے۔ جو اپنے کو "نیشنلسٹ مسلمان" کہتے ہیں۔ لیکن
حقیقت میں وہ ایسے نہیں ہیں۔ انھوں نے بڑے اعتماد سے
کہا کہ کانگریس ایک بھی نیشنلسٹ مسلمان کو کامیاب نہیں
کرا سکے گی، ہر نشست پر مسلم لیگ کا قبضہ ہوجائے گا۔ جناح
کو اس کی بھی شکایت تھی کہ جواہر لال نہرو اور ولبھ بھائی
پٹیل اپنی تقریروں میں اُن کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ آگے چل کر
انتخابات کے نتیجوں سے پتہ چلا کہ جناح کی لیڈری اور مسلم لیگ
کا اقتدار ناقابل تردید حقیقت تھی۔ وہ بلاشبہ مسلمانوں کے
نمائندے تھے اور کانگریس ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔

۲۴ مارچ ۱۹۴۶ء کو کیبنٹ مشن ہندوستان آیا
اور بہت جلد مختلف لیڈروں سے بات چیت میں مصروف
ہوگیا۔ اُنھیں دنوں مجھے امریکہ سے ایک دعوت موصول ہوئی
جس کی وجہ سے مجھے اس ملک میں مزدوروں کے مسائل کے
مطالعے کا موقع ملا۔ سفر کی تیاری اور بعض سرکاری کارروائیوں
کے لئے میں دلی گیا۔ ۱۰ اپریل کو صبح چھ بجے سردار پٹیل
کے بنگلے پر اُن سے رخصت ہونے کے لئے گیا۔ وہ میرے
سفر کے بارے میں سُن کر خوش ہوئے۔ کیبنٹ مشن کے
ارکان ان دنوں شملہ میں تھے۔ سردار نے مجھے بتایا کہ
شملہ سے واپسی پر مشن، کانگریس اور مسلم لیگ سے ایک
عبوری قومی حکومت بنانے کو کہے گا اور کانگریس اس بات
پر رضامند ہوجائے گی۔ اگر جناح نے اس میں شریک
ہونا منظور نہ کیا تب بھی کانگریس حکومت بنا لے گی۔ میں
نے سردار سے پوچھا کہ وہ کن شرائط پر جناح سے سمجھوتا کرنا
چاہتے ہیں؟ میرے سوال کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح سردار
سے ملاقات کا وقت مقرر کئے بغیر، میں اُن کے ہاں چلا گیا
تھا اسی طرح جناح کے یہاں بھی پہنچ جاؤں گا اور اُن کو
سردار کی شرطوں سے آگاہ کردوں گا۔ سردار نے جواب میں
کہا: "اب جناح کے ساتھ کسی سمجھوتے کی ضرورت باقی نہیں
رہی۔ جناح سے کہہ دینا کہ کانگریس اور برطانیہ کے درمیان
معاملہ طے پا چکا ہے۔ اب ہندوستان میں ان کا کوئی مقام
نہیں رہا،" پھر وہ مذاق کرتے ہوئے بولے: "اور سنو! تم
اُنھیں اپنے ساتھ امریکہ کیوں نہیں لئے جاتے ہو۔؟" گو بات
مذاق میں کہی گئی تھی لیکن اس سے سردار پٹیل کے سوچنے کا
ڈھنگ ظاہر ہوتا ہے۔ ان کا مقصد یہ بتانا تھا کہ ایک
بار جب برطانیہ سے بات طے ہوچکی تو پھر جناح اور مسلم لیگ
کے تعاون کی ضرورت ہی کیا تھی!"

میں ۳۰ مئی ۱۹۴۶ء کو بحری راستے سے امریکہ
کے لئے روانہ ہوگیا۔ ۴۲ دنوں کے تکلیف دہ سفر کے بعد
۱۲ جولائی کو بوسٹن پہنچا۔ وہاں سے دوسرے مقامات پر
گیا۔ اور بے شمار لوگوں سے ملا۔ ڈیڑھ مہینے کے خوشگوار
اور دلچسپ تجربے حاصل کرکے یکم ستمبر کو واشنگٹن آیا۔
دوسرے دن میں نے پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کے نام،
ہندوستان کی زمام حکومت ہاتھ میں لینے پر مبارکباد کے خطوط

لکھے۔ ۱۸ ستمبر کو سردار پٹیل کا یہ جواب آیا:

"تمہارا واشنگٹن سے ۱۲ ستمبر کا لکھا ہوا خط ملا۔

کافی تاخیر کے بعد آخر ہم نے حکومت کی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ لیکن اب تک مسلم لیگ کو ہم ساتھ نہیں لا سکے۔ اس منزل پہ مسٹر جناح کا رویہ بڑا افسوسناک ہے۔ اگر وہ دستِ تعاون بڑھا دیتے تو سارے ہندوستان کے لئے یہ دن یوم جشن ہو جاتا۔ اس کے بجائے انھوں نے رکاوٹیں ڈالنا پسند کیا ہے......"

امریکہ سے روانہ ہو کر ۲۴ ستمبر کو میں لندن اس وقت پہنچا جب وزیر اعظم ایٹلی نے لارڈ ویول، پنڈت نہرو، جناح، لیاقت علی خاں، اور بلدیو سنگھ کو ہندوستان کی سیاسی گتھی سلجھانے کے لئے وہاں بلایا تھا۔ اُن کی اس کانفرنس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ میں پندرہ دن لندن میں رہا۔ اس دوران میں جناح سے میری بیس منٹ کی ملاقات بھی رہی۔ میں نے اُنھیں پژمردہ، کمزور اور بیمار پایا۔ انھوں نے مجھ سے امریکہ کے سفر کی تفصیلات پوچھیں۔ پھر میں نے اُن سے کہا کہ میں ۷ مہینوں سے ہندوستان سے باہر رہا اس لیئے مجھے پوری طرح علم نہیں ہے کہ میرے ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ اس پر وہ بولے "ملک؟ کیسا ملک اور کہاں کا ملک؟ ہمارے یہاں کوئی ملک نہیں ہے، صرف ہندو ہیں اور مسلمان ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ اب جناح، پاکستان کے سوا اور کسی بنیاد پر سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، وہ اپنی جنگ جاری رکھنا چاہتے تھے۔ کانگریسی لیڈروں نے ان کی بری طرح توہین کی تھی۔

جناح نے بہار کے فرقہ وارانہ فسادات کا ذکر کیا اور کہا کہ کافی چھان بین کے بعد جو اعداد و شمار ملے ہیں ان کے حساب سے مقتولین کی تعداد تیس ہزار تک پہنچی ہے۔ یہ اعداد و شمار مبالغہ آمیز تھے۔ نہرو نے اسمبلی میں دو ہزار کا اندازہ لگایا تھا۔

چونکہ مسلم لیگ نے مجوزہ دستور ساز اسمبلی کا مقاطعہ کیا تھا۔ اس لئے ولبھ بھائی پٹیل نے ایک تقریر میں اس بات کا مطالبہ کیا کہ اصولاً مسلم لیگ کو عبوری حکومت سے مستعفی ہو جانا چاہیئے۔ عبوری حکومت کے روزمرہ معمولات میں مسلم لیگ تعاون سے گریز کر رہی تھی۔ میں نے جناح سے پوچھا کیا یہ مناسب نہ تھا کہ دستور ساز اسمبلی اور ملک کے دستور کے بارے میں مسلم لیگ چاہے جو رویہ چاہتی، اختیار کرتی لیکن حکومت کے کاروبار اور ملکی بھلائی کی کوششوں میں ان جھگڑوں سے دور رہتی۔؟ جناح نے جواب میں کہا:

"کیا مطلب؟ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اس کمرے میں بیٹھ کر ہم اور تم ایک دوسرے سے پیار کی باتیں کریں اور باہر ایک دوسرے کے چھرے گھونپیں؟"

ان کی گفتگو سے یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ نہ صرف یہ چاہتے تھے کہ مسلم لیگ کے ارکان عبوری حکومت میں تعاون نہ کریں۔ بلکہ یہ بھی کہ کانگریسی ارکان کے کاموں میں رکاوٹ ڈالیں۔

جب تک میں ان سے باتیں کرتا رہا، جناح کا رویہ نہایت دوستانہ رہا۔ انہوں نے بمبئی میں مجھے ملنے کو کہا اور یہ بھی یقین دلایا کہ میں جب چاہوں اُن سے مل سکتا ہوں۔

اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ اگر کانگریسی لیڈروں نے اُن سے ذاتی تعلقات منقطع نہ کئے ہوتے تو اُن میں اس حد تک تلخی نہ آئی ہوتی۔ اُن کے وقار اور اُن کی شخصیت کو بہت

صدمہ پہنچا تھا جس سے نہ صرف ان کے جذبات مجروح تھے بلکہ یہی اُن کی تلخی کا سبب بھی تھا۔ وہ اپنے اطراف عدم اعتماد اور شک وشبہے کا جال بچھا ہوا دیکھ رہے تھے۔ اُن کی فراست بہ دستور قائم تھی۔ وہ کم سُخن، اور اپنے مخالفوں کو زیر کرنے کا پُورا آرٹ جانتے تھے۔ نہرو جیسا نخوت پسند اور جذباتی آدمی بڑی آسانی سے اُس کا شکار ہو جاتا تھا۔ نہرو کی ایک کمزوری (جس سے جناح بھی واقف تھے) اُن کا لمبی تقریریں کرنے کا شوق تھا، جن میں وہ ایسی باتیں بھی کہہ جاتے تھے جن سے فائدہ کے بجائے اُلٹا نقصان ہوتا تھا۔

۱۷ دسمبر کو وزیر اعظم اٹیلی سے میری پندرہ منٹ ملاقات رہی۔ اٹیلی نے کہا کہ کانگریس کو ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے کہ کسی طرح جناح اور مسلم لیگ دستور ساز اسمبلی میں شریک ہو جائیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں جناح سے مل چکا ہوں اور میں نے اُن کا رویّہ غیر دوا جبی پایا۔ میں نے اٹیلی کو بتایا کہ ہندوستان کے لیڈر نہرو نہیں بلکہ پٹیل ہیں۔ اٹیلی نے کہا وہ بھی یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ میرے پوچھنے پر کہ ہندوستان میں سردار پٹیل سے ملاقات کرنے پر میں اُن سے کیا کہوں؟ اٹیلی نے جواب دیا ”پٹیل سے کہو کہ وہ طاقتور بھی ہیں اور بڑے بھی ہیں۔ انھیں چاہئے کہ جناح اور مسلم لیگ کے ساتھ تھوڑی سی فیاضی برتیں اور انھیں دستور ساز اسمبلی میں لے آئیں۔“ میں نے پوچھا کہ فرض کر لیجئے کہ پٹیل دستور ساز اسمبلی میں جناح کو شریک کرانے میں کامیاب ہو گئے تو کیا ان کے خیال میں جناح کا رویہ معقول ہوگا؟ اور کیا وہ تعاون کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے؟ اٹیلی نے جواب دیا کہ ایک بار جناح نے دستور ساز اسمبلی میں شرکت کر لی تو پھر ان سے نپٹنا آسان ہو جائے گا۔

میں ۲۵ دسمبر کو کراچی ہوتا ہوا بمبئی واپس آیا۔

۳۱ دسمبر کو احمد آباد میں پٹیل سے ایک طویل ملاقات ہوئی۔ اس موقع پر انھوں نے اعتراف کیا کہ اٹیلی نے سمجھوتہ کا جو مشورہ دیا تھا اسے قبول نہ کر کے کانگریس نے بڑی سخت غلطی کی ہے۔

۳ مارچ ۱۹۴۷ء کو میں نے پٹیل کو ایک خط لکھا جس میں اُس گفتگو کا حوالہ تھا اور اس کے ساتھ ایک ایسے نوٹ کا بھی ذکر تھا جو میں نے لندن میں اپنے مذاکرات پر تیار کر کے بی۔ جی۔ کھیر کی معرفت انھیں بھیجا تھا۔ میں نے اس خط میں یہ بھی دریافت کیا تھا کہ میرے لئے جناح سے ملنا مناسب ہوگا یا نہیں۔ ملک کے سیاسی حالات روز بروز بگڑتے جا رہے تھے، دوسرے ہی دن مجھے ولبھ بھائی کا یہ جواب ملا:

”مجھے تمہارا خط مورخہ ۳ مارچ آج ملا۔ بالا صاحب کھیر نے تمہاری لندن کی بات چیت کے نوٹ دیئے تھے۔ بلاشبہ لیبر حکومت نے ہمارے لئے اور دنیا کے سامنے اپنی نیک نیتی کا ثبوت دیا ہے لیکن اُن کے بیان سے سردست یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے ہاتھ سے پنجاب نکل گیا لیکن مجھے پھر بھی تمہاری طرح قطعی مایوسی نہیں ہے۔ مسلم لیگ وہاں وزارت بنانے میں کامیاب ہو بھی گئی تو سال سوا سال سے زیادہ نہیں چل سکے گی۔ اگلے جون سے قبل یقینی طور پر دستور تیار ہو جائے گا۔ اگر لیگ نے پاکستان پر اصرار کیا تو پھر یہ ایک ہی صورت رہ جائے گی کہ پنجاب اور بنگال کا بھی بٹوارہ کیا جائے۔ وہ لوگ خانہ جنگی کے بغیر تو پورا پنجاب اور پورا بنگال ہرگز نہیں لے سکیں گے۔ میں نہیں سمجھتا برطانوی حکومت تقسیم پر رضامند ہوگی، وہ سب سے زیادہ طاقت ور پارٹی کو زمام حکومت سپرد کرنے پر مجبور ہو جائے گی اور اگر اُس نے یہ بھی نہ کیا تو تقسیم کا مطالبہ تسلیم کرانے میں وہ کسی اقلیت کی

مدد نہیں کرے گی۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ مشرقی بنگال، پنجاب کا ایک حصّہ، سندھ اور بلوچستان کو چھوڑ کر باقی ہندوستان کی ایک مرکزی حکومت اتنی طاقت ور ہوگی کہ بقیہ حصّے مجبور ہو کر اس میں شامل ہو جائیں گے۔ جنگ کے بعد کے حالات کی بنا پر ساری دُنیا میں مزدوروں کے جھگڑے کا اُٹھ کھڑا ہونا لازمی بات ہے اور ہم بھی اسی لپیٹ میں آ گئے ہیں۔ میں نے تمہارا خط پنڈت جی کو دے دیا ہے۔" یہ خط بے حد اہم ہے۔ وَلبھ بھائی پہلی بار ملک کی تقسیم پر رضامندی کا اظہار کر رہے ہیں اور ساتھ ساتھ پنجاب اور بنگال کے بٹوارے کا بھی۔ اس خط کی قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ خط لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہندوستان پہنچنے اور وائسرائے بننے سے تین ہفتے قبل کا لکھا ہوا ہے۔ ایسی صورت میں تقسیم ہند کی ذمہ داری برطانوی حکومت یا ماؤنٹ بیٹن پر کیسے عائد کی جا سکتی ہے؟ پٹیل نے خود یہ لکھا تھا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کی تقسیم نہیں چاہتی۔

۱۸ مارچ کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ایک تجویز منظور کی جس میں برطانوی کیبنٹ مشن کی پیش کش اپنی تشریحات کے ساتھ منظور کی اور مسلم لیگ کو دستور ساز اسمبلی میں شریک ہونے کی دعوت بھی دی۔ کاش جناح یہ دعوت قبول کر لیتے! مگر اُس وقت وہ کیبنٹ مشن کے سلسلے میں کانگریس کی روش سے اس قدر بیزار ہو چکے تھے کہ انھوں نے اُس کی دعوت رد کر دی۔

۶ مئی کو گاندھی جی اور جناح، نئی دلّی میں آخری بار ملے اور پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی اختلاف کرتے ہوئے ایک دوسرے سے جُدا ہوئے۔ جناح نے گاندھی جی کی مرضی سے یہ بیان شائع کیا:

"ہم دونوں نے دو مسئلوں پر بحث کی، پہلا مسئلہ ہندوستان کو پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم کرنے کا تھا۔ مسٹر گاندھی تقسیم کے اصول کو تسلیم کرنے میں آمادہ نہیں ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں تقسیم ناگزیر نہیں ہے، لیکن میری رائے ہے کہ پاکستان صرف ناگزیر ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے سیاسی مسائل کا واحد حل ہے۔ دوسری بات جس پر ہم نے غور کیا، ایک خط تھا جس پر ہم دونوں نے دستخط کیے ہیں۔ اس کے ذریعے ہم نے عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ امن برقرار رکھیں۔ ہم دونوں اس نتیجے پر بھی پہنچے ہیں کہ اپنے اپنے میدانِ عمل میں اس بات کی پوری پوری کوشش کرنی چاہیے کہ اس اپیل پر عمل ہو اور اس سلسلے میں ہم بھی پوری محنت کریں۔"

برطانوی حکومت نے ۳ جون کو ہندوستان کی تقسیم اور اس کے ساتھ پنجاب اور بنگال کے بٹوارے کا بھی اعلان کر دیا۔ نہرو نے اس فیصلے کے بارے میں ریڈیو پر عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"میں جب آپ کے سامنے یہ تجویزیں رکھ رہا ہوں تو اس سے مجھے خوشی نہیں ہو رہی ہے، اگرچہ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ صحیح طریقہ کار یہی ہے۔"

۹ جون کو گاندھی جی نے اپنی پرارتھنا سبھا کے بعد ایک تحریری بیان پڑھ کر سنایا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ جب میں تقسیم کی مخالفت کرتا تھا تو اُس وقت میں عوام کی خواہش کا اظہار کرتا تھا، لیکن اب میں دیکھ رہا ہوں کہ عوام کا رجحان تقسیم کے حق میں ہے۔ ایسی صورت میں یہ کیوں کر ممکن ہے کہ میں عوام کو اپنی ذاتی رائے کے تسلیم کرنے پر مجبور کر دوں۔

ملک کی تقسیم کا پلان ہر طرف سے منظور کر لیا گیا اور اس کے بعد تقسیم اختیارات کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس موقع پر سر چمن لال سیتلواد نے ایک سیاسی پیشین گوئی کی تھی جو یہ تھی:

"ہندستان کی تقسیم نے افراتفری اور تنازعات کے لامتناہی سلسلوں کی بنیاد ڈال دی ہے جو آنے والی نسلوں کو ناقابلِ تصور مصیبتوں اور آفتوں میں مبتلا کر دے گی۔"

میں سمجھتا ہوں کہ جناح پاکستان نہیں چاہتے تھے۔ ۱۹۴۶ء تک وہ متحدہ ہندستان کے لئے کام کرنے پر تیار تھے۔ میرے خیال میں وہ پاکستان کا مطالبہ پیش کر کے مسلمانوں کے لئے زیادہ سے زیادہ حقوق و مراعات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ اگر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ کانگریسی لیڈر اُن سے کوئی سمجھوتا کرنا نہیں چاہتے تھے تو اس میں حق بجانب تھے۔ جب کبھی کانگریسی رہنماؤں نے یہ دیکھا کہ برطانیہ سمجھوتے پر آمادہ ہو رہا ہے تو اُن کے ذہن میں جناح کو نظر انداز کر دینے کا خیال فوراً آجاتا تھا۔ کانگریسی لیڈروں کا کہنا تھا کہ ہندو مسلمان مسئلے کو کانگریس جناح اور مسلم لیگ نہیں بلکہ صرف کانگریس اور برطانیہ حل کر سکیں گے۔

ہندستان تقسیم ہو گیا، بھارت اور پاکستان دو مملکتیں بن گئیں۔ جناح نے پاکستان نہیں جیتا ـــــ کانگریسی لیڈر، نہرو اور پٹیل، جناح کو پاکستان ہار بیٹھے!

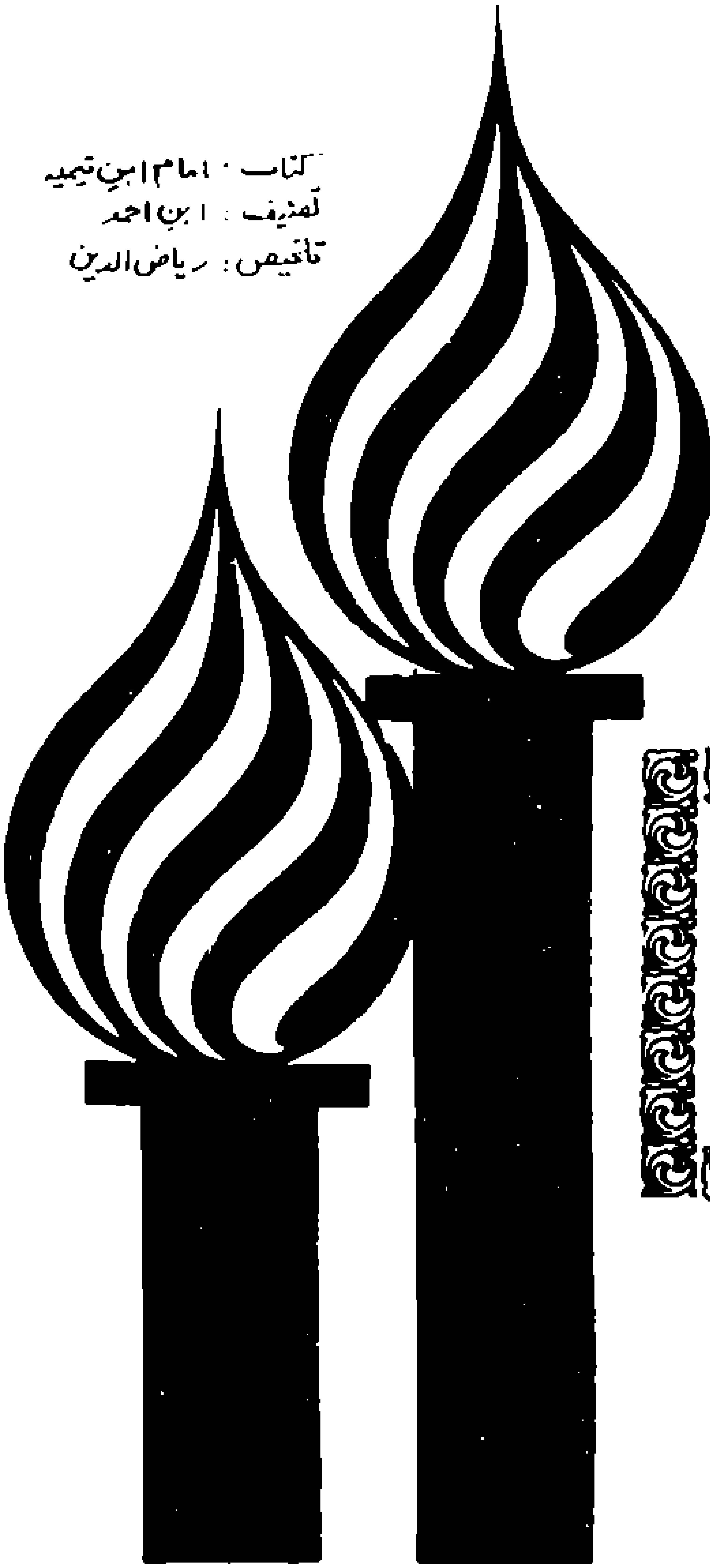
۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان دستور ساز اسمبلی کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر محمد علی جناح نے (جن کو "قائدِاعظم" کہا جانے لگا تھا) جو تقریر کی تھی وہ آج بھی دہرائے جانے کے قابل ہے۔ انھوں نے کہا تھا:

"ہم اس بنیادی اصول کے ساتھ اپنی مملکت کا آغاز کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک ریاست کے اور برابر حیثیت کے شہری ہیں۔ انگلستان کے لوگوں نے زمانے کے ساتھ حالات کو سمجھ لیا تھا۔ وہاں کی حکومت پر عوام نے جو ذمہ داریاں ڈالی تھیں اُنھیں پورا کرنے کی خاطر حکومت کو بہت سے اقدام کرنے پڑے تھے۔ آج آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہاں رومن کیتھولک یا پروٹسٹنٹ فرقے کا عدم اور وجود بالکل برابر ہے۔ وہاں کا ہر شہری انسان ہے اور بس ـــــ سب برابر کی حیثیت کے شہری ہیں۔ سب ایک قوم کے افراد ہیں۔ میرے خیال میں ہمیں بھی وہی نصب العین اختیار کرنا چاہیے۔ اس طرح وقت کے ساتھ ہندو، ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان، مسلمان نہیں رہیں گے ـــ مذہبی اعتبار سے نہیں ـــ کیوں کہ عقیدہ یا ایمان ہر شخص کا انفرادی حق ہے ـــــ البتہ سیاسی اعتبار سے وہ سب ایک ریاست کے شہری ہوں گے۔"

بھارت اور پاکستان کو ہر حال میں ایک دوسرے کا دوست بن کر رہنا ہے، نہ تو ان میں جنگ ہونی چاہیے اور نہ انھیں جنگی حالات کے قریب جانا چاہیے۔ بھارت اور پاکستان کی باہمی منافرت سے امنِ عالم کو خطرہ ہے، اس برِ صغیر میں امن، صلح و آشتی کا سایہ رہنا چاہیے۔

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو محمد علی جناح کا انتقال ہو گیا۔ وہ مملکتِ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے، اُن کی قوم نے اُنھیں "قائدِ اعظم" کا شاندار خطاب دیا۔ دُنیا کی تاریخ میں اُن کا نام ایک نئی ریاست کے بانی کی حیثیت سے لکھا جائے گا، لیکن میرے لئے اُن کی حیثیت ایک ہمدرد اور مخلص دوست کی ہے۔ میں نے اُن کی رفاقت اور دوستی سے بہت کچھ سیکھا اور پایا۔

کتاب : امام ابنِ تیمیہ
تصنیف : ابن احمد
تلخیص : ریاض الدین



امام ابنِ تیمیہ

اسلام کے زندہ معاشرے نے ایسے ایسے عظیم انسان پیدا کئے جن کی روح بے قرار، حریت افکار اور دمکتے ہوئے کردار انسانی تاریخ کے حسین نقش و نگار بناتے رہے۔ امام ابن تیمیہؒ انہی تاریخ ساز شخصیتوں میں سے ایک تھے۔ علمی و فکری میدان میں تحقیق و تجسس کے وہ گلشن کھلائے کہ آج بھی نسیم وہیں سے مہک لاتی ہے۔ ایک ہزار کتابوں کے یہ جلیل القدر مصنف جب محراب علم سے نکل کر میدانِ قتال کی طرف نکلے تو تاتاریوں کا رُخ پھیر دیا۔ جرأت مندی اور حق گوئی کا یہ عالم کہ سطوتِ شہنشاہی سرنگوں ہوگئی۔ بدعتوں کا خرمن ایک نگاہِ غلط انداز سے جلا ڈالا اور صدق و صفا کے آئینے میں رخسارِ زندگی یوں دمک اٹھے کہ ان پر حرص و ہوا کی گرد پڑی ہی نہ تھی ——

—— سلامت علی مہدی

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا خاندان شمالی عراق کے تاریخی شہر حران کا مشہور علمی اور ادبی خاندان تھا۔ شیخ الاسلام کے دادا ابوالبرکات مجدالدین ابنِ تیمیہ کا شمار مذہب حنبلی کے ائمہ و اکابر میں ہے۔ شیخ الاسلام کے والد شہاب الدین عبدالحلیم ابن تیمیہ عالم و محدث، فقیہہ اور صاحبِ درس و افتا تھے۔ اس نامور اور مخلص علمی و دینی خاندان میں دوشنبہ ۱۰ ربیع الاول ۶۶۱ھ (۱۲۶۳ء) میں تقی الدین ابن تیمیہ کی ولادت ہوئی۔ باپ نے احمد تقی الدین نام رکھا۔ بڑے ہوکر انھوں نے ابوالعباس کنیت اختیار کی، لیکن خاندانی لقب ابنِ تیمیہ سب پر غالب آیا اور وہ اسی نام سے مشہور ہیں۔

خاندانِ ابن تیمیہ کی وجہ تسمیہ مؤرخین نے یہ بیان کی ہے کہ امام صاحب کے جدِ امجد محمد بن خضر ایک مرتبہ حج کرنے گئے۔ یمن کی بستی تیما میں سے گزرے، تو وہاں ایک نہایت خوب صورت اور پاکیزہ اطوار کی لڑکی دیکھی۔ حج سے واپس آئے تو گھر میں بچی کی ولادت کا حال معلوم ہوا۔ چنانچہ محمد بن خضر اپنی اس بچی کو پیار سے "تیمیہ" کہہ کر پکارتے تھے، پھر وہی اس کا نام ہوگیا۔

ابن تیمیہ سات برس کے تھے کہ اُن کا وطن حران تاتاری حملے کی زد میں آگیا۔ مجبور ہوکر اُن کا خاندان بھی شرفا و علما کے صدہا خاندانوں کی طرح کسی اسلامی ملک میں پناہ ڈھونڈنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ اُس وقت تاتاریوں کی غارت گری سے بچا ہوا سب سے قریب ملک شام تھا۔

اس خاندان نے دمشق ہی کا رُخ کیا۔ اِس پریشانی اور بے سرو سامانی کی حالت میں اس علمی خاندان نے اپنے قیمتی کتب خانے کو، جو کئی پشتوں کا اندوختہ اور ایک بڑا علمی سرمایہ تھا جدا کرنا گوارا نہیں کیا۔ چنانچہ سب مال و متاع چھوڑ کر کتابیں ایک گاڑی پر بار کیں اور روانہ ہوگئے۔ تاتاریوں کا کھٹکا لگا ہوا تھا۔ ہر جگہ دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ عورتوں اور بچوں کا ساتھ تھا۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ جانوروں کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے کتابوں کی گاڑی خود کھینچنا پڑتی تھی۔

دمشق پہنچتے ہی اس علمی گھرانے کی آمد کی خبر ہوگئی۔ چند دن کے اندر ہی جامع اموی اور دارالحدیث السکریہ میں عبدالحلیم ابن تیمیہ کا درس شروع ہوگیا۔ کمسن احمد ابنِ تیمیہ نے بہت جلد قرآن مجید کے حفظ سے فراغت کرلی، اور حدیث و فقہ اور عربیت کی تحصیل میں مشغول ہوگئے۔

مؤرخین نے قبائلِ عرب میں کسی قبیلے کی طرف امام صاحب کو منسوب نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربی نہیں تھے۔ غالب قیاس یہ ہے کہ وہ کُردی تھے۔ کُرد قوم بڑی بہادر، باحوصلہ اور عالی ہمت ہے۔ اس کی سیرت و کردار میں قوت کا رنگ جھلکتا ہے اور آتش خوئی کا بھی۔ یہ تمام صفات امام صاحب میں واضح اور نمایاں طور پر موجود تھیں۔ قرآن مجید بچپن ہی میں حفظ کرلیا اور زندگی بھر اس کا دَور کرتے رہے۔ امام صاحب کے شوقِ تلاوت کا یہ عالم تھا کہ اپنی زندانی زندگی کے دور میں

بھی کبھی تلاوتِ قرآن کا ناغہ نہ کیا اور یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے جیل میں اسّی سے زیادہ قرآن ختم کیے۔ حفظِ قرآن کے بعد امام صاحب حفظِ حدیث ولغت کی طرف متوجہ ہوئے۔ احکام فقہ کی معرفت حاصل کی اور قرآن کا بڑا حصہ ازبر کرلیا۔

امام صاحب کے ایک معاصر ذہبیؒ نے ان کی صورت وسیرت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"سفید رنگ، سیاہ بال، سیاہ ڈاڑھی جس کے بال کانوں کی لَو تک پہنچے ہوئے، آنکھیں کیا تھیں، چشمِ گویا تھیں۔ چوڑا چکلا بدن، مونڈھے فراخ، آواز بلند اور شیریں، فصاحت وبلاغت کا جوہر نمایاں، کبھی غصہ بھی آجاتا، لیکن اس کو اپنے حلم سے دبا لیتے۔ بارگاہِ الٰہی میں عجز ونیاز، آہ وزاری، اللہ کی طرف توجہ اور اس سے مدد طلبی میں آپ جیسا کوئی شخص دیکھنے میں نہیں آیا۔ ان کی شخصیت میں ایک خاص قسم کا دبدبہ تھا اور زبان میں عجیب اثر اور حلاوت کہ جس سے بات کرتے، اُس کے دل میں اُترتے چلے جاتے۔"

ابنِ شاکر نے لکھا ہے کہ ابنِ تیمیہؒ نہایت متقی، پرہیزگار اور عابد تھے۔ ان کی پوری زندگی اللہ کے مقرر کردہ حدود کی پابندی میں گزری۔ اُن کا لباس امیروں کی طرح شاندار اور بیش قیمت نہ ہوتا اور نہ وہ علمار کی طرح عمامے اور جُبّے کے قائل تھے۔ جو مل جاتا پہن لیتے، جو مل جاتا، کھا لیتے۔ آپ کے متعلق آپ کی زندگی میں اور وفات کے بعد بہت سے لوگوں نے بے شمار خواب دیکھے۔

۶۹۹ھ میں تاتاریوں نے شام پر حملہ کیا، ۲۷ربیع الاوّل کو دمشق کے باہر قازان اور سلطان مصروشام کے درمیان معرکہ پیش آیا۔ مسلمان جم کر لڑے اور بہادری سے مقابلہ کیا، لیکن مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ سلطانی افواج نے مصر کا رُخ کیا اور اہلِ دمشق نے دمشق میں پناہ لی۔ شکستِ مصری افواج کی واپسی اور تاتاریوں کی پیش قدمی کے خطرے سے شہر میں بدحواسی پھیلی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے علمار اور سربرآوردہ اشخاص شہر چھوڑ چھوڑ کر مصر کا رُخ کر رہے تھے۔ تاجر اور عوام شہر چھوڑ چکے تھے، حکومتی عملہ رخصت ہو چکا تھا۔ حکّام میں سے صرف منتظم قلعہ ابھی مقیم تھا۔ طرفہ یہ ہوا کہ قیدی جیل خانہ توڑ کر نکل آئے۔ اوباشوں نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اِدھر دمشق میں یہ طوفانِ بے تمیزی برپا تھا، اُدھر قازان کی آمد آمد کا غلغلہ تھا جس سے رہے سہے حواس اور پراگندہ تھے۔

یہ حالات دیکھ کر اعیانِ شہر اور ابنِ تیمیہؒ نے مشورہ کیا اور یہ قرار پایا کہ ابنِ تیمیہؒ چند علمار اور رُفقا کی معیت میں قازان سے ملاقات کریں اور دمشق کے لیے پروانۂ امن حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

دوشنبہ ۳ ربیع الثانی ۶۹۹ھ کو دمشق کے نمائندہ اور اسلام کے سفیر ابنِ تیمیہؒ کی تاتاریوں کے جبّار بادشاہ قازان سے ملاقات ہوئی۔ شیخ کمال الدین، جو ابنِ تیمیہؒ کے ساتھ گئے تھے اور اس مجلس میں شریک تھے، اِس ملاقات کا حال بیان کرتے ہیں:

"امام ابنِ تیمیہؒ تاتاریوں کے لشکر میں پہنچے۔ شاہ قازان اور دوسرے سرداروں سے ملاقات کی۔ قازان تاتاریوں کا چوتھا مسلمان سلطان تھا۔ امام صاحب کے پاس تلوار تھی نہ خنجر، لیکن ایمان اور تقویٰ کے اسلحہ سے مسلح تھے۔ ہیبت اور جلال کی خاص کیفیت ان پر طاری تھی۔

"امام صاحب کے ساتھ وفد میں شریک ہو کر میں بھی گیا تھا۔ انھوں نے سلطان کے سامنے آیاتِ

قرآن کی تلاوت اور احادیثِ رسولؐ کا بیان، عدل و انصاف کے موضوع پر شروع کر دیا۔ اُن کا لہجہ بلند ہوتا جارہا تھا اور وہ جوش کے عالم میں سلطان کے قریب پہنچتے جا رہے تھے اور سلطان ہمہ تن گوش اُن کی تقریر سن رہا تھا۔ سراپا التفات بنا اُن کی طرف متوجہ تھا۔ تصویرِ حیرت بنا اُن کی طرف دیکھ رہا تھا اور دَم سادھے بیٹھا تھا۔ اس کے دل پر امام صاحب کی دہشت بیٹھ گئی تھی۔ اپنی بدنام تُندخوئی اور دُرشت مزاجی کے باوجود سہما ہوا تھا لیکن محبت بھری نظروں سے ٹکٹکی باندھے امام صاحب کی صورت دیکھ رہا تھا، آخر رہا نہ گیا، بول اٹھا:

"یہ کون بزرگ ہیں؟ میں نے آج تک اس جگر کا آدمی نہیں دیکھا، نہ کسی کی بات یوں تیر کی طرح میرے دل میں بیٹھی، نہ کسی کے سامنے میں نے اپنے آپ کو ایسا بے بس پایا۔"

سلطان کو بتایا گیا کہ اس کا مخاطب علم و عمل کے اعتبار سے کیسا بلند مرتبت شخص ہے۔ ادھر امام صاحب کی تقریر پوری گھن گرج اور جاہ و جلال کے ساتھ جاری تھی:

"اے قازان! تیرا دعویٰ ہے کہ تو مسلمان ہے، تیرے ساتھ قاضی بھی ہیں، شیخ بھی اور اذان دینے والے مؤذن بھی جو خدائے واحد کے نام پر لوگوں کو بلاتے اور پکارتے ہیں۔ تیرے باپ دادا کافر تھے لیکن وہ سیرت و کردار میں تجھ سے اونچے تھے۔ جو حرکتیں تو نے مسلمان ہو کر کی ہیں، وہ اُنھوں نے کافر ہو کر بھی نہ کی تھیں۔ وہ جو عہد کرتے اُسے پورا کرتے تھے۔ مگر تو نے پیمانِ وفا باندھا اور توڑ دیا۔ جو بول تیرے مُنہ سے نکلے، شرمندۂ عمل نہ ہوئے۔"

"امام صاحب نے تقریر ختم کی اور اُٹھ کھڑے ہوئے، لیکن قازان نے نہایت اصرار سے آپ کو روک لیا اور دسترخوان پر لے گیا۔ وفد کے دوسرے لوگوں نے کھانا کھایا، لیکن امام صاحب نے ہاتھ روک لیا۔ قازان نے پوچھا آپ کیوں نہیں تناول فرماتے؟"

ارشاد فرمایا: "اے سلطان میں تیرا کھانا کس طرح کھا سکتا ہوں؟ یہ کھانا وہی تو ہے جو لوگوں کو لوٹ کر تیار کیا گیا ہے۔ یہ جو کچھ پکا ہوا سامنے موجود ہے، یہ انہی درختوں کی ٹہنیوں پر پکایا ہے جو از راہِ ظلم و جور کاٹے گئے ہیں۔"

قازان نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ پھر امام صاحب سے دُعا کی درخواست کی۔ امام صاحب نے دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے اور فرمایا:

"اے اللہ! اگر تیرے علم میں یہ ہے کہ قازان نے اس لئے تلوار میان سے نکالی ہے کہ تیرا کلمہ بلند ہو اور تیری راہ میں جہاد کرے، تو پھر اس کی مدد کیجیو، اسے اپنی نصرت سے نوازیو لیکن اگر یہ جنگ زرگری میں مبتلا ہے، دُنیا اور بادشاہت اور توسیعِ مملکت کے لئے برسرِ پیکار ہے تو پھر تو اس سے اچھی طرح سمجھ لیجیو۔"

حالت یہ تھی کہ امام صاحب دُعا کر رہے تھے اور قازان کے مُنہ سے بے ساختہ آمین آمین کے الفاظ نکل رہے تھے اور ہم اس خوف سے اپنے دامن سمیٹے بیٹھے تھے کہ امام صاحب کی گردن ضرور اُڑا دی جائے گی اور خون کے چھینٹے ہمارے لباس پر پڑیں گے۔

۷۰۲ھ میں تاتاری پھر دمشق کی طرف بڑھے، ابنِ تیمیہؒ مصر گئے اور سلطان کو جہاد پر آمادہ کیا۔ ۲ رمضان کو شقحب کے میدان میں ایک طرف شامی و مصری فوجیں اور دوسری طرف تاتاری لشکر صف آرا ہوا۔ سلطان خود بنفسِ نفیس لشکر میں موجود تھا۔ خلیفہ عباسی ابوالربیع سلطان

کے پہلو میں تھے۔ ابنِ تیمیہؒ کو فتح کا اس قدر یقین تھا کہ اُمراء و عوام سے قسم کھا کر کہتے تھے کہ تم اس مرتبہ ضرور فتح پاؤ گے۔ بالآخر دونوں لشکر آپس میں گتھ گئے اور جنگ کا بازار گرم ہوا۔ سلطان نے بڑی ثابت قدمی دکھائی۔ سخت معرکہ ہوا، بڑے بڑے ترکی اُمراء کام آئے۔ بالآخر مسلمانوں کو فتح ہوئی اور تاتاریوں کے قدم اُکھڑ گئے۔ بھاگنے والوں کی ایک بڑی تعداد گھاٹیوں اور خطرناک جگہوں میں گر کر اور دریائے فرات میں ڈوب کر ہلاک ہو گئی۔

تاتاریوں کے قضیے سے فرصت پا کر ابنِ تیمیہؒ نے حسبِ معمول پوری سرگرمی کے ساتھ درس و تدریس اشاعتِ سنّت اور ردِّ بدعات کا کام شروع کر دیا اور شرک و جاہلیت کے خلاف جہاد میں مشغول ہو گئے جو اُن کا محبوب مشغلہ اور زندگی کا ایک بڑا مقصد تھا۔ اُس زمانے میں عیسائیوں اور یہودیوں کے اختلاط اور فاسد العقیدہ اور جاہل مقتداؤں کی تعلیم سے مسلمانوں میں بہت سے ایسے اعمال آ گئے تھے جو جاہلیت کی یادگار اور مشرک و بُت پرست اقوام کا شعار تھے۔

رجب ۷۰۴ھ کا واقعہ ہے کہ آن کے پاس ایک پیر مرد، جو اپنے کو المجاہد ابراہیم بن القطان کہتا تھا، لایا گیا۔ اُس نے بہت لمبی چوڑی گدڑی پہن رکھی تھی، بال اور ناخن بڑھے ہوئے تھے، لبیں مُنہ پر آ رہی تھیں، گالی اور فحش کثرت سے بکتا تھا اور نشہ آور چیزوں کا استعمال بھی کرتا تھا۔ ابنِ تیمیہؒ نے اس کی گدڑی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کا حکم دیا۔ سب طرف سے لوگ ٹوٹ پڑے اور اُس کا تار تار تبرک ہو گیا، سر کے بال اور لبیں ترشوائیں، ناخن کٹوائے، فحش گوئی اور نشے سے اُس کی توبہ کرائی گئی۔

دمشق میں ابنِ تیمیہؒ کی ایک طرح کی دینی سیادت قائم ہو گئی تھی۔ وہ اگر دیکھتے کہ حکومت کسی بدعت یا فعلِ منکر کے روکنے میں تساہل سے کام لے رہی ہے اور علماء خاموش ہیں، تو وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے اور خود شرعی احکام کا اجرا کرتے۔ ان کے ساتھ عقیدتمند تلامذہ اور دیندار اور صحیح العقیدہ عوام کی ایک بڑی جماعت تھی اور اُن کا حلقۂ اثر بڑھتا جاتا تھا۔ اُن کے علم و تقریر کے سامنے کسی کا چراغ نہ جلتا تھا، وہ جہاں رہتے، سب پر چھا جاتے تھے۔ درس دیتے تھے، تو درس کی دوسری محفلیں بے رونق ہو جاتی تھیں۔ تقریر کرتے تھے، تو علم کا دریا اُمڈتا نظر آتا تھا۔ ان کی شخصیت کی اس دلآویزی، بلندی اور عوام و خواص میں مقبولیت نے حاسدوں کا ایک طبقہ پیدا کر دیا جو اُن کے زوال کا متمنی اور اُن کی اہانت کے درپے تھا۔

ان سب اسباب نے مل کر شیخ الاسلام کو عمر بھر ابتلا اور آزمائش میں رکھا۔ اُنھیں کئی بار قید و بند کے مراحل سے گزرنا پڑا، حتیٰ کہ قید ہی کی حالت میں انتقال ہوا۔ شیخ صاحب جہاں کہیں بھی رہے، انھوں نے اپنا کام جاری رکھا۔ جیل سے باہر ہوتے، تو عام درس و افادہ میں مشغول رہتے۔ ان کی ان مجالس میں لوگ دُور دراز سے شرکت کے لئے آتے اور عوام و خواص سب دینی و علمی فائدہ اٹھاتے۔ جیل میں ہوتے، تو وہاں بھی اصلاحِ عقائد، تطہیرِ افکار اور تزکیۂ نفوس کا کام جاری رہتا۔

۷ شعبان ۷۲۶ھ کو حکومت نے اُنھیں ایک بار پھر گرفتار کر کے قلعۂ دمشق میں قید کر دیا۔ قید و بند کے یہ لمحات شیخ کے لئے سکون اور یکسوئی کی دولت لے کر آئے۔ شیخ پورے انہماک اور ذوق و شوق کے ساتھ عبادت و تلاوت

میں مشغول ہو گئے۔ اس سے جو وقت بچتا تھا، وہ مطالعہ، تصنیف اور اپنی کتابوں کی تنقیح و تصحیح میں صرف کرتے تھے، جو خود ایک مستقل عبادت تھی۔ شیخ جیل خانے میں جو کچھ لکھتے لوگ اس کو ہاتھوں ہاتھ لیتے اور وہ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاتا۔ آخر مصر کے قاضی عبداللہ بن الاخنائی کی شکایت پر سلطان نے فرمان جاری کیا کہ شیخ کے پاس جتنی کتابیں، کاغذ قلم دوات ہے، لے لیا جائے اور اُن کے پاس کوئی ایسا سامان نہ رہے جس کی مدد سے وہ تصنیف کر سکیں، ۹ جمادی الآخری ۲۸ ۷ھ کو اس فرمان کی تعمیل ہوئی۔

اب زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے۔ انتقال سے بیس روز پہلے طبیعت خراب ہوئی اور پھر درست نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ ۲۲ ذی قعدہ ۷۲۸ھ (۱۳۲۸ء) کی شب میں وقتِ موعود آ پہنچا اور اس مجمع کمالات ہستی نے ۶۷ سال کی عمر میں دُنیا سے کوچ کیا۔ شہر میں بجلی کی طرح یہ خبر پھیل گئی۔ قلعے کا دروازہ کھول دیا گیا اور اذنِ عام دے دیا گیا۔ لوگ جوق در جوق آتے تھے اور زیارت کر کے جاتے تھے۔

غسل کے بعد ایک نمازِ جنازہ قلعے میں ہوئی، نماز کے بعد جنازہ باہر لایا گیا۔ چار گھڑی دن چڑھے جنازہ جامع اموی میں پہنچا۔ مجمع کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ ظہر کے بعد نمازِ جنازہ ہوئی۔ لحظہ بہ لحظہ ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ میدان، گلیاں، بازار سب بھر گئے۔ ہر طرف مجمع ہی مجمع نظر آتا تھا، بازار بند تھا۔ نمازِ جنازہ کے بعد جنازہ اٹھا۔ کاندھا دینے کا موقع نہ تھا۔ جنازہ انگلیوں اور سروں پر جا رہا تھا۔ ہر طرف گریہ و بکا کی صدائیں بلند تھیں۔ جنازہ صبح کے وقت قلعے سے نکلا تھا، لیکن ہجوم کی کثرت کی وجہ سے کہیں عصر کی اذان کے وقت دفن کی نوبت آئی۔ بظاہر سارا شہر جنازے کی مشایعت میں تھا۔ ایسا ہجوم دمشق کی تاریخ میں دیکھا نہیں گیا۔

شیخ الاسلام حافظ ابنِ تیمیہؒ نے اپنے دور میں علوم اسلامیہ میں مجتہدانہ مقام حاصل کیا اور تفسیر و حدیث و فقہ میں بیک وقت اپنی امامت، تبحر اور غیر معمولی عبور کا جو نقش اپنے زمانے پر قائم کیا، اُس میں بہت بڑا دخل ان کے غیر معمولی حافظے اور ذہانت کو تھا۔

ابن تیمیہؒ کی شجاعت و دلیری اور موت سے بے خوفی ان کے تمام معاصرین حتیٰ کہ ترک سرداروں اور فوجی افسروں کے لئے بھی حیرت انگیز تھی۔ جب وہ گھوڑے پر سوار ہوتے تھے تو دُشمن کی صفوں میں اس طرح گھومتے تھے جیسے بڑے سے بڑا بہادر اور اس طرح کھڑے رہتے تھے جیسے بڑے سے بڑا ثابت قدم شہسوار۔ وہ دُشمن کو اپنے حملوں سے چُور کر دیتے تھے اور اس بے تکلفی سے فوج میں گھس جاتے تھے جیسے ان کو موت کا کوئی ڈر نہیں۔

ابن تیمیہؒ کی زندگی کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ وہ علم دین کی خدمت کے لئے ہمہ تن وقف تھے۔ انھوں نے زندگی بھر کسی چیز سے سروکار نہ رکھا۔ ان کے اکثر معاصرین، رفقاء اور ہم عمر جن میں بڑے بڑے مخلص اور بڑے بڑے فاضل تھے، حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز رہے یا عطیۂ سلطانی، خلعت شاہانہ سے سرفراز ہوئے یا حکومت کے وظیفہ خوار رہے لیکن ابن تیمیہؒ کا دامن ساری عمر ان آلائشوں سے پاک رہا۔

ابن تیمیہؒ صرف صاحب قلم نہ تھے، صاحب سیف بھی تھے۔ ان کے قلم نے جو نقوش بنائے، وہ ایک ہزار کتابوں کے اوراق میں محفوظ ہیں، لیکن ان کی نوک شمشیر نے دُشمنانِ اسلام کے سینے پر جو لکیریں کھینچیں، تاریخ نے انھیں بھی ناقابلِ فراموش بنا دیا ہے۔ وہ بزم کے میر مجلس ہی نہ تھے رزم کے امیر عساکر بھی تھے، وہ صرف جہاد کے مبلغ اور داعی نہ تھے، مجاہد صف شکن بھی تھے۔



اخوان المسلمین
کا لہو کتنا قیمتی تھا —
لیکن
کتنا ارزاں بہا

کتاب اخوان
تصنیف مصطفیٰ الخلدی
ترجمہ : محمد عثمان

صدر جمال عبدالناصر بلاشبہ نئے مصر کے معمار تھے، انہوں نے مصر کو ترقی کی نئی شاہراہ پر گامزن کر دیا۔ انہوں نے مصر کو عالمی سیاست میں ایک نیا اور باعزت مقام دلایا لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ انہوں نے بحیثیت آمر کچھ غلطیاں بھی کیں ——— وہ اگر غلطیاں نہ کرتے تو آج اسرائیل مصر اور دوسرے عرب ممالک کے علاقوں پر قابض نہ نظر آتا ——— وہ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں مصر کی انتہائی زبردست طاقت کو شکست نہ دے دیتا ———!

صدر ناصر مرحوم کی بے شمار غلطیوں میں سے ایک غلطی یہ تھی کہ انہوں نے اخوان المسلمین کو اپنا دشمن سمجھا، حالانکہ مسلمان سرفروشوں کی یہی وہ مصر کی واحد جماعت تھی جس نے شاہ فاروق کی حکومت کا تختہ الٹنے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا جو ہمیشہ سے انگریز سامراج کی دشمن تھی اور جس نے نہر سوئز کو قومی ملکیت قرار دیے جانے کے اعلان کے بعد صرف اپنی تنظیمی اور ایمانی طاقت کے بل پر غیر سرکاری طور پر بیک وقت برطانیہ، فرانس کے حملہ کا ۱۹۵۶ء میں مقابلہ کیا تھا اور مصر کو اس سہ طاقتی حملہ پر فتح دلائی تھی ——— لیکن ———۔

صدر ناصر نے اخوان کا یہ کارنامہ بھلا دیا ———۔ مصر کے آمر مطلق بننے کے بعد انہوں نے اپنی راہ کا سب سے بڑا کانٹا اخوان المسلمین کو سمجھا، انہوں نے اخوان کو ایک غیر قانونی جماعت قرار دیا اور پھر اس کے تمام لیڈروں کو گرفتار کر کے ان کو موت کے آہنی پنجے کے حوالے کر دیا۔ صدر ناصر کا یہ گناہ نہ انصاف پسند دنیا معاف کرے گی اور نہ ہماری اس دنیا کا خالق ———۔

مولانا قطبؒ اور ان کے ساتھیوں کا لہو ہمیشہ نیل کے پانی کو سرخ کرتا رہے گا اور دنیا کو یاد دلاتا رہے گا کہ شہیدوں کا قیمتی لہو کبھی رائیگاں نہیں جاتا ہے ———۔

میں صدر ناصر مرحوم کا پرستار ہوں لیکن مجھے ان کی سرکاری اور سیاسی زندگی کا یہ فعل کبھی بھی پسند نہیں آیا ———۔ میں حق گوئی کو اپنا ایمان سمجھتا ہوں، اور مجھے اس کی پروا نہیں ہے کہ مولانا قطب کی داستان کے بعد مصر کے موجودہ حکمران مجھ سے ناراض ہو جائیں گے ——— حالانکہ میں جانتا ہوں کہ ابھی ۲۰ اکتوبر کو مصر کے نئے صدر مسٹر انور سادات نے اخوان المسلمین سے پابندی ہٹا لی ہے۔ شاید وہ نئے مصر کے ساتھ گناہوں کی تلافی کر دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں ——— بہرحال ——— آپ یہ داستان پڑھ لیجئے اور پھر خود ہی یہ فیصلہ کر لیجئے کہ میرے خیالات وافکار حق اور انصاف پر مبنی ہیں یا نہیں ———۔

یہ تلخیص خود میری اپنی ذاتی نگرانی پر کی گئی ہے اور مجھے اس پر فخر ہے کہ میں ہندوستان میں پہلی بار مصر کی تاریخ کے اس تاریک باب کے چہرے کی نقاب الٹ رہا ہوں ———۔

میں دست بدعا ہوں کہ خدا مصر کے موجودہ صدر مسٹر انور سادات کو صراطِ مستقیم دکھائے وہ مادی طاقتوں کے بجائے روحانی طاقتوں پر بھی بھروسہ کریں اور عالم عرب کو اسرائیل کے وجود سے نجات

> بلادیں، وہ اس جذبۂ ایمانی کو وہی حرارت دیں جو ابھی چند صدی قبل مصر کے ایک بیٹے غازی صلاح الدین نے پوری عرب قوم میں پیدا کر دی تھی اور پورے یورپ نے عربوں کے سامنے یروشلم میں اپنا سر جھکا دیا تھا۔ ——
>
> سلامت علی مہدی

یہ فرعونوں کی سرزمین ہے۔ فوجی قید خانے کے صحن میں ہزار ہزار واٹ کے بہت سے بلب لگے ہیں —— پھر بھی چاروں طرف تاریکی ہے۔ اندھیرا ہے کہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ قمقموں کی روشنی بھی اسے کم نہیں کر سکتی۔ ظلمتوں کے اس سمندر میں کبھی فوجی افسروں کے قہقہے ابھرتے ہیں تو کبھی قیدیوں کی دبی دبی گھٹی گھٹی سسکیاں۔ ذرا اور قریب سے دیکھیں، تو پہرے داروں اور جلادوں کا ایک گروہ نظر آتا ہے۔ سب لوگ ایک دائرے میں کھڑے ہیں شاید کوئی تماشا ہو رہا ہے —— اچانک ام کلثوم کی سریلی آواز سنائی دیتی ہے۔ ریکارڈ بج رہا ہے —— "یا جمال —— یا مثال الوطنیہ" صدر ناصر کی شان میں یہ قصیدہ کتنا اچھا ہے۔ لیکن ٹھہریے —— ام کلثوم کی آواز کے ساتھ دوسری آوازیں بھی سنائی دے رہی ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی مرتے مرتے ام کلثوم کے ساتھ گانے کی کوشش کر رہا ہو۔ گانے کے ساتھ چیخیں بھی شامل ہیں۔ درد کی شدت سے مجبور ہو کر کوئی چلا رہا ہے۔ آیئے ہم بھی دیکھیں۔ یہ کیا ماجرا ہے —— دائرے کے بیچوں بیچ دس بڑی بڑی کرینیں کھڑی ہیں ان کرینوں پر تمیں کے لگ بھگ عریاں انسانی جسم لٹک رہے ہیں کہ ہر شخص کی ٹانگ دوسرے کے بازو سے بندھی ہے۔ یہ لوگ فضا میں معلق ہیں۔ اُف! میرے خدا، کس قدر بھیانک نظارہ ہے۔ ان بدنصیب قیدیوں کے سامنے پہرے دار لمبے لمبے کاغذ لئے کھڑے ہیں۔ صبح ان لوگوں کو عدالت میں پیش ہونا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رات کے اس سناٹے میں انہیں کرینوں سے لٹکا کر جرم کا اقرار کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے، لیکن یہ کیسا جرم ہے کہ قیدیوں کو قابلِ احترام صدر کی شان میں ام کلثوم کے ساتھ ساتھ گانے کا حکم ملتا ہے۔

دفعتہً داروغہ جیل کی آواز سنائی دیتی ہے:

"ہم پہلے سبق دیتے ہیں اور جو شخص سبق یاد نہ کرے یا یاد کر کے بھلا دے اُسے کرینوں کے ذریعہ چیر دیتے ہیں۔ یہ کرین دیکھ لو —— جو شخص ہماری بات ماننے سے انکار کرے گا، ہم اس کی دونوں ٹانگیں الگ الگ کرینوں سے باندھ کر دونوں کو مخالف سمتوں میں حرکت دیں گے۔ اس کا جسم دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ ہمیں معلوم ہے تمہیں مرنے کی آرزو ہے لیکن ہم تمہیں مرنے نہیں دیں گے۔"

ایک فوجی افسر آگے بڑھتا ہے اور ہر قیدی کے سامنے جا کر سوال کرتا ہے۔

"جو باتیں تمہیں لکھ کر دی گئی ہیں، اچھی طرح یاد ہیں؟"

"یاد ہیں" —— یہ آواز اتنی نحیف ہے کہ بمشکل سنائی دیتی ہے۔ لہولہان جسم والے قیدی نیم بے ہوش ہیں۔

"عدالت میں اپنا بیان بدلو گے تو نہیں؟"

"نہیں۔"

"جیل میں تمہارے ساتھ کیسا سلوک ہوا ہے؟"

"بڑا شریفانہ اور انتہائی مشفقانہ۔"

اسی وقت چند پہرے دار دو آدمیوں کو اسٹریچروں پر لاتے ہیں لکڑی کے بدبودار اور میلے تختوں میں سے ایک پہ سید قطب نیم مردہ حالت میں پڑے ہیں اور دوسرے پہ حسن الہضیبی۔

حسن الہضیبی کی طرف اشارہ کر کے فوجی افسر فضا

میں معلق شخص سے پوچھتا ہے:

"یہ کون ہیں؟"

"جناب مرشد ہیں"

"یوں کہو کہ مرشد کفر ہیں"

"مرشد کفر ہیں"

اب سید قطب کی طرف اشارہ ہوتا ہے:

"یہ کون ہیں؟"

"سید قطب" جواب ملتا ہے

"اسے کہو تو بڑا ظالم اور نادان شخص ہے۔"

کڑیوں سے الٹے لٹکے ہوئے ننگے جسموں میں سے کوئی تعمیل سے انکار کرتا ہے، تو فوجی افسر سیخ پا ہو جاتے ہیں اور جلتے ہوئے سگریٹ ان کے نازک اعضا پر لگاتے ہیں درد کی شدت سے بے اختیار ہو کر وہ پکار اٹھتے ہیں۔

"یہ مرشد کفر ہے اور وہ ظالم اور نادان شخص ہے"

اس ہنگامے سے کچھ دور، ایک صاحب علم و فضل خاتون کے سامنے اس کے بھائی کو اذیت دی جا رہی ہے کرائے کے پہریدار بھائی کو مجبور کر رہے ہیں:

"اپنی بہن کے بارے میں یہ لکھو کہ وہ بدکار ہے اور پیشہ کرتی ہے۔"

نیک نفس بھائی انکار کر دیتا ہے۔ بہن بار بار درخواست کرتی ہے کہ یہ تحریر لکھ دیں اور عذاب سے اپنی جان چھڑا لیں مگر بھائی نہیں مانتے۔

"میری بہن، تم میرے لئے نمونہ بنی ہو، میں تمہارے لئے نمونہ بنوں گا۔"

تین خواتین نیم عریاں حالت میں چوبی کھونٹی سے کسی ہوئی ہیں۔ یہ تینوں نیم مردہ اور بیہوش ہیں۔ ان کے جسم خون اور پیپ سے لت پت ہیں۔ ایک اخوانی انجینئر خود عزت اپنی قمیص اتار کر آگے بڑھتے ہیں اور ایک خاتون کی ستر پوشی کرنا چاہتے ہیں۔ اچانک ایک فائر ہوتا ہے اور وہ زمین پر گر پڑتے ہیں۔

یہاں نظر بندوں کو ننگا کیا جاتا ہے۔ لوہے کی زنجیروں سے باندھ کر ان پر کتے چھوڑے جاتے ہیں۔ انہیں جلتی ہوئی آگ میں ڈالا جاتا ہے۔ اس چار دیواری کے اندر بھائیوں کے سامنے بہنیں برہنہ کی جاتی ہیں۔ وہ کمرے ہیں جہاں نظر بندوں کی تواضع بجلی کے جھٹکوں سے ہوتی ہے اور انہیں عذاب کی نئی نئی کیفیتوں سے ہمکنار کیا جاتا ہے گلے میں پھندا ڈال کر لٹکا دیتے ہیں اور فوجی ان پر نشانہ بازی کی مشق کرتے ہیں۔ یہاں فاحشہ عورتوں کی آواز میں آواز ملا کر گانے کا حکم ملتا ہے۔ اخوانیوں کو ایک دوسرے کے سامنے کھڑا کر کے انہیں ایک دوسرے کو پیٹنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ مقعد میں دھونکنی سے ہوا بھرنے کا کام بھی باقاعدگی سے ہوتا ہے۔ پیٹ پھول کر کُپا ہو جاتے ہیں اور جب ان پر ہلکی سی ضرب لگائی جائے تو قیدی کی چیخیں نکل جاتی ہیں یہ کون لوگ ہیں —— کیا واقعی مجرم ہیں —— یہ شور کیسا ہے —— ایک پہریدار نے اخوان کے نظر بندوں کو پیٹنے سے انکار کر دیا ہے۔

"یہ ظلم ہے —— یہ جھوٹ ہے" پہرے دار کی آواز رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔

یہ پہرے دار ایک مدت سے قیدیوں کو سزا دینے پر مامور ہے۔ آخر آج اسے کیا ہوا جو یوں پھٹ پڑا —— اس کا ضمیر یکایک بیدار کیوں ہو گیا؟ کیا اخوان جادوگر ہیں؟

"گرفتار کر لو اسے، یہ بھی اخوان سے تعلق رکھتا ہے اور جاسوسی کرنے آیا ہے" تھوڑی دیر بعد پہرے دار کو پابجولاں تعذیب کی کوٹھڑیوں کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔

جن لوگوں کو سزائیں مل رہی ہیں وہ اس جماعت کے رکن ہیں جس کا نعرہ ہے:

"اللہ ہمارا مقصود ہے، قرآن ہمارا دستور ہے، رسولؐ ہمارا رہنما ہے، جہاد ہمارا راستہ ہے اور اللہ کے راستے میں موت ہماری سب سے بڑی آرزو ہے۔"

اخوان کا نام آیا تو ذہن کے افق پر بہت سی باتیں بیک وقت ابھر آئی ہیں:

یہ وہ جماعت ہے جس نے سب سے پہلے اسرائیل کے خلاف جہاد کیا۔

یہ لوگ جن پر الزام عائد کیا گیا ہے کہ وہ غیر قانونی طور پر حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں اور قابل احترام صدر کو قتل کرنے کی سازش کر رہے تھے، حکومت اور اقتدار کے کتنے خواہشمند ہیں اس کا اندازہ مرشد عام حسن الہضیبی کے اس قول سے ہو سکتا ہے۔ جب ایک بار حکومت میں شرکت کی درخواست پر انہوں نے کہا تھا:

"ہم ایسی حکومت کو پاؤں سے ٹھوکر مارتے ہیں جو طاقت کے بل پر چلائی جائے۔"

یہ جماعت کیا ہے اور مصر کی موجودہ حکومت اسے کچلنے کی کوشش کیوں کر رہی ہے۔ یہ سمجھنے کے لئے ہمیں مصری تاریخ کا ایک جائزہ لینا ہوگا۔ ۱۹۲۸ء میں مصر کے ایک صاحبِ دل حسن البنا شہید نے اخوان المسلمون کی بنیاد رکھی۔ یہ تحریک اسلامی نظام کے نفاذ کی علمبردار تھی اور مذہب کو جو خانقاہوں، مدرسوں اور مسجدوں میں قید کر دیا گیا تھا۔ عملی طور پر زندگی کے ہر شعبے میں آگے لانا چاہتی تھی۔ یہ لوگ غیر ملکی استعمار کے جانی دشمن تھے۔ چنانچہ انگریزوں نے حسن البنا شہید کے سر کی قیمت مقرر کر دی تھی۔ مصر کی حکومت اس وقت مغربی تہذیب کی پرستار تھی۔ لیکن عوام میں ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو دل سے اسلام کی حکمرانی چاہتے تھے۔ جلد ہی یہ جماعت مقبولِ عام ہوگئی۔ اخوان المسلمون کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں زیادہ تر پڑھے لکھے لوگ شامل تھے۔ وکیل، ڈاکٹر، انجینئر، سرکاری ملازم، پروفیسر، خطیب اور سب سے بڑھ کر طلباء کی برادری اس جماعت کا سب سے طاقتور حصہ تھی۔ شہنشاہ مصر اپنی رنگ رلیوں کے باعث ان کا ہدف تھا۔ اخوان کی حب الوطنی شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ یہی وجہ تھی جو لوگ اس جماعت کے باقاعدہ رکن نہ تھے وہ بھی اس کے پروگرام سے دلچسپی رکھتے تھے۔ شاہ فاروق اخوان المسلمون کی بڑھتی ہوئی عوامی طاقت سے خائف تھا چنانچہ اس کے حکم سے داعی اول حسن البنا کو دن دھاڑے ایک سڑک پر شہید کر دیا گیا۔ یہ شہادت ۱۹۴۹ء میں ہوئی لیکن تحریکیں کسی ایک شخص کے مرنے سے ختم نہیں ہو جایا کرتیں۔ پھول کو مسلا جا سکتا ہے۔ اس کی پنکھڑیوں کو پاؤں تلے روندا جا سکتا ہے۔ اس کے پرزے پرزے کئے جا سکتے ہیں لیکن اس کی خوشبو ختم نہیں کی جا سکتی۔ حسن البنا بھی ایک پھول تھے۔ اس لئے تمام کوششوں کے باوجود بھی حکومت انہیں نیست و نابود نہ کر سکی۔ وہ اپنے پچاس لاکھ ساتھیوں کی صورت میں ہمیشہ زندہ رہے۔ حکومت کے جبر و تشدد کے باوجود یہ جماعت اپنا کام کرتی رہی۔ جہادِ فلسطین میں اخوان نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مصر میں انقلاب آیا، انقلابیوں کو اخوان کی تائید حاصل تھی۔ انقلابی حکومت نے ملک کی تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کی تو اخوان کے مرشدِ عام (صدر) حسن الہضیبی نے جنرل نجیب سے کہا:

"ہمارا دین بھی سیاست ہے ——— اور سیاست بھی دین ———"

چنانچہ اخوان المسلمون اس حکم سے آزاد رہی، مگر جلد ہی اقتدار کی باگ ڈور جمہوریت پسند اور اسلام دوست عناصر کے ہاتھ سے نکل کر ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آگئی جو اپنی رائے کو

ہر قانون پر فائق سمجھتے تھے اور جن کے نزدیک اسلام محض ایک کھوکھلا نعرہ تھا —— جنرل نجیب نظر بند کر دیے گئے ۔ انقلابی کونسل کے دوسرے ارکان کو حراست میں لے لیا گیا ۔

صدر ناصر عرب سوشلزم کا علمبردار تھا اس کے نزدیک ایک عرب عیسائی غیر عرب مسلمان سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا عرب قومیت کا یہ جنون اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا —— فاروق کے عہد تک دستور میں کم از کم یہ جملہ موجود تھا کہ ریاست کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا ۔ لیکن عرب سوشلسٹ پارٹی نے اپنے محبوب صدر کی سرکردگی میں دستور سے یہ دفعہ بھی ختم کر دی

اب ذرا ان اسباب پر بھی نظر ڈالتے چلیں جن کی بنیاد پر ناصر اخوان کشمکش نے جنم لیا ۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ اخوان المسلمون اسلام پسند جماعت ہے ۔ ادھر مصری حکومت جس راستے پر جا رہی تھی وہ سراسر قومی اور نسلی تعصب کا راستہ تھا ۔ مصر اسرائیل کو اپنا دشمن قرار دیتا ہے لیکن ان ممالک سے اس کی گہری دوستی ہے جو نہ صرف اسرائیل کو تسلیم کرتے ہیں ، بلکہ اس طفیلی مملکت کی تعمیر و ترقی میں مصروف ہیں ۔ قبرص کے صدر میکاریوس مسلمانوں کے صف اول کے دشمن ہیں قبرصی ترکوں کے اس قاتل کے ساتھ بھی مصری حکومت کی گاڑھی چھنتی ہے ۔ یہاں تک کہ حال ہی میں نقوسیا سے یہ اعلان کیا گیا کہ اگر ترکی نے قبرص پر حملہ کیا ، تو مصر ترکی کے مقابلے میں قبرص کی مدد کے لئے اپنے راکٹ بھیجے گا ۔

مصر جس کا نام متحدہ عرب جمہوریہ بھی ہے مختلف مسائل سے دوچار ہے فلسطین کا مسئلہ ، یمن کا مسئلہ ، شام کی علیحدگی اور اس قسم کے دوسرے کئی مسائل ایسے ہیں جنہیں حل کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں ، مگر بات کچھ بن نہیں رہی آج کل دنیائے اسلام کا سب سے اہم موضوع اسلامی اتحاد ہے ۔ سعودی عرب کے شاہ فیصل اس مہم کا آغاز کر چکے ہیں اور سر توڑ کوشش کر رہے ہیں کہ تمام اسلامی ممالک اپنی چھوٹی چھوٹی رنجشیں بھول کر ایک پرچم تلے اکٹھے ہو جائیں ۔ مصر اس تجویز کا سب سے بڑا مخالف ہے ۔ وہ عرب اتحاد کا علمبردار ہے بلکہ تخصیص کے ساتھ صرف سوشلسٹ عربوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانا چاہتا ہے ۔ اسلامی اتحاد چونکہ سوشلزم کی راہ میں رکاوٹ ہے ۔ اس لئے مصر بڑی شد و مد کے ساتھ اس کی مخالفت کرتا ہے ۔ مصری ریڈیو نے اتحاد اسلامی کے حامیوں کو "ڈاڑھے" ، "شیطان" اور "یہودیوں کے بچے" کے القاب سے نوازا ہے ۔

یہ تو تھے خارجی معاملات ، اب ذرا مصر کے عوام پر نظر ڈالئے ۔ عام آبادی کسانوں کی ہے ۔ یہ لوگ اسلام کے شیدائی ہیں اور پسند نہیں کرتے کہ اسلام کے شعائر کی کھلم کھلا تضحیک کی جائے لیکن ملک میں حالات اس کے برعکس ہیں ۔ مصر کی کمیونسٹ پارٹی ، حکمراں پارٹی میں مدغم ہو چکی ہے ۔ فرعونی تہذیب کا احیا حکومت کا اولین مقصد ہے ۔ موجودہ مصری میثاق واضح طور پر بتا رہا ہے : "ہم اپنی ترقی کا خاکہ فرعونوں کی تہذیب سے اخذ کریں گے" ۔ اسی منصوبے پر عملدرآمد کرتے ہوئے فرعون مصر رعمیس کا مجسمہ صحرا سے کھدوا کر قاہرہ کے وسط میں نصب کیا گیا ہے —— متحدہ عرب جمہوریہ کے قابل احترام صدر عوام سے خطاب کرتے ہیں تو تقریر کچھ اس طرح کی ہوتی ہے : اے تحتوت اور رعمیس کے بیٹو! مصری پونڈ ، ڈاک کے ٹکٹ اور مصری کرنسی پر فرعون کی تصویر چھاپی گئی ہے ۔ مجسموں کی بنیادوں میں مصری میثاق ، انجیل اور قرآن مجید کے دو دو نسخے دفن کئے گئے ہیں ۔ ظاہر ہے قرآن حکیم کی اس بے حرمتی کو ان پڑھ سے ان پڑھ مسلمان بھی گوارا نہیں کر سکتا ۔ کمیونسٹ اخبارات اور لٹریچر ملک میں عام کئے جا رہے ہیں ۔ ازہر کے علماء میں سے کچھ لوگ حکومت کے ہاتھ تنگ گئے ہیں جو اسلام کو سوشلزم ثابت

کر رہے ہیں۔ یہ ہے ان حالات کی سرسری سی جھلک جو مصر کی موجودہ حکومت اور اخوان کی باہمی کشمکش کا باعث بنے۔ حکومت ایک جماعت کو کیونکر برداشت کر سکتی تھی۔ جو اس کے اختیار کردہ راستے میں مضبوطی اور استقلال کے ساتھ ڈٹ جائے اور اس کی پالیسیوں پر کھلے لفظوں میں تنقید کرے۔ چنانچہ صدر ناصر نے برسر اقتدار آنے کے بعد سب سے زیادہ خطرہ اسی جماعت سے محسوس کیا، ۱۹۵۴ء میں اخوان المسلمون پر پابندی لگا دی گئی۔ حکومت کے خلاف بغاوت کے جرم میں اس کے تمام سرکردہ لیڈر گرفتار کر لئے گئے۔ اخوان کے ہیڈ کوارٹر کو آگ لگا دی گئی۔ کہا یہ گیا کہ عوام نے حملہ بول دیا تھا۔ یہ آگ دن بھر بھڑکتی رہی لیکن فائر بریگیڈ کو یہ خیال نہ آیا کہ اسے بجھایا بھی جا سکتا ہے۔ چاروں طرف لوگ کھڑے تھے۔ مسلح پولیس کے دستوں نے انہیں بھی آگ بجھانے سے روک دیا۔ دوسرے لیڈروں کے ساتھ ساتھ اخوان کے صدر جناب حسن الہضیبی کو جو ایک ممتاز قانون داں ہیں اور جج کے عہدے پر بھی فائز رہے ہیں۔ شدید سزائیں دی گئیں۔ اس وقت اخوان پر جو الزام عائد کئے گئے ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

"اخوان المسلمون نے انقلابیوں سے تعاون نہیں کیا۔"

حقیقت یہ ہے کہ اخوان ہی کی دعوت اور تبلیغ سے فوج میں فاروق کے خلاف جذبہ بیدار ہوا۔ اخوان نے عملی طور پر بھی انقلابیوں کی مدد کی۔ چنانچہ صدر ناصر کی اپنی ڈائری اور اس کے دست راست انور السادات کی یادداشتیں اس کی گواہ ہیں۔ جنرل نجیب انہی خدمات کی وجہ سے اخوان کا احترام کرتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ حسن الہضیبی نے اپنی تنظیم کو انقلابی پارٹی میں مدغم ہونے نہیں دیا۔ انہوں نے کہا:

"ہم حکومت کے بے لوث خادم ہیں۔ ارباب اقتدار اچھا کام کریں گے تو انہیں ہماری تائید حاصل ہوگی اور اگر ان سے غلطیاں سرزد ہوں گی، تو ہم ٹوکیں گے۔"

ایک جمہوری حکومت میں یہ پالیسی قطعاً قابل اعتراض نہیں ہے۔

فرد جرم میں دوسرا الزام یہ تھا:

"اخوان اسلامی قانون کے نفاذ اور تطبیق کا مطالبہ کر رہے ہیں۔"

واقعی بہت بڑا جرم ہے ـــــ اس جرم کی سزا اسلام دشمن عناصر کی نظر میں موت سے بھلا کیا کم ہوگی۔

تیسرا الزام یہ تھا:

"اخوان انگریزوں سے ساز باز کر رہے ہیں۔"

اس دور کے انگریزی اخبار گواہ ہیں کہ اس جرم پر خود انگریز حیران تھے۔ اخوان وہ جماعت ہے جو انگریزوں کی نظر میں سب سے زیادہ مطعون ہے۔ اس کے صدر کے سر کی قیمت انگریزوں ہی نے مقرر کی تھی۔

ان لوگوں پر ایک بڑا جرم یہ تھا کہ ان کے پاس اسلحہ اور بارود جمع ہے حالانکہ ملک کے تمام باخبر لوگ جانتے ہیں کہ یہ اسلحہ حکومت نے خود اخوان میں تقسیم کیا تھا کیونکہ سویز پر سے برطانوی تسلط ختم کرنے کے لئے ایک منصوبہ بنایا گیا تھا کہ گوریلا جنگ شروع کر دی جائے۔ اس ضمن میں یہ تذکرہ بھی بے جا نہ ہوگا کہ ۱۹۵۲ء میں انقلاب آیا لیکن اپنے ہی دیئے ہوئے اسلحہ پر حکومت کی نظر ۱۹۵۴ء میں پڑی۔

چوتھا الزام یہ تھا:

"اس جماعت نے حکومت کا تختہ الٹنے اور نظم و نسق کی مشینری پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی۔"

لیکن اس جرم کا آخر ثبوت کیا ہے۔ کوئی بھی حکومت کسی مخالف جماعت پر یہ الزام عائد کر سکتی ہے۔

ان گرفتاریوں کا اصل سبب کچھ اور تھا، مصری حکومت

معاہدۂ سویز کے تحت انگریزوں کو یہ حق دے چکی تھی کہ وہ ہنگامی حالات میں جنگی ضرورتوں کے پیش نظر اپنی فوجیں سویز میں لا سکتے ہیں۔ اخوان کے علاوہ ملک کے دوسرے کئی طبقے بھی مصری حکومت سے خوش نہ تھے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ معاہدۂ سویز پر دستخط کر کے مصر نے اپنے آپ کو پھر سے انگریز کی جھولی میں ڈال دیا ہے۔ اخوان نے ایک قرارداد منظور کر کے صدر ناصر کی خدمت میں پیش کی مگر صدر ناصر نے اسے بغیر پڑھے ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ ادھر قاہرہ یونیورسٹی کے چالیس اساتذہ نے معاہدۂ سویز پر تنقید کی۔ انھیں ملازمتوں سے برطرف کر دیا گیا۔ یہ لوگ اخوان سے تعلق نہ رکھتے تھے اور محض محبّ الوطنی کی بنا پر معاہدۂ سویز کی مذمت کر رہے تھے۔ اخوان نے صدر سے ملنے کی کوشش کی مگر صدر نے انکار کر دیا۔ اخوان کا ایک ہنگامی اجلاس ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ عوام کو صحیح صورت حال سے باخبر کیا جائے۔ چنانچہ اخبارات میں قراردادیں بھجوائی گئیں لیکن وہ سنسرشپ کی زد میں آگئیں۔ ہر طرف سے مجبور ہو کر اخوان نے پمفلٹ چھپوائے اور ایک مقررہ وقت پر ملک کے گوشے گوشے میں تقسیم کروا دیے۔ عوام کو جب اصل حقیقت کا علم ہوا تو اضطراب کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مصری حکومت نے بھانپ لیا تھا کہ معاہدۂ سویز پر لوگوں کی اکثریت مطمئن نہیں ہے۔ چنانچہ "برائی کی جڑ" کاٹنے اور عوام کو ہراساں کرنے کے لئے اخوان المسلمون کو دھر لیا گیا۔

اوپر ہم وہ الزامات بیان کر چکے ہیں جو اخوان پر عائد کئے گئے۔ اب رہی بات ان جرائم کے اقرار کی، تو ہم آپ کو ۱۹۵۴ء میں واپس لئے چلتے ہیں تاکہ آپ نظربندوں کی حالت کا اندازہ کر سکیں۔

یہ ایک بہت بڑا فوجی قلعہ ہے۔ کتاب و سنّت کی حکمرانی کے خواہش مندوں کو اس قلعے میں رکھا گیا ہے۔ جب

نظربند کئی کئی دن سے بھوکے اور پیاسے ہیں۔ جب کوئی پیاس کی شکایت کرتا ہے تو اسے اپنا پیشاب پینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ہر صبح تیل میں بھیگے ہوئے لچکدار کوڑوں، فولادی کیلوں والے بھاری بھرکم بوٹوں اور رائفلوں کی سنگینوں سے انھیں جی بھر کے اذیت دی جاتی ہے۔ تفتیش کرنے والا ہاتھ میں چابک لئے کھڑا رہتا ہے اور اگر کوئی نظربند جواب نہ دے تو مار مار کر کھال ادھیڑ ڈالتا ہے ـــــ تعذیب کے دوران میں ایک مشہور اخوانی لیڈر عبدالغنی عابدین کی آنکھیں ضائع ہو چکی ہیں۔ ایک اور ساتھی عبدالعزیز احمد کا سارا جسم بجلی کے جھٹکوں سے زخمی ہو گیا ہے۔ نظربند تعذیب کی کوٹھڑیوں سے نکلتے ہیں تو ان سے چلا نہیں جاتا۔ اس حالت میں بھی ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہوتی ہیں اور پاؤں میں بیڑیاں۔ مار پیٹ کے بعد انہیں جن کوٹھڑیوں میں ڈالا جاتا ہے، وہاں پہلے سے ٹھنڈا پانی چھوڑ دیتے ہیں۔ رات کے وقت بھی انہیں آرام نہیں ملتا۔ بلکہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد زور سے دروازہ کھٹکھٹا کر بیدار رکھا جاتا ہے۔ چشم فلک نے یہیں علی الفیومی کو کوڑے کھاتے دیکھا ہے۔ ہر ضرب پر ان کی زبان سے قرآن مجید کی آیات نکلتی تھیں۔ عذاب دینے کا ایک اور طریقہ بھی ہے۔ سر کے گرد لوہے کی مضبوط زنجیر باندھ دیتے ہیں اور زنجیر کے دونوں سروں کو پکڑ کر دو طاقتور آدمی اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ یہاں تک کہ نظربند کی کھوپڑی ٹوٹنے لگتی ہے اور حواس مختل ہو جاتے ہیں۔ ذہنی اذیت پہنچانے کے لئے اخوانیوں کے سامنے ان کے مرشد عام حسن الہضیبی کو زدوکوب کیا جاتا ہے ـــ حکم ہوتا ہے کہ سب لوگ مرشد کو فحش گالیاں دیں۔ پہرے دار خود بتلاتے ہیں کہ یہ گالی دو۔ جو شخص گالی دینے سے انکار کرتا ہے سپاہی اس پر پل پڑتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ اخوان ایک تنظیم ہے۔

جس کا ہر رکن دوسرے رکن کو اپنا بھائی کہتا ہے، انہیں روزانہ دوبدو مقابلے میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ حکم ملتا ہے کہ ہر شخص اپنے مدمقابل کو پیٹے۔ جو انکار کرتا ہے اس پر بے تحاشا کوڑے برسائے جاتے ہیں۔

کوٹھڑیوں میں انہیں رکھا گیا ہے وہاں پہننے کو کپڑا ہے نہ لیٹنے کے لئے بستر، ان کے پاس کوئی برتن بھی نہیں ہے، حالانکہ بڑے سے بڑے مجرموں کو بھی لوہے کی چھوٹی چھوٹی پلیٹیں ملتی ہیں۔ ہر شخص کو چوبیس گھنٹے میں کھانے کو صرف چار عدد آلو ملتے ہیں۔ تین چار روز بعد روٹی کا ایک آدھ ٹکڑا دے دیا جاتا ہے۔

اخوان کے اکابر سے انقلابیوں کا سلوک زیادہ متشددانہ ہے۔ ڈاکٹر توفیق الشاوی پر کوڑے برسانے کے لئے سپاہی ڈیوٹی بدل بدل کر آتے ہیں۔ اگر ایک تھک جاتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ آجاتا ہے۔ تعذیب کے شکار لوگوں میں بیشتر شخصیتیں ایسی ہیں جن کا نام ملک سے باہر بھی عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ سید ابو سالم، کمال السنانیدی، فرید عبدالخالق، نفیس حمدی، محمود طاہر، عبدالحلیم الوشاحی، حسین کمال الدین اور محمود الشربجی بڑے بڑے سرکردہ لیڈر ہیں۔ اخوان نماز کے پابند ہیں لیکن جیل کے داروغہ حمزہ بسیونی نے پہلے دن واشگاف الفاظ میں کہہ دیا ہے:

”ہم یہودی ہیں، یہاں کسی کو نماز ادا کرنے اور قرآن پڑھنے کی اجازت نہیں ہے جو حکم عدولی کرے گا، ہم اس کی کھال ادھیڑ دیں گے۔“

لیکن جو جماعت اسلام کی سربلندی کے لئے سر کٹوا سکتی ہے وہ کھال اُدھڑنے کے خوف سے نماز ترک نہیں کر سکتی۔ اخوان چھپ چھپ کر بغیر جماعت کے نمازیں پڑھتے ہیں۔

حق کے ان متوالوں کے لئے عام عدالتوں کے بجائے خاص فوجی عدالت قائم کی گئی۔ سوڈان کے اسّی وکیلوں نے حسن الہضیبی اور دوسرے اخوان لیڈروں کے مقدمات کی پیروی کے لئے عدالت میں پیش ہونے کی اجازت چاہی لیکن انہیں اجازت نہ ملی۔ یہ عجیب مقدمہ تھا کہ ملزموں کو اپنی صفائی پیش کرنے کا بھی حق نہ تھا۔ شیخ حسن الہضیبی کو موت کی سزا دی گئی حسن پر وہ صرف مسکرا دیئے۔ ان کے سات رفقاء کو سزائے موت، سات کو عمر قید اور دو کو تین تین سال قید کا حکم ملا۔ دُنیا کے گوشے گوشے میں اس نام نہاد عدالت کے فیصلے پر غم و غصے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ تمام اسلامی ممالک کے عوام نے ... ناصر کے نام تار ارسال کئے جن میں فوجی عدالت کے فیصلے پر نظر ثانی کی درخواست کی گئی تھی۔ لیکن مصری حکومت نے ذرا بھی پروا نہ کی۔ انقلابی کونسل نے فوجی عدالت کے فیصلے پر نظر ثانی کی اور شیخ حسن الہضیبی کے علاوہ چند دوسرے لیڈروں کی سزائے موت عمر قید میں تبدیل کر دی گئی۔ پانچ بڑے بڑے ارکان کو پھانسی کی سزا ملی۔ محمود عبداللطیف ان میں سے ایک تھے جن پر صدر ناصر کے قتل کی سازش کا الزام تھا۔

یہ دسمبر ۱۹۵۴ء کی صبح ہے۔ پھانسی گھر میں باری باری اخوانیوں کو لایا جا رہا ہے۔ سب سے پہلے محمود عبداللطیف آتے ہیں۔ یہ اخوان کے اتنا عام رکن نہیں ہیں۔ تختۂ دار پر جانے سے قبل وہ کہتے ہیں:

”اے اللہ مجھ سے کوئی بھول ہوگئی ہے۔ تو مجھے معاف فرما۔ بیشک ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔“

محمود کے بعد یوسف طلعت شہید کی باری آتی ہے سپاہی ان سے آخری خواہش پوچھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ”میں نماز پڑھنا چاہتا ہوں۔“

صرف دو منٹ کی اجازت ملتی ہے۔ یوسف طلعت شہید کے آخری الفاظ یہ ہیں:

”اے خدا ان تمام لوگوں کو معاف کر جنہوں نے مجھے تکلیف

پہنچائی اور سزائیں دیں۔"

ہنداوی دویر، اللہ اکبر کہہ کر رخصت ہو جاتے ہیں۔

اب شیخ محمد الفرغلی کی باری آتی ہے۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی ہے "میں خوش ہوں کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے مر رہا ہوں۔ ایک دن آئے گا جب ظالم اور مظلوم دونوں خدا کے روبرو پیش ہوں گے۔"

ابراہیم الطیب اطمینان کی سانس لے کر فرماتے ہیں:

"اللہ کا شکر ہے کہ میرا شمار بھی شہیدوں میں ہوگا۔"

سب سے آخر میں اخوان المسلمون کے جنرل سکریٹری عبدالقادر عودہ آتے ہیں۔ کرائے کے پہرے داروں کے سامنے وہ ایک لمحے کے لئے رک کر کہتے ہیں: "خدا کا شکر ہے کہ میں ایک مسلمان کی حیثیت سے جان دے رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔"

حسن الہضیبی کے ساتھ جن لوگوں کو عمر قید کی سزا دی گئی اُن میں سید قطب بھی شامل ہیں۔ اخوان کے دفاتر سربمہر ہو چکے ہیں۔ فنڈ بحق سرکار ضبط کئے جا چکے ہیں۔ لٹریچر جلا دیا گیا ہے، پریس اور اخبارات اپنے قبضے میں لے لئے گئے ہیں۔ دُنیا کے گوشے گوشے میں اخوان کے شہدا کے لئے غائبانہ نماز جنازہ ادا کی جا رہی ہے۔ ملّت اسلامیہ کی تاریخ کا ایک باب ختم ہوا۔

ان واقعات کو اب مدت گذر چکی ہے۔ ۱۹۵۴ء میں جو اخوان قید کئے گئے تھے۔ ان میں حسن الہضیبی کو خرابی صحت کی بنا پر جیل سے گھر منتقل کر دیا گیا ہے۔ وہ نظر بندی کی حالت میں زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ نامور عالم دین سید قطب کو پندرہ سال قید کی سزا ملی تھی۔ لیکن دس سال بعد عراق کے صدر عبدالسلام عارف کی ذاتی سفارش پر ۱۹۶۴ء میں انہیں رہا کر دیا گیا۔ یہ لوگ اپنے گھروں میں کڑے پہرے کے اندر رہتے ہیں۔ اگست ۱۹۶۵ء متحدہ عرب جمہوریہ کے قابل احترام صدر ماسکو تشریف لے جاتے ہیں اور ایک عظیم اجتماع سے خطاب فرماتے ہیں:

"اخوان نے میرے قتل کی سازش کی تھی،
ماضی میں مَیں نے انہیں معاف کر دیا تھا،
لیکن اب معاف نہیں کروں گا۔"

واپس پہنچ کر موصوف سب سے پہلے اخوان کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ صدر محترم کے قتل کی "سازش" کا انکشاف ہوتا ہے اور ایک بار پھر ملک بھر میں پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ گرفتار کئے جانے والے لوگوں میں نمایاں شخصیتیں حسن الہضیبی، ان کے دونوں صاحبزادے، اسمٰعیل اور مامون، سید قطب اور سید قطب کے بھائی محمد قطب، بہنیں حمیدہ قطب اور امینہ قطب اور زینب الغزالی، یوسف ہواری، عبدالفتاح یمن، احمد عبدالسمیع ہیں۔ ان کے علاوہ حسن الہضیبی کی اہلیہ اُن کی صاحبزادی خالدہ الہضیبی اور ان کی بہو بھی گرفتار کر لی جاتی ہیں۔ مجموعی طور پر خواتین تعداد میں آٹھ سو کے قریب ہے۔

ڈیلی ٹیلیگراف کے بیان کے مطابق اکتوبر ۶۵ء تک بیس ہزار اخوان گرفتار کئے جا چکے ہیں لیکن باقاعدہ مقدمہ صرف پچاس ساٹھ افراد پر چلایا جاتا ہے۔ اس مقدمے میں انصاف کا دامن کس حد تک داغدار کیا گیا۔ اس کا اندازہ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے بیان سے ہو سکتا ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل لندن میں قانون دانوں کی ایک تنظیم ہے جس کا مقصد سیاسی انتقام کا نشانہ بننے والوں کی امداد ہے۔ تنظیم کا ایک نمائندہ آیا جو اخوان کے وکالت کے لئے قاہرہ گیا۔ واپس آکر اس نے جو رپورٹ پیش کی اس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ ایک خصوصی قانون کے تحت مصر کے صدر کو یہ اختیارات حاصل ہیں کہ وہ سیاسی وجوہ کی بنا پر جس شخص کو

چاہے مقدمہ چلائے بغیر گرفتار کر سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کو ایک خاص عدالت کے سامنے پیش کیا جاتا ہے جس کے جج خود صدر نامزد کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ملزم کی قسمت کا فیصلہ صدر خود کرتا ہے۔

۲۔ فوجی جیلوں میں ملزموں پر بے تحاشا مظالم توڑے گئے۔ لیکن عدالت میں ان کا ذکر کرنے سے منع کر دیا گیا۔ اس مقدمے کے مشہور نظر بند سید قطب نے اپنی صفائی میں کچھ لکھنا چاہا تو عدالت نے یہ کہہ کر روک دیا:

"تمام ملزمین جھوٹے ہیں۔ ان کی کسی بات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا:"

۳۔ سید قطب اور دوسرے اخوانی نظر بندوں کو اپنی صفائی کے لئے وکیل مقرر کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ گذشتہ فروری کو سوڈان کے دو وکلا مقدمے کی پیروی کے لئے قاہرہ گئے۔ لیکن انہیں وجہ بیان کئے بغیر مصر سے نکال دیا گیا۔ حالانکہ مصری قانون کے مطابق سوڈان کے وکلا مصر کی عدالتوں میں پیش ہو سکتے ہیں۔

۴۔ اس خاص عدالت کے سامنے ملزموں پر تشدد کا سوال پیش ہوا تو کارروائی بند کمرے میں ہونے لگی۔ اخباری نامہ نگاروں کو بھی اندر آنے کی اجازت نہ مل سکی یہاں تک کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے نمائندے مسٹر اجر بھی اندر نہ جا سکے۔

۵۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل بڑے افسوس کے ساتھ یہ اعلان کرتی ہے کہ عدالتی کارروائی سے ان مظالم کی تصدیق ہوتی ہے جس کا اظہار نظر بندوں کی طرف سے کیا گیا۔ نیز مصر کے عدالتی نظام کی غیر جانب داری بھی مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ یہ کارروائی اس اعتبار سے غیر تسلی بخش ہے کہ سماعت کے وقت ملزم جسمانی اور دماغی اعتبار سے صحت مند نہیں تھے۔ بعض مقدمات میں تو ایک ملزم کو صرف دو منٹ کا وقت دیا گیا۔

یہ ایمنسٹی انٹرنیشنل کا بیان ہے جسے بہرحال اخوان سے کوئی ذاتی دلچسپی نہیں اور مصری حکومت سے کوئی کد ہے۔ ہمارے اپنے علم کے مطابق فرانس کی بار ایسوسی ایشن کے صدر ولیم تھارپ، بیگ کے مشہور وکیل مسٹر جے۔ ایم ویڈل، مراقش کے دو سابق وزرائے قانون اور متعدد نامور وکلا نے اخوان کے مقدمے میں پیروی کی اجازت چاہی لیکن انکار کر دیا گیا۔ چنانچہ حال ہی میں جو سزائیں اخوانی لیڈروں کو دی گئی ہیں ان میں ملزموں کی طرف سے کوئی وکیل موجود نہ تھا۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ میں جن مظالم کا ذکر ہوا ہے ان کی چند جھلکیاں دیکھئے۔

اخوان کے بعض نظر بند جیل کی چار دیواری میں عمارت کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ ان کے پاؤں زخمی ہیں اور جسم تھکن سے چور۔ پہرے داروں کے ہاتھوں میں کوڑے ہیں جونہی کوئی نظر بند رکتا ہے۔ پہرے دار کوڑے مار مار کر اس کی کمر لہولہان کر دیتے ہیں۔ پہرے داروں کی ایک اور ٹولی نظر بندوں کے چہروں پر گرم چونا پھینک رہی ہے۔

لیمان جیل میں ایک اخوانی کے چند رشتے دار ملنے آئے۔ پہرے داروں نے ایک خاتون سے بدکلامی کی۔ اخوانی کو غصہ آگیا۔ اس نے پابہ زنجیر ہونے کے باوجود پہرے دار کو ڈانٹا۔ ساتھیوں نے بھی اس کی تائید کی۔ تھوڑی دیر بعد بہت سے اخوانیوں کو صحن میں لایا گیا اور ان نہتے لوگوں پر گولیوں کی بارش ہونے لگی ۱۲ نوجوان اسی وقت شہید ہو گئے۔ مرتے مرتے ان کی زبان سے کلمۂ طیبہ جاری تھا وہ شدید زخمی ہوئے جن میں سے گیارہ بعد میں چل بسے۔ دن بھر لاشیں پڑی رہیں اور باقی لوگوں کو حکم دیا گیا کہ وہ انہیں روندتے ہوئے گذریں۔

ایک نوجوان طالب علم محی الدین کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے بھائی سے ایک ایسی حرکت کا مرتکب ہو جس کے تصور

ہی سے گھن آتی ہے زبان اسے بیان نہیں کر سکتی اور قلم لکھتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔ یہ حکم سُن کر طالب علم فرطِ غم سے بے ہوش ہو گیا۔ لیکن کوڑے مار مار کر اسے فوراً ہی ہوش میں لایا گیا۔ اب آگے کیا لکھا جائے۔

یہ سب واقعات ایک لبنانی عیسائی روکس معکرون نے اپنی کتاب "انست ان اروی" میں نے قسم کھائی ہے کہ سب کچھ بیان کروں گا، میں بیان کئے ہیں۔ یہ ادیب مصر کی جیلوں میں چار سال تک رہا۔ اپنے وطن لوٹ کر اس نے یہ پمفلٹ لکھا ہے۔ معکرس کا اندازہ ہے کہ اس وقت مصر کی جیلوں میں چالیس ہزار کے لگ بھگ اخوانی زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار ہیں۔

یہ ساٹھ سالہ سید قطب ہیں جو عالم اسلام کے نامور اہل قلم اور اکیس کتابوں کے مصنف ہیں۔ فوجی عدالت میں ان کے مقدمے کی سماعت دو منٹ تک ہوئی اور جیل میں ان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا۔ اس کی صرف ایک ہی مثال کافی ہے۔ اسلام کے اس عظیم فرزند کے لئے ظالموں نے ایک بھیڑیا نما کتا پال رکھا تھا۔ جب وہ بھوک پیاس، تھکان اور سزا کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو جاتے تو کتا ان پر چھوڑ دیا جاتا۔ کتا انہیں ٹانگ سے پکڑ کر اور صحن میں گھسیٹا پھرتا۔ جیل میں ان کے بھائی محمد قطب کو اس قدر اذیتیں دی گئیں کہ وہ شہید ہو گئے۔ حال ہی میں سید قطب، عبدالفتاح اسمٰعیل اور یوسف ہواش کو عالمی رائے عامہ کی پروا نہ کرتے ہوئے پھانسی کی سزا دے دی گئی ہے۔ چار اخوان یعنی کو عمر قید کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ باقی بہت سے لوگوں کو ایک سال سے دس سال تک قید با مشقت کی سزا ملی ہے۔ ان میں شعبہ خواتین کی سربراہ زینب غزالی اور سید قطب شہید کی بہن حمیدہ قطب بھی شامل ہیں۔ سید قطب نسلاً ہندوستانی تھے۔ پانچ پشت پہلے ان کے اجداد مصر میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ اخوان کے ہزاروں رکن ابھی تک مقدمہ چلائے بغیر جیلوں میں بند ہیں۔ ان کے لواحقین کس مپرسی کے عالم میں ہیں۔ ان کی مدد کرنا قانوناً ممنوع ہے۔ لندن کے ایک یہودی اخبار جیوش آبزرور نے بڑی مسرت سے یہ سب خبریں دی ہیں۔ نیز جرم میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو اسلحہ اخوان سے برآمد ہوا ہے وہ سنٹو کا تھا۔ دوسرے لفظوں میں "بغاوت" پاکستان، ایران، اور ترکی نے کرائی تھی۔

سید قطب اور ان کے رفقاء خوش نصیب ہیں کہ اتنی آزمائشوں کے باوجود ان کے قدم نہیں ڈگمگائے اور وہ سرخرو ہو کر خدا کے حضور گئے ہیں۔

یہ وہی راستہ ہے جس پر چل کر سقراط نے زہر کا پیالہ پیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھایا گیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن میں کپڑا ڈال کر انہیں زمین پر گرا دیا گیا۔ بلالؓ تپتی ہوئی ریت پر لٹائے گئے۔ حسینؓ نے کربلا میں جان دے دی، امام حنبلؒ نے کوڑے کھائے ابوحنیفہ نے جان پیش کی۔ یہ لوگ دوسروں کے لئے نشانِ راہ بن گئے۔ سید قطب اور ان کے ساتھی بھی زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ○○

بےضرورت اور بے کار باتوں سے زبان کو بند رکھنے میں سلامتی ہے۔ اس لئے کہ جو شخص ہر وقت بک بک کرتا رہتا ہے، وہ یا تو کسی کی غیبت یا شکایت یا اہانت کرنے میں مبتلا ہو گا اور اس صورت میں دینی و دنیاوی نقصان کے سوا کچھ فائدہ حاصل نہ ہو گا اس لئے ہر انسان کو چاہئے کہ اپنی زبان غیر ضروری باتوں سے بند رکھے۔

کتاب: TERRIBLE ENEMY

مصنف: جان۔ ایف برگر

تلخیص: ستیش کمار دوبے



وادی کی خوفناک بلا

جان۔ ایف۔ برگر اپنے وقت کا ایک بہترین شکاری تھا، ساری عمر وہ افریقہ اور جنوبی امریکہ کے جنگلوں میں جنگلی جانوروں کا شکار کرتا رہا اور اپنے ذوق کی تسکین کرتا رہا۔ وہ ایک دولتمند باپ کا بیٹا بھی تھا اور خود بھی بہت زیادہ دولتمند تھا اس لئے اس کے ذوق کی تکمیل کی راہ میں دولت کی کمی حائل نہیں ہوئی، کیوں کہ حقیقت یہ ہے کہ شکار کا شوق صرف دولتمند ہی اپنا سکتے ہیں ــــــ۔

برگر نے بہت سے موذی درندوں کا شکار کیا لیکن ایک مرتبہ رفٹ کی وادی میں ایک خوف ناک بلا کے گرداب میں پھنس گیا ــــــ۔

برگر اپنی فطری صلاحیتوں کا سہارا لے کر اس جنگلی بھینسے کا شکار کرنے کے لئے روانہ ہوا ــــــ وہ خود لکھتا ہے کہ "مسلسل تین گھنٹے تک ہم درخت پر بیٹھے رہے اور خونخوار بھینسا درخت کے گرد منڈلاتا بھی رہا اور جوشِ غضب میں پھنکاریں مارتا رہا ــــــ جبکہ میرے پاس ایسی بندوق تھی جس میں اتفاق سے کوئی کارتوس نہ تھا" ــــــ۔

شکار کے موضوع پر واقعی برگر کی یہ کتاب لافانی ہو چکی ہے۔ بدقسمتی سے کتاب نایاب ہے اسی لئے اس کی مختصر تلخیص شائع کی جا رہی ہے ــــــ۔

شیر واقعی ایک درندہ ہے، چیتا بھی کچھ کم خوفناک نہیں ہے لیکن ایک سبزی خور جنگلی جانور جسے بھینسا کہا جاتا ہے کبھی کبھی کتنا خطرناک ہو جاتا ہے۔ اس کا اندازہ صرف اس تلخیص سے ہی لگایا جا سکتا ہے ــــــ۔

سلامت علی مہدی

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں ٹڈی مار مہم کے سلسلے میں وادیٔ رفٹ میں تعینات تھا۔ ہمارا کام زوروں پر تھا ہمارے کیمپ سے چھ میل دور مرکزی کیمپ تھا جہاں سے بے شمار قلی روزانہ منوں کے حساب سے ٹڈی مار چارہ لاتے تھے۔ شکار کا موسم گزر چکا تھا۔ اس کے علاوہ میری بڑی نالی کی بندوق بھی خراب کارتوسوں کے باعث بیکار ہو گئی تھی۔ یہ خراب کارتوس اوّل تو چلتے نہ تھے اور جب چلتے، تو کٹ کر جاتے تھے یعنی لبلبی دبانے اور گھوڑے کی سوئی کے نیچے پر گرنے کے بعد وقفہ رہتے تھے جس سے نشانہ خطا ہو جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں خطرناک جانوروں کے شکار پر نہ جاتا تھا، کیونکہ ایسی ناکارہ بندوق کے ساتھ کسی خطرناک جانور کا تعاقب کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

ایک روز جب میں کیمپ میں بیٹھا تھا، چند قلی میرے پاس آئے۔ اُن کے چہروں پر تشویش کے آثار تھے میرے استفسار پر اُن میں سے ایک بولا: "جب ہم ٹڈی مار چارہ لا رہے تھے، تو ایک بھینسا مارنے کے لئے دوڑا۔"

میں اس علاقے کے بھینسوں سے بخوبی واقف تھا۔ یہ جنگلی بھینسے افریقہ کے خطرناک ترین درندوں میں شمار کئے جاتے ہیں سبزی خور ہونے کے باوجود جنگلی بھینسا انتہائی سخت جان، مکار اور خونی ہوتا ہے اور اس وقت تک اپنے دشمن کا پیچھا کرتا ہے جب تک اسے موت کے گھاٹ نہ اتار دے یا خود نہ مر جائے۔

قلیوں نے درخواست کی کہ آپ اس موذی جانور کو جلد از جلد ہلاک کر دیں، ورنہ ہم کام پر نہیں جا سکیں گے۔ میں سمجھ گیا وہ بھینسے کا

گوشت حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں اور کام سے جی چرا رہے ہیں، اس لئے زمی سا وعدہ کر کے انہیں واپس بھیج دیا، لیکن دوسرے روز بہت سے قلی دوڑتے ہوئے میرے پاس آئے اور بھینسے کی شکایت کی۔ جنگل سے فرار ہوتے وقت انھوں نے چارہ بھی پھینک دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد باقی قلی بھی آگئے۔ وہ بھی بھینسے سے خوفزدہ تھے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ صورت حال واقعی تشویش ناک ہے اور اگر بھینسے نے ایک آدھ قلی کو مار دیا، تو ہمارا کام درہم برہم ہو جائے گا؛ چنانچہ میں نے اس خونی بھینسے کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ کام اس قدر مشکل ہے کہ میرا سارا تجربہ دھرا کا دھرا رہ جائے گا اور بھینسے کے سامنے میں خود کو اتنا مجبور و معذور پاؤں گا۔

قلیوں سے یہ وعدہ کر کے کہ کل صبح بھینسے کے شکار کو چلوں گا، میں اپنے خیمے میں آگیا۔ خیمے سے باہر میرے شکاری ملازموں اور قلیوں میں گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ یہ قلی بیگار میں پکڑے ہوئے مقامی باشندے تھے۔ بحث کے دوران میں بنائی (بھینسا) اور سیتو (جنگل) کا ذکر بار بار آتا۔ یہ بحث دو گھنٹے سے زیادہ جاری رہی، لیکن میں نے اس کی طرف مطلق توجہ نہ دی، کیونکہ میں جانتا تھا یہ لوگ معمولی سی بات پر گھنٹوں بیکار بحث کے عادی ہوتے ہیں، خصوصاً اس صورت میں جب فریقین مختلف قبائل سے ہوں۔ بالآخر میں نے اپنے وفادار ملازم ان ڈجی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ شکار پر نہیں جائے گا، بلکہ اس مسئلے کو میرے سامنے دوبارہ پیش کرے گا۔ دوسرے ہی لمحے ان ڈجی میرے خیمے کے دروازے پر آیا اور بولا:

"بوانا، ہمارے خیال میں بہتر یہ ہو گا کہ آپ اس معاملے پر غور کر کے فیصلہ دیں کہ ہمارے لئے کونسی بات مفید ہو گی۔"

مجھے سرے سے یہ علم نہ تھا کہ متنازعہ فیہ مسئلہ کیا ہے اور فریقین نے کیا دلائل پیش کئے ہیں، اس لئے میں نے ان ڈجی سے کہا:

"پہلے زیر بحث مسئلہ بتاؤ۔"

"بوانا، آپ چاہتے ہیں کل صبح ہم اس بدکردار بھینسے کے شکار پر چلیں، لیکن ہم اس کے لئے تیار نہیں۔ میں اس علاقے میں پہلے کئی بار گھوم پھر چکا ہوں۔ یہاں اونچی اونچی گھاس ہے اور ایسے درختوں کی افراط ہے جن میں سُوئی کی طرح نوکیلے اور انگلی جتنے لمبے کانٹے ہیں۔ اچانک کوئی مصیبت آن پڑے، تو ان خاردار درختوں پر چڑھنا ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں جیسا کہ آپ جانتے ہیں یہ بھینسا بدی پر تُلا ہوا ہے۔ بہتر یہی ہے ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں، وہ یقیناً یہ علاقہ خالی کر دے گا۔"

"ان ڈجی، اوّل تو ہم یہ کوشش کریں گے کہ درختوں پر چڑھنے کی ضرورت نہ پیش آئے اور خدانخواستہ ضرورت پڑ ہی گئی تو میرے خیال میں کانٹے سدِ راہ نہ ہوں گے۔ ذرا سوچو تو، کانٹے نکالنا کچھ زیادہ مشکل کام نہیں، مگر بھینسے کے سینگ انسانی جسم میں پیوست ہو جائیں، تو انھیں نکالنا بہت کٹھن اور جان لیوا کام ہے۔"

یہ سن کر ان ڈجی خاموش ہو گیا۔

دوسرے دن ہم شکار پر روانہ ہوئے اور خاصی مسافت طے کر کے اس جگہ پہنچے جہاں بھینسے کو آخری مرتبہ دیکھا گیا تھا۔ تیز بارش شروع ہوئے چھ ہفتے ہو چکے تھے اور وادی میں ہر جگہ لمبی لمبی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود کھوجیوں نے جلد ہی اندازہ لگا لیا کہ بھینسے کہاں ہوں گے۔ زمین گیلی ہونے کی وجہ سے کھُروں کے نشان نمایاں تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ بھینسے تعداد میں پانچ ہیں۔ یہ نشان جھاڑیوں کے گھنے جھنڈ تک چلے گئے تھے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ہمیں وہ شدزور بھینسا نظر آیا جس نے قلیوں پر حملہ کیا تھا۔ سرخی مائل بادامی رنگ کی وجہ سے ہمیں اُسے پہچاننے میں دقت نہ ہوئی۔ وہ خاردار جھاڑیوں کے پاس اکیلا کھڑا تھا۔ میرے اور اُس کے درمیان قدِ آدم سے اونچی گھاس تھی جس کی وجہ سے صحیح

نشانہ لینا مشکل نظر آتا تھا۔ ہم دبے پاؤں چلنے لگے حتیٰ کہ بھینسا ایک سو بیس گز کے فاصلے پر رہ گیا۔ میرا سانس پھول چکا تھا، لہٰذا نشانہ لینے سے قبل میں نے چند لمحے توقف کرنا مناسب خیال کیا؛ البتہ میری نگاہیں بھینسے پر مرکوز رہیں۔ اچانک بغیر کسی ظاہری سبب کے بھینسا مُڑا اور گھاس میں غائب ہو گیا۔ ہم بڑی احتیاط اور خاموشی سے آگے بڑھے۔ تفتیش کرنے پر یہ معلوم ہوا وہ ایک جگہ کیچڑ میں لیٹا ہوا ہے۔ اگرچہ فاصلہ [illegible] یارڈ تھا، لیکن اس کے جسم کا کوئی نازک حصّہ گولی کی زد میں نہ آتا تھا۔ جھاڑیوں کا وہ جھنڈ جس میں ہم چھپے ہوئے تھے، ایسی جگہ جا کر ختم ہوتا تھا جہاں سے بھینسا چند فٹ کے فاصلے پر تھا۔ میں نے دل میں سوچا اگر کسی طرح بھینسے کے عقب میں پہنچ جاؤں، تو اس کے سر کا نشانہ لینے میں کوئی مشکل نہ ہو گی۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ سر میں لگی ہوئی گولی اکثر و بیشتر مہلک ثابت ہوتی ہے۔ اب میرے منصوبے کی کامیابی کا انحصار انتہائی احتیاط پر تھا؛ چنانچہ ہم جھنڈ کے کنارے کنارے بہت خاموشی سے پیٹ کے بل رینگتے ہوئے اس کی طرف بڑھے، لیکن عین وقت جب ہماری تدبیر کارگر ہونے کو تھی، میرے داہنے ہاتھ جھاڑیوں میں کچھ شور ہوا۔ ہم نے یہ نہ سوچا کہ جس جھنڈ کے کنارے ہم رینگتے ہوئے جا رہے ہیں ممکن ہے اُسی جھنڈ میں باقی چار بھینسے چھپے ہوئے ہوں؛ چنانچہ ان سے صرف پانچ گز کے فاصلے پر تھے کہ انھیں ہماری موجودگی کا علم ہو گیا۔ اب وہ سرپٹ بھاگے جا رہے تھے، ان کے ساتھ ہی خونخوار بھینسا بھی اُٹھ بھاگا۔

میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو بُرا بھلا کہا کہ کیوں نہ اسی وقت گولی چلا دی۔ جب بھینسا میرے قریب سے اُٹھ کر بھاگا تھا، لیکن اب محاسبے کا وقت نہ تھا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ ہم اپنے شکار کی تلاش میں تیزی سے آگے بڑھیں۔ پندرہ منٹ میں ہم نے پھر بھینسوں کو پا لیا۔ اس مرتبہ وہ ایک کھلے میدان میں تھے اور اُن سے کوئی دو سو گز اِدھر کچھ جھاڑیاں تھیں جن کی آڑ ہم لے سکتے تھے، مگر ان جھاڑیوں سے آگے بڑھنا ممکن نہ تھا۔ بڑی بندوق کے خراب کارتوسوں کے باعث میں پہلے خاصی پریشانی اُٹھا چکا تھا، لہٰذا اعشاریہ ۳۰۳ کی بندوق استعمال کرنے کی ٹھانی۔ اس کی میرے پاس چند ہی گولیاں تھیں۔ مجھے یقین تھا دو سو گز کے فاصلے سے میں جہاں چاہوں گا، بھینسے پر گولی چلا سکوں گا۔ مجھے بھینسے کا صرف دایاں کندھا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے فائر کیا، گولی نشانے پر لگی، لیکن فاصلے کی وجہ سے یہ گولی اُس کا دل یا پھیپھڑوں تک مار نہ کر سکی۔ نتیجتاً وہ اپنے ساتھیوں سمیت بھاگ کھڑا ہوا۔ تقریباً سو گز تک تو وہ اُن کے ساتھ دوڑتا رہا، پھر یک لخت اس کی رفتار سست پڑ گئی اور وہ دائیں جانب جھاڑیوں کے جھنڈ کی طرف مڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم آگے بڑھے تو ہمیں اُس جھنڈ کے پیچھے جس کی طرف بھینسا دوڑا تھا، ایک اور جھنڈ دکھائی دیا جو پہلے جھنڈ سے بڑا اور گھنا تھا۔ یہ قیاس کرنا کہ بھینسا کون سے جھنڈ میں جا چھپا ہے، ناممکن تھا؛ البتہ یہ طے تھا کہ وہ دونوں میں سے کسی ایک میں ہو گا، کیونکہ بڑے جھنڈ کے پیچھے کھلا میدان تھا جس میں ہمیں وہ نظر نہ آیا۔ اب مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ کون سے جھنڈ میں چھپا ہوا ہے۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ بڑے جھنڈ میں ہے، لیکن میرے ساتھی مُصر تھے کہ بُری طرح زخمی ہونے کے بعد وہ اتنی دُور نہیں جا سکتا۔ قدرے بحث و تمحیص کے بعد یہ طے پایا کہ کچھ فاصلے پر رہ کر ہم بڑے جھنڈ کے گرد چکر کاٹیں اور اگر دشمن کا کوئی سُراغ نہ ملے، تو واپسی پر دونوں جھنڈوں کے بیچ میں جو کھلی جگہ ہے، اُس کے عین وسط میں ہوتے ہوئے لوٹ آئیں اور یہ خیال رکھیں کہ دونوں جھنڈوں سے ہمارا فاصلہ کوئی سو گز کا رہے، یہی بہترین حفاظتی صورت تھی۔

ہم نے بڑے جھنڈ کے گرد چکر کاٹا، لیکن بھینسا ہمیں نظر نہ آیا۔ میرے ساتھی مجھ سے پہلے ہی جھنڈوں کے بیچ والی کھلی جگہ پہنچ چکے تھے اور اب ان کی نگاہیں چھوٹے جھنڈ میں بھینسے کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں دیدہ و دانستہ سب سے پیچھے تھا تاکہ خطرے کی صورت میں اپنے ساتھیوں کی حفاظت کر سکوں۔ بھینسا ہمیں بڑے جھنڈ میں نظر نہ آیا اور نہ ادھر جاتے ہوئے ہمیں اس کے کھُروں کے نشان ملے، لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ بھینسا بڑے جھنڈ ہی میں ہے؛ البتہ یہ بات مجھے پریشان کر رہی تھی کہ اس نے اب تک ہم پر حملہ کیوں نہیں کیا۔ اس کا بھی امکان تھا کہ وہ زخمی ہونے کے باعث حملہ کرنے سے معذور ہو گیا ہو۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ ایک افریقی نے چھوٹے جھنڈ کی جانب اشارہ کیا۔ میں تیزی سے اُدھر بڑھا تاکہ بھینسے کے حملے کا توڑ کر سکوں۔ ہماری تمام تر توجہ اسی مقام پر مرکوز تھی کہ اچانک عقب میں جھاڑیاں ٹوٹنے کی آواز آئی جیسا کہ مجھے شبہ تھا بھینسا بڑے جھنڈ ہی میں تھا، لیکن اس کمال عیاری سے کہ ہم میں سے کوئی بھی اسے نہ دیکھ سکا۔ بالآخر اس نے حملہ کیا جس کا ہمیں دیر سے انتظار تھا۔ میں نے فوراً بندوق کی نالی اونچی کی۔ قبل اس کے کہ نشانہ باندھوں میں گر پڑا اور قلابازیاں کھانے لگا۔ میرے گرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ جب عام بھگدڑ مچی، تو ایک افریقی بھاگتے ہوئے مجھ سے ٹکرا گیا۔ جب میں دوبارہ کھڑا ہوا تو موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ میرے گرتے ہی بھینسا میرے قریب سے ہو کر گزر گیا۔ اب اس کے سامنے آٹھ افریقی سر پر پاؤں رکھے بھاگ رہے تھے۔ مصیبت یہ تھی کہ بھینسا اور افریقی ایک ہی سیدھ میں تھے۔ ایسی صورت میں بھینسے پر گولی چلانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ بھینسا سرعت کے ساتھ افریقیوں سے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ ان کے سر پر پہنچ گیا۔ راستے میں ایک افریقی جو بھینسے کے قریب تھا، لڑکھڑا کر گرا۔ ابھی وہ زمین سے ٹکرایا بھی نہ تھا کہ بھینسے نے اسے سینگوں پر اُٹھا کر ہوا میں اچھال دیا۔ عین اس وقت میں نے گولی چلائی جو تڑاخ سے بھینسے کے لگی۔ بجلی کی سی تیزی سے وہ اپنے شکار کو چھوڑ کر جنگل کی طرف دوڑا اور گھاس میں گم ہو گیا۔ اس افراتفری میں ان زخمی اور اُس کے ساتھی درختوں کی بلند ترین شاخوں پر جا بیٹھے تھے۔ یہ معمّہ کہ جب دشمن اس کے رحم و کرم پر تھا، بھینسا اُسے یوں چھوڑ کر کیوں چلا گیا، پانچ روز بعد حل ہوا۔ میں نے جان بوجھ کر نشانہ نیچا باندھا تھا، تاکہ کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ گولی بھینسے کے کھُر سے ذرا اُوپر ٹکرائی جس سے اس کا ٹخنہ پاش پاش ہو گیا۔ درد کی شدت سے مجبور ہو کر اسے مزید تعاقب سے کنارہ کشی کرنا پڑی۔ وہ افریقی جسے بھینسے نے اُچھال پھینکا تھا، درد کی وجہ سے چلا رہا تھا۔ قریب پہنچ کر جب میں نے اُس کے زخم کا معائنہ کیا، تو یہ جان کر تسلی ہوئی کہ میرے خیال کے برعکس اس کا زخم مہلک نہیں ہے۔ بھینسے کا سینگ لگنے سے اس کی دائیں ران میں پانچ انچ چوڑا شگاف پڑ گیا تھا، مگر ہڈی بچ گئی تھی۔ یہاں سے ہمارا کیمپ تین میل کے فاصلے پر تھا۔ ہم نے لکڑیاں اکٹھی کر کے سٹریچر بنایا اور زخمی کو واپس کیمپ میں لے آئے اور اس کی مرہم پٹی کی۔ ساری رات مجھے یہ خیال پریشان کرتا رہا کہ زخمی بھینسا ایک ایسے علاقے میں ہے جہاں سینکڑوں لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ موجودہ حالت میں وہ یقیناً بغیر کسی اشتعال کے لوگوں پر پے در پے حملہ کرے گا اور لوگ ہر وقت دہشت زدہ رہیں گے۔ انھیں اس خوف سے نجات دلانے کی ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ بھینسے کو جلد از جلد جہنم واصل کیا جائے۔

ایک طرف تو اس حادثے کا افریقیوں پر بڑا اثر پڑا؟ دوسری طرف بعض افریقی خار دار درختوں پر چڑھنے کی وجہ سے زخمی ہو گئے۔ اگلے دن میں شکار پر جانے کے لئے تیار ہوا، تو کوئی بھی افریقی میرے ہمراہ چلنے پر آمادہ نہ تھا؛ البتہ شکاری عملے

کے چند افراد نے طوفان کر کا میرا ساتھ دیا، لیکن ان لوگوں نے بھی زخمی بھینسے کا کھوج لگانے میں مستعدی نہ دکھائی، اُلٹے دل ہی دل میں دعائیں مانگتے رہے کہ خدا کرے بھینسے کی دہشت ناک شکل دکھائی نہ دے۔ جب کھروں کے نشان ایک گھنے جنگل کی طرف رہنمائی کرنے لگے، تو انھوں نے آگے بڑھنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان حالات کے پیشِ نظر مجھے ناکام لوٹنا پڑا۔ دوسرے دن مجھے بخار نے آ لیا اور میں دو روز تک صاحبِ فراش رہا، البتہ دونوں دن میں نے مخبر روانہ کیے جن کی زبانی پتہ چلا کہ بھینسا اسی جنگل کے قرب و جوار میں ہے۔ اس کا مزاج اب بہت زیادہ برہم ہو گیا تھا اور آدمی کی بُو پاتے ہی وہ آمادۂ پیکار ہو جاتا تھا۔ وہ جائے حادثہ سے زیادہ سے زیادہ پانچ سو گز کے فاصلے پر اور آخری اطلاع کے مطابق اپنے ساتھیوں سے زیادہ دُور نہ تھا۔ گمان غالب تھا کہ ہر شام وہ ان میں شامل ہو جاتا ہے۔

جونہی میری طبیعت سنبھلی، میں اس کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا۔ میرے پاس اعشاریہ ۳۳۳ کی صرف ایک ٹھوس گولی باقی رہ گئی تھی جس کے بعد مجھے اپنی بڑی بندوق کے ناقص کارتوسوں کا سہارا لینا پڑا۔ جلد ہی ہمیں کھروں کے نشان مل گئے۔ ان نشانات پر تھوڑی دُور چلنے کے بعد پانچوں بھینسے نظر آئے۔ زخمی بھینسا ہمارے قریب ہی گھاس چر رہا تھا۔ اگرچہ درمیانی فاصلہ زیادہ سے زیادہ تین سو گز ہوگا، لیکن ظاہر ہے یہ فاصلہ بھی اعشاریہ ۳۳۳ کی بندوق کے لیے بہت زیادہ تھا۔ میں دبے پاؤں چھپ چھپ کر آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ فاصلہ صرف دو سو گز رہ گیا۔ اس سے آگے نہ کوئی اوٹ تھی اور نہ خطرے کی صورت میں جان بچانے کے لیے کوئی درخت؛ چنانچہ یہیں سے گولی چلانے کے سوا کوئی صورت نہ تھی۔ شاید اس احساس کے تحت کہ یہ آخری گولی ہے، میں نے مبالغے کی حد تک محتاط ہو کر گولی چلائی۔ نشانہ خطا ہو گیا! پانچوں بھینسے دریا کی طرف بھاگے جہاں بارہ فٹ اونچی گھاس تھی۔ ہمارے قریب ہی بہت سے ٹیلے تھے ادھر جونہی بھینسے بھاگے، ہم بلند ترین ٹیلے کی طرف لپکے تاکہ ان پر نظر رکھی جا سکے۔ جب ہم ایک ٹیلے کے اوپر پہنچے، تو بھینسے گھاس میں روپوش ہو چکے تھے۔ دو افریقی ایک اور ٹیلے پر چڑھ گئے۔ ہم متجسسانہ نظروں سے گھاس کی طرف دیکھ رہے تھے کہ ایک افریقی چلایا: "یہاں سے بڑا صاف نظر آرہا ہے۔" میں فوراً ان کے پاس پہنچا۔ بھینسے اب دلدلی زمین پر تھے، لیکن تعداد میں چار تھے، پانچواں بھینسا کہیں دکھائی نہ دے رہا تھا۔ دونوں افریقیوں نے بڑے اعتماد سے کہا کہ پانچواں بھینسا دریا عبور کر چکا ہے۔ دُور، بہت دُور مجھے ایک سیاہ شے دکھائی دی، جسے میں شناخت نہ کر سکا۔ ان افریقیوں کے قول کے مطابق یہ زخمی بھینسا تھا جو نڈھال ہو کر گر پڑا تھا۔ اس کے قریب چاروں بھینسے کھڑے تھے۔ مجھے ان کی بات ماننے میں قدرے تامل تھا۔ ساتھ ہی یہ شک بھی تھا کہ آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں، شاید ایک ہزار گز کے فاصلے پر پڑا ہوا بھینسا ٹھیک دکھائی نہ دے رہا ہو، لیکن وہ بڑے وثوق سے کہہ رہے تھے کہ ہم نے زخمی بھینسے کو اس درخت تک جاتے خود دیکھا ہے جہاں اب وہ سیاہ شے پڑی ہے۔ اس درخت کے قریب اور بھی کئی درخت تھے۔ میں نے سوچا اگر احتیاط سے کام لوں اور ہوا کے رُخ کا خیال رکھوں، تو اپنے شکار کی نظروں سے بچ کر ان درختوں تک پہنچ سکتا ہوں اور پھر ناقص کارتوسوں کے باوجود زخمی بھینسے کو ابدی نیند سُلا سکتا ہوں۔ میں نے دو کھوجی ساتھ لیے، ایک افریقی کو ٹیلے پر بطور نگہبان مقرر کیا اور اونچی گھاس میں گھس گیا۔ کھروں کے نشان واضح تھے، مجھے آگے بڑھنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر ایک بھینسا زاویہ قائمہ بناتے ہوئے ایک طرف مڑ گیا تھا۔ غور سے دیکھا، تو گھاس پر تازہ خون کے قطرے دکھائی دیے

یہ دریافت نہ صرف حوصلہ شکن، بلکہ دہشت انگیز بھی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دشمن یہیں کہیں گھات میں ہے اور میرے عقب یا پہلو سے کسی لمحے حملہ کرنے والا ہے، وہ صرف اس بات کا منتظر ہے کہ میں مکمل طور پر اس کے نرغے میں آجاؤں، وہ مجھے اُلٹے پاؤں جانے بھی نہ دے گا۔ میں خطرے میں بُری طرح گھر گیا تھا۔ گھنی گھاس میں نگاہ صرف چند فٹ تک کام کرتی تھی، لہٰذا حملے کی صورت میں بندوق چلانے کی مہلت کا امکان بھی نہ تھا۔ بالفرض مُہلت مل بھی جاتی، تو اتنے قریب سے ناقص کارتوس کارآمد نہ ہوسکتے تھے۔ میری ہلکی سی جنبش پر حملہ یقینی تھا، چاروں طرف مکمل سکوت طاری تھا۔ دونوں کھوجی پیچھے رہ گئے تھے، مجھے ان کی کوئی خبر نہ تھی۔ میں نے رینگ کر کسی محفوظ جگہ پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ اچانک وہ افریقی جسے میں بطور نگہبان ٹیلے پر چھوڑ آیا تھا، چلایا۔ میں نے مُڑ کر پیچھے دیکھا، مجھے وہ سینگ اپنی طرف بڑھتے ہوئے نظر آئے۔ بھینسا ایک بلند مقام پر تھا۔ یہ جگہ اس نے اس لئے منتخب کی تھی کہ میری چال کا جائزہ لیتا رہے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے اسے بروقت دیکھ لیا۔ چشم زدن میں سینگ غائب ہو چکے تھے میں جانتا تھا اب بھینسا اس وقت دکھائی دے گا جب ہمارا درمیانی فاصلہ صرف تین چار قدم رہ جائے گا اور وہ مجھے ہوا میں اُچھالنے کے لئے پوری طرح مستعد ہوگا۔ ایسے خطرناک موقع پر ذراسی تاخیر کی بھی گنجائش نہ تھی۔ اچانک خیال آیا جس طرح دوڑتے وقت بھینسا مجھے دکھائی نہیں دے رہا میں بھی اسے نظر نہیں آسکتا، چنانچہ میں اپنی جگہ سے ذرا پرے ہٹ جاؤں، تو وہ یقیناً تیزی میں سیدھا نکل جائے گا۔ اگرچہ وہ زخمی ہونے کی وجہ سے پہلے کی طرح تیز نہیں بھاگ سکتا تھا، تاہم میرے لئے اس سے زیادہ تیز دوڑ کر ٹیلے تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔ وہ تو گھاس میں دوڑنے کا عادی تھا، میرے لئے گھاس میں دوڑنا آسان نہ تھا۔ اب صرف ایک ہی طریقہ تھا، وہ یہ کہ میں فوراً ایک طرف ہٹ جاؤں

اور جس سمت سے بھینسا آرہا ہے، اس طرف چل کھڑا ہوں۔ اس طرح ہمارے درمیان کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فاصلہ پیدا ہوگا بھینسے کے مڑتے مڑتے میں ٹیلے کے قریب پہنچ جاؤں گا۔ خوش قسمتی سے ہوا میرے موافق تھی۔ فیصلہ کرتے ہی میں دائیں طرف بگٹٹ بھاگا۔ پندرہ گز دور جاکر میں بائیں طرف مڑا، اور اُدھر چل پڑا جہاں بھینسے کو آخری بار دیکھا تھا۔ میں نے حتی الامکان خاموشی اور پھرتی سے کام لیا۔ اتنی پھرتی سے کہ اس کارروائی کے بیان کرنے میں نسبتاً بہت زیادہ وقت صرف ہوا ہے۔ اس دوران میں میں نے نہ تو بھینسے کو دیکھا اور نہ اس کے دوڑنے کی آواز سنی۔ مجھے یقین تھا کہ میں بھینسے کو فریب دینے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ بالآخر ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جس سے تقریباً ۱۰ گز کے فاصلے پر میں نے بھینسے کے سینگ گھاس میں غائب ہوتے دیکھے تھے۔ اب خطرہ کم ہوگیا تھا، میں دم لینے اور بھینسے کا اتا پتا معلوم کرنے کے لئے رُکا۔ افریقی نگہبان مسلسل چلا چلا کر کچھ کہہ رہا تھا، لیکن اس کی بات میری سمجھ میں نہ آرہی تھی۔ بھینسا پُراسرار طور پر کہیں غائب ہو چکا تھا۔ چند منٹ تک میں امید و بیم کی حالت میں کھڑا رہا۔ اب افریقی نگہبان چلانے کے ساتھ ساتھ دور بائیں سمت اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے اس طرف نگاہ دوڑائی، تو مجھے سینگ نظر آئے جس مقام پر میں پہلے کھڑا تھا، بھینسا اس سے کوئی دو سو گز دور سر اوپر اُٹھائے گھوم رہا تھا۔ اب تک اُسے میرا کچھ پتہ نہ تھا مجھے اطمینان تھا کہ اس نے مجھے دیکھ بھی لیا، تو میں اس کے پہنچتے پہنچتے ٹیلے پر چڑھ جاؤں گا، اور اگر اس نے ڈھلوان ٹیلے پر چڑھنے کی کوشش کی، تو میں اُسے بڑی عمدگی سے گولی کا نشانہ بنا دوں گا۔ ٹیلہ کوئی دو سو گز دور تھا، میں پوری رفتار سے ٹیلے کی طرف دوڑا اور اپنی ساری قوت صرف کردی، لیکن یوں محسوس ہوتا تھا میں ٹیلے تک کبھی پہنچ نہ سکوں گا۔ ایک ایک قدم من من بھر کا ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے ٹیلے تک پہنچا اور اعصابی کشیدگی کی وجہ سے گر پڑا۔ میرے

ساتھیوں نے مجھے پکڑ کر اوپر چڑھا دیا۔ ہاں، میں اُن دونوں کا جن کے متعلق بتانا بھول گیا جو میرے ساتھ بھینسے کی تلاش میں چلے تھے۔ وہ حفظِ ماتقدم کے طور پر جان بوجھ کر مجھ سے بہت پیچھے رہ گئے تھے اور جوں ہی انھیں خطرے کا احساس ہوا بھاگ کر ٹیلے پر واپس پہنچ گئے تھے۔ ٹیلے کی چوٹی پر چڑھ کر ہم نے بھینسے کو تلاش کرنے کی کوشش کی، کیوں کہ وہ پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ کئی منٹ تک اس کا کچھ پتہ نہ چلا، پھر ایک افریقی نے نشان دہی کی، وہ اب دوسرے بھینسوں میں شامل ہو چکا تھا۔ سرِ دست میں اس کا مزید تعاقب کرنا نہ چاہتا تھا۔ اس روز زندگی میں پہلی بار میرے اوسان خطا ہوئے۔ مزید برآں اعصابی تشنج میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ آدھ گھنٹے تک ہم وہیں بیٹھے ان بھینسوں کو دیکھتے رہے جو اب اطمینان سے گھاس چر رہے تھے۔ وہ سیاہ شے اب تک جوں کی توں پڑی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کھجور کے درخت کا جلا ہوا تنا تھا۔

یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ان افریقیوں نے اسے دیکھ کر کیسے یقین کر لیا کہ یہی زخمی بھینسا ہے، مگر داد دیجیے ان کی قوتِ متخیلہ کی جس کے طفیل میں موت کے چنگل میں جا پھنسا تھا۔ اگر مجھے بھینسے کے ٹھکانے کا ذرا بھی شبہ ہو جاتا تو میں خواب میں بھی اس گھاس میں داخل ہونے کی کوشش نہ کرتا۔ میرے ساتھیوں کی قوتِ اختراع کی بدولت بھینسا مجھے کامیابی سے مات دے گیا تو۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بڑا ہی عیّار نکلا۔ ایک طرف اس نے بڑی کامیاب گھات لگائی اور دوسری طرف اپنے لیے بلند جگہ منتخب کی، جہاں سے وہ ہماری حرکات اور سکنات کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے طریقِ کار میں صرف ایک خرابی تھی، وہ یہ کہ حملے کا آغاز سو گز یا اس سے بھی زیادہ فاصلے سے کرتا تھا۔ محض اس طویل فاصلے کی وجہ سے اسکے دونوں حملے بے اثر ثابت ہوئے۔ اس افریقی نے جو ٹیلے پر مامور تھا، بعد میں مجھے بتایا کہ جب بھینسے نے آپ پر حملہ کیا، تو وہ یکساں رفتار سے ناک کی سیدھ میں تیز دوڑتا چلا گیا تھا۔

خیر، بھینسا ابھی تک صحیح سالم تھا، بلکہ اب تو وہ انتہائی خطرناک ہو گیا تھا۔ اس کے خلاف ہماری مہم صرف اس حد تک کامیاب رہی تھی کہ وہ ٹخنے کے زخم کی وجہ سے دُور نہیں جا سکتا تھا اور ہمیں پوری امید تھی کہ کل جب ہم دوبارہ آئیں گے، تو وہ یہیں کہیں ہو گا۔ دہشت زدہ ساتھیوں اور خراب کارتوسوں کے باوجود میں نے عہد کر لیا کہ کل اس سفاک بھینسے کو ہلاک کر کے دم لوں گا۔ کانٹوں کے زخموں کی وجہ سے اَن زَبی آج میرے ساتھ نہ آ سکا تھا؛ چنانچہ اسی لیے آج کھوجی کارآمد ثابت نہیں ہوئے تھے۔ کیمپ واپس پہنچنے پر میں نے اَن زَبی سے کہا کہ خواہ کچھ ہو کل صبح تمھیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ طویل بحث کے بعد میں نے پانچ دوسرے افریقیوں کو بھی اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا۔ وہ جگہ جہاں ہم بھینسے کو چھوڑ آئے تھے، نسبتاً بہتر تھی کہ وہاں گھاس بھی نہ تھی اور درخت بھی متعدد تھے۔ بس کامیاب کھوج اور نشان دہی کی ضرورت تھی۔ اَن زَبی کے ہوتے ہوئے مجھے اس طرف سے کوئی فکر نہ تھی۔

اگلے روز صبح سویرے کیمپ سے نکل کھڑے ہوئے تھوڑی دیر کے بعد میرے ساتھیوں نے چند سفید کرم خور پرندے دیکھے جن سے بھینسوں کی موجودگی کا پتہ چل گیا۔ پانچوں بھینسے ایک خاردار درخت کے سائے تلے لیٹے ہوئے تھے۔ ہمارے لیے اب سب سے مقدم امر یہ تھا کہ فوراً کسی درخت کے قریب پہنچ جائیں جہاں سے گولی کارگر ہو سکے وہاں پہنچ کر زخمی بھینسے کی شناخت کے لیے ان بھینسوں میں ہلچل پیدا کرنی بھی ضروری تھی۔ پچاس گز کے فاصلے پر اپنی دائیں جانب ہمیں ایک موزوں درخت نظر آیا۔ بھینسے وہاں سے کوئی ڈیڑھ سو گز دور تھے۔ قریب ہی اور بھی بہت سے درخت

تھے جو خطرے کے وقت اچھی پناہ گاہیں ثابت ہو سکتے تھے۔ ان ڈچی کے علاوہ ایک اور افریقی میرے ساتھ کھڑا تھا۔ باقی چار افریقی قدرے دُور تھے۔ جونہی ہم اس درخت کے قریب پہنچے، ان ڈچی زور سے چلایا۔ فوراً چار بھینسے اُچھل کر کھڑے ہو گئے۔ پانچواں بھینسا دھیرے دھیرے اُٹھا۔ چاروں بھینسے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر بگٹٹ بھاگے اور درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئے۔ زخمی بھینسا وہیں کھڑا رہا۔ اس کا انداز انتہائی جارحانہ تھا۔ اس کا سر غصے کے عالم میں دائیں بائیں حرکت کر رہا تھا جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ حملہ کیا ہی چاہتا ہے۔ میں نے گولی چلا دی لیکن نشانہ خطا گیا۔ گولی بھینسے کے منہ کے سامنے کیچڑ میں جا کر لگی جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ بھینسا ہماری طرف دوڑا۔ اس اثنا میں ان ڈچی اور دوسرے افریقی نزدیک ترین درخت پر چڑھ گئے۔ بھینسا ابھی سو گز کے فاصلے پر تھا کہ میں نے نشانہ باندھ کر ایک اور گولی چلائی۔ کارتوس پھر وقفہ دے کر چلا۔ میں نے تیسری گولی پھر چلائی۔ اس مرتبہ بھی یہی ہوا۔ اب میرے لیے درخت پر چڑھنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا۔ ابھی میں درخت پر چڑھ کر بیٹھا ہی تھا کہ غضب ناک بھینسا نیچے آ موجود ہوا۔ وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر تھا۔ یہاں تو خراب کارتوس بھی یقیناً کارآمد ثابت ہوتے۔ میری بندوق میں ابھی دو کارتوس باقی تھے جو اُسے ہلاک کرنے کے لیے کافی تھے۔ بھینسا درخت کے گرد چکر کاٹ رہا تھا۔ غصے کے سبب اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا، وہ کبھی کبھی درخت کو ٹکر بھی مارتا۔ ایک بار جونہی وہ میرے سامنے آیا، میں نے نشانہ باندھ کر لبلبی دبا دی۔ بندوق کی نالی کا سرا اس سے صرف دو فٹ دُور تھا۔ اس بار کوئی دھماکہ نہ ہوا۔ حتیٰ کہ پٹاخہ تک نہ چلا۔ میں نے پھرتی سے خراب کارتوس نکالا، نیا کارتوس ڈالا اور دوبارہ لبلبی دبائی، لیکن آخری کارتوس نے بھی جواب دے دیا۔ ان ڈچی مجھ سے چند فٹ اوپر بیٹھا تھا۔ کارتوسوں کا تھیلا اسی کے پاس ہوتا تھا۔ میں نے اسے کہا تھیلا مجھے دے دو، لیکن تھیلا ان ڈچی کے پاس نہ تھا۔ ہم ایک بار پھر مات کھا گئے۔

شکار میں بسا اوقات شکاری اور کھوجی ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ اس کے پیشِ نظر ان ڈچی نے کارتوسوں کا تھیلا ایک دوسرے افریقی کے حوالے کر دیا تھا۔ اور اسے ہدایت کر دی تھی کہ میرا ساتھ نہ چھوڑے، لیکن اس بھگدڑ میں وہ افریقی الگ ہو گیا اور ہم سے کوئی بیس گز دُور ایک اور درخت پر بڑے آرام سے بیٹھا تھا۔ اس کے باوجود ہم نے ابھی پوری بازی نہیں ہاری تھی۔ ان ڈچی اپنے ساتھ پٹاخے دار رقیانوسی بندوق لے آیا تھا۔ اس مختصر ترین فاصلے سے یہ بندوق اس کے ماہر ہاتھوں میں جدید ترین بندوق سے کم مہلک نہ تھی۔ پیارا ان ڈچی مصیبت کے وقت ہمیشہ کام آیا۔ ایک بار پھر وہ میری مدد کے لیے تیار ہو گیا۔ میرے زخمی کیے ہوئے شکار کو ہلاک کر کے آج اسے میری رسوائی کی تکمیل کرنی تھی۔ کل میں نے بھاگ کر جان بچائی تھی۔ آج مجھے درخت پر پناہ لینی پڑی اور ان ڈچی میری جدید ترین بندوق کی موجودگی میں اپنی رذیل بندوق سے بھینسے کو ہلاک کر کے میری رہی سہی آبرو بھی خاک میں ملا دینے والا تھا۔ بالآخر اس نے نشانہ باندھا اور اگلے ہی لمحے ایک عجیب قسم کا قیامت خیز دھماکا ہوا جس نے ہمارے درخت کی جڑیں تک ہلا دیں۔ کوئی چیز میرے کان کو چھوتی ہوئی زن سے گزر گئی۔ میں درخت سے گرتے گرتے بچا۔ اُدھر ان ڈچی اپنی جگہ سے ڈھلک گیا۔ لیکن خوش قسمتی سے درخت کی ایک ٹہنی اس کے ہاتھ آ گئی ورنہ وہ سر کے بل سیدھا بھینسے کے سینگوں پر جا گرتا۔ اس کا چہرہ بُری طرح جھلس گیا تھا اور داہنے ہاتھ سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ ان ڈچی کی پرانی بندوق یوں کہیے اس کا رہا سہا حصہ درخت کی شاخ میں اٹک گیا تھا۔ بندوق کی نالی پھٹ گئی تھی جس کا چھ انچ

لوہے کا ٹکڑا میرے کان کو چھوتا ہوا نکل گیا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ نالی کیوں کر پھٹی۔ اُن زنجی نے اس میں مقدار سے زیادہ بارود بھر دی تھی۔ بیچارے کو اسلحے کا زیادہ علم نہ تھا۔ اس نے خطرے کے تناسب سے بندوق میں تین گنا زیادہ بارود بھر دی ۔۔۔۔ یہ قدرت کا ایک معجزہ تھا جس نے ہمیں موت سے بچا لیا۔ اس ہنگامے کے باعث بھینسا اور بھی غضب ناک ہو گیا۔ اب اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی کہ ہم اس وقت تک درختوں پر بیٹھے رہیں جب تک بھینسا بھوک یا پیاس سے مجبور ہو کر دور نہ چلا جائے۔ متواتر تین گھنٹے تک وہ درخت کے آس پاس منڈلاتا رہا۔ جونہی ہم میں سے کوئی اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش کرتا، وہ پوری تیزی سے لوٹ آتا۔ ایک بار وہ خاصی دور نکل گیا اور جس افریقی کے پاس اسلحے کا تھیلا تھا، اسے ہمارے درخت تک پہنچنے کی مہلت مل گئی۔

وہ بھاگ کر آیا اور درخت پر چڑھ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے بھینسا بھی دوڑتا ہوا آ پہنچا۔ وہ مجھے اپنی خونخوار آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ ایک بار وہ میرے قریب پہنچ گیا۔ اتنا قریب کہ میں اپنی بندوق کی نالی سے اُسے چھو سکتا تھا۔ وہ غصّے کے عالم میں اپنا سر ہلا رہا تھا۔ میں نے شست باندھی اور دونوں آنکھوں کے بیچ گولی مار دی۔ ایک زبردست دھماکا ہوا۔ بھینسا تیورا کر گرا اور دم توڑ گیا ۔۔۔۔ ہم درخت سے نیچے اُترے۔ میں نے بھینسے کا جائزہ لیا۔ بیلاشبہ درست نکلا۔ اسے ایک ہفتہ پہلے کسی افریقی نے زخمی کر دیا تھا۔ یہ پُرانا زخم جو اس کے پہلو میں تھا، ابھی تک رِس رہا تھا؛ چنانچہ اس میں سے بیسیوں دیسی گولی برآمد ہوئی۔ میں نے اپنی زندگی میں سینکڑوں بھینسوں کا شکار کیا ہے۔ لیکن مجھے اس طرح کا ہیجان خیز اور زبردست معرکہ کبھی پیش نہیں آیا۔

قسمت کا لکھا

کتاب: THE WALL
مصنف: جینیفر آندرے
تلخیص: گریش چند



وہ جنگی قیدی تھے اور تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں موت کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کو بچ نکلنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی لیکن پھر ایک دن ....

جیفر آندرے کی یہ کتاب حیرتناک اور ناقابل یقین سچے واقعات سے بھرپور ہے۔ کتاب پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قاری نے کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی بلکہ کوئی فلم دیکھی تھی ـــــ اس کتاب کی یہی خصوصیت ہے اور اسی لئے اس کی تلخیص شائع کی جا رہی ہے۔

اس کتاب کا ایک اور کارنامہ بھی ہے، اس کا مطالعہ قاری کو بہادر بناتا ہے، اس کی بزدلی کا خاتمہ کرتا ہے اور اس کو ایک نیا انسان بنا دیتا ہے۔ یہ کتاب ایک یہ درس بھی دیتی ہے کہ وطن اور ملت کے لئے مر مٹنے والے کبھی نہیں مرتے ہیں ـــــ وہ لافانی ہو جاتے ہیں۔

سلامت علی مہدی

یہ کہانی ایک جری اور نڈر فرانسیسی نوجوان آندرے دیوی کی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں جرمن فوجوں نے فرانس پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان دنوں آندرے دیوی شہر نانٹیس میں تھا اور جوانوں کے ایک ایسے خفیہ گروہ کا سرگرم لیڈر جس نے جرمن خفیہ پولیس "گسٹاپو" کو پریشان کرنے اور زک پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ آندرے نے اپنے ساتھیوں کو "گوریلا جنگ" کے لئے تیار کیا، انھیں دست بدست لڑائی کے داؤ پیچ سکھائے اور اس حد تک تیار کر دیا کہ وہ جرمنوں کے لئے ایک مستقل عذاب بن گئے۔ لیکن گسٹاپو نے بھی آندرے اور اس کے گروہ کو ختم کرنے کے لئے ایسی چالیں چلیں کہ ایک ایک کر کے تمام فرانسیسی جوان نازیوں کے ہتھے چڑھ کر موت کے گھاٹ اترتے رہے۔ ۱۷ اپریل ۱۹۴۳ء کو آندرے پکڑا گیا، لیکن انتہائی جدوجہد کے بعد اور اس وقت جب کہ اس نے گسٹاپو کے تین آدمیوں کے جسم اپنی رائفل کی گولیوں سے چھلنی کر دیئے۔ پکڑے جانے کے بعد گسٹاپو نے آندرے سے جو وحشیانہ سلوک کیا، اس کی داستان بے حد لرزہ خیز ہے۔

ہلاک کرنے کے سوا کوئی عذاب ایسا نہ تھا جو بدنصیب آندرے پر نازل نہ کیا گیا ہو۔ دراصل گسٹاپو کو یہ شبہ تھا کہ ابھی آندرے کے کچھ اور ساتھی موجود ہیں جن کا پتہ آندرے ہی سے لگ سکتا ہے اس لئے وہ اُسے زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ کئی کئی دن اُسے بھوکا رکھا گیا، پھر مرغن غذائیں کھلا کر رات کو سونے نہیں دیا گیا۔ انتہائی طاقتور اور تیز روشنی کے بلب اس کی کوٹھڑی میں لگائے گئے جو چوبیس گھنٹے تک باری باری جلتے بجھتے رہتے، اس کے ناخنوں میں سوئیاں چبھوئی گئیں اور اسے باندھ کر زہریلی چیونٹیاں آندرے کے برہنہ جسم پر چھوڑی جاتی رہیں، لاتوں، گھونسوں اور ہنٹروں سے اس کی کھال ادھیڑ دی گئی ـــــ لیکن وہ بھی ایسا سخت جان تھا کہ یہ تمام مصائب جھیل گیا اور کچھ بتا کر نہ دیا۔ آخر گسٹاپو کے سربراہ اعلیٰ کے حکم سے آندرے پر "مقدمہ" چلایا گیا اور فوجی عدالت نے اُسے موت کی سزا دی۔ موت کی سزا کا حکم سنانے کے بعد آندرے کو جسمانی اور روحانی سزائیں دینی بند کر دیں اور پھر اُسے لاسترز کے فوجی قیدخانے کی ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا تاکہ اپنی موت کا انتظار کرتا رہے۔ اُسے یہ نہیں

بتایا گیا تھا کہ کب موت کا مزا چکھایا جائے گا۔

لائنز کے قید خانے کی یہ عمارت خاصی پرانی تھی، اور اس کا بڑا حصہ شاہ بلوط کی پرانی، لیکن بے حد مضبوط لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ کمروں میں فرش بھی لکڑی کا اور دروازے بھی لکڑی ہی کے تھے۔ آندرے کی طرح یہاں اور بھی بہت سے قیدی لاکر رکھے گئے جو اپنی اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کی کوٹھڑیاں برابر برابر تھیں وہ آسانی سے ایک دوسرے سے بات چیت بھی کر سکتے تھے، مگر ایسا کرنے کی سختی سے ممانعت تھی۔ اگر کوئی قیدی دوسرے سے بات کرتے ہوئے دیکھ لیا جاتا، تو اُس کی پشت برہنہ کر کے کوڑے برسائے جاتے۔ دن گزرتے رہے اور قیدی مسلسل آتے رہے۔ حتیٰ کہ اکثر کوٹھڑیوں میں ایک ایک کے بجائے دو دو اور تین تین قیدی جمع کیے جانے لگے۔ ایک معینہ وقت پر مسلح محافظوں کے کڑے پہرے میں انھیں پیشاب پاخانے کے لیے لے جایا جاتا؛ ورنہ چوبیس گھنٹے بند رہتے۔ کبھی کبھار ایک بڑی سی جیپ آتی اور چند قیدیوں کو اپنے ساتھ لے جاتی۔ اُن کے بارے میں صرف یہی معلوم ہوتا کہ آج ان بدنصیبوں کو شوٹ کر دیا جائے گا۔ آندرے سوچتا کہ جلد ہی اُس کی باری بھی آ جائے گی، تاہم وہ مایوس نہیں تھا اور ہر دم یہاں سے فرار ہونے کی تدبیر سوچتا رہتا۔ بڑی مصیبت یہ تھی کہ وہ اب بھی اپنی کوٹھڑی میں تنہا تھا۔ کاش! کوئی اور شخص اُس کا ساتھ دینے کے لیے یہاں بھیجا جاتا۔ ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔ اپنی اس فضول سی خواہش پر وہ خود ہی ہنس پڑتا۔ ایک روز عجیب معاملہ پیش آیا۔ معمول کے مطابق وہ سب ایک قطار کی صورت میں بیت الخلا کی طرف لے جائے جا رہے تھے۔ سبھی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی تھیں۔ یہ ہتھکڑیاں کبھی نہ کھولی جاتیں، حتیٰ کہ کھانے پینے کے وقت بھی نہیں۔ گسٹاپو کے آدمی ان خطرناک قیدیوں کو بھاگ نکلنے کا

صرف لوہے کی ایک باریک پن تھی، اور آندرے کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں — لیکن یہی 'پن' اس کا سب سے بڑا ہتھیار بن گئی، اس نے اس پن سے اپنے ہاتھوں میں لگی ہتھکڑی کھول بھی لی اور پھر بند بھی کر دی ——۔

کوئی موقع دینے کو تیار نہ تھے۔ قطار میں چلتے ہوئے آندرے کے آگے جانے والا ایک لمبا فرانسیسی شخص دفعتہً لڑکھڑایا، اور یوں گرا جیسے اُس کا پیر پھسل گیا ہو۔ آندرے اُسے سنبھالنے کے لیے جھکا۔ ایک ثانیے کے اندر اندر گرنے والے نے کوئی باریک اور مضبوط سی شے آندرے کی مٹھی میں ٹھونس دی۔ اُسی لمحے جرمن محافظ نے ایک غلیظ گالی دونوں کو دی اور رائفل کا کندہ مار کر آگے بڑھا دیا۔

آندرے نے بیت الخلا میں جا کر مٹھی کھولی۔ یہ لوہے کی بنی ہوئی ایک پتلی سی مڑی تڑی پن تھی۔ کوٹھڑی میں واپس آنے کے بعد آندرے نے اس پن کے ذریعے ہاتھوں میں پڑی ہوئی ہتھکڑی کا قفل کھولنے کی کوشش شروع کر دی اور چند لمحے بعد ہتھکڑی کھل گئی۔ ایک ثانیے کے لیے فرطِ مسرت سے آندرے کا دل دھڑک اٹھا۔ مگر فوراً ہی اس نے قفل کا کھٹکا دبایا اور ہتھکڑی دوبارہ لگ گئی۔ اس نے کئی بار ہتھکڑی کھولی اور بند کی۔ اب وہ پوری طرح مطمئن تھا کہ جب چاہے اپنے ہاتھوں کو ہتھکڑی سے آزاد کرا سکتا ہے۔

اس غیر متوقع امداد نے آندرے کے مرجھائے ہوئے حوصلے تازہ کر دیے۔ اس کے اندر جینے کی آس ابھرنے لگی اور زندگی کا ولولہ شدت سے بیدار ہو گیا۔ اب اس نے کوٹھڑی کا بھرپور جائزہ لیا۔ دروازہ بے حد مضبوط تھا اور اس کے باہر

دوسری جنگِ عظیم کے دوران نازیوں نے جو مظالم جنگی قیدیوں پر ڈھائے وہ رہتی دُنیا تک یاد رکھے جائیں گے۔ نازیوں نے بعض ایسے قید خانے بنائے تھے کہ ان میں دن کی روشنی بھی نہیں پہنچ پاتی تھی ——— اس داستان کا ہیرو ایک ایسے ہی قید خانے میں بند تھا۔

لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ادھر سے بھاگ نکلنا ممکن نہ تھا۔ پھر اس نے لکڑی کے فرش کا جائزہ لیا اور تختے اکھاڑنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ اس کی کوٹھڑی عمارت کی دوسری منزل پر تھی۔ آندرے کو خیال آیا کہ اگر فرش اکھاڑ ابھی گیا تو نچلی منزل کی کوٹھڑی میں رہنے والے قیدی اُسے کوئی مدد نہیں دے سکیں گے۔ اس کی نگاہ روشندان کی طرف گئی۔ اس نے سوچا فرار ہونے کے لئے اس سے بہتر راستہ کوئی اور نہیں۔ روشندان سے نکل کر وہ عمارت کی چھت پر آسانی سے پہنچ سکتا ہے اور پھر اس کے ساتھ ملی ہوئی دوسری عمارت پر کود جائے گا، مگر سوال یہ تھا کہ آٹھ فٹ اونچے روشندان تک پہنچے کیونکر؟ اسی سوچ بچار میں گم تھا کہ دفعتہً اُس کے ذہن میں ایک انوکھی تدبیر سرسرانے لگی۔ اُس نے پٹ سن کے بنے ہوئے گدے کو جس پر وہ سویا کرتا تھا، اُلٹ دیا اور اس کے نیچے لگا ہوا موٹا کپڑا اُتار کر الگ کر دیا، پھر ساری رات وہ اس کپڑے کو اُدھیڑ اُدھیڑ کر پٹیاں بناتا اور اس کی رسّی بنتا رہا۔ اس طرح اس نے بیس پچیس فٹ لمبی رسّی تیار کر لی، لیکن اب اُسے اپنی کمند مکمل کرنے کے لئے ایک اور چیز کی ضرورت تھی اور وہ تھا لوہے کا کوئی آنکڑا جسے رسّی کے ایک سرے پر باندھ کر روشندان میں اٹکایا جا سکے۔ تھک ہار کر وہ اپنے "بستر" پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے۔ بائیں ہاتھ پر روشندان سے کوئی تین فٹ نیچے بجلی کا بلب لگا ہوا تھا جو ساری رات جلتا تھا۔ آندرے اس روشنی کا ایسا عادی ہو چکا تھا کہ یہ جلتا ہوا بلب اُسے قطعاً ناگوار نہ گزرتا۔ یکایک اس کی نگاہ بلب پر پڑی اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا دل بلیّوں اُچھلنے لگا۔ قدرت بلاشبہ اس کی مدد کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔ بلب کی حفاظت کے لئے جرمن محافظوں نے اس کے گرد لوہے کی پتلی تاروں سے بنا ہوا ایک چوکھٹا لگا رکھا تھا اور اس کی ضرورت یوں پیش آئی تھی کہ اکثر قیدی بلب توڑ دیا کرتے تھے۔ دوسرے ہی لمحے آندرے نے بلب کے اُوپر سے یہ چوکھٹا اُتار لیا۔ اب اس کا مطلوبہ آنکڑا بالکل تیار تھا۔ رسّی کے ایک سرے پر یہ آنکڑا باندھ کر اُس نے یہ سامان اپنے سرہانے چھپا لیا اور اطمینان سے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر ابھی وہ بمشکل پندرہ بیس منٹ ہی سویا تھا کہ اس کی کوٹھڑی کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور جرمن محافظوں نے ایک نئے قیدی کو اس کوٹھڑی میں دھکیل دیا۔

"میرا نام جیمز ہے" ——— نووارد قیدی نے جو سترہ اٹھارہ برس کا ایک خوبصورت اور قوی نوجوان تھا، بھرائی ہوئی آواز میں آندرے سے کہا: "انھوں نے مجھے بھی موت کی سزا دی ہے ——— کیونکہ میں نے گشتاپو کے چار آدمیوں کو موت کی نیند سلا دیا ہے" ——— وہ مسکرایا "کوئی پرواہ نہیں ——— میں خوش ہوں کہ زندگی کے ان آخری لمحوں میں آپ سے ملاقات ہوئی ——— آپ کا نام آندرے دیوینی ہے نا؟"

"ہاں، میں ہی آندرے ہوں ——— مگر ——— اس سے پیشتر کہ وہ کچھ اور کہے، دروازہ پھر کھلا اور اس مرتبہ جرمن محافظوں نے پٹ سن کا نیا بنا ہوا ایک اور گدا کوٹھڑی میں پھینک دیا اور بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔ یقیناً وہ ان

قیدیوں کو اپنی شرمناک گالیوں سے نوازرہے تھے۔ میرا خیال ہے تم سو جاؤ۔ اب صبح ہونے والی ہے ــــــ میں بھی رات بھر کا جاگا ہوا ہوں ــــــ کل بات کریں گے۔"

نوجوان جیمز واقعی تھکا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر جا بجا گہرے زخم تھے اور چہرہ بھی سوجا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گسٹاپو کے آدمیوں نے اس کی خوب ٹھکائی کی ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ خراٹے لے رہا تھا۔ آندرے چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ دل ہی دل میں بے حد پریشان تھا۔ اس نوجوان کے اچانک آجانے سے بھاگ نکلنے کا سارا پروگرام درہم برہم ہوتا نظر آرہا تھا۔ اس نے سوچا اگر میں اسے چھوڑ کر بھاگ گیا تو یہ شانِ مردانگی کے خلاف ہوگا اور ویسے بھی وہ اس کو ایک لمحہ ضائع کئے بغیر شوٹ کر دیں گے، اس جرم میں کہ اس نے بھاگنے کی اطلاع محافظوں کو کیوں نہ دی ــــــ آندرے نے اس نئی صورتِ حال سے نبٹنے کے لئے جو منصوبہ بنایا اس کی رُوداد اسی کی زبانی سُنئے۔

نوجوان جیمز کے آنے سے میرے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ دیر تک سوچتا رہا کہ اسے بھی فرار ہونے کی سازش میں شریک کرنا مفید رہے گا یا نہیں۔ چال ڈھال اور گفتگو سے تو یہی معلوم ہوا کہ وہ بے حد نڈر اور باحوصلہ جوان ہے ــــــ اور ہر قیمت پر ساتھ دے گا؛ تاہم ان جرمن جاسوسوں کا بھی کوئی اعتبار نہ تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ اپنے ہی کسی آدمی کو "قیدی" بنا کر کوٹھڑیوں میں دھکیل دیتے تھے تاکہ وہ قیدیوں کے اندر رہ کر جاسوسی کرے اور اس طرح تمام خبریں جرمنوں تک پہنچائے یہی وجہ تھی کہ کوئی شخص دوسرے پر آسانی سے اعتبار نہ کرتا۔ اگلے روز ناشتے کے بعد میں نے جیمز سے گفتگو چھیڑی اور طویل جرح کے بعد اتنا اطمینان کر لیا کہ یہ گسٹاپو کا آدمی نہیں ہے البتہ

مصیبت کا مارا فرانسیسی ہی ہے۔ جرمنوں نے اس کے پورے خاندان کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ غالباً اس بحث اور لمبی جرح سے وہ بھانپ گیا کہ میں اس پر شک کر رہا ہوں؛ چنانچہ وہ ہنس کر بولا:

"مونسیو آندرے، آپ کا مجھ پر شک کرنا بالکل بجا ہے۔ میں اپنے مرحوم ماں باپ اور بہن بھائیوں کی عزت اور حرمت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرا کوئی تعلق گسٹاپو سے نہیں ہے۔ ممکن ہے میں آپ سے پہلے ہی موت کی آغوش میں پہنچا دیا جاؤں۔ لیکن یہ بات میرے لئے باعثِ ذلّت ہے کہ آپ جیسا عظیم محبِ وطن آدمی مجھ پر شک کرے ــــــ"

"نہیں میرے دوست، ایسی بات نہ کہو۔" میں نے اس کے ان جملوں سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ "مجھے تم پر پورا پورا اعتماد اور بھروسہ ہے؛ تاہم احتیاط کا تقاضہ تھا کہ میں تم سے ساری تفصیلات معلوم کروں۔"

اس کے بعد میں نے اُسے بھاگ نکلنے کا پروگرام سمجھایا۔ وہ حیرت اور مسرت کی ملی جُلی نظروں سے میری طرف تکنے لگا آخر بولا،

"خدا رحم کرے ــــــ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان موذیوں کے چُنگل سے ہم کیوں کر بچ سکیں گے۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ چھت پر پہنچنے کے بعد ہم ان کی متلاشی نگاہوں سے محفوظ رہ کر کسی دوسری عمارت میں داخل ہو جائیں گے۔ جب میں یہاں لایا گیا تو میں نے دیکھا کہ چپّے چپّے پر پہرے دار اور دوسرے مسلح سپاہی موجود ہیں اور ان کو حکم دیا گیا ہے کہ جونہی کسی جانب سے مشتبہ حرکات دیکھیں، بلا تامل گولی مار دیں۔"

"گولی تو بہر حال ہمارے لئے ہر طرف سے ہے، لیکن گیدڑوں کی طرح مرنے سے کہیں بہتر ہے کہ کچھ ہاتھ پیر ہلائیں؛ جان بچانے کی کوشش تو کرنی چاہیے۔" اس کے بعد تو خدا کے

ہاتھ میں ہے۔ یہ حسرت تو نہ رہے گی کہ سعی و جہد کرتے، تو یوں کتے کی موت نہ مارے جاتے۔"

"میں آپ کے ساتھ ہوں موسیو۔" نوجوان نے جوش سے کہا۔ "ویسے بھی آپ کے جانے کے بعد یہ بدمعاش مجھے زیادہ عرصے زندہ نہ رکھیں گے۔ اب یہ طے کرنا ہے کہ بھاگنے کا وقت کونسا مقرر کیا جائے۔ چونکہ آپ یہاں پہلے سے ہیں اور پہرے داروں کی نقل و حرکت اور ڈیوٹیاں بدلنے کے اوقات سے واقف ہیں، اس لئے یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔ میں بہرحال آپ کے حکم کی تعمیل میں فخر محسوس کروں گا۔"

میں نے اپنا گدا اٹھا کر اُسے وہ کمند دکھائی اور روشندان کے راستے باہر نکل کر چھت پر پہنچنے کے منصوبے سے آگاہ کیا۔

"آہ آپ نے کپڑا پھاڑ کر اس کی پٹیوں سے یہ رسی بٹی ہے، اور یہ کیا چیز ہے؟" اس نے ایک بہرے پر بندھے ہوئے آنکڑے کو ٹٹولا۔ میں نے بتایا یہ وہ چیز ہے جو بجلی کے اس قمقمے کی حفاظت کے لئے ان بدمعاشوں نے لگا رکھی تھی، مگر اب یہ ہمارے کام آئے گی۔ "آپ کے ذہنِ رسا کی داد دیتا ہوں موسیو آندرے، لیکن یہ تنگ روشندان شاید ہمیں گزرنے کی اجازت نہ دے۔"

"میں نے وہاں تک جانے کے لئے یہ کمند بنائی تھی، مگر اب اس کی اتنی ضرورت نہیں رہی۔ تم دیکھتے ہو کہ روشندان زیادہ سے زیادہ نو دس فٹ اونچا ہے۔ ذرا اس دیوار کے نیچے کھڑے ہو جاؤ، میں تمہارے کندھوں پر چڑھتا ہوں، ابھی معلوم ہو جائے گا کہ پہلی طرف کیا ہے۔"

وہ فوراً دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور میں نے اُس کے کندھوں پر چڑھ کر روشندان کا جائزہ لیا۔ باہر ہولناک تاریکی تھی۔ پورے شہر پر جیسے سکوتِ مرگ طاری تھا۔ کہیں سے روشنی کی کوئی کرن پھوٹتی نظر نہ آتی تھی۔ آسمان پر آوارہ بادلوں کے ٹکڑے جمع ہو رہے تھے اور ان میں سے اِکّا دُکّا تارا جھانک رہا تھا۔ میں نے جونہی روشندان سے اپنا چہرہ باہر نکالا، سرد ہوا کا ایک زبردست تھپیڑا منہ پر لگا اور سارے بدن میں تھرتھری سی چھوٹ گئی۔ بہت دور کسی کتے کے بھونکنے کی مدھم آواز کانوں میں آ رہی تھی۔ روشندان تک پہنچنے میں جس مشقت کا مجھے سامنا کرنا پڑا، اس نے مجھے نڈھال کر دیا۔ میں نے ٹٹول ٹٹول کر اندازہ کیا کہ چھت کی لگر کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں ہے اور اگر میں روشندان سے اپنا پورا جسم باہر نکال کر لگر کو تھامنے کی کوشش کروں تو کامیاب ہو سکتا ہوں، لیکن روشندان سے نکلنا ہی تو کارے دارد تھا۔ اس کی لمبائی چوڑائی بمشکل ڈیڑھ فٹ تھی اور وہ تو خیریت ہوئی کہ اس کا ڈھکنا غائب تھا، ورنہ اس میں سے نکلنا ممکن نہ ہوتا یا ڈھکنا توڑنا پڑتا۔ ایک ایک انچ کر کے نہایت استقلال اور ہمت سے میں نے اپنے جسم کو اوپر اٹھانا شروع کیا اور چند منٹ کی انتہائی اذیت و تکلیف کے بعد تقریباً آدھا دھڑ روشندان سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گیا، مگر اس کوشش میں میری انگلیاں، کہنیاں، بازو اور منہ جگہ جگہ سے چھل گیا تھا اور میں بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

دفعتاً ایک سرچ لائٹ آسمان پر گھومتی ہوئی گزر گئی اور میں اسی طرح آدھا دھڑ کمرے میں اور آدھا روشندان سے باہر لٹکنے کا نظارہ گیا۔ پھر تو روشنیوں کا تانتا بندھ گیا اور اس کے ساتھ ہی جرمن پہرے داروں کے ایک دوسرے کو آوازیں دینے اور اِدھر سے اُدھر چلنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"خدا کے لئے موسیو آندرے واپس آ جاؤ ——— اس وقت چھت پر جانا خطرناک ہے۔" جینز ہلکی آواز میں بولا۔ اس کے لہجے سے بے پناہ اضطراب کا اظہار ہوتا تھا۔

"چپ رہو ——— بالکل خاموش۔" میں نے منہ پھیر کر اس سے کہا۔ "غالباً ڈیوٹیاں تبدیل ہو رہی ہیں۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس عظیم الشان عمارت کی چھت پر بھی ایک دو پہرے دار موجود ہیں۔ چونکہ میں نے دھب دھب کی آواز قریب سے سنی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ چھت ابھی تک پکی ہے اور یہ آواز کسی سپاہی کے فوجی جوتوں کی ہے۔

روشندان میں ذبح کئے ہوئے بکرے کی طرح لٹکے لٹکے پندرہ منٹ گذر گئے، لیکن سرچ لائٹیں مسلسل گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھیں اور پھر یک لخت تاریکی چھا گئی۔

"میں اوپر جاتا ہوں" ــــــ میں نے اپنے ساتھی کو مدھم آواز میں بتایا۔ "تم بھی اس کمند کے ذریعے روشندان سے نکل آؤ۔ اگر چھت پر ایک آدھ موذی موجود ہوا تو ہم اس سے نپٹ لیں گے۔"

یہ کہہ کر میں نے پھر اپنے جسم کو آگے سرکانا شروع کیا اور مزید پانچ منٹ صرف کئے۔ اب میں بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ روشندان میں اپنے پیر ٹکا کر میں تقریباً دوہرا ہو گیا اور پھر میری انگلیاں چھت کی پتلی سی نگر کو چھونے لگیں۔ دوسرے ہی لمحے میں چھت پر چڑھ چکا تھا، لیکن توقع کے برعکس وہاں کوئی موجود نہ تھا؛ البتہ کچھ فاصلے پر دو زرد چمکیلی آنکھیں ضرور دکھائی دیں جو فوراً ہی غائب ہو گئیں۔ کوئی بدنصیب بلی چھت پر گھوم رہی تھی۔

چھت پر پہنچ کر میں اوندھے منہ لیٹ گیا اور خود ساختہ رسّی کو ایک جھٹکا دیا، تاکہ جینیز بھی آنے کی تیاری کرے۔ اب ایک ایک لمحہ مجھ پر قیامت بن کر گذر رہا تھا۔ میں نے گردن اٹھا کر اِدھر اُدھر جائزہ لیا، مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرف سے راہِ فرار اختیار کی جا سکتی ہے۔ جس قریبی عمارت کا میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اس کی چھت جیل خانے کی عمارت سے ملی ہوئی ہے، وہ خاصے فاصلے پر تھی، لیکن اس کی نچلی منزل کے ایک کمرے سے روشنی کی ہلکی ہلکی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ اتنے میں نیچے کوٹھڑی سے کچھ کھڑبڑ کی آواز سنائی دی۔ جینیز رسّی کی مدد سے اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن بدحواسی ملاحظہ ہو کہ جوتے اتارنا بھول گیا اور یہ آواز اسی کے جوتوں کی تھی جو لکڑی کی دیوار پر رگڑ کھا رہے تھے۔

"احمق ــــــ اپنے جوتے اتار دو" میں نے بمشکل غصہ ضبط کر کے کہا۔ جواب میں اس کی طرف سے خاموشی رہی، پھر اس نے شاید رسّی پر لٹکے لٹکے یکے بعد دیگرے اپنے جوتے اتار کے اور فرش پر پھینک دئے، لیکن خیر گذری کہ جوتے گدّے پر گرے اور زیادہ شور نہ اٹھا؛ تاہم اتنی آواز تو ضرور آئی جو میں نے چھت پر لیٹے لیٹے سن لی۔

فطری طور پر میں بھی بڑا جلد باز اور بے صبرا ہوں، لیکن جب دوسرا شخص زیادہ عجلت کا مظاہرہ کرے، تو میں جھنجھلا جاتا ہوں؛ چنانچہ میں نے روشندان کی طرف منہ کر کے کہا، "تم اپنے ساتھ مجھے بھی کسی مصیبت میں پھنسواؤ گے۔ ابھی ہمارے پاس بڑا وقت پڑا ہے۔ جلدی کی ضرورت نہیں، اطمینان اور سکون سے کام کرو۔"

میں کہہ نہیں سکتا کہ اس وقت بدنصیب جینیز پر کیا بیت رہی تھی اور میرا اس پر یوں ناراض ہونا کہاں تک صحیح تھا؛ تاہم اس کے بے پناہ صبر اور استقلال کی داد دینی پڑتی ہے کہ اس نے پلٹ کر جواب نہ دیا۔ میری آنکھیں روشندان پر جمی ہوئی تھیں اور اب میں جینیز کے ہانپنے کی آواز بخوبی سن سکتا تھا۔ پھر دو ہاتھ روشندان سے چپکے ہوئے دکھائی دئے۔ اس کے بعد جینیز کا سفید چہرہ رات کی تاریکی میں چمکا۔ وہ گردن باہر نکالے اوپر تک رہا تھا۔

"موسیو، میں اس میں سے باہر نہیں نکل سکوں گا یہ چھوٹا ہے اور میرا جسم ــــــ"

"اُف۔ خدایا!" میں نے دانت پیس کر کہا۔ "کیا بکواس

ہے۔ دیکھو بھائی میں تمہیں پانچ منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔ اس دوران میں اگر تم چھت پر نہ پہنچے تو میں چل دوں گا۔ پھر میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں گا کہ تمہارا کیا حشر ہوتا ہے۔"

میرے یہ الفاظ سن کر نوجوان کا چہرہ یک لخت یوں زرد پڑ گیا جیسے اس کا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ اگرچہ اندھیرے میں اس کے نقوش اور چہرے پر پھیلے ہوئے تاثرات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہ ہوتا تھا؛ تاہم اتنا تو میں نے دیکھ لیا کہ میرے ان جملوں سے اُسے انتہائی اذیت پہنچی ہے۔ میں دل ہی دل میں نادم ہوا؛ تاہم یہ موقع مزید بحث مباحثے کا نہ تھا۔ اب میں نے جھک کر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

"کوشش تو کرو میرے یار ——— اتنا مایوس ہونے کی کیا ضرورت ——— آخر تم مجھ سے زیادہ تگڑے تو نہیں ہو۔" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی، اور واقعی چند منٹ بعد وہ چھت پر آ چکا تھا، لیکن اس کوشش میں اس کا جسم بھی بُری طرح چھل گیا اور خصوصاً کہنیوں پر تو گہری خراشیں آئی تھیں۔ میں نے کہا: "تم یہاں دل جمعی کے ساتھ لیٹے رہو اور جی چاہے تو سو بھی جاؤ۔ میں ذرا حالات کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اب میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں، چھت کے مشرقی حصے میں چند چمنیاں سی دکھائی دیں جن میں سے ہلکا ہلکا دھواں اُٹھ رہا تھا۔

"دیکھو، تم ان چمنیوں کی آڑ میں چھپ جاؤ۔" میں نے جیمز کو ہدایت کی: "میں ایک گھنٹے تک واپس نہ آیا، تو پھر خدا تمہارا حافظ و نگہبان ہو ——— یہ خیال نہ کرنا کہ میں تمہیں تنہا چھوڑ کر بھاگ جاؤں گا۔ اگر پکڑا گیا تو اور بات ہے۔"

نوجوان نے اثبات میں گردن ہلائی اور آہستہ آہستہ چمنیوں کی طرف رینگنے لگا۔

جیسا کہ ابتدا میں میرا خیال تھا اس عظیم الشان عمارت کی چھت کچی ہے اور اس پر میں نے کچھ ایسی آواز بھی سُنی تھی جیسے کوئی شخص جوتے پہنے بھاگ رہا ہو، لیکن اب نظر آیا کہ یہ دونوں ہی باتیں غلط تھیں۔ چھت کچی نہ تھی بلکہ لکڑی کے چوکور اور بڑے بڑے تختوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ میں زینے کی تلاش میں تھا اور چپکے چپکے ادھر سے اُدھر رینگ رہا تھا۔ اس دوران میں آسمان پر جمع ہونے والے بادلوں نے تاروں کی روشنی کا راستہ روک لیا اور ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان حالات میں یہ بارش ہمارے لئے فائدہ مند تھی مگر اس تاریک اور سرد رات میں اگر ہم بھیگ کر اکڑ جاتے تو کچھ بعید نہ تھا۔ اب میں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

چھت کے بیچوں بیچ ایک ٹوٹے ہوئے تختے میں روشنی کی جھلک دکھائی دی۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ دو جرمن سپاہی لالٹین کی مدھم روشنی میں بیٹھے بڑے بڑے مگ ہاتھ میں پکڑے قہوہ پی رہے تھے۔ اُن کے قریب ہی دو بندوقیں پڑی تھیں۔ بارش اور تیز ہو گئی اور پانی کے ننھے ننھے قطرے میرے برہنہ جسم پر یوں پڑنے لگے جیسے سیسے کے بنے ہوئے چھرّے بدن میں پیوست ہوتے جا رہے ہوں۔ لکڑی کی چھت بُری طرح بج رہی تھی۔ یکایک ایک سپاہی نے سر اُٹھایا اور اپنے ساتھی سے جرمن زبان میں کچھ کہا۔ چونکہ میں کچھ کچھ جرمن زبان سمجھنے لگا تھا اس لئے یہ سمجھ میں آیا کہ وہ اپنے ساتھی کو بتا رہا ہے۔ بارش ہو رہی ہے۔ جواب میں دوسرے نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور قریب رکھی ہوئی کیتلی میں سے مزید قہوہ اپنے مگ میں اُنڈیلنے لگا۔

دفعتہً میں نے شمال کی جانب سے آتی ہوئی ٹرین کی آواز سنی ——— اُف خدایا۔ تو کیا ریلوے لائن اس قید خانے کے نزدیک سے گزرتی ہے؟ چشم زدن میں ایک مسافر ٹرین جس کے انجن کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں، دندناتی ہوئی آئی اور شور برپا کرتی ہوئی گزر گئی۔ پھر ڈیڑھ منٹ تک ٹرین کے پہیوں کی دھڑ

دھڑ سے عمارت کانپتی رہی۔ اب میری حماقت دیکھیے کہ میں نے اس سنہری موقع سے کوئی فائدہ نہ اُٹھایا؛ تاہم دل کو اطمینان تھا کہ صبح ہونے سے پہلے پہلے کئی ریلیں ادھر سے گزریں گی اور یقیناً ہمیں ان میں سے کسی ایک پر چڑھنے کا موقع مل جائے گا۔

اب ہلکی ہلکی بوندا باندی موسلا دھار بارش میں بدل چکی تھی اور بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک سے کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ کئی مرتبہ تو یوں معلوم ہوا جیسے بجلی اسی چھت پر گر کر ہم دونوں کو قتل کر دے گی۔ میں نے چھت کا ایک ایک چپہ دیکھا، مگر نیچے اُترنے کا کوئی راستہ نہ ملا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ میں نے دل میں سوچا۔ راستہ تو ضرور ہونا چاہئے پھر یاد آیا کہ اس قسم کی عمارتوں میں چھت پر جانے کے لئے زینہ نہیں بنایا جاتا، بلکہ چھت میں نیچے کی طرف ایک ڈھکنا بنا دیا جاتا ہے، جو نیچے ہی سے کھلتا اور بند ہوتا ہے۔

اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ خود ساختہ کمند کو کام میں لایا جائے۔ یہ عمارت دو منزلہ تھی اور اس کی اونچائی زیادہ سے زیادہ پچاس فٹ ہو گی، لیکن کمند بہرحال چھوٹی تھی۔ اس کے ذریعے زیادہ سے زیادہ انیس فٹ نیچے تک اُترا جا سکتا تھا، بقیہ فاصلہ ظاہر ہے چھلانگ لگا کر ہی طے کرنا پڑتا اور اس کام میں ہڈی پسلی ٹوٹنے کا خدشہ بھی نظر آ رہا تھا۔

میں واپس رینگتا ہوا چمنیوں کی طرف گیا۔ کیا دیکھتا ہوں نوجوان جمیز طوفانِ باد و باراں اور انتہائی سرد موسم میں بھی دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا خراٹے لیتا ہے۔ سچ پوچھیے تو اس کی حالت پر مجھے بڑا رشک آیا۔ میں نے آہستہ سے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا، وہ چونک اُٹھا اور آنکھیں ملنے لگا۔

"کہیے موسیو آندرے، کامیابی کی کوئی راہ ملی؟ آپ تو بُری طرح بھیگے ہوئے ہیں۔ میں نے تو اس چمنی کی آڑ میں کسی حد تک اپنا بچاؤ کر لیا۔"

"راستہ تو نظر نہیں آتا۔ غالباً اس چھت میں اندرونی طور پر کوئی دروازہ بنا ہوا ہے جو نیچے سے کھلتا ہوگا۔ بہرحال آؤ، ہم اس کمند کے ذریعے شمالی دیوار کے ساتھ ساتھ اُتریں گے۔ کیا تم بائیس فٹ کی اونچائی سے زمین پر کود سکو گے؟"

"آپ کے ساتھ تو تحت الثریٰ میں بھی کودنے کے لئے تیار ہوں موسیو۔" جمیز نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور پھر ہم دونوں گھٹنوں کے بل چپکے چپکے شمالی دیوار کی طرف بڑھے۔ یک لخت نہ جانے کیا ہوا، شاید جمیز کا پیر پھسلا اور وہ دھڑام سے فرش پر گرا۔ اس کے گرنے سے چھت لرز گئی اور فوراً ہی میں نے نیچے سے ایک جرمن سپاہی کو بولتے سُنا۔ وہ کہہ رہا تھا:

"آج چھت پر بلیاں پھر رہی ہیں ——— ان کم بختوں نے تنگ کر دیا ہے۔"

ہم دونوں چوہوں کی طرح چمنیوں کی آڑ میں دُبکے ہوئے تھے، غالباً ایک یا دو منٹ گزرے، لیکن یوں محسوس ہوا جیسے صدیاں بیت گئی ہیں۔ دفعتاً چھت درمیان سے شق ہوئی اور چار فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا ایک ڈھکنا سا اوپر اٹھا۔ پھر ایک جرمن سپاہی نے چھت پر قدم رکھا۔ اس نے ٹارچ روشن کی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سب مشین گن اس کے کندھے پر لٹک رہی تھی۔ ہمارا اور اس کا فاصلہ بمشکل پانچ فٹ رہا ہوگا۔ میرا کلیجہ جیسے حلق میں آگیا اور بدن گویا پتھر ——— تاہم میں نے اپنے عقب میں دبکے ہوئے جمیز کا ہاتھ دبایا۔

یکایک ٹارچ کی روشنی ہماری آنکھوں پر پڑی اور دوسرے ہی لمحے جرمن سپاہی ہمارے سر پر کھڑا تھا۔ ہمیں وہاں پا کر وہ حیرت سے دم بخود تھا۔ ایک ثانیہ یا اس سے بھی کم عرصے میں ہم فریقین بُت بنے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، پھر دفعتاً جمیز نے چیتے کی مانند جست کی اور جرمن سپاہی کا گلا پکڑ لیا۔ اتنے میں میں اپنے ساتھی کی مدد کو پہنچ چکا تھا۔

جیمز نے اس کا گلا اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک بدنصیب سپاہی کا دم نہ نکل گیا۔ خدا کی پناہ ــــ اس کی آنکھیں اور زبان باہر کو نکل آئی تھی اور چہرے پر کرب اور اذیت کے ایسے آثار نمایاں تھے کہ بیان سے باہر ــــ

"بدمعاش ــــ سُور ــــ" جیمز نے ہانپتے ہوئے کہا اور انگلی سے پیشانی پر آیا ہوا پسینہ سُونتنے لگا۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ اس سترہ اٹھارہ سالہ نوجوان نے زبردست بازوؤں اور اپنی انگلیوں میں کیسی قوت چھپی ہوئی ہے۔

ہم نے جلد جلد مرے ہوئے جرمن سپاہی کے کپڑوں کی تلاشی لی۔ چند کرنسی نوٹ، ایک سگریٹ لائٹر، سگریٹوں کا بھیگا اور تُڑا مُڑا پیکٹ، چار انچ لمبے پھل کا ایک چاقو برآمد ہوا۔ اس کے علاوہ شناختی کارڈ بھی ملا۔ اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ ہم نے یہ سارا کام کس اطمینان اور خوش اسلوبی سے انجام دیا تھا، حالانکہ چھت کا دروازہ ابھی تک کھلا تھا اور کسی بھی لمحے کوئی اور جرمن سپاہی اُوپر آسکتا تھا۔ مرنے والے کی ٹارچ قابو میں کر کے میں نے وہ کھٹکا تلاش کر لیا جس کے ذریعے باہر سے یہ دروازہ بند کیا اور کھولا جا سکتا تھا۔ یہ لوہے کی ایک موٹی سی میخ تھی جسے دبایا تو دروازہ آہستہ آہستہ بند ہو گیا۔

واش کو وہیں چھوڑ کر ہم شمالی دیوار کے قریب پہنچے۔ عین اسی لمحے دُور سے کسی اور ٹرین کے آنے کی آواز سنائی دی۔

"جلدی کرو دوست ــــ تم پہلے اتر جاؤ، دیکھتے ہو اس طرف خاصا گھنا باغ ہے۔ یہ بہترین جگہ ہے پناہ لینے کی صبح ہونے سے پہلے پہلے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ کوئی دم میں اس جرمن سپاہی کے ساتھی چھت پر آجائیں گے۔"

میں نے چھت کے ایک تختے میں بڑی مشکل سے انگڑا پھنسایا اور پھر جیمز آہستہ آہستہ رسی کے سہارے اُترنے لگا۔ چند لمحوں بعد جب کہ ٹرین عمارت کے قریب سے گزر رہی تھی، وہ فاناً رسی چھوڑ کر تاریکی میں کود گیا۔ کیونکہ رسی یکایک ڈھیلی پڑ گئی تھی۔

میں نے خدا کا نام لیا اور اُترا، لیکن چند فٹ نیچے ہی اُترا ہوں گا کہ رسی جیسے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور میں نیچے ہی نیچے گرتا چلا گیا۔ اتنا یاد ہے کہ پُرشور آواز کے ساتھ کسی درخت یا جھاڑی پر گرا تھا۔ ہوش آیا تو جیمز مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو خود رَو اُونچی گھاس کے ایک وسیع قطعے میں پڑے پایا۔ بارش تھم چکی تھی اور صبح صادق کے آثار مشرق کی طرف سے نمودار ہو رہے تھے۔ عمارت کے اندر ہل چل ہو رہی تھی اور جرمن سپاہی اِدھر اُدھر چیختے چلاتے پھر رہے تھے۔

"انھیں پتہ چل گیا ہے موسیو" ــــ جیمز نے میرے کان میں کہا۔ "خدا کا شکر ہے آپ کو ہوش آ گیا، ورنہ میں پیٹھ پر لاد کر لے جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔"

"رسی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی" میں نے بمشکل کہا۔

کیسا عجیب اتفاق تھا اور خدا کی قدرت کہ اتنی بلندی سے گرنے کے باوجود میری ہڈی پسلی سلامت رہی۔ اس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا تھا کہ ابھی مرنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ قدرت کا دستِ غیب خود ہر لمحے میری حفاظت کا سامان کر رہا تھا۔ یاد آیا کہ میں کچھ عرصے قبل اس عمارت اور باغ میں ایک مرتبہ آیا تھا، لیکن ان دنوں اس کی صورت کچھ اور تھی، تاہم ذہن پر زور دیا تو یاد آ گیا کہ یہ خاصا وسیع و عریض جنگل نما باغ ہے، چنانچہ میں نے جیمز سے کہا کہ جس قدر تیز بھاگ سکتے ہو، باغ کے مشرقی حصے کی طرف بھاگ نکلو۔ یہ ہدایت دے کر میں خود بھی اُٹھا اور اس وقت محسوس ہوا

کہ بائیں ٹخنے میں درد کی ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھ رہی ہے۔

بہت جلد ہم ایک محفوظ اور کسی قدر آرام دہ علاقے میں پہنچ گئے۔ آرام دہ میں نے اس لئے کہا کہ یہاں گھنے درختوں کے باعث زمین پر وہ پھسلن نہ تھی جو باغ میں ہو رہی تھی اور جس کے باعث ہم کئی مرتبہ منہ کے بل گرے اور اٹھے تھے

"مجھے یاد ہے کہ ریلوے سٹیشن یہاں سے قریب ہی ہے۔ وہاں پہنچنا چاہئے۔ سٹیشن ماسٹر میرے شناساؤں میں سے ہے۔ وہ ہمیں پناہ دے سکتا ہے" میں نے کہا

"لیکن مرسیو، میں بہت تھک گیا ہوں۔ بالکل نہیں چلا جاتا" جیمز نے جواب دیا اور نڈھال ہو کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ واقعی اس بیچارے کی حالت خراب تھی۔ سارا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا اور سانس کی کیفیت یہ کہ پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ ظاہر ہے اس وقت میں کچھ زیادہ زور بھی نہ دے سکتا تھا؛ تاہم دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کوئی لمحہ جاتا ہے گسٹاپو کے خونخوار کھوجی اپنے کتوں سمیت ہماری تلاش میں نکلیں گے اور پھر ہم دونوں کا کتے کی موت مارے جانا یقینی تھا۔

"خدا کے لئے ہمت کرو جیمز ——— یہ وقت ستانے کا نہیں" میں نے کہا

"صرف دو منٹ ——— دو منٹ ——" اس نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ دفعتہً بائیں جانب سے کسی شخص نے کرخت جرمن لہجے میں کہا،

"کون ہے؟ ادھر کون آیا ہے ——— بولو، جواب دو ———" پھر یوں سنائی دیا جیسے پکارنے والا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اسی طرف آ رہا ہے۔ غالباً یہاں جرمن چوکی ہے ہم دونوں ایک درخت کے تنے سے لگ گئے۔ چند لمحے بعد ٹارچ کی روشنی ادھر ادھر پھیلتی ہوئی نظر آئی۔ یہ واقعی ایک جرمن سپاہی تھا۔ رائفل اس کے شانے پر لٹک رہی تھی لیکن

چال ڈھال سے تھکن کا اندازہ ہوتا تھا۔ ادھر ادھر دیکھنے بھالنے کے بعد وہ بڑبڑایا اور جدھر سے آیا تھا، اسی طرف چلا گیا۔ ممکن ہے وہ اور قریب آ جاتا، تو اس کا بھی وہی حشر ہوتا جو پہلے ایک سپاہی کا ہو چکا تھا۔

"بچ کر نکل گیا بدمعاش" جیمز نے آہستہ سے کہا۔

"وہ تو نکل گیا، مگر سوال یہ ہے کہ اب ہم کیسے بچ کر نکلیں، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جرمنوں کی متعدد چوکیاں اس علاقے میں قائم ہیں۔ بہرحال قسمت آزمانے میں ہرج کیا ہے۔ اسی طرف کو چلتے ہیں۔ غالباً یہ سپاہی اکیلا ہے اور ویسے بھی اس کی حالت سے تھکن اور بیزاری کا احساس مجھے ہوا ہے ہم اسے آسانی سے زیر کر لیں گے۔ ممکن ہے ہم دوسری جانب جائیں، تو زیادہ خطرہ ہو"

اب دن کا اجالا اتنا نمودار ہو گیا تھا کہ ارد گرد کا منظر اور آس پاس کی اشیا بخوبی دکھائی دیتی تھیں۔ بائیں ہاتھ پر تقریباً ایک فرلانگ دور ایک مکان بنا ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ یہی سٹیشن ہے

"ہمیں کسی نہ کسی طرح سٹیشن جانا ہے۔ اس کے بعد کوئی فکر نہیں ہوگا" میں نے کہا اور ہم دبے پاؤں اس طرف بڑھنے لگے۔

ایک ڈیڑھ فرلانگ کا یہ فاصلہ طے کرنا قیامت ہو گیا۔ ہماری حالت ان گیدڑوں کی سی تھی جو کتے کے تعاقب میں نازی کتے لگے ہوئے ہوں اور بچاؤ کی کوئی صورت دکھائی نہ دیتی ہو۔ نصف فاصلہ طے کرنے کے بعد یکایک ہمیں رک جانا پڑا، چونکہ واقعی ہمارے عقب میں کوئی شخص چلا آ رہا تھا۔ ہم پھرتی سے دائیں بائیں ہٹ گئے اور درختوں کے پیچھے پناہ لی کیا دیکھتا ہوں کہ چھوٹی سی پکی پگڈنڈی پر ایک جرمن سپاہی سائیکل پر سوار مزے مزے میں ہماری جانب آ رہا ہے۔ رائفل اس کے

کندھوں پر سجی تھی۔ یہ شخص غالباً اپنی ڈیوٹی پر جا رہا تھا تاکہ رات کو پہرہ دینے والا سپاہی آرام کر سکے۔

میں نے سیٹی بجا کر جیمز کو خبردار کر دیا کہ جانے نہ پائے۔ اُدھر وہ بھی یہی سوچ رہا تھا۔ جونہی جرمن سپاہی ہمارے قریب سے گزرا، ہم دونوں بیک وقت اس کی طرف دوڑے اور چشم زدن میں وہ بدنصیب ہمارے بازوؤں کی گرفت میں آ کر پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ ہوا کیا اور ہم لوگ آخر کون ہیں۔ باری باری ہم پر حیرت اور خوف کی نظر ڈالتا ہوا جرمن زبان میں چلاّیا،

"کون ہو تم اور یہ حرکت کرنے کا مقصد کیا ہے۔ جانتے نہیں کہ اس مذاق کی سزا کیسی بھیانک مل سکتی ہے؟"

ہم سمجھ گئے کہ وہ ہماری شخصیتوں سے بے خبر ہے اور یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اس کا تعلق لائنز کے قید خانے سے نہیں؛ تاہم اسے چھوڑنا ممکن نہ تھا۔ جیمز نے اس کی کنپٹی پر اس زور کا ہاتھ مارا کہ بدنصیب جرمن مزید کوئی آواز نکالے بغیر بے ہوش ہو گیا۔ ہم اسے اطمینان سے ڈنڈا ڈولی کر کے ایک طرف لے گئے۔ اب ایک اور انوکھی تدبیر میرے ذہن میں جنم لے چکی تھی۔

آدھ گھنٹے بعد اسی جرمن سپاہی کو ہم نے دوبارہ دیکھا جو بے چینی سے اس جنگل کی آخری سرحد پر ٹہل رہا تھا۔ بار بار وہ گھڑی کی طرف دیکھتا، لیکن جونہی اس نے ہم دونوں کو آتے دیکھا، رُک گیا اور حیرت سے دیکھنے لگا۔

میں جرمن سپاہی کی وردی پہنے، ایک ہاتھ میں رائفل تھامے اور دوسرے ہاتھ میں سائیکل لئے چل رہا تھا اور میرے آگے آگے جیمز یوں جا رہا تھا جیسے میں اسے گرفتار کر کے لایا ہوں۔

جرمن سپاہی نے ایک نظر جیمز کو دیکھا، پھر میری طرف نگاہ کی اور جھلاّ کر بولا:

"یہ کون شخص ہے اور تم اتنی دیر کہاں رہے، ڈیوٹی پر آنے کا یہی وقت ہے؟"

میں نے حتی الامکان اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کی تھی، اس ڈر سے کہ کہیں وہ پہلے سے پہچانتا نہ ہو کہ فلاں شخص ڈیوٹی پر آئے گا۔ میں نے جواب دینے کے بجائے اشارے سے بتایا کہ اس نوجوان کی تلاشی لو۔ اب وہ جیمز کی طرف بڑھا۔ میں نے اپنی رائفل جیمز پر تان لی۔ جرمن سپاہی نے جیمز کے ہاتھ اوپر اٹھائے اور اس کی پتلون کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ ابھی اس کا ہاتھ جیمز کی جیب سے باہر نہ نکلا تھا کہ جیمز نے اس زور کی ٹکر سپاہی کی ناک پر ماری کہ وہ لڑکھڑا کر پرے گرا، مگر تھا آدمی جاندار، فوراً اُٹھا اور جیمز کی طرف اشارہ کر کے چلاّیا:

"شوٹ کر دو اسے!"

لیکن میں نے اپنی رائفل کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔ اتنے میں جیمز کا گھونسا جرمن سپاہی کی ٹھوڑی پر پڑا اور پھر تو اس نے اس کی ایسی مرمت کی کہ خون میں نہلا دیا۔ اسے بے ہوش چھوڑ کر ہم جلدی سے سٹیشن کی طرف لپکے، عین اسی وقت ایک مال گاڑی دندناتی ہوئی آئی اور سٹیشن پر رُک گئی۔ جب ہم یارڈ میں پہنچے، تو یہ دیکھ کر سٹی گم ہو گئی کہ دس بارہ جرمن مسلح سپاہی بے تحاشا بھاگتے ہوئے ہماری طرف آ رہے ہیں اور اس سے پیشتر کہ ہم ان کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش کرتے، انھوں نے اپنی رائفلوں اور سٹین گنوں کا منہ کھول دیا۔ فائرنگ کے دھماکوں سے سٹیشن کی فضا گونج اٹھی اور بہت سے لوگ جو ادھر ادھر گھوم رہے تھے آناً فاناً دہشت زدہ ہو کر بھاگ اٹھے۔ رائفلیں ہمارے پاس بھی تھیں؛ چنانچہ ہم نے جرمنوں کو وہیں روک دیا۔ جرمنوں نے ہمیں

گھیرے میں لینے کی کوشش کی، لیکن جب اُن کے تین چار آدمی ہماری گولیوں کا نشانہ بن گئے تو وہ ڈر گئے۔ اب میں نے جیمز سے کہا کہ وہ سٹیشن کے پچھلے حصے میں پہنچنے کی کوشش کرے۔ مجھے معلوم تھا کہ گاؤں کے آدمیوں میں ایک گارڈ کا مکان آخری سرے پر ہے اور وہیں پناہ مل سکتی ہے۔ آدھ گھنٹے تک جرمنوں کو میں نے روکے رکھا اور پھر میں بھی انھیں مغالطہ دے کر سٹیشن کی پچھلی طرف دوڑا۔ یہاں اور بھی بہت سے درمیانہ درجے کے چھوٹے چھوٹے مکانات بنے ہوئے تھے۔ میں نے جرمنوں کے قدموں کی آوازیں سنیں اور کبھی کبھی گولیاں میرے دائیں بائیں سنسناتی ہوئی نکل گئیں۔

مکانوں کی کھڑکیوں میں سے فرانسیسی عورتیں جھانک رہی تھیں، لیکن کسی نے دروازہ نہ کھولا، کیونکہ وہ مجھے وردی کی وجہ سے جرمن سمجھ رہی تھیں۔ خدا جانے جیمز کہاں چھپا ہوا تھا۔ میں نے گارڈ کے مکان پر جا کر دستک دی، لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ مکان خالی پڑا تھا۔ پچھلے دروازے سے نکل کر میں ایک اور تنگ سی گلی میں داخل ہوا۔ اب جرمن بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ بائیں ہاتھ پر پہلے ہی مکان کا دروازہ کھلا ہوا دکھائی دیا۔ میں بے دھڑک اندر گھس گیا۔ وہاں ایک موٹی تازی فرانسیسی عورت کے سوا کوئی نہ تھا جو باورچی خانے میں برتن صاف کر رہی تھی۔ میرے پاؤں کی آہٹ پا کر وہ مڑی اور اسی دم اس کے ہاتھ سے چائے دانی گر کر ٹوٹ گئی۔ اُس نے مجھے جرمن سپاہی سمجھا۔

”مجھے مت مارو ـــــ مجھے مت مارو ـــــ“ وہ دہشت سے چیخنے لگی اور میں نے آگے بڑھ کر اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”چُپ رہو ـــــ میں جرمن نہیں ہوں ـــــ فرانسیسی ہوں ـــــ وہ مجھے تلاش کر رہے ہیں“

عورت ایک ثانیے تک پتھر کے بُت کی مانند میری جانب تکتی رہی، پھر کچھ کہے بغیر بھاگی اور مکان کا بیرونی دروازہ بند کر کے اندر سے قفل ڈال دیا۔

”میرے ساتھ آؤ“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”جب تک وہ دروازہ توڑیں گے، میں تمھیں ایک محفوظ جگہ پہنچا دیتی ہوں“

”لیکن ـــــ“ میں نے کچھ کہنا چاہا۔

”زیادہ بات مت کرو ـــــ انھوں نے میرے تین جوان بیٹوں کو مار ڈالا ہے، اب وہ مجھے بھی مار ڈالیں تو کوئی پروا نہیں“

اس نے مجھے اپنے مکان کی ایک چھوٹی سی تاریک کوٹھڑی میں دھکیل دیا اور مجھ سے کہا کہ دروازہ اندر سے بند کر لو، پھر سرگوشی کے انداز میں بولی:

”تم اطمینان سے چھپے رہو، وہ تمھیں ڈھونڈ نہ سکیں گے“

بس یہ آخری الفاظ تھے جو میں نے اس فرشتہ صفت عورت کے منہ سے سُنے۔ اس کے بعد وہ چلی گئی۔ اس کوٹھڑی میں برسوں پُرانا کاٹھ کباڑ بھرا تھا۔ میں نے احتیاطاً اس کے عقب میں پناہ لی اور نتائج کا انتظار کرنے لگا۔ دفعتاً کچھ ایسی آوازیں آئیں جیسے بہت سے آدمی چیخ رہے ہوں۔ ان میں عورتوں کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ پھر فائروں کی تڑتڑ ـــــ... اس کے بعد دروازہ ٹوٹا اور یوں محسوس ہوا جیسے بہت سے آدمی اس مکان میں داخل ہو گئے ہیں۔ وہ ہر ایک شے تلپٹ کر رہے تھے۔ دیر تک توڑ پھوڑ کرنے کے بعد آخر وہ چلے گئے۔ اور ہر طرف ہیبت ناک سنّاٹا چھا گیا۔

میں تین روز تک بھوکا پیاسا اسی تاریک کوٹھڑی میں بند رہا۔ چوتھے روز رات کے وقت یہاں سے نکلا۔ جرمن سپاہی کی وردی اس وقت بھی میرے تن پر تھی اور رائفل ہاتھ میں،

اسی گلی کے نکڑ پر ایک سپاہی کھڑا تھا، لیکن میں بے پروائی سے ٹہلتا ہوا اس کے قریب سے ہو کر گذر گیا۔ اس نے مجھے دیکھ کر صرف سلیوٹ کرنا کافی سمجھا اور منہ پھیر کر سیٹی بجانے لگا۔

آندرے دیویی واقعی قسمت کا دھنی تھا کہ موت کے منہ سے بچ نکلا، لیکن اس کا ساتھی جیمز پکڑا گیا اور جرمنوں نے اسے اسی دن گولی مار دی۔ وہ فرانسیسی عورت بھی جس نے آندرے کو بچایا، گرفتار ہوئی اور گسٹاپو نے اسے اتنی اذیتیں دیں کہ بے چاری قید خانے ہی میں ہلاک ہو گئی۔ ڈیڑھ ہفتے تک فرانس کے مختلف قصبوں اور دیہاتوں میں "زیرِ زمین" چھپے رہنے کے بعد آندرے دیویی سرحد پار کر کے سوئٹزر لینڈ جانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں سے وہ سپین اور پھر الجیریا چلا گیا۔

تاہم اس کی شخصیت جرمن جاسوسوں کے نزدیک اتنی اہم تھی کہ وہ برابر اس کا پیچھا کرتے رہے، مگر آندرے دوبارہ ان کے ہاتھ نہ آیا۔ الجیریا میں اس نے بہت سے مفرور فرانسیسی جوانوں کا گروہ بنایا اور پھر اتحادیوں کو اپنی خدمات پیش کر دیں؛ چنانچہ آندرے کو لیفٹیننٹ کرنل کا عہدہ دے کر دوبارہ فرانس بھیجا گیا اور اس نے اپنے ملک کو نازیوں سے آزاد کرانے کے لئے جان کی بازی لگا دی۔

آج کل وہ پیرس کے ایک نواحی گاؤں میں آرام اور سکون کی زندگی بسر کر رہا ہے اور جب کبھی فوجی تقریب منعقد ہوتی ہے، تو لوگ اس کے احترام میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور یوں بھی پورے فرانس میں وہ واحد شخص ہے جس کے پاس بہادری و شجاعت کے تمغے سب سے زیادہ ہیں۔

★★

- وحشی جانور جس طرح لوگوں سے اور پالتو جانوروں سے بھاگتا رہتا ہے اسی طرح بداخلاق آدمی سے سب لوگ ملنا جلنا چھوڑ دیتے ہیں اور تنہائی کی وحشت کے سوا اس کا کوئی ساتھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا سبھی کو چاہئے کہ بداخلاقی کی بُری صفت کو چھوڑ کر حُسنِ اخلاق کی اچھی صفت کو اختیار کریں۔ تاکہ انسان کا معنی اس میں جلوہ گر ہو۔ بداخلاق آدمی انسان کا معنی کھو بیٹھتا ہے۔
- انسان کا دل جتنا پاک و صاف اور عمدہ ہوگا۔ اس کی خصلت و سیرت بھی اتنی پاکیزہ اور بہتر ہوگی۔ اور جس کا دل گندہ اور خراب ہوگا، اس کی عادتیں بیہودہ اور بدتر ہوں گی۔ غرضکہ انسان کی عادتیں ان کے دل کا عکس ہوتی ہیں۔ جیسا دل ویسی عادتیں۔ پس ہر انسان کی خصلتوں کو دیکھ کر اس کے دل کی پاکیزگی یا ناپاکیزگی کا پتہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔
- وہ انسان جو ہوا و حرص کا شکار ہو، وہ ہلاک ہو جاتا ہے، خواہ دنیا میں، خواہ عقبیٰ میں اور جو انسان خواہشات نفسانیہ کو روکے رکھے اور اس سے باز رہے، وہ دونوں جہاں میں سلامت رہتا ہے۔
- قوم کا سردار ہوتا ہے جو ان کے سارے معاملات کا حل نکالتا ہو۔ فقیہہ آدمی چونکہ لوگوں کے مسائل دینیہ کا حل نکالتے ہیں اور اُمّت کو صحیح راستہ بتلاتے ہیں۔ حرام سے بچا کر حلال کی طرف لاتے ہیں۔ اس لئے اُمّت کے سردار فقیہہ لوگ ہی ہیں جو اُن کو اپنا سردار نہ مانے وہ خسران و نقصان میں ہے۔
- جو آدمی جتنا انکسار اور فروتنی کرے گا اتنا ہی وہ بڑا مرتبے والا ہوگا۔ جو شخص بڑے مرتبے کا خواہشمند ہو وہ انکساری اور فروتنی کی محمود صفت کو اختیار کرے، خود بخود عظیم المرتبت ہو جائے گا۔


مراقش
کا
آخری
مجاہد
غازی
عبدالکریم
ریف
کتاب :- LAST WARRIOR
مصنف :- رابرٹ ہوکس
تلخیص : عبید علی شاہ پور

عربوں کی تاریخ تحریک حریت میں غازی عبدالکریم ریف کا نام ہمیشہ سنہری حرفوں سے لکھا جاتے گا۔ انھوں نے مراقش کی تحریک آزادی مسلسل چالیس سال تک جاری رکھی، ان کی یہ تحریک عدم تشدد پر مبنی نہیں تھی۔ وہ پتھر کا جواب پتھر سے دینے کے قائل تھے ـــــ ان کے مقابلے پر اسپین تھا، فرانس تھا اور ان کے ساتھ صرف ان کے قبیلے کے سرفروش نوجوان تھے ـــــ رابرٹ فربکس ـــــ چند سال قبل ریف گیا تھا، وہاں بوڑھوں سے ملا جنھوں نے جوانی میں عبدالکریم کے شانہ بشانہ جنگ آزادی لڑی تھی، واپس آکر اس نے ایک کتاب لکھی جو تاریخ کا سرمایہ اور جہد آزادی کا ایک زریں باب بن گئی ـــــ۔

آپ بھی اس کی تلخیص پڑھیے اور اندازہ لگائیے کہ ایک قوم کو آزاد ہونے کے لئے کتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے

• ـــــ سلامت علی مہدی

(۱)

"بڑی طاقتیں چھرے تیز کر رہی ہیں۔ اب ہماری باری ہے" مقرر نے اپنے چھوٹے چھوٹے خوبصورت ہاتھوں کے اشارے سے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ خاموش ہو گیا اور پھر ایک بھرپور گہری نظر سامعین پر ڈالی۔ پورا مجمع بڑی توجہ سے اس کی تقریر سن رہا تھا۔ مقرر کی شخصیت کچھ ایسی پرکشش نہ تھی۔ چھوٹا سا قد، البتہ جوش و جذبے اور درد و گداز میں ڈوبی ہوئی آواز اور اس کی موٹی موٹی سیاہ آنکھوں کی بے پناہ چمک بے حد مسحور کن تھی۔

مقرر کے چپ ہوتے ہی مجمع میں ہلکی سی ہلچل پیدا ہوئی۔ اور پھر کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ قبائلی سردار ایک دوسرے سے صلاح مشورے کرنے لگے۔ مقرر نے کان لگا دیے، شاید کسی کی کوئی بات پلے پڑ جائے۔ اس کی نگاہ ان کے چہروں پر تھی، وہ صرف چند سرداروں سے واقف تھا۔ اکثر اجنبی تھے جن سے اس کی ملاقات چند ماہ پہلے ہوئی تھی۔ یہ لوگ ریف کے دور افتادہ علاقوں سے آئے تھے۔ ریف کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا اجتماع تھا۔ ریفی ایک زمانے سے الگ تھلگ بلند و بالا پہاڑوں کی محدود دنیا میں رہتے چلے آرہے تھے۔ ہر قبیلہ اپنے آپ میں مست تھا اور اپنے پڑوسیوں کا جانی دشمن۔

ریف شمالی افریقہ میں بحیرۂ روم کا ساحلی علاقہ ہے۔ یورپ سے بہت دور واقع ہے۔ اس کی وادیاں پتھریلی اور پہاڑ چٹیل ہیں۔ اسی لئے نہ کبھی یورپ والوں نے اس علاقے میں کوئی کشش محسوس کی اور نہ اس کے پڑوسیوں نے، لیکن اب ریف کی آزادی خطرے میں تھی۔ مقرر متواتر سات ماہ سے اپنے ہم وطنوں کو جھنجھوڑتا اور اس خطرے سے آگاہ کرتا پھر رہا تھا۔ سامراجی اسپین کی ہوس بھری نظریں ریف پر پڑ رہی ہیں۔ وہ برسات اور سردیوں کا موسم گزرنے کا انتظار کر رہا ہے۔ موسم بہار آتے ہی ریف پر چڑھ دوڑے گا۔ صرف ۲۶ ہفتے باقی ہیں۔ ریفیوں کو چاہیے کہ اپنے اختلافات بھلا دیں اور مشترکہ دشمن کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوں۔ وہ جہاں کہیں گیا لوگوں سے یہی اپیل کی، انھیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگانے کی کوشش کی اور اب ریفی قبیلوں کے قائد اور شیوخ مشاورت کے لئے جمع ہوئے تھے۔

یہ تھے اسلام کے بطل جلیل محمد بن عبدالکریم ریفی جنھیں دنیا عموماً عبدالکریم ریفی کے نام سے پکارتی ہے۔

ریفی شیوخ کی موثر ناکام رہی۔ مدت دراز کی جانی دشمنیوں نے ریفی قبائل کو اس طرح پھاڑ دیا تھا کہ عبدالکریم سر توڑ کوشش کے باوجود انھیں متحد نہ کر سکے۔ وہ لوگ آپس میں جھگڑنے اور تند و تلخ باتیں کرنے کے بعد اپنے اپنے دیہات کو چلے گئے۔ سب کا تقریباً ایک ہی جواب تھا: سپین نے حملہ کیا تو وہ خود اس سے نبٹ لیں گے۔ عبدالکریم بھی اپنے گھر اجدیر چلے گئے۔ مستقبل کی فکر سے وہ سخت مضطرب تھے۔ اب کوئی زبردست فتح ہی لوگوں کو اُن کے پرچم تلے جمع کر سکتی تھی۔ سنہ ۱۹۲۰ء کا اکتوبر رخصت ہو رہا تھا۔ ریف کے پہاڑوں میں موسم سرما عموماً نہایت شدید ہوتا ہے۔ مسلسل بارشوں نے اسے شدید تر بنا دیا تھا۔

(۲)

اُدھر، اجدیر سے ستر میل دور ملیلیا میں جنرل فرینڈز سلویسٹر بڑی بے صبری سے موسم بہار کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ ملیلیا پر سپین نے ۱۴۹۶ء میں قبضہ کیا تھا۔ ۱۵۰۸ء میں اس نے وسطی ریف کے ساحلی جزیرے بیڈس کو فتح کیا۔ پھر سیوتا پرتگیزیوں سے چھینا اور جزیرہ پنیان میں ایک زبردست قلعہ تعمیر کیا جس سے خلیج ہکوس اس کے کنٹرول میں آگئی۔ سپینی ریف کے دروازے پر قدم رکھ چکے تھے، مگر وہ اسے کھول کر آگے نہ بڑھ سکے۔ پوری چار صدیاں وہ بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل کے علاقوں پر قبضہ جمانے میں مصروف رہے۔ انیسویں صدی ان کے زوال کا پیغام لے کر آئی۔ ایک ایک کرکے سارے مقبوضات ہاتھ سے نکل گئے۔ یہ پوری صدی ان مقبوضات کو بچانے کی تگ و دو میں گزری۔ ۱۸۹۸ء میں انھوں نے امریکیوں کے ہاتھ سے رسوا کن شکست کھائی اور سمندر پار کی نوآبادیات بھی ہاتھ سے گنوا دیں۔ یہی وجہ انھیں ملیلیا سے باہر نکل کر ادھر اُدھر پھیلنے کا موقع ہی نہ ملا۔

۱۸۹۳ء میں انھوں نے ملیلیا سے نکلنے کی کوشش کی۔ ملیلیا کے گورنر نے شہر سے باہر ایک ہزار گز کے فاصلے پر قلعہ تعمیر کیا۔

یہ جگہ ایک ریفی بزرگ کے مقبرے سے بالکل قریب تھی۔ مقامی قبائلیوں نے احتجاج کیا، مگر گورنر کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اور قلعے کی تعمیر جاری رہی۔ اس پر ایک رات ریفیوں نے حملہ کر دیا۔ سپینی فوج زیر تعمیر قلعے کو چھوڑ کر پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئی۔ بھاگتے بھاگتے بیس آدمی مارے گئے۔ ریفیوں نے قلعے کو نذر آتش کر دیا۔ سپین کے وقار کا جنازہ پہلے ہی نکل رہا تھا، یہ گویا فیصلہ کن ضرب تھی جو اس پر پڑی۔ سپینی تلملا اٹھے۔ فوراً ہی بیس ہزار فوج ملیلیا پہنچ گئی۔ چھاپہ ماروں کا صفایا کرنے کے بعد قلعہ از سر نو تعمیر کر لیا گیا، لیکن پھر اس سے آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہوئی۔

انیسویں صدی ختم ہو گئی۔ سپین، سمندر پار کے سارے مقبوضات سے محروم ہو چکا تھا۔ نوآبادیات کے استحصال کے نتیجے میں خوشحالی اور اقتصادی فارغ البالی کا جو دور آیا تھا، وہ رفتہ رفتہ ختم ہو رہا تھا۔ ملک میں ہر طرف مایوسی اور بدعنوانی کا دور دورہ تھا۔ ٹھیک اس وقت ۱۹۰۴ء میں فرانس نے سپین کو تجویز پیش کی کہ وہ مراکش کے شمالی علاقے پر قبضہ کر لے۔ فرانس نے یہ پیشکش دراصل اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے کی تھی۔ الجزائر اور تونس فتح کرنے کے بعد اس کی نگاہیں مراکش پر جمی ہوئی تھیں۔ مراکش کی سلطنت انتشار اور افتراق کا شکار ہو چلی تھی۔ اس وقت تخت پر سلطان عبدالعزیز متمکن تھا جو ایک نوعمر لڑکا تھا۔ اس کی کمزوری نے بیرونی مداخلت کے دروازے کھول دیے تھے۔ فرانس اس پر قبضہ کرکے اپنی افریقی سلطنت کو مکمل کرنا چاہتا تھا، لیکن اسے اپنے دیرینہ رقیب برطانیہ کی طرف سے مخالفت کا خطرہ تھا جو خود شمالی افریقہ میں استعماری مفاد رکھتا تھا۔ فرانس نے برطانیہ سے گفت و شنید شروع کر دی۔ اس نے پیشکش کی کہ وہ مصر کے معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کرے گا، برطانیہ اُسے مراکش میں من مانی کرنے دے۔ برطانیہ خود بھی فرانس سے دوستی کا خواہشمند تھا۔ یورپ کا سب سے طاقتور ملک جرمنی، برطانیہ کی بحری قوت کے مقابلے میں ایک زبردست بحری بیڑا تیار کر رہا تھا؛ چنانچہ برطانیہ

فوراً رضامند ہو گیا۔ اس نے صرف ایک شرط پیش کی، مراکش کا جو علاقہ جبرالٹر کے بالکل سامنے ہے، فرانس اس پر قبضہ نہیں کرے گا۔ فرانس نے شرط مان لی اور اس سازش میں سپین کو بھی شریک کر لیا۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء کا مشہور ناپاک معاہدہ طے پا گیا۔

فرانس نے سپین کے ساتھ مل کر خفیہ عہد کیا کہ وہ دونوں سلطنتِ مراکش کی آزادی و سلامتی اور سلطان کے اقتدارِ اعلیٰ کا احترام کریں گے ــــ برطانیہ کے خدشات رفع کرنے کے لیے شمالی علاقے کی اجارہ داری سپین کو دے دی۔ ای۔ ڈی موریل کے الفاظ میں مراکش کو موت کی خفیہ سزا سنا دی گئی۔ فرانس کو جلاد کا کردار ادا کرنا تھا، سپین کو غرض مند ساہوکار کا اور برطانیہ کو غرض پرست گواہ کا۔

اس ناپاک معاہدے کی توثیق متعلقہ ملکوں نے الجیرز کے مقام پر ایک کانفرنس میں ۱۹۰۶ء میں کی۔ اب فرانس نے مراکش پر قبضہ کرنے کے لیے اس طویل المیعاد تکنیک پر عمل شروع کیا جو ان دنوں افریقہ کو شکار کرنے والی استعماری طاقتوں نے بالعموم اختیار کر رکھی تھی۔ پہلے اس نے مراکش کو مشیر مہیا کیے تاکہ وہ حکومت کا نظم و نسق جدید خطوط پر استوار کرنے میں سلطان کی مدد کریں، پھر ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے بہت بڑی رقم بطور قرض دی اور اسے ان مشیروں کے ذریعے سامانِ تعیش اور دوسری بیکار آسائشوں پر ضائع کروا دیا، پھر مراکش کے ساتھ تجارتی معاہدے کیے اور فرانسیسی تاجروں نے ملک کے طول و عرض میں اپنا جال بچھا دیا۔ ۱۹۰۸ء میں فرانس کو وہ موقع مل گیا جس کی اسے تلاش تھی۔ مراکش میں خانہ جنگی چھڑ گئی۔ سلطان عبدالعزیز کو اپنے بھائی مولائی حفیظ کے حق میں سلطنت سے دستبردار ہونا پڑا۔ اس افراتفری کے عالم میں کچھ فرانسیسی تاجر مارے گئے۔ فرانس نے اپنی فوجیں کاسابلانکا میں اتار دیں۔ ۱۹۱۲ء میں تنجیر (طنجہ) اور شمالی علاقے کے سوا سارے مراکش پر فرانس نے انتداب قائم کر لیا۔ تنجیر کو بین الاقوامی بندرگاہ بنا دیا اور شمالی علاقہ سپینیوں کے حوالے کر دیا۔

(۳)

ریف کا علاقہ مراکش کے شمالی سلسلے کے شرقاً غرباً جتنے پر مشتمل ہے اور سمندر کے ساحل سے ریف کے کوہستان تک پھیلا ہوا ہے۔ شرقاً غرباً ۱۲۰ میل لمبا اور شمالاً جنوباً ۵۰ میل چوڑا ہے۔ کوہستانِ ریف کی بعض چوٹیاں سات ہزار فٹ اونچی ہیں۔ پہاڑ زیادہ تر جنگل ہیں، گھاٹیاں تنگ اور وادیاں پتھریلی ہیں۔ سارا علاقہ سخت ناہموار، خشک اور بنجر ہے۔ ابھی تک اس کا نقشہ تیار نہ ہو سکا۔

زیادہ تر ریفی خالص بربر نسل سے تعلق رکھتے ہیں، بربری زبان بولتے ہیں، تاہم ان میں سے بعض قبائل خالص عرب ہیں یا عربوں اور بربروں کے اختلاط سے وجود میں آئے ہیں۔ ریفی بالعموم مضبوط توانا اور چھوٹے یا میانہ قد و قامت کے ہیں ــــ دھڑ کے مقابلے میں ٹانگیں خاصی لمبی ہیں۔ سر لمبوترا، چہرہ پتلا، دانت چھوٹے، ناک نمایاں، بال سیاہ اور آنکھیں بھوری ہوتی ہیں۔ ساتویں صدی عیسوی میں جب عرب اسلام کی دعوت لے کر ریگ زارِ عرب سے نکلے اور مراکش فتح کیا تو یہ لوگ مسلمان ہو گئے۔ تاہم انھوں نے اپنی بولی کو برقرار رکھا جو شلحے کہلاتی ہے۔ ریفی قدامت پسند ہیں، اپنے ماحول سے محبت کرتے ہیں، اجنبیوں کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں ــــ اگرچہ عرصۂ دراز سے وہ مراکش کی سلطنت کے ماتحت رہتے آئے ہیں، لیکن عملاً آزاد زندگی بسر کرتے ہیں۔ انھیں اس زندگی سے محبت ہے اور جب بھی کسی بیرونی قوت نے انھیں اس زندگی سے محروم کرنا چاہا انھوں نے اس کی سخت مزاحمت کی۔ ہر قبیلے کے اپنے جمہوری ادارے اور تنظیمیں ہیں۔ خالص بربر نسل کے ریفی قبیلے چھبیس ہیں ــــ بنی ارباغل سب سے بڑا قبیلہ ہے اور ریف کی سیاست میں ہمیشہ اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔ عبدالکریم ریفی اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔

۱۹۲۶ء میں یہ قبیلہ تقریباً چالیس ہزار افراد پر مشتمل تھا۔ بنی

اُریافل کا علاقہ شمال میں خلیج البوتھمس سے مشرق، مغرب اور جنوب تک ۲۰۸۰۰ مربع کلومیٹر رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔

شمال میں خلیج البوتھمس کے گرد وپیش وسیع میدان ہے جس کے وسط میں ریف کا سب سے بڑا شہر اجدیر واقع ہے۔ بارش اس علاقے میں بہت کم ہوتی ہے، مگر جب بھی ہوتی ہے خوب موسلا دھار اور اچانک ہوتی ہے ــــــ علاقے کے دو بڑے دریا نیکور اور غیس اپنے کناروں سے اچھل پڑتے ہیں۔ ریفی موسم خزاں اور سردیوں میں ترکاریاں اور جَو بوتے ہیں اور گرمیوں میں کاٹتے ہیں۔ کام کاج کی تفصیل کا اعلان گاؤں کا مکھیا، جسے فقیہ کہتے ہیں، ہر ہفتے نمازِ جمعہ کے بعد کرتا ہے۔ ریفی میوہ دار درخت بھی اُگاتے ہیں اور بکریاں بھی پالتے ہیں۔ کھیتی باڑی زیادہ تر امداد باہمی کی بنیادوں پر ہوتی ہے ــــــ نہایت خلیق اور خوش اطوار انسان ہیں۔ شرم و حیا اور عجز و انکسار ان کے کردار کی نمایاں خصوصیت ہے۔ بے شرمی اور غرور و تکبر ان کے نزدیک لائقِ تعزیر جرم ہے۔ بڑے سے بڑا کارنامہ انجام دینے کے بعد بھی آپ ان کی زبان سے اس کا ذکر نہ سنیں گے۔ بڑا نکتے اور اپنا فرض ادا کرنے کے بعد اس کی ڈونڈی پیٹنے کو نہایت معیوب سمجھتے ہیں ــــــ بہت کم گو ہیں۔ مذہب کے شیدائی اور نماز روزے کے سخت پابند ہیں۔ بڑے محنتی، جفاکش اور جنگجو، رائفل چلانے میں مشاق ہیں، نشانہ شاذ و نادر ہی چوکتا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں رائفل ریفیوں کا عام ہتھیار تھا جسے ہر شخص اپنے پاس رکھنا ضروری سمجھتا تھا۔ جب کوئی لڑکا جوان ہوتا، تو نشانِ مردانگی کے طور پر اُسے رائفل دی جاتی۔

ریفیوں کے مکانات عموماً ایک منزلہ مربع یا مثلث نما ہوتے ہیں، کمرہ عموماً ایک ہی ہوتا ہے۔ صحن وسیع اور کشادہ ــــــ ہر مکان کے گرد و پیش ناگ پھنی کے گھنے جھنڈ ہوتے ہیں، اور حفاظت کے لیے کئی کئی کتے۔ ۱۹۲۲ء تک ہر گھر قلعے کی طرح تھا۔ گھر کے قریب ایک بلند مینار ہوتا جس پر بیٹھ کر گھر والا اپنے دشمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھتا۔ جونہی دشمن آنا دکھائی دیتا، اُسے گولی سے اڑا دیتا۔ عبدالکریم کے حکم سے یہ مینار منہدم کر دیے گئے۔ ریفیوں میں قبائلی دشمنی کی جڑیں بڑی گہری تھیں۔ ایک مرتبہ دشمنی کا بیج پڑ جاتا تو اس کی فصل نسل در نسل کٹتی رہتی۔ انتقام در انتقام کا چکر کبھی ختم ہونے میں نہ آتا۔

ایک ہی مورثِ اعلیٰ کی نسل سے وجود میں آنے والے کئی خاندانوں کی ایک برادری اور پانچ برادریوں کا ایک خیل اور کئی خیل مل کر ایک قبیلے کی شکل اختیار کرتے۔ ہر سطح پر ایک مجلسِ شوریٰ ہوتی اور ان سب کے اوپر قبیلے کی مجلسِ شوریٰ تھی۔ یہ مجلس جنگ و صلح، غیر قبائل کے ساتھ تعلقات اور مختلف قبائلی امور کے متعلق فیصلے کرتی تھی۔ ابتدائی سطح کی شوریٰ کا اجلاس بالعموم مسنڈی میں ایک بڑے درخت کے نیچے منعقد ہوتا۔ شوریٰ کے ارکان حلقہ بنا کر بیٹھتے۔ شوریٰ قتل، چوری اور بدکاری کے مقدمات کی سماعت بھی کرتی تھی۔ سزا کے طور پر قاتل کا گھر جلا دیا جاتا اور اس کے درخت کاٹ دیے جاتے۔ قاتل کو حکم ہوتا کہ وہ مقتول کے وارثوں کو زرِ فدیہ دے، لیکن ایک قتل بالعموم خاندانی دشمنی اور پھر انتقامی جنگ کی صورت اختیار کر لیتا تھا؛ چنانچہ قبیلے کی مجلسِ شوریٰ کو آگے بڑھ کر مداخلت کرنا پڑتی، تب کہیں جا کر یہ جنگ رکتی۔

ریف کی تمدنی زندگی میں ان گنت خرابیاں تھیں۔ لاقانونیت کے مظاہر قدم قدم پر نظر آتے تھے۔ جذبات کی تیزی اور خون کی حدت کا یہ عالم تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر لڑائی جھگڑے اور قتل ہو جاتے اور پھر خاندانی دشمنیاں پڑ جاتی تھیں۔ شرۃ ابو رسن کے ایک شیخ کے ہاں کوئی شخص مہمان ٹھہرا۔ اس کا گھر بنی القاسم کے ایک آدمی نے مار ڈالا۔ بنی القاسم سے کہا گیا کہ وہ تاوان کے طور پر پچاس ڈالر ادا کر دیں، مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فریقین میں جنگ چھڑ گئی۔ پہلے دن بارہ آدمی مارے گئے۔

جلد ہی فریقین کے حلیف اور اتحادی بھی اس جنگ میں شامل ہو گئے اس بھیانک جنگ میں ۸۴ آدمی ایک فریق کے اور ۹۲ دوسرے فریق کے مارے گئے۔ اِکّا دُکّا اور چوری چھپے قتل اور زہر کھلانے کے نتیجے میں اموات اِن کے علاوہ تھیں۔ آخر مفتوح فریق اپنا گھر بار چھوڑ کر زرحون کے پہاڑ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا، کیونکہ اس کے سارے جوان مرد مارے جا چکے تھے۔ بوڑھے مردوں عورتوں اور بچوں کے سوا کوئی نہ رہا تھا۔

(۴)

یہ تھی ریف اور اہلِ ریف کی سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی حالت جب فرانس نے مراکش پر قبضہ کرنے کے لئے برطانیہ کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا اور اسے مطمئن کرنے کی خاطر اس علاقے کو سپین کی عملداری میں دے دیا۔

اِس خفیہ سودے بازی کو زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ ریفیوں اور سپین کی فوجوں میں تصادم شروع ہو گیا۔ اس کی ابتدا ملیلیا کی کانوں سے شروع ہوئی۔ جب مراکش میں خانہ جنگی چھڑی، تو بوحمیرا نامی ایک شخص نے مراکش کے تخت کا دعویٰ کر دیا۔ اس نے کہا کہ وہ مرحوم سلطان کا بھائی ہے اور ریف کے جنوب میں تزّہ کے مقام پہ حکومت قائم کر لی۔ پھر سلطانِ مراکش کے مخالف عنصر کو جمع کیا، اور ریف پر چڑھ دوڑا۔ سپین کی حمایت حاصل کرنے کے لئے اس نے ملیلیا کے نزدیک لوہا نکالنے کے حقوق سپینیوں کے ہاتھ فروخت کر دئے۔ یہ سراسر ناجائز سودا تھا۔ بوحمیرا کو اس خرید و فروخت کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ محمد بن عبدالکریم کے قبیلے بنی اُریاغل نے اس کی سخت مخالفت کی اور عبدالکریم (اکبر) کی قیادت میں بوحمیرا کو شکست دے کر ریف سے باہر نکال دیا۔ سپین نے کان کنی شروع کر دی تھی۔ اس نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ بوحمیرا نے کان کنی کے حقوق ناجائز طور پر دئے تھے۔ ریفی چھاپہ ماروں نے سپینی کان کنوں پر حملوں کا سلسلہ چھیڑ دیا۔ کئی کان کن مارے گئے۔ فرانسیسی گورنر جنرل مارینا فوج لے کر ان کی حفاظت کے لئے ملیلیا سے نکلا۔ ریفیوں نے اسے مار بھگایا۔ جنرل مارینا نے سپین سے کمک طلب کی جو فوراً بھیج دی گئی، اس پر وہاں ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مخالفین نے فوجوں کو روکنے کی کوشش کی۔ ملاگا اور بارسیلونا میں زبردست فسادات ہوئے۔ مزدوروں نے گرجوں اور کنونشن کو آگ لگا دی۔ بیشمار JESUITS پادری راہب اور مشنری مارے گئے۔ ادھر ملیلیا کے باہر ریفیوں نے زبردست جنگ کے بعد جنرل مارینا کو تباہ کن شکست دے دی۔ مرنے والوں میں دو جرنیل بھی تھے۔ اتنے میں چالیس ہزار فوج سپین سے پہنچ گئی۔ دست بدست جنگ کے بعد ریفیوں کو شکست ہوئی اور وہ پہاڑوں میں غائب ہو گئے۔ سپین نے سمجھا کہ قصہ ختم ہو گیا ہے، لیکن اسے جلد ہی پتہ چل گیا کہ ریفی تر نوالہ نہیں، لوہے کے چنے ہیں۔ انھوں نے سپین کے خلاف گوریلا جنگ چھیڑ دی۔ وہ پہاڑی کمین گاہوں سے اچانک نمودار ہوتے اور مار دھاڑ کر کے چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتے۔ اسی زمانے میں جبالہ کا ایک عرب سردار ریسولی ریف کے اُفق پر ابھرا۔ اس نے سپینی فوجوں کو کئی بار شکست دی۔ ۱۹۱۲ء میں مراکش میں خانہ جنگی کی آگ پھر بھڑک اٹھی اور مولائی حفیظ کی جگہ مولائی یوسف برسرِ اقتدار آ گیا۔ فرانس نے اس انقلاب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فاس پر قبضہ کر لیا۔ اس سے سپین کے حوصلے بھی بڑھ گئے۔ اس نے ایک طرف اوقیانوس کے ساحل پر لارشے کی بندرگاہ پر فوجیں اتار دیں، دوسری طرف وہ سیوتا سے اندرونِ ملک کی طرف بڑھا اور تطوان پر قابض ہو گیا۔ ریسولی سے تصادم ابھی جاری ہی تھا کہ جنگِ عظیم چھڑ گئی۔

(۵)

محمد بن عبدالکریم الخطابی اجدیر میں ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے باپ کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ عبدالکریم اجدیر کے قاضی یا جج تھے۔ ان کے ایک اور صاحب زادے کا

نام بھی محمد تھا۔ اوّل الذکر اپنے باپ کے نام پر عبدالکریم کے نام سے تاریخ میں مشہور ہیں اور مؤخرالذکر محمد الخطابی کے نام سے۔

آئندہ ہم ان دونوں کو ان کے معروف عوام ناموں سے اور ان کے والدِ گرامی کو عبدالکریم اکبر کے نام سے پکاریں گے۔ عبدالکریم نے اپنی زندگی کے ابتدائی دس سال اَجدیر میں گزارے۔ ان کے خاندان کا شمار شہر ہی کے نہیں پورے علاقے کے مُعزز خاندانوں میں ہوتا تھا۔ ان کے والد اپنے علم و فضل، دیانت اور عدل و انصاف کی وجہ سے مشہور تھے اور سب لوگ انہیں عقیدت و محبّت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس عظیم الشان خاندان کی آغوش میں اس ننھے بچّے نے تربیت پائی۔ ماحول کی آب و ہوا نے سیرت سازی پر عمدہ اثر ڈالا۔

پانچ برس کی عمر میں عبدالکریم کو مکتب میں بٹھایا گیا جہاں انھوں نے قرآنِ کریم حفظ کیا۔ یہاں پانچ سال تک پڑھتے رہے۔ ۱۸۹۲ء میں ان کے چھوٹے بھائی محمد الخطابی پیدا ہوئے۔ اسی سال ان کا خاندان ایک پُرانی بھولی بسری انتقامی لڑائی میں اُلجھ گیا۔ عبدالکریم اکبر چونکہ جاہلیت کے اس رواج کے سخت مخالف تھے، اس لئے انھوں نے انتقام در انتقام کے خونی چکّر میں پڑنے کے بجائے اَجدیر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ وہ اپنے بال بچّوں کو لے کر تطوان چلے گئے۔ یہاں یہ خاندان سات برس تک رہا۔ تطوان اس علاقے میں علم و تہذیب کا مرکز تھا۔ یہاں کا مدرسہ دُور دُور تک مشہور تھا۔ عبدالکریم نے اس مدرسے میں عربی زبان اور اسلامی قانون کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اسی اثنا میں اَجدیر کا جھگڑا کسی طرح چُک گیا۔ عبدالکریم اکبر یہ خبر سن کر ۱۸۹۹ء میں واپس اجدیر چلے گئے۔ عبدالکریم اس وقت سترہ برس کے ہو چکے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے فاس چلے گئے اور قیروان یونیورسٹی میں داخل ہو گئے جس کا شمار دنیا کے قدیم ترین علمی مراکز میں ہوتا تھا۔

عبدالکریم اکبر ابتدا میں فرانس اور سپین کے متعلق حُسنِ ظن رکھتے تھے۔ وہ ریف میں سپین کے بڑھتے ہوئے اثرات کے زیادہ مخالف نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ برابر کی سطح پر کسی مُہذّب قوم کے ساتھ روابط مفید ہی رہیں گے۔ ریف پسماندہ ہیں، انہیں ڈاکٹروں، اساتذہ، اور قدرتی وسائل کو کام میں لانے کے لئے انجنیروں کی ضرورت ہے، لیکن ان کی اس خوش فہمی کا تار و پود بہت جلد بکھر گیا۔ سپین بھی مغرب کی دوسری سامراجی طاقتوں کی طرح ریف میں استعماری عزائم رکھتے تھے۔ عبدالکریم اکبر نے جب ان کے مذموم عزائم کے خلاف آواز بلند کی، تو قلعہ مِنیان کے گورنر نے ایک فوجی دستہ بھیج کر اُن کے گھر کو آگ لگوا دی۔ عبدالکریم اکبر نے ریفیوں کو سپینیوں کے خلاف متحد اور صف آرا کرنے کی جدّوجہد شروع کر دی۔ ۱۹۰۹ء میں عبدالکریم بھی تعلیم مکمل کر کے پہنچ گئے اور اس مہم میں اپنے والد کے ساتھ شریک ہو گئے۔ بُوحمیرا کو ریف کے علاقے سے نکالنے کے لئے عبدالکریم اکبر نے جو جنگ لڑی، اس میں عبدالکریم نے بھی حصّہ لیا۔ جنگ ختم ہو گئی، تو باپ نے انھیں ملیلیا بھیج دیا۔ جہاں انھوں نے وکالت شروع کر دی۔

عبدالکریم جب ملیلیا پہنچے، تو ریف کی کانوں کا جھگڑا شروع ہو چکا تھا۔ یہ جھگڑا کئی سال تک رہا اور متعدّد لڑائیاں ہوئیں۔ عبدالکریم اس دوران میں سال بھر تک ایک مقامی درس گاہ میں پڑھاتے رہے، پھر ملیلیا کے سپینی اخبار ٹیلیگراما ڈل ریف کا عربی صفحہ مرتّب کرنے لگے۔ اسی زمانے میں ملکی امور کے محکمے کے سکرٹری بنا دیے گئے۔ ۱۹۱۴ء میں فوجداری عدالت کے کونسلر مقرر ہوئے۔ دو سال بعد انھیں ترقی دے کر چیف جسٹس بنا دیا گیا۔ اور دیسی باشندوں کے فوجداری اور دیوانی مقدمات کی سماعت کرنے لگے۔ دراصل سپینی عبدالکریم کو اعلیٰ منصب دے کر ان کا تعاون حاصل کرنا چاہتے تھے۔ سپینیوں نے ریف پر قبضہ کرنے کے بعد عبدالکریم کو پورے ملک کا گورنر بنا دینے کی بھی پیشکش کی،

مگر انھوں نے اس بھاری رشوت کو مسترد کر دیا۔ انھوں نے کہا، "وہ سپین کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں، مگر پہلے انھیں اطمینان ہونا چاہیے کہ سپینی ریف میں استعماری مقاصد نہیں رکھتے۔"

ایک اعلیٰ مناصب سے عبدالکریم کو بہت سے فائدے پہنچے۔ انھیں سپینی حکام کو قریب سے دیکھنے اور ان کے عزائم کو جانچنے کا موقع ملا۔ دوسری طرف لوہے کی کان میں کام کرنے والے جرمن انجنیئروں اور جرمن کمپنی کے دیگر عہدے داروں سے روابط پیدا ہوئے۔ انھی مناصب کی بدولت عبدالکریم کو ریف سے متعلق سپین کی خفیہ دستاویزات تک رسائی حاصل ہوئی جن کے آئینے میں سپینیوں کے حقیقی خدوخال پوری طرح روشن اور واضح ہو گئے۔ سپینی دنیا کو دھوکا دینے کے لیے کہا کرتے تھے کہ ریفی، حکومت کے امور میں برابر کے شریک ہیں اور ریف کی سرزمین میں چھپی ہوئی معدنیات اگر نکالی گئیں، تو اس کا فائدہ ریفیوں کو پہنچے گا۔ ان دستاویزات نے عبدالکریم کی آنکھیں کھول دیں۔ اگر کوئی خوش فہمی ان کے دل میں باقی تھی، تو وہ بھی جاتی رہی۔ انھوں نے جرمنوں سے مدد مانگی۔ جرمن کمپنی کے عہدیداروں نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ ٹیلیگرافا کا عربی صفحہ وہ ابھی تک مرتب کرتے تھے۔ اس صفحے میں انھوں نے مراکش کو فرانس اور سپین کے درمیان تقسیم کرنے کے خفیہ منصوبے پر احتجاج کیا۔

انھی دنوں ریف میں متعین سپینی فوجوں کا کمانڈر جنرل سلوسٹر ملیلیا کے دورے پر آیا۔ عبدالکریم نے اس سے ملاقات کی۔ مشہور ہے کہ پہلے ان کے درمیان تلخ کلامی ہوئی اور پھر دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ حقیقت جو کچھ بھی ہو، اس ملاقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ سپینی حکومت نے عبدالکریم کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ ۱۹۱۶ء کی ایک رات انھوں نے جیل سے فرار ہونے کی کوشش کی۔ وہ ایک رسّے کے ذریعے جیل کے "ٹاور" سے اترے، مگر رسّہ چھوٹا نکلا۔ انھوں نے دوبارہ اوپر چڑھنا چاہا، لیکن بھاری بھرکم تن و توش کی وجہ سے ناکام رہے۔ آخر دس فٹ کی بلندی سے کود تو گئے، مگر ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ پہرے داروں نے انھیں آ کر اٹھایا اور ہسپتال پہنچا دیا۔ ڈاکٹروں نے ٹانگ کاٹنے کا مشورہ دیا۔ عبدالکریم نے انکار کر دیا۔ انھیں صحت تو مل گئی، تاہم اس حادثے کے نتیجے میں عمر بھر کے لیے لنگڑے ہو گئے۔ سال ختم ہونے سے پہلے انھیں یرغمالوں کے بدلے میں رہا کر دیا گیا اور وہ اجدیر چلے گئے۔ دو سال تک گھر ہی پر رہے۔ ۱۹۱۸ء میں ملیلیا واپس آئے اور دوبارہ دیسی عدالت کے چیف جسٹس مقرر کر دیے گئے۔ اسی زمانے میں ان کے چھوٹے بھائی محمّد الخطابی انجنیئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے میڈرڈ روانہ ہوئے۔ ملیلیا میں عبدالکریم کو پتہ چلا کہ سپینی، ریف کے ان تمام سرداروں کو قتل کروانے کا منصوبہ تیار کر رہے ہیں جو سپین کے مخالف ہیں۔

جنگِ عظیم ختم ہوتے ہی سپین نے مراکش کے شمالی منطقے کو فتح کرنے کی رفتار تیز کر دی۔ سپین کی داخلی صورتِ حال بگڑتی جا رہی تھی۔ جنگ کے زمانے میں سپین اتحادیوں کے ہاتھ سامانِ خوراک، خام لوہا اور گولہ بارود فروخت کرتا رہا تھا جس سے ملک میں عارضی طور پر خوشحالی کا دور دورہ ہو گیا تھا۔ جنگ کے ساتھ یہ نفع بخش کاروبار بھی ختم ہو گیا۔ ادھر عوام سپین پر مسلط نظامِ حکومت سے غیر مطمئن تھے۔ بڑھتی ہوئی بیکاری اور بدحالی نے اس بے اطمینانی میں مزید اضافہ کر دیا۔ اصلاحات کا مطالبہ شروع ہو گیا۔ ۱۹۲۰ء تک اقتصادی حالت ابتر ہو گئی — تنخواہ اور ترقی کے مسئلے پر فوج میں بھی بے چینی پھیل گئی اور خانہ جنگی کا خطرہ سر پر منڈلانے لگا۔ فوج اور عوام کی توجہ داخلی مسائل سے ہٹانے کے لیے شاہ الفانسو نے جنرل سلوسٹر کو ریف میں پیش قدمی کے خفیہ احکام جاری کر دیے۔

۱۹۱۹ء کے اواخر میں عبدالکریم ملیلیا سے اجدیر چلے گئے

ان کے والد عبدالکریم اکبر بستر مرگ پر پڑے تھے۔ عبدالکریم کے گھر والوں کا بیان ہے کہ انھیں عبدالسلام التفرسیلی نامی ایک ریفی نے ہسپینوں کے اشارے پر زہر دیا گیا۔ ان دنوں وہ ریف کے دورے پر تھے اور جگہ جگہ اجتماعات منعقد کر کے ریفیوں کو ہسپین کے استعماری عزائم سے خبردار کر رہے تھے۔ تفرسیط پہنچے اور عبدالسلام کے یہاں ٹھہرے۔ اس نے انڈوں کا ایک پیالہ اُن کے سامنے رکھا۔ عبدالکریم اکبر نے ایک انڈا کھایا، فوراً ہی اُن کے پیٹ میں درد اٹھا۔ لیکن قبائلی رواج کے مطابق وہ پورا کھانا کھائے بغیر دسترخوان سے نہیں اُٹھ سکتے تھے۔ اجدیر پہنچتے پہنچتے بستر سے لگ گئے۔ فوراً ہی محمد الخطابی کو میڈرڈ سے بُلایا گیا۔ مرنے سے پہلے انھوں نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ وہ ریف کی جنگِ آزادی کے لئے آخر دم تک لڑیں۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۲۰ء کو ان کا انتقال ہو گیا اور عبدالکریم ان کے جانشین اور اجدیر کے جج بن گئے۔

عبدالکریم نے ستمبر کا آخری ہفتہ اور پورا اکتوبر ریف کے دورے میں گزارا۔ اکتوبر کے اواخر میں کالا کے مقام پر ریفی قائدین اور شیوخ کی موتمر منعقد ہوئی جو ناکام ہو گئی۔ عبدالکریم اجدیر چلے گئے۔ کچھ دن بعد اجدیر ہی کے ایک اچھے گھرانے میں شادی کر لی اور پھر نئے سرے سے پر تُل کھڑے ہوئے۔ اس مرتبہ انھوں نے صرف اپنے قبیلے بنی اُریاغل کے قصبوں اور دیہات کا دورہ کیا۔ انھیں سر پر منڈلاتے ہوئے خطرے سے متنبہ کیا اور کہا،

"دوسرے قبیلے تمھارا ساتھ دیں یا نہ دیں، تمھیں مشترکہ دشمن کے مقابلے میں متحد ہو جانا چاہئے۔"

عبدالکریم کی یہ جدوجہد آخر نتیجہ خیز ہوئی۔ بنی اُریاغل باہمی دشمنیاں اور مناقشے ترک کر کے اُن کے پرچم تلے جمع ہونے لگے۔ ہسپین نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے اُن کے اس اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی اور خطابیوں کے مخالف خاندان کو ان کے خلاف اُکسایا، مگر ان ایجنٹوں کو منہ کی کھانی پڑی۔ عبدالکریم نے اپنے دورے کے دوران میں ہر جگہ لوگوں کو فوجی حکمتِ عملی سے بھی آگاہ کیا۔ انھوں نے کہا،

"مجتمع ہو کر کہیں مت لڑو، ہم جدید ترین ہتھیاروں سے لیس تربیت یافتہ فوج کا مقابلہ کھلے میدان میں نہیں کر سکتے، ہمیں گوریلا جنگ لڑنی پڑے گی، بجلی کی طرح دشمن پر ٹوٹ پڑو اور قتل و غارت کا بازار گرم کر کے پہاڑوں کی گھاٹیوں اور کمین گاہوں میں غائب ہو جاؤ۔"

مشرق میں ایک چھوٹا سا قبیلہ تسامان رہتا تھا۔ اسی طرف سے ہسپینوں کے حملے کا امکان تھا۔ عبدالکریم نے ان سے تعاون کی درخواست کی۔ ان لوگوں نے بڑے پیمانے پر امداد کرنے سے معذوری ظاہر کی، البتہ وعدہ کیا کہ جب ہسپینی افواج حملہ آور ہوں گی، تو وہ اہم پہاڑی چوٹیوں پر الاؤ روشن کر کے اُن کی یلغار کی خبر دے دیں گے۔

(۶)

۱۹۲۱ء کا اپریل شروع ہو چکا تھا۔ جبلِ حمّان کی چوٹیوں پر برف پگھلنے لگی تھی۔ ریف میں موسم بہار کا آغاز قدرے دیر سے ہوا۔ جنرل سلوسٹر حملے کا منصوبہ تیار کر چکا تھا۔ وزیرِ جنگ اور طلیلیا کا ہائی کمشنر جنرل برنگیر ریف میں غیر محتاط فوجی اقدامات کے سخت مخالف تھے، مگر شاہ الفانسو کے نزدیک داخلی مسائل کا حل مراکش میں ہسپینی افواج کی فاتحانہ پیش قدمی میں مضمر تھا۔ اس نے سلوسٹر کو حملے کا حکم دیتے ہوئے لکھا،

"جس طرح میں کہتا ہوں، اس پر عمل کرو، وزیرِ جنگ کی بات پر کان نہ دھرو، وہ تو احمق ہے۔"

جنرل سلوسٹر بہادر، پرجوش اور پاگل پن کی حد تک مغرور، ناعاقبت اندیش اور گرم مزاج تھا۔ ریفی اس کی نظروں میں نہایت حقیر تھے۔ وہ انھیں "زنانہ سپاہی" کہا کرتا تھا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ اچانک حملہ کرے گا اور بنی اُریاغل کے علاقے میں مردانہ وار گھستا چلا جائے گا اور اس سے پہلے کہ وہ مجتمع ہوں، اُن کا تیا پانچا کر دے گا۔ بنو اُریاغل مغلوب ہو گئے، تو جنگ ختم ہو جائے گی۔

دوسرے قبیلے اُن کے بغیر ہسپینی افواج کی مزاحمت نہیں کر سکیں گے اور پورا ریف اس کے قدموں میں آ گرے گا۔ اسے خبر مل چکی تھی کہ عبدالکریم ریفی قبائل کو متحد کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ ملیلیا میں اس کے پاس ۲۰ ہزار ہسپینی اور چار ہزار دیسی فوج تھی۔ خلیج الہوتمس میں قلعہ پنیان کی محافظ فوج تھی۔ اُدھر مشرق سے سلوسٹر یلغار کرے گا، اُدھر شمال سے یہ فوج ریفیوں کی پشت پہ ضرب لگائے گی۔ اَجدیر پہنچنے کے لئے دو راستے تھے۔ ایک لمبا جو جنوبی پہاڑوں کا چکر کاٹتے ہوئے اَجدیر پہنچتا تھا، یہ راستہ وقت بھی لیتا تھا اور محفوظ بھی تھا۔ دوسرا چھوٹا راستہ تھا جو پہاڑوں اور وادی اقرموس میں سے ہو کر کوہ ابران کو پیچھے چھوڑتا چلا گیا تھا۔ ہسپینی ان پہاڑوں سے بالکل ناواقف تھے، ان کی پگڈنڈیاں سخت خطرناک، گھاٹیاں نہایت عمیق اور ڈھلوانیں بالکل سیدھی تھیں۔ سلوسٹر نے اس راستے کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ آخری تیاریاں کر رہا تھا کہ الفانسو کا تار پہنچا:

"میں انتظار کر رہا ہوں۔"

سلوسٹر نے یلغار کا حکم دیا۔

ہسپینی فوج ٹڈی دل کی طرح ملیلیا سے نکلیں اور پہاڑیوں کی طرف بڑھیں۔ سلوسٹر تصور ہی تصور میں عظمت و شوکت کی راہ پر گامزن تھا۔ اس نے شیخی بگھارتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ ایک مہینے کے اندر اندر جدرین کے چشمے پر اپنے گھوڑے کو پانی پلائے گا اور سیدی ادریس کے مزار پر اپنے بوٹ صاف کرے گا۔ افریقہ کا گرم سورج آگ برسا رہا تھا، گرد و غبار کے بادل اُٹھ اُٹھ کر فضا میں پھیل رہے تھے۔ لمبی سیاہ قطاریں سانپوں کی طرح لہراتی اور بَل کھاتی ہوئی بڑھ رہی تھیں۔ فوجی بینڈ ہسپین کی عظمت و سطوت کے ترانے گا رہے تھے۔ فوجیوں کے ساتھ نوجوان عورتوں کی بھی ایک جماعت تھی۔ اب وہ دریائے کرت عبور کر رہے تھے۔ گزشتہ پانچ سو سال میں یہ پہلا موقع تھا کہ

ہسپینی افواج یہاں تک پہنچی تھیں۔ آگے پہاڑی سلسلہ شروع ہو رہا تھا۔ ہسپینی کسی مزاحمت کے بغیر وادی اقرموس کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں قبیلہ تمسامان رہتا ہے۔ یہ وادی بیس میل چوڑی ہے، بلند بالا پہاڑوں سے گھری ہوئی۔ بیچ وسط میں ایک قصبہ انوال ہے، پہاڑوں میں چار ہزار فٹ کی بلندی پر پیچ و خم کھاتے ہوئے دو ناہموار رستے ہیں۔ سلوسٹر بے روک ٹوک پہاڑوں میں گھستا چلا گیا۔ فوج پیش قدمی کے ساتھ ساتھ اہم مقامات اور ناکوں پر مضبوط گڑھیاں تعمیر کرتی جا رہی تھی تاکہ عقب محفوظ رہے ——— سامان رسد کسی رکاوٹ کے بغیر فراہم ہوتا رہے اور اگر پسپا ہونا پڑے، تو ان گڑھیوں سے فوج کی حفاظت کی جا سکے۔ اب ہسپینی افواج بنو سعید کے علاقے سے گزر رہی تھیں۔ بنو سعید ایک چھوٹا سا قبیلہ ہے، لیکن بڑا بہادر اور جانباز۔ اس نے ہسپینیوں کی بالکل مزاحمت نہ کی۔ اب سلوسٹر نے اپنی فوج کے تین حصے کر دیئے۔ ایک حصے کو لے کر وہ خود سیدی ادریس کے مزار کی طرف بڑھا اور دوسرا حصہ پہاڑ میں ایک پگڈنڈی پر ہو لیا اور تیسرا دوسری پگڈنڈی پر۔ مقامی قبائلیوں کو ہسپینیوں نے رشوت دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ اس لئے یہاں بھی انھیں کسی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ دونوں فوجیں بیدھڑک پہاڑ پر چڑھتی چلی گئیں۔ اب چڑھائی ختم ہو کر ڈھلوان شروع ہو گئی تھی۔ دونوں افواج نے بے خوف و خطر اُتر کر وادی پر قبضہ کر لیا اور باہم مل گئیں۔ بنو تمسامان نے بھی کوئی مزاحمت نہ کی، لیکن انھوں نے اپنا وعدہ ایفا کیا۔ رات کے وقت مقررہ مقامات پر الاؤ روشن کر دئے۔

بنو اُریاغل نے مشرقی پہاڑوں پر الاؤ جلتے دیکھے تو وہ ہوشیار ہو گئے۔ آناً فاناً پورے علاقے میں خبر پھیل گئی کہ ہسپین نے حملہ کر دیا ہے۔ عبدالکریم نے ٹھیک پیشین گوئی کی تھی۔ ہر جگہ یہی چرچا تھا۔ عبدالکریم نے خبر ملتے ہی بنو اُریاغل کے سرداروں کے پاس پیغامبر بھیجے، لیکن بہت کم لوگوں نے جواب دیا۔ بصفحہ ۱۲۰ از اد

نے ان کی پکار پر لبیک کہی۔ ان میں بھی زیادہ تعداد سولہ سے بیس برس تک کے نوجوانوں کی تھی۔

عبدالکریم نے حوصلہ نہ ہارا۔ وہ ان لوگوں کے متعلق خوب جانتے تھے۔ یہ وہ جفاکش لوگ تھے جن کی ساری زندگی اُن پہاڑوں پر دوڑتے بھاگتے، جست کرتے اور چڑھتے اُترتے گزری تھی۔ وہ ان کے چپے چپے سے واقف تھے۔ ان میں ہر شخص جنگجو اور بہادر تھا۔ بلا کا قدر انداز۔ مرنے مارنے کو بچوں کا کھیل سمجھتا تھا۔ ہر ایک اپنی رائفل اور پانی ساتھ لے کر آیا تھا۔ سب کے پاس ماؤزر رائفلیں تھیں جو انھوں نے ہسپانوی چھاؤنی ملیلہ کی منڈی میں خریدی تھیں۔ سوال گولیوں کا تھا۔ ہر شخص کے پاس صرف دس دس راؤنڈ تھے۔ عبدالکریم کو اس صورتِ حال کا پہلے ہی سے اندازہ تھا۔ انھوں نے سولہ سو راؤنڈ ایک ہسپانوی افسر سے بڑی گراں قیمت پر خرید لیے تھے اور ساری رقم اپنے پلے سے خرچ کی تھی۔ عبدالکریم نے اس ننھی منی فوج کا جائزہ لیا۔ ان سے یہ عہد لیا کہ وہ مر جائیں گے، لیکن پیچھے نہ ہٹیں گے، آخری دم تک دشمن سے لڑیں گے۔ اللہ اکبر کا نعرہ فضا میں بلند ہوا اور حرکہ (لشکر) رات کے وقت عبدالکریم کی قیادت میں پہاڑوں کی طرف روانہ ہو گیا۔ محمد الخطابی بھی اس فوج میں شامل تھے۔ صبح سویرے نور کے تڑکے یہ لوگ مشرقی پہاڑوں کے دامن میں پہنچ گئے اور دن بھر پہاڑ پر چڑھتے رہے۔ وہ کوہ ابران کی طرف بڑھ رہے تھے جس کی بلند چوٹی وادیٔ اقرموس کے عین اُوپر شمال میں تھی۔

مئی ۱۹۲۱ء کے اواخر تک چودہ ہزار ہسپانوی فوج وادیٔ اقرموس میں خیمہ زن ہو چکی تھی۔ اس کے پیچھے ملیلیا کے دروازوں تک فوجی چوکیوں کی ایک پتلی سی قطار چلی گئی تھی۔ ہر چوکی پر محافظ فوج متعین کر دی گئی تھی۔ وادی میں پہنچتے ہی ہسپانیوں نے گرد و پیش کی پہاڑیوں پر قلعے تعمیر کر لیے۔ سلوسٹر سپلائی لائن کو محفوظ کرنے کے بعد کوہ ابران کے نیچے تنگ درّے سے گزر کر مغرب کی طرف بڑھنا چاہتا تھا۔ اس اہم مقام پر اس نے ایک قلعہ کی تعمیر کر لیا تھا جس میں پانچ سو محافظ متعین کیے گئے تھے۔ ابران، وادیٔ اقرموس اور مغرب کی طرف جانے والے راستے، دونوں پہاڑ پر سے جھانک رہا تھا۔ ابران پر جو بھی فوج قابض ہوتی، وہ مارٹروں اور توپوں کی مدد سے گھاٹی کے راستے اور وادی کے مغربی حصے پر حریف کے قبضے کو غیر محفوظ بنا سکتی تھی۔ ارد گرد پہاڑیوں پر جو قلعے تعمیر کیے گئے تھے، وہ بنیادی اہمیت رکھتے تھے۔ ہسپانیوں کے ہاتھ سے نکل جانے کی صورت میں پورا لشکر ایک پنجرے میں بند ہو کر رہ جاتا تھا۔ ان قلعوں پر قابض رہنا ہر حالت میں ضروری تھا، چاہے ہسپانیہ آگے بڑھنے کا ارادہ کرے یا وہیں مقیم رہنے کا۔ سلوسٹر آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ اسے ریفیوں کی طرف سے کسی مزاحمت کی توقع نہ تھی۔ اس کے تصور میں بھی نہ تھا کہ مشین گنوں، مارٹروں یا توپوں کے بغیر قبائلیوں کا ایک چھوٹا سا نیم مسلح گروہ ایک فوج کی قیادت میں اس کی مزاحمت پر آمادہ ہو سکتا ہے۔

عبدالکریم اور اس کے ساتھی اسی روز رات کو کوہ ابران کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ اگلے روز علی الصبح عبدالکریم اور محمد الخطابی نے ایک بلند چٹان کے پیچھے سے جھانک کر نیچے وادی میں نظر دوڑائی۔ عبدالکریم کے پاس دوربین تھی اور محمد الخطابی کے پاس ٹیلی سکوپ۔ محمد الخطابی دشمن کی بے پناہ فوج دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ وادی میں دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ وادی کے شہر انوال کے ارد گرد خیمے اور چھولداریاں نصب تھیں۔ کیمپ میں نقل و حرکت جاری تھی۔ کچھ لوگ پکٹ ڈیوٹی پر جا رہے تھے، کچھ سامانِ رسد لا رہے تھے، کچھ پانی بھر رہے تھے۔ بگل اور ڈھول بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

عبدالکریم کوہ ابران پر تعمیر شدہ قلعے کو غور سے دیکھ رہے تھے جو بالکل اُن کے بائیں جانب تھا۔ انھوں نے دوربین آنکھوں سے الگ کی اور کہا۔

• ابران کلید ہے، اگر یہ قلعہ سر ہو جائے تو پوری وادی ہمارے

قبضے میں ہوگی۔"

یہ بہت کٹھن کام تھا۔ قلعے کے چاروں طرف پتھر کی فصیل تھی اور پہاڑی کی ڈھلوانیں سیدھی اور خطرناک تھیں۔ قلعے کے دمدموں پر پانچ سو جوان متعین تھے جن کے پاس چار مشین گنیں، دو مارٹر اور ایک پہاڑی توپ تھی۔ دس میل پرے چودہ ہزار فوج خیمہ زن تھی۔

دونوں بھائی نیچے اترے، اپنے آدمیوں کے پاس پہنچے۔ وہ ان کے منتظر تھے۔ عبدالکریم نے فوراً مجلسِ مشاورت منعقد کی۔ سب اس بات پر متفق تھے کہ قلعے پر قبضہ کر لینا چاہیے لیکن سوال یہ تھا کہ ایسا ہو، تو کس طرح؟ دیر تک بحث ہوتی رہی۔ آخر منصوبہ تیار کر لیا گیا۔ ۲۱ مئی کی صبح کو منھ اندھیرے ریفی مجاہد قلعے پر ٹوٹ پڑے۔ وہ ساری رات قلعے کے گرد تنگ تنگ حلقوں کی شکل میں رینگ رینگ کر اوپر چڑھتے رہے۔ یہ بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی انھیں بہت گہری گھاٹیوں میں پھینک سکتی تھی، یا قلعے میں متعین فوج کو چوکنا کر سکتی تھی۔ ایک تیسرا گروہ محمد الخطابی کی کمان میں چوٹی کی شمال مشرقی سمت سے قلعے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا مقصد دشمن کو مغالطے میں ڈالنا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ صبح کی سپیدی نمودار ہوتے ہی یہ لوگ بے دھڑک قلعے کی طرف بڑھیں گے اور یہ ظاہر کریں گے کہ وہ دیسی امدادی فوج کی ریلیو فورس ہیں۔ رات کو وہ راستہ بھول گئے تھے۔ عبدالکریم صبح کا انتظار کر رہے تھے۔ آخر رات تمام ہوئی۔ محمد الخطابی کا دستہ قلعے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ شور سن کر قلعے کی محافظ فوج ہوشیار ہو گئی۔ پہرے دار للکارا۔ محمد الخطابی شستہ ہسپانوی زبان میں چلائے،

"ہم ہسپانوی فوج کے دیسی سپاہی ہیں۔"

قلعے کے اردگرد حلقہ باندھے ہوئے قدر اندازوں نے اپنی رائفلوں کا رخ دمدموں کی طرف کر دیا۔ ہسپانوی نیم بیداری کے عالم میں تھے ــــــ انھوں نے رائفلیں بھرنے کی آواز سنی اور نہ انھیں خاکی چادروں میں لپٹے ہوئے ریفی رینگتے نظر آئے۔ اب قلعہ بیس گز کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ عبدالکریم نے بلند آواز سے کہا،

"لا الٰہ الا اللہ"

ریفی تیزی سے قلعے کی طرف دوڑے۔ اس عرصے میں محمد الخطابی کے آدمی پھاٹک کے پہرے داروں کو موت کی نیند سلا چکے تھے۔ شور و غل سن کر ہسپانیوں نے دمدموں سے سر اٹھا کر دیکھا۔ رائفلوں کی نالیوں سے گولیاں سنسناتی ہوئی نکلیں اور ان کے سر میں پیوست ہو گئیں۔ اس عرصے میں [illegible] ریفی [illegible] کی دیوار پر چڑھ گئے۔ پہلے تو ہسپانوی ہکا بکا رہ گئے، پھر سنبھلے اور رائفلوں اور مشین گنوں کی طرف دوڑے۔ ایک افسر ریوالور تانے ایک خیمے سے نکلا۔ فوراً ہی ایک ریفی کی گولی نے اس کا کام تمام کر دیا۔

۱۲۵ مجاہد دمدموں میں گھس گئے تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں رائفل تھی اور دوسرے میں خنجر۔ انھوں نے موت کا بازار گرم کر دیا۔ ہسپانیوں میں افراتفری مچ گئی۔ وہ چیختے ہوئے بھاگے اور ایک ایک کر کے مارے گئے۔ بیس منٹ کے اندر اندر جنگ ختم ہو گئی۔

قلعے پر عبدالکریم کا قبضہ ہو گیا۔ اس دست بدست جنگ میں صرف چار ریفی شہید ہوئے۔ پانچ سو رائفلیں، دو مارٹر، ایک پہاڑی توپ اور چار مشین گنیں ہاتھ آئیں۔ ریفیوں نے اپنی ذہانت سے مشین گنیں اور توپ چلانی فوراً ہی سیکھ لی، البتہ مارٹر چلانے میں خاصی دقت پیش آئی اور ایک ریفی کو اپنے دائیں ہاتھ کی قربانی دینی پڑی۔ گھنٹے بھر کے اندر اندر وہ ایک بڑے حملے کو پسپا کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو چکے تھے۔

ہسپانوی فوج نے جوابی حملہ کر کے قلعہ چھیننا چاہا۔ ریفیوں نے توپ سے گولہ باری کر کے بڑھتی ہوئی فوج کے پرخچے اڑا دیے۔ باقی فوج پسپا ہو گئی۔ ہسپین کے پہاڑی توپ خانے نے قلعے پر گولہ باری کرنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ وادی کا شمالی حصہ اور اجدیر کو جانے والا راستہ اب عبدالکریم کی توپ اور مشین گنوں کی زد میں تھا۔

کوہ ابرن کا قلعہ چھن جانے کی خبر سلوسٹر کو سیدی ادریس میں ملی وہاں سے یہ خبر تطوان اور تطوان سے میڈرڈ پہنچ گئی۔

جوابی حملے کا خطرہ کم ہو گیا، تو عبدالکریم نے مجلس شوریٰ بلائی۔ طے ہوا کہ فتح کے ثمرات فوراً سمیٹنے چاہئیں اور قبیلہ تمسامان کو اپنے ساتھ ملانا چاہیے، لیکن یہ کام آسان نہ تھا۔ اس قبیلے کے زیادہ تر افراد اس علاقے میں رہتے تھے جس پر ہسپانوی افواج قابض ہو چکی تھیں۔ اس کٹھن کام کا بار خود عبدالکریم نے اٹھایا۔ وہ رات کی تاریکی میں تن تنہا خالی ہاتھ قلعے سے نکلے اور وادی میں سے گزر کر سامنے کی پہاڑی پر ایک گاؤں میں جا پہنچے۔ لوگوں کو جگایا کہ وہ قائدین کو بلا لائیں۔ تھوڑی ہی دیر میں لوگ جمع ہو گئے ——— عبدالکریم نے کہا،

"ہمیں عظیم الشان فتح حاصل ہوئی ہے اور اب تمہاری امداد کی ضرورت ہے۔ بنی اُریاغل اور تمسامان مل کر ہسپانیوں کو شکست دے سکتے ہیں۔ میں آپ لوگوں کے پاس مدد کی درخواست لیکر آیا ہوں۔"

قدیم قبائلی قانون کے مطابق تمسامان عبدالکریم کی اس براہِ راست درخواست کو قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ فوراً ہی قبیلے کی مجلس شوریٰ طلب کی گئی جس نے عبدالکریم کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ چھپائے ہوئے ہتھیار نکالے گئے اور پانچ سو قبائلیوں پر مشتمل لشکر چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر وادی کے گرد و پیش کی پہاڑیوں میں پھیل گیا۔ عبدالکریم بھی ایک ٹولی کے ساتھ ہو گئے اور ایک بڑے غار کو اپنا مرکز بنا لیا۔ پروگرام یہ تھا کہ مختلف پہاڑیوں پر ہسپانیوں نے جو فوجی قلعے تعمیر کیے ہیں، انھیں سر کیا جائے۔

جون کا پورا مہینہ اور جولائی کا ابتدائی حصہ ان قلعوں کو یکے بعد دیگرے فتح کرنے میں گزرا۔ یہ ایک عظیم الشان کارنامہ تھا جو بنی اُریاغل اور تمسامان کے ۵۰۰ آدمیوں نے انجام دیا، حالانکہ ہسپانیوں کی چودہ ہزار فوج دس میل سے بھی کم فاصلے پر مقیم تھی۔ جولائی کے وسط تک سارے قلعے فتح ہو چکے تھے اب یعنی مجاہدین پہاڑوں سے انزکر وادی کی طرف متوجہ ہوئے۔

(۷)

پہاڑ سے اتر کر وادی پر حملہ کرنے کا فیصلہ قبائلیوں نے جلسۂ عام میں کیا۔ یہ جلسۂ عام پہاڑ کی ڈھلوان پر ہسپانوی فوج کی آنکھوں کے بالکل سامنے ہوا۔ اب عبدالکریم کے لشکر کی تعداد پانچ چھ سو تک پہنچ گئی تھی ——— وادی میں چودہ ہزار ہسپانوی فوج تھی۔ گویا ایک اور تیس کا مقابلہ تھا۔ ۵ جون کو ہائی کمشنر برنگیر سیدی ادریس میں سلوسٹر سے ملا۔ سلوسٹر نے اسے بادشاہ کے احکام دکھلائے۔ برنگیر عجیب شش و پنج میں پڑ گیا۔ فوج کو واپسی کا حکم دے کر وہ بادشاہ کی مخالفت مول نہ لے سکتا تھا۔ آخر اس نے سلوسٹر سے اس بات پر مصالحت کر لی کہ وہ سر دست ریف میں پیشقدمی روک دے۔ اس نے متنبہ کیا کہ ریفی بڑے سخت جان ہیں۔

"میرے جوان بھی سخت جان ہیں۔" سلوسٹر نے شیخی بگھاری۔

اس نے بظاہر برنگیر کا کہا مان لیا، لیکن وہ سیدی ادریس ہی میں رہا اور بادشاہ کے تازہ احکام کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے عہد کیا کہ وہ انجدیر میں عبدالکریم کے گھر جا کر چائے پیئے گا۔ عبدالکریم نے اسی وقفے سے فائدہ اٹھایا اور ہسپانوی فوج کو حفاظتی چوکیوں سے محروم کر دیا۔

۱۵ جولائی کو ریفیوں نے وادی کے جنوب مغربی کنارے سیدی ابراہیم کے قریب ایک بلند قطعۂ زمین پر قبضہ کر لیا۔ ہسپانوی فوراً انزبین پر قابض ہو گئے جو انوال کے جنوب میں پانچ میل دور ایک چھوٹی سی گاؤدم پہاڑی تھی۔ عبدالکریم کو اس اقدام کی پہلے ہی سے توقع تھی۔ ریفی لشکر فوراً انوال اور پہاڑی کے درمیان پہنچا۔ ایک وسیع علاقے میں پھیل کر دور دور مورچے اور خندقیں کھود لیں اور چھپ کر بیٹھ گیا۔ کچھ مجاہدین کا رُخ انزبین کی جانب تھا اور اکثریت انوال سے آنے والے راستے کی نگرانی کر رہی تھی۔ ہسپانوی فوج اسی طرف سے حملہ آور ہو سکتی تھی۔ گاؤں میں مقیم عبدالکریم کے آدمی ہسپانیوں کی ہر

نقل و حرکت کی خبر دے رہے تھے۔

۹ جولائی کو دام بچھانے کا کام مکمل ہو گیا۔ ۱۰ جولائی کو اغربین کی ہسپانوی فوج نے شمشی آلۂ خبر رسانی کے ذریعے انوال کو مطلع کیا کہ ان کے پاس پانی ختم ہو چکا ہے۔ پانی اغربین سے چار میل کے فاصلے پر ایک تنگ گھاٹی میں تھا۔ عبدالکریم نے اغربین کے اس کمزور پہلو کو پہلے روز ہی بھانپ لیا تھا۔ ایک دستے نے پانی تک پہنچنے کی دو مرتبہ کوشش کی۔ لیکن ریفیوں نے مار بھگایا۔ محافظ فوج کے کمانڈر میجر بنشر نے انوال سے مدد طلب کی جواب ملا کہ امدادی فوج کل بھیج دی جائے گی۔ اسی رات انوال کے گاؤں سے ایک ریفی یہ خبر لے کر پہنچ گیا کہ ہسپانوی پیش قدمی کی تیاری کر رہے ہیں۔ عبدالکریم اور ان کے بھائی نے مورچوں کا دورہ کیا، دفاعی انتظامات کا جائزہ لیا اور مجاہدین کو ہدایت کی کہ وہ مورچوں میں چھپ کر بیٹھے رہیں۔

اگلے روز طلوعِ آفتاب کے وقت ہسپانوی فوج انوال سے نکلی تین صفیں تھیں اور ہر صف میں تقریباً ایک ہزار سپاہی تھے۔ ادھر سے اغربین کی محافظ فوج نے زبردست پہرے میں ایک نفٹنگ پارٹی باہر بھیج دی۔ انوال کی طرف سے آنے والی فوج ان خندقوں کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی جن میں ریفی مشین گنوں اور رائفلوں سے مسلح منتظر بیٹھے تھے۔ جونہی وہ ان کی زد میں آئی فائرنگ شروع کر دی۔ گولیاں اولوں کی طرح برسنے لگیں۔ ہسپانوی گھبرا گئے، مگر وہ آگے بڑھتے رہے۔ ریفی گولیاں برساتے رہے۔ مرنے والوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ آخر انہیں ۱۲۵ لاشیں پیچھے چھوڑ کر پسپا ہونا پڑا۔ اغربین سے جو پارٹی نکلی تھی وہ گھاٹی میں پہنچ چکی تھی، مگر ریفیوں نے اسے بھی ڈھیر کر دیا۔

سلوسٹر سبدی ادریس سے انوال پہنچ گیا تھا۔ اس نے جنرل برنگیر سے لاسلکی کے ذریعے کمک طلب کی، لیکن برنگیر کے پاس بھیجنے کے لئے فوج نہیں تھی۔ اس نے دفاعی پوزیشن اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ عبدالکریم نے ۱۹۵۳ء میں لکھا:

"جب میں نے سنا کہ سلوسٹر تطوان سے دوڑ کر بڑھ رہا ہے تو مجھے اپنی فتح کا یقین ہو گیا۔"

۲۰ جولائی کو انوال کے تعاون سے اغربین کی محافظ فوج نے دوبارہ پانی تک پہنچنے کی جدوجہد کی، مگر ناکام رہی۔ میجر بنشر نے انوال کو اطلاع دی کہ اس کے جوان خون اپنا خون پی رہے ہیں۔ عبدالکریم نے سفید پرچم کے ساتھ اپنا پیغامبر بھیجا اور میجر بنشر کو ہتھیار ڈال دینے کی دعوت دی۔ میجر بنشر نے انکار کر دیا۔

عبدالکریم کو یقین تھا کہ فتح ان کے قدم چومے گی مگر دو باتیں خاصی پریشان کن تھیں، ایک یہ کہ ریفیوں کے پاس گولہ بارود بہت تھوڑا تھا۔ فی کس بمشکل پچیس کارتوس باقی رہ گئے تھے۔ دوسرے یہ کہ ہر کہ کے بہت سے جوان اپنے گھر جانے کے لئے بے چین تھے۔ ۲۰ جولائی کی رات کو عبدالکریم نے خندقوں اور مورچوں کا دورہ کیا تو ان کا مطالبہ سامنے آ گیا۔ عبدالکریم انہیں واپس جانے سے باز نہیں رکھ سکتے تھے۔ وہ رضا کار تھے، قبائلی رواج کے مطابق عارضی اتحادی: "ایک دن اور ٹھہر جائیے" عبدالکریم نے ان سے استدعا کی "ایک عظیم الشان فتح آپ کی منتظر ہے" ریفی مان گئے۔

۲۱ جولائی کو ہسپانوی انوال سے کیڑے مکوڑوں کی طرح نکل کھڑے ہوئے۔ سلوسٹر نے عبدالکریم کے اندازے کے عین مطابق پوری فوج کے ساتھ اغربین کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ محمد الخطابی نے ٹیلی سکوپ سے جائزہ لیا۔ رمضان کا مبارک مہینہ تھا۔ ریفی مجاہدین سب روزے سے تھے۔ نماز کا وقت آتا تو باری باری اپنی خندقوں میں پڑھ لیتے۔ ہسپانوی فوج کی پیش قدمی اور توپ گاڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ سے ساری وادی گونج اٹھی۔ اب ہسپانوی ڈھلان کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ ریفی مورچوں میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک جوش کی لہر دوڑ گئی۔ اچانک

اغزبین کی طرف سے رائفل چلنے کی آواز آئی اور پھر محافظ فوج کے پانچ سو جوان ریفی مورچوں کی طرف بڑھے۔ ریفی فوج کی واحد توپ حرکت میں آگئی۔ توپچی بازرازحاف نے توپ کی نال گھماتے ہوئے گولے برسانے شروع کر دیے۔ اُسے یاد آگیا کہ عبدالکریم نے رات کے وقت اس سے کہا تھا کہ کل یوم بدر ہے، وہی دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدر کی لڑائی میں فتح ہوئی تھی۔ عبدالکریم نے توپ کو تھپکتے ہوئے کہا تھا،

"اللہ کے رسُول کے پاس اس قسم کے ہتھیار نہیں تھے"

ہسپینیوں کی ایک بڑی تعداد وہیں کھیت ہوگئی۔ باقی توپ کی زد سے بچنے کے لئے پیچھے کی طرف بھاگے۔

دوسری طرف ہسپینی فوج برابر بڑھ رہی تھی۔ اب اُن کے توپ خانے نے ریفی خندقوں پر گولہ باری شروع کر دی تھی۔ ریفی خاموش بیٹھے رہے، یہاں تک کہ قریب آپہنچے۔ چند منٹ کے اندر اندر ریفیوں نے سارے کے سارے تقریباً دس ہزار کارتوس چلا دیے۔ نتیجہ حیرت انگیز تھا۔ ہسپینی فوج میں تباہی مچ گئی۔ صفوں کی صفیں اُلٹ گئی تھیں۔ دھوئیں اور گرد وغبار کے اُٹھتے ہوئے بادل میں وہ افتاں وخیزاں بھاگ کھڑے ہوئے۔ بادل چھٹا، تو ریفیوں نے دیکھا کہ ہسپینی انوال کی طرف بے تحاشا بھاگ رہے ہیں۔ جنگ جیتی جا چکی تھی۔ ہسپین کی آدھی سے زیادہ فوج کا صفایا ہوگیا تھا ——— محمد الخطابی نے اس فتح کا ذکر کرتے ہوئے کہا،

"یہ ایک معجزہ تھا ——— مجھے نہ عبدالکریم کو ایسی عظیم الشان فتح کی اُمید تھی۔ فی الواقع ہم نے ایسی فتح کا کبھی خواب بھی نہ دیکھا تھا"

سلوسٹر انوال میں ایک مکان کی چھت پر کھڑا ہسپینی فوج کی تباہی کا منظر دیکھ رہا تھا۔ ریفیوں کے مقابلے میں اَب بھی اُس کے پاس بہت بڑا لشکر تھا۔ اسلحہ اور گولہ بارُود بھی وافر تھا۔ سامان رسد کی بھی کمی نہ تھی، مگر اُس کے ہوش ایسے اُڑے کہ باقی فوج کو بچانے کے لئے وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ رات کے وقت ریفی میدانِ جنگ میں پھیل گئے۔ سینکڑوں رائفلیں اور ہزاروں راؤنڈ گولہ بارُود اکٹھا کر لیا۔ اب حرکہ دو حصّوں میں بٹ گیا۔ ایک حصّے کے ساتھ عبدالکریم نے انوال کا محاصرہ کر لیا، اور دوسرا حصّہ محمد الخطابی کی کمان میں درّے کے ارد گرد کے پہاڑوں میں پھیل گیا۔ مجاہدین کی ایک منتخب جماعت انوال کے گاؤں میں داخل ہوگئی اور انھوں نے گھروں میں گھس کر ہسپینیوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ اس سے مزید افراتفری پھیل گئی۔ اِدھر مشرق سے سپیدۂ صبح نمودار ہوا۔ اُدھر سلوسٹر نے فوج کو پسپا ہونے کا حکم دے دیا۔ ہسپینی میدان میں پھیل گئے اور درّے کی طرف بڑھے۔ جونہی وہ درّے میں داخل ہوئے، پہاڑوں میں چھپے ہوئے ریفی مجاہدین دائیں بائیں دونوں اطراف سے اُن پر ٹوٹ پڑے۔ عقبی دستے نے مزاحمت کی کوشش کی، مگر ریفیوں کی بے پناہ قدراندازی کے آگے اُن کی ایک نہ چلی۔ اسی اثنا میں سلوسٹر مارا گیا۔ اب کمان جنرل نوارو نے سنبھالی۔ ہسپینی میدان کی طرف بڑھ رہے تھے اور موت کا فرشتہ ان کی روحیں قبض کر رہا تھا۔

اس عظیم الشان فتح کی خبر چاروں طرف موجِ نسیم کی طرح پھیل گئی ——— ہر طرف سے قبائلی اُمڈ پڑے۔ بیشمار ریفی خالی ہاتھ تھے اور انوال کے میدان میں رائفلوں کی کمی نہ تھی۔ درّے میں لاشوں کی سیج بچھ گئی تھی۔ خدا خدا کر کے ہسپینی درّے سے نکل کر میدان میں داخل ہوئے۔ یہاں بنو سعید بھی تعاقب کرنے والوں میں شامل ہو گئے ——— کوہ اردیط کے قریب ملیلیا سے تیس میل دُور ایک ریگستانی میدان میں جنرل نوارو نے پھر قدم جمانے کی کوشش کی، لیکن جلد ہی میدان چھوڑ کر قلعے میں محصور ہونا پڑا۔ آخر ڈھائی ہزار فوجی کٹوانے کے بعد اگست

کو جنرل نوار دو نے ہتھیار ڈال دیے۔ ملیلیا سے باہر یہ آخری مضبوط حصار تھا جو سپین کے ہاتھ سے نکل گیا۔

۲۱ مئی سے ۲ اگست تک ۱۸ ہزار سپینی مارے گئے یعنی تقریباً سارا لشکر۔ ۱۹۳۰۴ رائفلیں، ۳۹۲ مشین گنیں اور ۱۲۹ توپیں اور کئی لاکھ کارتوس اور ہزاروں گولے ریفیوں کے ہاتھ آئے۔ گیارہ سو سپاہی قید کر لیے گئے۔ اب ہزاروں ریفی چاروں طرف سے پروانہ وار جمع ہو کر فاتحانہ یلغار میں شریک ہو گئے تھے جو کہ ملیلیا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ۹ اگست کو ناظور قبضے میں آیا۔ اور پھر ملیلیا کو خشکی کی طرف سے جا گھیرا۔

عبدالکریم چند روز انوال میں ٹھہرے۔ ضروری امور سے فارغ ہو کر ملیلیا پہنچے، تو مجلسِ مشاورت منعقد ہوئی۔ قائد اور ارکانِ شوریٰ دن بھر تقریریں کرتے رہے۔ آخر میں عبدالکریم اٹھے وہ چند روز پہلے ایک چھوٹے سے قبیلے کے جج تھے۔ ریفی سرداروں نے ان کے جھنڈے تلے جمع ہونے سے انکار کر دیا تھا، مگر اب وہ مراکش کی تاریخ کی ایک بڑی جنگ کے فاتح تھے۔ انھوں نے دھیمے لہجے میں تقریر کی۔

"ہمارے آدمی ابھی نہایت غیر منظم اور ضابطے سے بے خبر ہیں۔" عبدالکریم نے قبائلی سرداروں سے کہا۔ "ملیلیا فتح کرتے ہی وہ شہریوں کا قتلِ عام شروع کر دیں گے۔ عورتوں اور بچوں کے قتل سے دنیا میں تہلکہ پڑ جائے گا۔ جنگِ آزادی جیتنے کے لیے ریفیوں کو امریکہ اور برطانیہ کی حمایت درکار ہے۔ سرِدست ملیلیا پر قبضہ نہیں کرنا چاہیے۔"

بعد میں انھوں نے تسلیم کیا کہ سپین کے ہاتھ میں اس بندرگاہ کے رہنے سے ریف کا مستقبل متاثر ہوا، مگر اپنے اس فیصلے پر وہ کبھی متاسف نہ ہوئے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ عبدالکریم کے اس فیصلے کی کسی شخص نے مخالفت نہ کی۔ چند ہفتوں کے اندر اندر وہ اہلِ حریت کے سچے رہنما بن چکے تھے۔ دنیا بھر کے اخبارات ان کی فتوحات کی خبریں جلی سرخیوں میں شائع کر رہے تھے۔ سپین اور فرانس ان کی ابھرتی ہوئی قوت سے لرزہ براندام تھے۔ افق پر ایک اور انقلاب کی شفق پھوٹ رہی تھی۔

سپینی افواج کے تباہ ہونے کی خبر سپینی عوام پر بجلی بن کر گری ۔۔۔ پوری فوج کا صفایا ہو گیا۔ سلوسٹر مارا گیا، جنرل نوار دو نے ہتھیار ڈال دیے۔ ملیلیا اور فاتح ریفیوں کے درمیان مٹھی بھر فوج باقی رہ گئی تھی۔ خبر پہنچتے ہی قومی حکومت قائم ہوئی جس نے کمک فوراً ملیلیا کی طرف روانہ کر دی۔ فارن لیجن جب ملیلیا پہنچا، ریفیوں نے ملیلیا کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اگست کے آخر تک ۳۶۰۰۰ سپینی افواج اور پہنچ گئیں۔ سخت معرکے ہوئے۔ ریفیوں نے قدم قدم پر شدید مزاحمت کی۔ فارن لیجن کی پیش قدمی بہت سست اور نقصان بے اندازہ تھا۔ لیجن کے ۶۱ افسر مارے جا چکے تھے۔ اکتوبر کے اوائل میں میجر فرانکو کی فوج کوہ اُروط کو جانے والی سڑک پر نکل کھڑی ہوئی تھی۔ ملیلیا ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ لیکن سپین زبردست بحران میں مبتلا تھا۔ کابینہ میں پانچ مرتبہ تبدیلی آ چکی تھی۔ پارلیمنٹ میں انتظامیہ اور فوج پر سخت لے دے ہو رہی تھی۔

۲

عبدالکریم کو بہت سے اہم مسائل درپیش تھے، اس لیے اجدیر چلے گئے۔ بنی اَریاغل نے فتحِ انوال کی شاندار تقریب منعقد کی۔ اسی روز ۲۱ جولائی کو عبدالکریم کا پہلا بچہ پیدا ہوا۔ اسی تقریب میں عبدالکریم نے ایک نہایت اہم اصلاح کا اعلان کیا:

"آئندہ جو شخص بھی قتل کے جرم کا مرتکب ہو گا، اسے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔"

ایک معمر سردار نے پوچھا:

"عبدالسلام التفرسیطی سے آپ کیا معاملہ کریں گے جس نے آپ کے والد کو زہر دیا تھا؟"

قبائلی ماحول کے پیشِ نظر سوال خاصا ٹیڑھا تھا۔

"میں التفرسیطی سے انتقام نہیں لوں گا۔" عبدالکریم نے کہا۔ "اس بات کا کوئی قانونی ثبوت نہیں کہ اس نے میرے باپ کو زہر دیا ہے۔ التفرسیطی کو عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا اور اس کے ساتھ پورا انصاف ہوگا۔ میں ایک قانون پسند مملکت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ اگر کوئی شخص مجھے قتل کر دیتا ہے، تو اس پر جدید قانون کے تحت مقدمہ چلایا جائے گا" ـــــ عبدالکریم کے بے لاگ جواب سے سب مطمئن ہو گئے۔

قانون نافذ ہوئے چند روز ہوئے تھے کہ بنی اُریاغل کے ایک شخص نے اپنے کسی دشمن کو قتل کر ڈالا۔ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اُس کی اپنی برادری کی کونسل نے اُسے موت کی سزا سُنائی۔ عبدالکریم سے اپیل کی گئی، انھوں نے سزا کی توثیق کر دی اور قاتل کو گولی مار دی گئی۔ یہ خبر ریف کے طول و عرض میں پھیل گئی، نیا قانون کسی سے رُو رعایت نہیں کرے گا، ہر شخص نے عملاً دیکھ لیا تھا۔ ریف جو لاقانونیت کا خطّہ تھا، دیکھتے ہی دیکھتے قانون کی سرزمین بن گیا۔

عبدالکریم نے جنوری ۱۹۲۳ کو جمہوریۂ ریف کے قیام اور آزادی کا اعلان کر دیا، اور آزاد قوموں سے نئی مملکت کو تسلیم کرنے کی درخواست کی۔ اعلانِ آزادی میں کہا گیا تھا:

" جب تک ہمیں اپنا جائز اور قانونی حق نہیں ملتا، سپین کے ساتھ آزادی کی جنگ جاری رکھیں گے ـــــ"

۱۹۲۳ء میں محمد الخطابی اور اُن کے دو بہنوئی بوجبیر اور محمد الزرقین مملکتِ ریف کے لئے حمایت حاصل کرنے کی غرض سے پیرس اور لندن گئے۔ فرانسیسی وزراء نے تو ملنے ہی سے انکار کر دیا، البتہ بوجبیر لندن میں لارڈ سیسل سے ملے اور درخواست کی کہ ریف کا مسئلہ مجلسِ اقوام میں پیش کرنے کے لئے برطانیہ، ریفی قوم کے ساتھ تعاون کرے۔ فرانس کے متعلق تو عبدالکریم جانتے تھے کہ اس نے سپین سے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے۔ البتہ برطانیہ کے سازشی کردار سے وہ آخر وقت تک بے خبر رہے۔

ریفی مملکت کو جدید خطوط پر استوار کرنے میں دو سال لگے۔ عبدالکریم نے ریفی قبائل میں پھیلی ہوئی انارکی پر قابو پایا۔ غلامی ختم کی اور حشیش کی تجارت ممنوع قرار دے دی۔ انھوں نے اپنے لئے امیر کا خطاب پسند کیا، بعض لوگوں نے انھیں سلطان کہنا چاہا، تو منع کر دیا۔ نئی سلطنت سلطانِ مراکش کا اقتدار تسلیم کرتی تھی مگر عملاً آزاد تھی۔

عبدالکریم کی بے پناہ انتظامی صلاحیتوں کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے حکومت کی جو مشینری قائم کی، بعد ازاں سپین نے انھیں جوں کا توں برقرار رکھا۔ انکی زندگی تکلفات اور شان و شوکت سے کلیتاً خالی تھی۔ نہایت سادہ ہاتھ کے بُنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے۔ ریفیوں کی طرح عام گھر میں رہتے اور سادہ خوراک کھاتے تھے۔ ریفیوں کے دُکھ سُکھ میں برابر کے شریک ہوتے، ان کے درمیان اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اور ان کی شکایات کا ازالہ کرتے تھے۔

انتظامی محکموں کی طرح فوج کو بھی جدید خطوط پر منظم کیا۔ ۱۶ سے ۶۰ برس تک کے تمام صحت مند فردوں کے لئے فوجی خدمت لازمی قرار دی۔ مستقل فوج کی تعداد صرف پانچ ہزار تھی اور سب باری باری اس مستقل فوج میں خدمت انجام دیتے تھے، تاہم ریزرو فوج سمیت کُل تعداد ۲۵ ہزار سے زیادہ کبھی بڑھنے نہ پائی۔ ہنگامی حالات میں پچاس ساٹھ ہزار قبائلی رضاکار بھی شریک ہو جاتے تھے۔ فوج کے دستے

اور رجمنٹیں کسی ایک قبیلے پر مشتمل نہ ہوتی تھیں۔

ریفی مملکت میں کاغذی کارروائی کم سے کم ہوتی۔ زیادہ تر احکام زبانی دیئے جاتے اور ان پر فوراً عمل ہوتا۔ ٹیکس مقامی کونسلیں فراہم کرتیں اور سرکاری خزانے میں جمع کروا دیتیں۔ مملکت کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ تحفے تحائف تھے، اس میں ریفی خواتین دل کھول کر حصہ لیتی تھیں۔ سونے چاندی کے زیورات تک اتار کر دے دیتی تھیں۔

عبدالکریم نے بے شمار اصلاحات کیں، رواجی قوانین منسوخ کر کے شرعی قوانین نافذ کیے۔ باضابطہ عدالتیں قائم کیں اور انھیں دیوانی مقدمات کے علاوہ فوجداری مقدمات کی سماعت کا اختیار دیا۔ پہلے جج صرف دیوانی مقدمات سنا کرتے، فوجداری مقدمات کی سماعت قبائلی کونسلیں کرتی تھیں۔ اجتماعی حلف کا رواج بھی منسوخ کیا۔

قبل ازیں مجرم کے ساتھ اس کے ہم قبیلہ افراد کی مقررہ تعداد حلف اٹھایا کرتی تھی - اس طرح مجرم صاف چھوٹ جاتا تھا۔ اب ساری ذمے داری مجرم پر ڈال دی گئی۔ عبدالکریم نے زرعی قوانین میں بھی اصلاح کی۔ ایک نیا قانون نافذ کیا جس کے تحت اگر کوئی شخص اپنی زمین کو بے کاشت اور بنجر چھوڑ دیتا، اس سے زمین لے لی جاتی، پہلے پہاڑوں سے نکلنے والے ندی نالوں کا پانی افراد کی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ عبدالکریم نے اسے پورے گاؤں کی ملکیت قرار دیا۔

جنگی قیدی پورے دو برس تک در دِ سر بنے رہے۔ سپین اور فرانس نے قیدیوں پر مظالم کی داستانیں بڑھا چڑھا کر بیان کیں۔ مگر حقیقت بالکل برعکس تھی۔ ریفیوں نے انھیں بڑے آرام سے رکھا۔ جو کچھ خود کھاتے وہی انھیں کھلاتے۔ شدید زخمی قیدی فوراً سپینوں کے حوالے کر دیئے گئے، صحت مند قیدیوں سے سڑکیں تعمیر کروائیں۔ مگر ان کی برداشت سے زیادہ کام کبھی نہ لیا۔ عبدالکریم نے کچھ رقم سے ہتھیار، ایمبولینس، دو موٹر کاریں اور ایک پرانے طرز کا بریگویٹ بمبار طیارہ خریدا۔ طیارے کی قیمت ۲۸۰۰ پونڈ ادا کی گئی تھی۔ مگر وہ بالکل ناکارہ نکلا اور سپینی طیاروں نے بمباری کر کے اُسے زمین ہی پر تباہ کر دیا۔ خرید کردہ اشیاء میں سب سے کارآمد چیز فیلڈ ٹیلی فون سسٹم تھا جس کا انچارج ایک سولہ سالہ ریفی لڑکے کو بنایا گیا۔

۳

۱۹۲۲ء کے اواخر تک کیل کانٹے سے لیس دو لاکھ سپینی فوج مراکش پہنچ چکی تھی۔ اپریل ۱۹۲۲ء میں سپین نے اجدیر میں فوج اتارنے کا فیصلہ کیا۔ ایک جنگی جہاز ابتدائی دیکھ بھال کے لیے خلیج ایلوتھمس میں داخل ہوا۔ ریفی جہاز کو آتا دیکھتے رہے، جب ساحل کے قریب پہنچا، اجدیر کی پہاڑی پر نصب شدہ توپ حرکت میں آگئی۔ تین گولے یکے بعد دیگرے جہاز پر گرے اور جہاز غرق ہو گیا۔ یہ ایک زبردست کامیابی تھی۔ میجر فرانکو فارن لیجن کا کمانڈر مقرر ہوا۔ اس نے کمان لیتے ہی ریفی پہاڑیوں کی طرف پیش قدمی شروع کر دی اور بڑھتے بڑھتے جزیرہ عزہ پر قابض ہو گیا۔

یہ گاؤں ریفی پہاڑوں کی عین دہلیز پر واقع تھا۔ عبدالکریم اجدیر میں تھے۔ ریفیوں نے سوچے سمجھے بغیر جوابی حملے کر دیا۔ ملیلیا سے بمبار طیارے پہنچ گئے اور ریفی فوج پر بمباری کرنے لگے۔ ۹۰ ریفی شہید ہو گئے۔ ایک ریفی نے پرانی قسم کی توڑے دار بندوق سے ایک طیارہ مار گرایا۔ زمین پر گرتے ہی وہ شعلوں کی نذر ہو گیا۔

۱۹۲۳ء کے وسط تک سپین کا سیاسی بحران انتہا کو پہنچ گیا۔ جنگ پر دو کروڑ پونڈ سالانہ ضائع ہو رہے تھے اور اس کا حاصل کچھ نہ تھا۔ ۱۳ ستمبر کو جنرل پرائمو ڈی ریفرا نے

فوج کی مدد سے حکومت کا تختہ اُلٹ دیا۔ زمامِ اقتدار ہاتھ میں لینے کے بعد جنرل رِفرا نومبر میں مراکش پہنچا اور ریف کی مہم خود سنبھال لی۔ فوج کو حکم دیا کہ وہ اگلی چوکیاں چھوڑ دے اور قطوان اور طیلیا کے گرد اگرد تیار شدہ مورچوں میں پہنچ جائے۔ رفرا نے فوجوں کی واپسی کی تاریخ بھی مقرر کر دی۔ اخباری نامہ نگاروں سے بات چیت کے دوران میں اس نے واپسی کے منصوبے کی تفصیلات بھی بیان کر دیں۔

۴

اخبارات نے رِفرا کا منصوبہ پوری تفصیلات کے ساتھ شائع کر دیا۔ اس منصوبے کے مطابق سپینی افواج مشرق میں تفرسیط اور طرزی عزّہ اور مغرب میں شاوِن کو ستمبر ۱۹۲۴ء میں خالی کر رہی تھیں۔ جنرل رِفرا کا منصوبہ سامنے آتے ہی عبدالکریم نے اپنا منصوبہ تیار کر لیا۔

ستمبر کا مہینہ قریب آرہا تھا۔ عبدالکریم نے فوج کو از سرِ نو منظم کیا۔ سپریم کمان اپنے ہاتھ میں رکھی۔ مغربی محاذ کی کمان اپنے ۳۲ سالہ بھائی محمد الخطّابی کو دی اور احمد حریرد کو ان کا نائب مقرر کیا۔ محمد الخطّابی ایک باصلاحیت، منظم، اور اعلیٰ جرنیل تھے۔ انھوں نے ایک منصوبے کے تحت شاوِن سے واپس ہونے والی سپینی افواج کو تباہ کر دیا۔ طیلیا محاذ کی کمان لیعقوبی کے سپرد کی۔ لیعقوبی قبیلۂ تمسامان کا ایک نوجوان سردار تھا۔ وادئ اقرموس کی لڑائیوں میں اس کی عمدہ فوجی صلاحیتیں سامنے آئی تھیں۔ اسے ہدایت کی گئی کہ وہ سیدی ادریس سے جنوب میں طرزی عزّہ کی طرف پیش قدمی کرے۔

بنی اُریاغل کے ایک سردار ہَدّو امیزانی کو جنوبی محاذ کا کمانڈر بنایا۔ اسے اکنول سے شمال کی طرف بڑھنا تھا۔ ان دونوں حرکوں کا کام یہ تھا کہ وہ طرزی عزّہ اور تفرسیط کا رابطہ طیلیا سے کاٹ دیں اور سپینی افواج کو محفوظ چوکیوں سے باہر نکلنے پر مجبور کریں۔ اس منصوبے پر ٹھیک عمل اُسی وقت ہو سکتا تھا جب فوجوں کی نقل و حرکت میں مکمل ہم آہنگی اور ربط و ضبط ہو، چنانچہ عبدالکریم نے اُس ساری نقل و حرکت کی نگرانی فیلڈ ٹیلی فون کے ذریعے خود سنبھالی۔

تمسامان کے ایک سردار شعیب تموہ کو دریائے ورغا کی طرف فرانسیسی سرحدوں کی نگہداشت کے لیے بھیج دیا۔ عبدالکریم نے توپ خانے کی رجمنٹ الگ بنائی اور اس کی کمان محمد برنوسی کے سپرد کی۔ محمد برنوسی سلطانِ مراکش کے توپ خانے میں کمانڈر رہ چکا تھا اور وسیع تجربہ رکھتا تھا۔ عبدالکریم نے جوابی سُراغ رسانی کا شعبہ بھی قائم کیا جس کا سربراہ بوہُود تھا۔ بوہُود سپین کی دیسی فوج میں افسر تھا۔ اور عبدالکریم سے آن ملا۔ نہایت ذہین، ہوشیار اور تجربے کار آدمی تھا۔

مارچ ۱۹۲۴ء کے آغاز تک عبدالکریم اپنے منصوبے کے مطابق سپینیوں پر تباہ کُن ضرب لگانے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ اس دوران میں سپینی طیارے ریفی دیہات پر بم برسا رہے تھے۔ جنگ کے قابل تمام مَرد مختلف محاذوں پر تھے اور اس وحشیانہ بمباری کا ہدف ریفی عورتیں اور بچے بن رہے تھے۔

عبدالکریم نے مغربی کمان کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ اپنی کارروائی سپینیوں میں ہراس پھیلانے تک محدود رکھے، پہلے مشرقی محاذ سے نبٹنا ضروری تھا جو گھر کے قریب بھی تھا اور مغربی محاذ پر اُلجھ جانے کی صورت میں خطرہ بھی بن سکتا تھا۔ مارچ ۱۹۲۴ء میں ریفی افواج نے عفران، طرزی عزّہ، تفرسیط اور میدار پر حملہ کر دیا۔

تفرسیط پر حملے کی کمان بنو تمدوت کا سردار بُقّش

کر رہا تھا۔ حملے کا آغاز طلوعِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے ہوا۔ ہر شخص شوقِ شہادت میں سرشار چٹانوں کی آڑ میں رینگتے ہوئے شہر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ قریب پہنچ کر ریفی مجاہدین نے فائرنگ شروع کر دی۔ سپینیوں نے شہر پناہ کی دیوار پر اور مکان کی بالائی منزلوں میں مشین گنیں نصب کر رکھی تھیں۔ جونہی ریفی قریب پہنچے مشین گنوں کے دہانے کھل گئے۔ ریفیوں نے بڑی دانش مندی کا ثبوت دیا تھا، وہ دُور دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ مشین گنوں سے برسنے والی گولیاں ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔

اس کے برعکس ریفی مجاہدین کا نشانہ شاذ و نادر ہی چوکتا۔ محافظ افواج کو جلد ہی فصیل کے پیچھے پناہ لینی پڑی۔ انھوں نے مشین گنیں دیوار کے روزنوں میں نصب کر دیں۔ اس طرح سپینی خود تو محفوظ ہو گئے مگر مشین گنوں کی مار محدود دائرہ عملاً غیر مؤثر ہو گئی۔ ریفی شہر پناہ کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اچانک ایک بمبار طیارہ مشرق کی طرف سے نمودار ہوا، اور ان کے سر پر پہنچ کر بم اور گولیاں برسانے لگا۔ متعدد ریفی شہید ہوئے، باقی جھاڑیوں اور چٹانوں کے پیچھے پناہ لینے کے لئے دوڑے۔

طیارہ بہت نیچی پرواز کر رہا تھا۔ ایک ریفی کا نشانہ کام کر گیا۔ گولی لگتے ہی طیارے کا انجن بند ہو گیا اور پھر شعلے بھڑک اُٹھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ شہر پناہ کی دیوار سے ٹکرایا اور زبردست دھماکے سے زمین پر آ رہا۔ اللہ اکبر کا نعرہ فضا میں گونجا، ریفی شہر پناہ کی طرف لپکے۔ سپینی شہر کے عقبی دروازے سے نکل کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ریفی مجاہدین دروازے کی طرف دوڑے۔ انھوں نے بھاگنے والوں کا تعاقب کیا۔ دست بدست جنگ شروع ہو گئی۔ ریفیوں نے مشین گنوں پر قبضہ کر لیا اور ان کا رُخ بھگوڑے سپینیوں کی طرف پھیر دیا۔ گھنٹے بھر کے اندر اندر میدان صاف ہو گیا۔ تفرسیط خالی ہو چکا تھا اور حرکہ دار دریوس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

دار دریوس پر سپینیوں کی مزاحمت خاصی سخت تھی، لیکن ریفیوں کے جوش و خروش کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔ رات بھر مقابلہ کرنے کے بعد ان کی ہمت جواب دے گئی۔ صبح تین بجے شہر کا عقبی دروازہ کھلا اور ایک ریل گاڑی برق رفتاری کے ساتھ فراٹے بھرتی ہوئی نکل گئی۔ "اب ایسا نہیں ہوگا۔" بقش نے چلا کر کہا اور حکم دیا کہ ریل کی پٹڑی اُکھاڑ دی جائے۔ پندرہ ریفی رات کی تاریکی میں غائب ہو گئے۔ صبح پانچ بجے کے قریب شہر کا پھاٹک پھر کھلا۔ انجن شور مچاتا ہوا پوری تیز رفتاری سے برآمد ہوا۔ بغیر چھت کے ڈبے ایک ایک کرکے گزرنے لگے۔ گاڑی رفتار سے جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ایک قیامت خیز شور بلند ہوا۔ انجن ایک زبردست گڑگڑاہٹ کے ساتھ زمین میں دھنس گیا اور گاڑی کے ڈبے ایک ہیبت ناک دھماکے کے ساتھ آپس میں ٹکرا گئے۔ ہزاروں سپینی ہوا میں اُچھلے اور دُور جا گرے۔

ریفی شہر میں داخل ہو گئے — گھنٹے بھر کی دست بدست جنگ کے بعد بچے کھچے سپینیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

دار دریوس فتح ہو گیا۔ اب تسنوتمین کی باری تھی۔ اس کے لئے تازہ دم فوج کی ضرورت تھی۔ بقش نے کمک طلب کی۔ عبدالکریم خود ایک بڑی فوج لے کر پہنچ گئے۔ تسنوتمین معمولی مزاحمت کے بعد سرنگوں ہو گیا۔

ادھر جنرل یعقوبی نے مشرق میں طرزی عزّہ پر قبضہ کر لیا اور سپینیوں کو ملیلیا کی طرف مار بھگایا۔ ۳۱ اگست کو بارش شروع ہو گئی اور روز بروز شدید تر ہوتی چلی گئی، برسات کا آغاز دو مہینے پہلے ہو گیا تھا۔ ریفیوں نے اسے تائیدِ غیبی سمجھا۔

۵

ادھر ہسپانیوں نے واپسی کا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ چالیس ہزار فوج جنرل ایزپورو کی قیادت میں جمع ہو چکی تھی۔ جنرل ریکولم کو سوق العربہ کی مدد کے لئے بھیجا گیا جہاں وہ جاتے ہی گھر گیا۔ ریفیوں نے سڑک پر قبضہ کر کے واپسی کا راستہ کاٹ دیا۔ ریکولم کو بچانے کے لئے مزید فوج بھیجی گئی۔ وہ زبردست نقصان سے دوچار ہوئی۔

امدادی فوج اب شاون کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ریفی صرف ہراولوں اور پیچھے رہ جانے والی ٹولیوں پر حملے کر رہے تھے۔ جنرل سترانو ۳۰ ستمبر کو اور باقی ماندہ فوج ۲ اکتوبر کو شاون پہنچ گئی۔ جنرل ایزپورو نے دُور افتادہ چوکیوں اور قلعوں میں متعین محافظ افواج کو نکالنے کے لئے امدادی دستے پھیلا دیئے۔ منصوبے کے مطابق یہ کام چھ دن میں انجام پانا تھا، مگر سست رفتاری کی وجہ سے چھ ہفتے لگ گئے۔

ہسپانی اپنے خیال میں بڑی رازداری سے کام لے رہے تھے۔ ۱۶ نومبر کو انھوں نے شاون خالی کر دیا۔ جنرل ایزپورو نے قلعے کی فصیل پر فرضی سپاہی بٹھا دیئے تھے، لیکن ریفی اس دھوکے میں نہیں آئے۔ انھوں نے شاون پر قبضہ کر لیا۔

عبدالکریم شہر میں ننگے پاؤں داخل ہوئے اور سب سے پہلے شہر کی مسجد میں شکرانے کے نفل ادا کئے۔

جنرل کاسٹرو گیرونا ہسپانی افواج کے ہراول دستوں کی قیادت کر رہا تھا۔ عقبی دستے جنرل فرانکو کی کمان میں تھے۔ ہراول فوج ۱۹ نومبر کو سوق العربہ پہنچ گئی، لیکن باقی تمام فوج بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ موسلا دھار بارش اور طوفانی ہوا راہ میں سخت رکاوٹ بن گئی تھی۔

ریفی پہاڑوں سے اتر آئے اور وادی میں پھیل گئے۔ فارن لیجن نے ان کے ساتھ کئی بار جم کر لڑنے کی کوشش کی، لیکن ریفی کبھی جم کر نہ لڑتے، وہ دھند میں غائب ہو جاتے اور چٹانوں اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر گولیاں برساتے رہتے۔ امریکی صحافی ویب مولیر اس مارچ میں ہسپانی افواج کے ساتھ تھا۔ —— ایک ہسپانی افسر نے کہا:

"ہم سایوں سے لڑ رہے ہیں اور ریفیوں کے مقابلے میں ہمارا تیس گنا نقصان ہو رہا ہے۔"

پسپائی شکستِ فاش میں بدل گئی۔ جنرل سترانو گولی کا شکار ہو گیا، اُس کی جگہ جس افسر کو بھیجا گیا، وہ بھی مارا گیا۔ بڑی مشکل سے ہسپانی سوق العربہ پہنچے۔ ان کی حالت سخت ناگفتہ بہ تھی۔ سردی اور بھوک کا شکار، پست حوصلہ اور شکست خوردہ —— ویب مولر ان سپاہیوں کی حالتِ زار بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"میں نے ایسے تھکے ہارے، خستہ حال، گندے اور پست حوصلہ سپاہی کبھی نہیں دیکھے، متعدد ننگے پاؤں تھے، اکثر کے جوتے پھٹ چکے تھے۔ کسی نے بھی اپنے افسر کو سلیوٹ نہیں کیا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھے اور لائن میں جا کھڑے ہوئے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بغاوت کر دیں گے۔

بڑی افسردہ دلی کے ساتھ ریفی چھاپہ ماروں کی طرف بڑھے۔ ریفی دوبارہ کسی اور مقام پر نمودار ہونے کے لئے فوراً تاریکی میں غائب ہو گئے۔ یہی ان کا معمول تھا۔ افسر مجھے ایک کیمپ میں لے گیا۔ نان کمیشنڈ افسروں کے سوا اسے کسی نے سلامی نہ دی۔ نیچے ایک چھوٹا سا گاؤں نظر آ رہا تھا۔ "تماشا دیکھو گے؟" ہسپانی افسر نے مجھ سے کہا۔ "تماشا" غروبِ آفتاب کے بعد شروع ہوا۔ بوڑھے ریفی اس وقت گاؤں کی مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ہسپانی توپیں

آگ برسانے لگیں ـــــــ"

ویب مولر نے اپنی دُوربین سے نمازیوں اور گاؤں کی عورتوں اور بچوں کو پناہ لینے کے لئے پہاڑوں کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا ـــــــ نمازیوں پر گولیاں برسانے والوں کو ہر مقام پر شکست ہو رہی تھی۔ ان کی پسپائی ایک داستانِ عبرت تھی۔ وہ سینکڑوں لاشیں پیچھے چھوڑ کر اندھا دُھند بھاگ رہے تھے۔ دریائے جالہ سے پیچھے ہٹتے وقت وادِ نخلہ کے مقام پر ہسپانیوں نے تین بکتر بند گاڑیاں پیچھے چھوڑ دیں اور ان کے چودہ سپاہیوں کو حکم دیا کہ جب تک فوج دریا عبور کر کے نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جائے، وہ ریفیوں کو روکے رہیں۔ یہ چودہ سپاہی تین دن تک بھوکے پیاسے لڑتے رہے۔ چوتھے روز ریفی توپ لے آئے اور گولے برسا کر گاڑیاں تباہ کر دیں۔ آٹھ ہسپانی تو اسی وقت مارے گئے اور دو شدید زخمی ہوئے۔ باقی چار نے ہتھیار ڈال دیئے۔ جب وہ شکستہ گاڑیوں سے نکلے، ضعف سے لڑکھڑا رہے تھے۔ ریفی ان کی بہادری سے بے حد متاثر ہوئے۔ کیپٹن حسن باشا اور ان کے ساتھیوں نے انھیں سلامی دی اور ریفی ہیڈ کوارٹرز میں پہنچا دیا۔ محمد الخطابی نے ان کا نام تبادلے کئے جانے والے قیدیوں میں سرِ فہرست رکھا۔

ہسپانی بھگوڑوں کی آخری جماعت ۱۳ دسمبر کو تطوان پہنچی۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ایک جنرل، ۴ لیفٹننٹ کرنل، ۸ میجر اور ۱۷۵ دوسرے افسر مارے جا چکے تھے، ۶۰۰ افسر زخمی ہوئے اور ۱۰ ہزار عام سپاہی کام آئے۔

۶

جنوری ۱۹۲۵ء میں فتح کی تقریب منانے کے لئے اجدیر میں ایک بہت بڑا اجتماع منعقد ہوا۔ گورنمنٹ ہاؤس کے احاطے میں تمام قبائلی سردار، قاضی اور شیوخ آلتی پالتی مارے زمین پر بیٹھے عبدالکریم کی تقریر سن رہے تھے۔

بنی زرہال کے شیخ نے تشویشناک خبر دی تھی، ۱۹۲۴ء کے دوران میں فرانس دریائے ورغا عبور کر کے ریف میں گھس آیا تھا۔ کوہستانِ ریف کے دامن میں فوجی چوکیاں اور فاس سے عین عائشہ تک فوجی سڑک بنالی تھی۔ عین عائشہ میں فرانسیسی فوج نے صدر کیمپ قائم کر لیا تھا۔ وہ تو زینت تک بڑھ چکی تھی اور مشرق اور مغرب کی طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ بنی زرہال نیم بربر اور نیم عرب، مخلوط قبیلہ تھا۔ اس کا علاقہ دریائے ورغا کے شمالی کنارے سے کوہستانِ ریف کے جنوبی حصے تک پھیلا ہوا تھا۔ بنی زرہال اور عبدالکریم دونوں اُسے ریف ہی کا علاقہ سمجھتے تھے۔

فرانس کی جارحیت سے ریفی قبائل میں زبردست جوش و خروش پیدا ہوا۔ دراصل عبدالکریم کی فتوحات نے مراکش اور فرانس میں بے چینی کی لہر دوڑا دی تھی۔ مراکش کے ریذیڈنٹ جنرل مارشل لیلاتے ان کی بڑھتی ہوئی قوت سے سخت خائف تھا۔ اس نے پیرس کو اطلاع دیتے ہوئے لکھا:

"ریفی اپنی پوری تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک شخص کے مطیع ہوئے ہیں۔ کریم مصطفےٰ کمال کا کردار ادا کرنا چاہتا ہے، وہ مراکش کا ہیرو بن چکا ہے، سارے مراکش میں اس کے لئے دُعائیں مانگی جا رہی ہیں، اس کی رنگین تصویریں سارے شمالی افریقہ اور ایشیائے کوچک میں آویزاں کی جا رہی ہیں۔"

ورغا کا علاقہ نہایت زرخیز اور ریف کا اناج گھر تھا۔ مارشل لاتے کا خیال تھا کہ اگر یہ علاقہ عبدالکریم کے پاس رہا، تو ریفیوں کی طاقت میں خطرناک حد تک اضافہ ہو جائے گا۔ انٹیلی جنس کا ایک مستقل شعبہ کھولا گیا تھا۔ اس کا سربراہ ایک فرانسیسی افسر گبرلی تھا۔ گبرلی نے ریف کی حالت اور فوجی طاقت کے متعلق ایک مفصل رپورٹ تیار کر لی تھی۔

اس رپورٹ کی روشنی میں ایک زبردست فوجی منصو

بنا یا گیا۔ اس منصوبے کی روشنی میں فرانسیسی فوجوں نے ریف کے جنوبی پہاڑوں کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ وہ بڑے پیمانے پر پکے مورچے، قلعے اور چوکیاں تعمیر کر رہا تھا۔ پچاس ہزار فوج تیار کھڑی تھی۔ یہ تمام سرگرمیاں ریف کی بقا کے لیے سخت خطرہ تھیں۔ عبدالکریم نے مشیروں کا اجلاس طلب کیا۔ تین روز تک نئی صورتِ حال پر غور ہوتا رہا۔

عبدالکریم کو اُمید تھی کہ جنوری میں فرانس سے اطمینان بخش سمجھوتہ ہو جائے گا، لیکن اس دوران میں درکوی کا شریف اُٹھ کھڑا ہوا، اور فرانسیسیوں سے جا ملا۔ عبدالکریم نے ایک سردار عمر حمید و کو شریف کے پاس بھیجا کہ وہ اپنا اثر فرانس پر ڈال کر ریف کے ساتھ سمجھوتے کی صورت پیدا کرے۔

حمید و ۱۳ اپریل کو روانہ ہوا، اس کے ہمراہ ۵۰۰ فوجی جوان بھی تھے۔ شریف نے اس کے آنے کی خبر سُنی، تو بھاگ کر فرانسیسی لائنز میں چلا گیا۔ وہاں بتایا کہ ریفیوں نے اس پر حملہ کر دیا ہے۔ فرانسیسی پہلے ہی کسی بہانے کی تلاش میں تھے، انھوں نے بمبار طیارے بھیج دیئے۔ حمید و اور ان کے ساتھی گاؤں سے نکلے ہی تھے کہ ریفی علاقے میں طیاروں نے آ لیا۔ بہت سے ریفی شہید ہوئے۔ حمید و جان بچا کر تفرسیط پہنچا، اور عبدالکریم کو ٹیلی فون پر فرانسیسیوں کے حملے کی اطلاع دی۔

عبدالکریم نے احکامات تین ہزار باضابطہ فوج جنوب کی طرف روانہ کر دی اور جنوبی قبائل کو پیغامات بھیجے کہ مدد پہنچ رہی ہے۔ فرانس کے حملے کی خبر سارے ریف میں پھیل گئی۔

۷

عبدالکریم کی طرف سے اعلانِ جنگ سُنتے ہی چند گھنٹوں میں ہزاروں ریفی محاذِ جنگ پر پہنچ گئے اور چند روز کے سخت معرکے کے بعد وہ فرانس کی پچاس چوکیوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مئی میں دریائے ورغا عبور کیا اور بڑھتے بڑھتے مراکش کے پُرانے دارالحکومت فاس سے صرف ۲۰ میل دُور رہ گئے۔ اُس وقت فاس بالکل غیر محفوظ تھا اور فرانسیسی اُسے خالی کرنے کی سوچ رہے تھے کہ ریفی خود ہی واپس چلے گئے کیونکہ جنوبی پہاڑوں میں ابھی متعدد بڑے قلعے فرانس کے قبضے میں رہ گئے تھے۔

ستمبر تک فرانسیسیوں کی مزاحمت دم توڑنے لگی۔ وہ سپینیوں کے مقابلے میں زیادہ مؤثر ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ ان کے پاس ایک زبردست فضائی بیڑا بھی تھا۔ قدم قدم پر سخت جنگ کے باوجود ریفی فوج فرانسیسیوں کو پیچھے دھکیلتی رہی۔ فرانسیسی طیارے اس دوران میں ریفیوں پر بم اور گولیاں برساتے رہے۔ ریفی پیش قدمی کرتے ہوئے اولائی پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ فرانسیسیوں نے بارُودی سُرنگ بچھائی اور قلعہ خالی کر دیا۔ ریفی قلعے میں داخل ہو گئے اچانک سُرنگ پھٹی اور ریفیوں کی ایک بڑی تعداد شہید ہو گئی۔

۸

تین مہینے کی جنگ میں فرانس کو سخت نقصان پہنچا۔ پچاس چوکیاں ہاتھ سے نکل گئیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۱۲۷۳ فوجی قتل اور ۲۲۷۵ زخمی ہوئے تھے۔ اس صورتِ حال سے پیرس میں ہلچل مچ گئی۔ مارشل پیتاں، محاذ کا جائزہ لینے کے لئے آئے۔ اس عرصے میں مارشل لیوائے نے گبریلی کو عبدالکریم کے پاس صلح کی بات چیت کے لئے بھیجا۔ گبریلی عبدالکریم کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوا۔

"ہم بات چیت کے لئے تیار ہیں۔" عبدالکریم نے کہا "لیکن یہ بات یاد رہے کہ ریفی عوام حاصل کی ہوئی مکمل آزادی سے دستبردار نہیں ہوں گے۔"

اِدھر گبریلی عبدالکریم سے بات چیت کر رہا تھا، اُدھر میڈرڈ میں فرانس اور سپین کے سفارتی نمائندے ریف کے

خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔ ۱۱ر جولائی کو انھوں نے ایک معاہدے پر دستخط کئے جس میں ریف کو داخلی خود مختاری دینے سے متعلق مشترکہ شرائط درج تھیں۔ فرانس اور سپین کا مشترکہ وفد یہ شرائط لے کر ملیلیا پہنچا۔ مگر عبدالکریم نے ملاقات سے انکار کر دیا۔ وہ مکمل آزادی سے کم کسی شرط پر رضامند نہ تھے۔

جولائی کے آخر میں جنگ شدت اختیار کر گئی۔ تازہ دم فرانسیسی فوج فاس پہنچ گئی تھی۔ عین عائشہ اور تونیت ابھی تک فرانسیسیوں کے قبضے میں تھے۔ فرانسیسی طیارے ریفی دیہات پر اندھا دھند بمباری کر رہے تھے۔ بےشمار عورتیں اور بچے ہلاک اور ایک بڑی تعداد اپاہج اور اندھی ہو گئی تھی۔ وسطی محاذ پر پھنس جانے کے بعد عبدالکریم تازہ کی طرف بڑھے۔ یہاں تسول اور برنس قبائل ان کے ساتھ مل گئے۔ لیوائے نے یورپی عورتیں اور بچے تازہ سے نکال لینے اور تازہ کو ہر قیمت پر بچانے کا حکم دیا۔

تازہ پر حملہ ناکام ہو گیا، تو عبدالکریم نے مغربی علاقے میں اوزان کو جا گھیرا، جہاں احمد حریرو کی فوجیں بھی پہنچ گئیں۔ اوزان پر سپین اور فرانس کے خود ساختہ انتدابی علاقوں کی سرحدیں ملتی تھیں۔ سپینی جنرل ریکولم اور فرانسیسی جنرل کولبٹ نے عبدالکریم کی پیش قدمی روکنے کے لئے مشترکہ منصوبہ بنایا لیکن اسی منصوبے نے جنگ کا رخ بدل دیا۔ مارشل پیٹن نے اپنی رپورٹ میں لکھا:

"تاریکی کے بادل چھٹ رہے ہیں اور افق پر روشنی پھیلتی جا رہی ہے۔"

۱۷ر اگست کو مراکش کی کمان مارشل پیٹن کو سونپ دی گئی اور فرانسیسی کمک دھڑا دھڑ آنے لگی۔ بمبار طیاروں کے کئی سکویڈرن کے علاوہ توپ خانے کی مزید کئی بیٹریاں اور پچاس ٹینک بھی پہنچ گئے۔ ستمبر تک فرانس کے دو مارشل، ۴۰ جنرل اور دو لاکھ سپاہی عبدالکریم کے خلاف صف آرا ہو چکے تھے۔

مارشل پیٹن مراکش آتے ہوئے الجیکرس کے مقام پر جنرل پرفراسے ملا اور مشترکہ اقدامات کے سلسلے میں بات چیت کی۔ اب عبدالکریم کو اپنی مہلک غلطی کا احساس ہوا۔ اگر وہ مئی میں بڑا حملہ کر کے فرانس کو مراکش سے نکال باہر کرتے، تو سپین کو فرانس کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے اور انھیں شکست دینے کا موقع نہ ملتا۔

۹

۱۹۲۵ء کے موسم گرما میں عبدالکریم کے نمائندوں نے تنجیر سے اطلاع دی کہ سپین خلیج ایلوتھمس میں ریف کے ساحل پر فوجیں اتارنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ وہ برطانیہ سے اُن جہازوں (LANDING CRAFTS) کا سودا کر رہا ہے جو اس نے گیلی پولی میں استعمال کئے تھے۔ اس نے بری اور بحری حملے کے منصوبے تیار کر کے فرانس کی توثیق کے لئے پیرس بھیج دیئے ہیں۔ عبدالکریم نے فیصلہ کیا کہ وہ فوجیں اتارنے کی ہر ممکن مزاحمت کرے گا۔

اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ افرادی کمی کا تھا۔ جنوب، مشرق اور مغرب تینوں محاذوں پر فوج کا بڑا حصہ برسرِ پیکار تھا۔ جنگی نقطۂ نظر سے عبدالکریم کی ایک بڑی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے خلیج ایلوتھمس میں قلعہ پینان سپین ہی کے قبضے میں چھوڑ دیا۔ یہ قلعہ ساحل سے صرف نصف میل دور ایک ایسے خنجر کی طرح کھڑا ہے جسے کسی وقت بھی ریف کے دل میں بھونکا جا سکتا ہے۔ میں نے ۱۹۶۴ء میں اجدیر کے گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد عبدالکریم کے بیٹے سعید سے پوچھا:

"آپ کے والد نے اس قلعے کو کیوں چھوڑ دیا؟"

"ہاں وہ بڑی آسانی سے اس پر قبضہ کر سکتے تھے، کیونکہ قلعے کی محافظ افواج پینے کا پانی ساحل کے قریب ایک چشمے سے بھرا کرتی تھیں۔"

"پھر انھوں نے قبضہ کیوں نہ کیا؟" میں نے کہا۔

"قلعے میں سپاہیوں کی عورتیں اور بچے بھی تھے۔ تیرے والد انھیں پیاسا نہیں مار سکتے تھے۔" سعید نے جواب دیا۔

یہی سوال ایک بوڑھے ریفی سے کیا جو عبدالکریم کے پرچم تلے انوال اور دوسری جنگوں میں لڑ چکا تھا۔ اُس نے کہا:

"ہمارا دین عورتوں اور بچوں کو گزند پہنچانے کی اجازت نہیں دیتا۔ ہم عورتوں اور بچوں کو پیاسا مار کر جنگ تو جیت لیتے مگر پھر ہم ریفی نہ رہتے۔"

میں سوچنے لگا۔ ایک طرف عبدالکریم کی انسان دوستی کا یہ عالم، دوسری طرف ہسپانوی، ریفیوں پر اندھا دھند زہریلی گیس پھینک رہے تھے۔

ہسپانوی بیڑا ۸ ستمبر کی صبح کو خلیج ایلوتھمس کے سامنے ظاہر ہوا۔ بیڑے میں فرانسیسی جنگی جہازوں سمیت ۱۱۱ جہاز تھے۔ عبدالکریم اور اُن کے مشیروں کا خیال تھا کہ ہسپانوی قلعہ پینان کو استعمال کریں گے اور خلیج کے وسط میں اجدیر کے عین سامنے لنگر انداز ہوں گے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی فوج کی بھاری تعداد خلیج ایلوتھمس اور اجدیر کے ارد گرد متعین کر دی اور کیبادلیا بیچ کو بالکل نظر انداز کر دیا جو مغربی راس کے دوسری جانب زیادہ موزوں مقام تھا۔ یہ افسوس ناک غلطی تھی۔ فارن رنڈ سٹینڈ اور رومیل (۱۹۴۴ء) کی طرح عبدالکریم یہ سمجھنے میں ناکام رہے کہ کون سی (LANDING) حقیقی ہے اور کونسی محض چال۔

کیبادلیا بیچ کا دفاع عبدالکریم نے قبیلۂ بکویا کے سپرد کیا جس کے سردار کی وفاداری خود کریم کے نزدیک بھی مشکوک تھی۔ مغربی راس ____ ماؤنٹ نولیفو پر تین توپیں نصب کر دی گئیں۔

عبدالکریم کو اپنی غلطی کا احساس اُس وقت ہوا جب ہسپانوی بیڑا کیبادلیا بیچ میں لنگر انداز ہوا، اور ہسپانوی افواج کشتیوں میں بیٹھ کر ساحل کی طرف بڑھنے لگی۔ معاً جنگی جہازوں کی ۱۹۰ توپوں کے دہانے کھل گئے۔ ہسپانوی اور فرانسیسی فضائیہ اور بحریہ کے طیارے بمباری کرنے لگے۔ آگ اور لوہے کی اس زبردست بارش میں تین ٹرانسپورٹ جہاز فوج لے کر کیبادلیا بیچ پر پہنچ گئے۔ ہلکے ہتھیار اور توپ خانہ پہلے ساحل پر اُتارا گیا۔ گرد و پیش کی چٹانوں سے ریفیوں نے مشین گنوں اور رائفلوں سے گولیاں برسائیں۔

ماؤنٹ نولیفو پر نصب شدہ توپیں بھی حرکت میں آئیں۔ چند گولے سمندر میں گرے اور پھر ہسپانیوں نے دیکھا کہ قبائلی ایلوتھمس کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ عبدالکریم خطرے کے مقام کی طرف دوڑے۔ راستے میں بکویا کے آدمی اپنے سردار کے ساتھ آتے ہوئے ملے۔ پوچھا:

"تم نے اپنا مورچہ کیوں چھوڑ دیا؟"

"ہم مٹھی بھر آدمی کیسے مزاحمت کر سکتے ہیں۔" انھوں نے جواب دیا۔ عبدالکریم کو خبر ملی تھی کہ ہسپانیوں نے بکویا کے سردار کو رشوت دے کر اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ اُن کا شک یقین میں تبدیل ہو گیا۔ انھوں نے فوراً کیبادلیا بیچ کے دفاع اور ماؤنٹ نولیفو پر باضابطہ فوج کے دستے بھیج دیئے۔ ہسپانوی فوج کا صرف ایک دستہ ساحل پر اُتر پایا تھا۔

ماؤنٹ نولیفو کا دفاع ریفیوں نے بڑے شاندار اور سرفروشانہ انداز میں کیا۔ گیلی پولی کے معرکے کی یاد تازہ ہو گئی۔ لیکن ہسپانوی توپوں کی گولہ باری اور طیاروں کی بمباری کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔ میجر فرانکو ماؤنٹ نولیفو پر قابض ہو گیا ____ ۱۰ ستمبر کو سمندری طوفان کا زور ٹوٹ گیا اور مزید ہسپانوی فوجیں کیبادلیا کے ساحل پر اُتر گئیں اور خلیج میں پہنچنے لگیں۔

ہسپانوی فوج کا ایک دستہ اجدیر اور ریپورٹ ایلوتھمس کے درمیان برننگ بیچ پر اُتر گیا۔ برننگ بیچ کی دونوں اطراف ڈھلوان چٹانیں ہیں اور پشت پر پہاڑ بلند ہوتا چلا گیا ہے۔ یہ فوج اُتر رہی تھی کہ سورج غروب ہو گیا اور تاریکی

پھیل گئی۔ ریفی مجاہدین کی ایک جماعت کشتی میں بیٹھ کر آئی اور ساحل پر اُن کے عقب میں پہنچ گئی اور لمبے لمبے خنجروں سے اُن پر ٹوٹ پڑی۔ تمام ریفی ایک ایک کر کے شہید ہو گئے، مگر مرنے سے پہلے دشمن کی ایک بھاری تعداد کو ختم کر گئے۔

امریکی صحافی ونسنٹ شین اسی زمانے میں پھر ریف پہنچا اور عبدالکریم سے ملا۔ اسی ملاقات کے دوران میں ہسپانوی اور فرانسیسی طیاروں نے اجدیر پر بمباری شروع کر دی۔ ان کا اصل ہدف عبدالکریم کا گھر تھا۔ عبدالکریم اور شین ایک غار میں چلے گئے۔ شین تو غار کے اندر بیٹھا رہا، لیکن عبدالکریم رائفل لئے غار کے دہانے پر طیاروں کی طرف شست باندھے کھڑے رہے۔ طیارے بمباری کر کے چلے گئے، تو انھوں نے رائفل نیچی کی:

"ہم اس طرح سے کئی طیارے گرا چکے ہیں،" عبدالکریم نے کہا "اب وہ نیچی پرواز نہیں کرتے۔"

اس انتہائی نازک زمانے میں عبدالکریم ایک عظیم انسان نظر آتے تھے۔ شین لکھتا ہے:

"ان کی جرأت عظیم و جلیل ہے۔ ان کے نظریات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، بلکہ موجودہ خطرے سے انھیں اور تقویت ملی ہے۔ آج میں نے انھیں جس عالم میں دیکھا، اس کا کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ وہ بڑے عالی حوصلہ اور عظمت و وقار کے مالک ہیں اور خطرے کے طوفانوں میں مسکراتے رہتے ہیں۔"

اگلے روز شین نے اپنی نوٹ بک میں مندرجۂ ذیل سطور لکھیں:

"زبردست گولہ باری ہو رہی ہے۔ ہسپانوی بیڑا ہلال نما صورت میں خلیج کے اندر پھیلا ہوا ہے اور آگ اگل رہا ہے۔ قلعے سے بھی گولے برس رہے ہیں اور ہسپانوی اور فرانسیسی ہوائی جہاز ہر وقت بموں کی بارش کر رہے ہیں۔"

۱۴ ستمبر تک پندرہ ہزار فوج ساحل پر اتر چکی تھی۔ ریفی سخت مزاحمت کر رہے تھے۔ محمد نودرا نے ریفیوں کی مزاحمت کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا:

"ریفیوں نے قدم قدم پر مردانہ وار جنگ کی۔ ایک مقام پر پچاس ریفیوں نے آخر دم تک مقابلہ کیا اور سات سو ہسپانیوں کو قتل کر کے شہید ہو گئے۔ کوہ طموس پر ریفیوں نے عزیمت و شجاعت کی ایک تاریخ مرتب کر دی۔ انھوں نے راستے میں بارودی سرنگیں بچھا دی تھیں، ایک ایک انچ زمین کے لئے جانیں نثار کیں۔ یہاں تک کہ ایک بھی ریفی زندہ نہ بچا۔"

فرانکو شدید جانی نقصان کے باوجود ریف کے دارالحکومت اجدیر کی طرف بڑھا۔ ریفی شہر خالی کر کے جنوب کی طرف پہاڑوں میں پسپا ہو گئے تھے۔ اجدیر پر ہسپانیوں کے قابض ہو جانے کی خبر آناً فاناً سارے ریف میں پھیل گئی۔ جنرل برفرا نے ریفیوں کو دو دن کے اندر اندر ہتھیار ڈالنے کی ہدایت کی اور حکم دیا کہ عبدالکریم کو زندہ یا مردہ ہسپانیوں کے حوالے کر دیں۔

۱۰

اس دوران میں فرانس بنی زرویال کے سارے علاقے پر قبضہ کر چکا تھا۔ فرانسیسی افواج طیاروں اور ٹینکوں کی مدد سے بڑی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ ریفی قدم قدم پر مزاحم ہو رہے تھے۔ ان آہنی دیواروں کے ساتھ ان کا پہلی مرتبہ پالا پڑا تھا۔ وہ غاروں کے اندر اور دیواروں کے پیچھے ٹینکوں کا انتظار کرتے تاکہ ان پر اچانک ہلہ بول دیں۔ ہسپین کی بکتر بند گاڑیوں کے مقابلے میں انھوں نے یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ جونہی بکتر بند گاڑیاں دفاعی دیواروں کے قریب آ کر رکتیں، ریفی چھاپہ مار اچانک کمین گاہ سے نکلتے، گاڑیوں میں کود جاتے اور چشم زدن میں ہسپانوی سپاہیوں کا صفایا کر دیتے۔

ٹینک بکتر بند گاڑیوں سے بالکل مختلف تھے۔ وہ دیواروں اور رکاوٹوں کو گراتے اور ریفیوں کو کچلتے ہوئے نکل جاتے تھے۔

ہوائی جہازوں اور ٹینکوں کی تباہ کاریوں کے باوجود عبدالکریم نے جنگ جاری رکھی۔ یہاں تک کہ موسم سرما کی بارش شروع ہوئی اور جنگ رک گئی۔

مارشل پیتاں نومبر کے مہینے میں پیرس چلا گیا۔ وہاں اُس نے اخباری نامہ نگاروں کو بتایا:

"میرا فوجی کام ختم ہو چکا ہے، اب میں یہ مسئلہ سیاست والوں کے سپرد کرتا ہوں۔ عبدالکریم کی قوت ٹوٹ چکی ہے، اُس کی آخری شکست بس چند روز کی بات ہے۔"

۱۹۲۵ء کی سردیاں اور ۱۹۲۶ء کا موسم بہار کے امن کے مذاکرات میں گزرا۔ چند شرائط کے ساتھ ریف کو حقِ خود اختیاری دینے کی پیش کش ہوئی۔ عبدالکریم نے یہ پیش کش قبول کر لی مگر اچانک فرانس کی حکومت بدل گئی۔ نئے وزیر اعظم نے عبدالکریم کے نمائندے سے ملنے سے انکار کر دیا۔ دراصل فرانس کے فوجی افسر عبدالکریم کو ذلت کے ساتھ اپنے قدموں میں سرنگوں دیکھنا چاہتے تھے۔

جنگ دوبارہ شروع ہو گئی۔ فرانس اور سپین کی فوجیں چند روز کے اندر اندر مغرب میں تطوان اور وزان کے درمیان اور مشرق میں میدار اور تمسنت کے درمیان مل گئیں۔ عبدالکریم اور اُن کے ساتھی چاروں طرف سے فولاد کی دیواروں میں گھر گئے۔ دس دن تک خوف ناک جنگ ہوتی رہی۔ ریفی قدم بقدم پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ اب بنی اریانل کے صرف چند سو مخلص نوجوان عبدالکریم کے ساتھ رہ گئے، انھوں نے رفاقت کا حق ادا کر دیا۔ ایک ایک کر کے سب شہید ہو گئے۔ عبدالکریم ترجست کے قریب پہاڑوں میں چلے گئے۔ اُن کے ساتھ صرف پچاس جاں نثار تھے۔

۲۳ مئی کی رات کو دشمن کے ساتھ آخری تصادم ہوا، ۲۸ ساتھی اور کم ہو گئے۔ اب وہ اپنے باقی ساتھیوں کے ساتھ سنادا چلے گئے اور وہاں کے شریف حمیدو کے گھر پناہ لی، وہ اب بھی جنگ جاری رکھنا چاہتے تھے، مگر شریف حمیدو کی رائے یہ تھی کہ ریف جنگ ہار چکا ہے۔ اہلِ ریف کو سپینیوں کے ہاتھوں قتلِ عام سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ فرانس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے جائیں، چنانچہ انھوں نے اپنی قوم کو بچانے کے لئے خود کو فرانسیسیوں کے حوالے کر دیا۔

کرنل ڈلوس، شریف حمیدو کے گھر میں عبدالکریم سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"کمرے میں بالکل وہی فضا تھی جو عبدالکریم کے زمانۂ عروج میں ہوا کرتی تھی۔ اُن کے وزیر مشیر بڑے ادب اور وقار سے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ ہم اندر داخل ہوئے، تو عبدالکریم اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے وزیروں کا تعارف کرایا۔ عبدالکریم کا چہرہ نہایت پُرسکون تھا اور اُن کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔"

بات چیت کے بعد انھوں نے اپنے خاندان اور ساتھیوں کو کوچ کر جانے کا حکم دیا۔ فرانسیسی سمجھ گئے وہ نہیں چاہتے کہ ریفی اُن کی روانگی کا منظر دیکھیں۔

۲۷ مئی کی رات ایک بجے عبدالکریم، شریف حمیدو کے گھر سے روانہ ہوئے۔ ریف کے پہاڑ چاندنی میں نہائے ہوئے تھے۔ سب لوگ خاموش تھے۔ سب سے آگے عبدالکریم اور ان کے پیچھے اُن کے بھائی محمد الخطابی۔ جھاڑیوں کے پیچھے سے سایہ نمودار ہوئے۔ یہ عبدالکریم کے غلام اور ساتھی تھے۔ وہ دوڑ کر آئے اور عبدالکریم کی رکاب چوم چوم کر رونے لگے۔ عبدالکریم کسی تاثر کا اظہار کئے بغیر آگے بڑھتے رہے۔

اگلے روز عبدالکریم، ان کے گھر والوں اور رشتے داروں

ساتھ عورتوں اور بچوں کو ترجست لایا گیا۔

ریفیوں کی طویل جنگِ آزادی ختم ہوگئی۔ بنی اُریا غل کے پندرہ ہزار افراد اپنے گھر بار جلا کر ترجست روانہ ہوگئے۔ احمد حریدو، غمارا کے پہاڑوں میں چلے گئے اور گوریلا جنگ لڑتے رہے۔ نومبر کے مہینے میں دُشمن کے ساتھ تصادم میں شہید ہو گئے۔ ــــــ ۱۴ جون ۱۹۲۶ء کو پیرس میں کانفرنس منعقد ہوئی اور عبدالکریم کی قسمت کا فیصلہ کر دیا گیا۔ سپین کے احتجاج کے باوجود عبدالکریم، اُن کے بھائی، اُن کی والدہ اور اُن کے چچا عبدالسلام، اُن کے گھر والوں یعنی کُل ۲۵ افراد کو بحرِ ہند کے جزیرہ ری یونین میں جلاوطن کر دینے کا حکم ہوا۔

عبدالکریم ری یونین میں ۲۱ برس تک رہے، ۱۹۴۷ء میں درخواست کی کہ انھیں فرانس میں رہنے کی اجازت دی جائے کیونکہ ری یونین میں ان کا خاندان اور بچوں کا کوئی مستقبل نہیں۔ سپین کے سخت احتجاج کے باوجود فرانس نے ان کی درخواست منظور کر لی۔

عبدالکریم اور ان کے رشتے دار مئی کے مہینے میں ایک یونانی جہاز ایس ایس کاتمبا سے روانہ ہوئے۔ پندرہ فرانسیسی سیکورٹی افسر اُن کے ساتھ تھے۔ کاتمبا عدن پہنچا، تو قوم پرست عربوں کا ایک جمِ غفیر اُن کے استقبال کے لیے موجود تھا ــــــ یہاں عبدالکریم نے ساحل پر کئی جلسوں میں شرکت کی۔ جب جہاز عدن سے روانہ ہوا، تو قوم پرستوں نے تار کے ذریعے شاہ فاروق سے درخواست کی کہ عبدالکریم کو مصر میں پناہ دی جائے۔ جہاز سوئز پہنچا، تو شمالی افریقہ کے قوم پرست رہنما ان سے جہاز پر ملنے آئے۔ مراکش کی تحریکِ آزادی کے لیڈروں نے زور دیا کہ ہماری رہنمائی کیجیے۔ یہیں شاہ فاروق کا نمائندہ اُن سے ملا اور شاہ کی طرف سے مصر میں پناہ دینے کی پیش کش کی ــــــ عبدالکریم نے یہ پیش کش قبول کر لی۔

۳۱ مئی کی صبح کو جہاز پورٹ سعید پہنچ گیا۔ بندرگاہ پر مصری گورنر، بورقیبہ (تونس کے موجودہ صدر) اور دوسرے بہت سے قوم پرست رہنماؤں نے اُن کا استقبال کیا۔ مرد، عورتیں اور بچے کُل ۴۲ افراد جہاز سے اُترے۔ باہر کاریں منتظر کھڑی تھیں، سب لوگ ان میں بیٹھے اور شہر کی طرف روانہ ہوگئے۔ فرانسیسی سیکورٹی افسر جہاز سے دیکھتے رہ گئے۔

شاہ فاروق نے عبدالکریم اور ان کے ساتھیوں کا خیر مقدم کیا۔ رہائش کے لیے مکان اور ۰۰ پاؤنڈ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔

عبدالکریم کا گھر شمالی افریقہ کے آزادی پسندوں کا مرکز بن گیا۔ وہ آئینی جدوجہد کے بجائے مسلح جدوجہد کے قائل تھے۔ الجزائر کی جنگِ آزادی میں اُن کے مشورے اور رہنمائی کام آتی رہی ۱۹۵۶ء میں مراکش آزاد ہوا، اور سلطان محمد خامس فروری ۱۹۶۰ء میں قاہرہ آئے اور عبدالکریم کے گھر پر اُن سے ملنے گئے۔ انھوں نے مراکش آنے کی دعوت دی۔ مگر عبدالکریم نے انکار کرتے ہوئے کہا:

"جب تک مراکش کی سرزمین پر دشمن کا ایک سپاہی بھی موجود ہے، میں ریف واپس نہیں جاؤں گا۔"

عبدالکریم ۱۹۵۳ء میں بیمار ہوئے۔ انھیں معدے کا سرطان ہوگیا تھا۔ اس بیماری سے ۶ فروری ۱۹۶۳ء کو ۸۱ برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔

یہ خبر سُن کر بہت سے لوگ چونک اُٹھے۔ وہ انھیں شاید بھول چکے تھے، حالانکہ وہ بھول جانے والی شخصیت نہ تھے۔ وہ پہلے جری انسان تھے جنھوں نے چالیس برس پہلے آزادی کا پرچم بلند کر کے اس تحریک کو شروع کیا جو بعد میں پورے شمالی افریقہ میں تیز و تند طوفان کی صورت اختیار کر گئی اور مغربی قوموں کو نکلتے ہی بنی۔ عبدالکریم قومی ہیرو قرار دیے گئے اور انھیں "امیر" کا خطاب دیا گیا۔

★★



کتاب: HEAVEN PAYS NO DIVIDENDS

تصنیف: رچرڈ کالمان

تلخیص: ستار طاہر



HEAVEN PAYS NO DIVIDENDS کا مصنف رچرڈ کافمان دوسری جنگ عظیم کا عینی شاہد ہے۔ اس کی تباہ کاریوں کو اس نے ایک نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ ناول کا ہیرو آفاقی قدروں کا مالک ہے۔ یہ آدمی اس ملک میں پیدا ہوا ہے جو جنگی جنون میں مبتلا ہے اور جو ساری دنیا کو جنگ کے جہنم میں جھونک چکا ہے۔ یہ آدمی اپنے آقاؤں کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتا۔ اس کی حیثیت ہی کیا ہے؟ وہ اتنا ضرور سمجھتا ہے کہ اس کا ملک دوسرے ملکوں کو فتح کر کے، ایک غلط راستے پر چل رہا ہے۔ وہ اس خونی ڈرامے کا خاموش تماشائی ہے۔ اور یہی اس کا جرم ہے کہ وہ مملکت کا ایک شہری ہونے کی حیثیت سے اپنے آقاؤں کی ہوسِ ملک گیری، ظلم، اور جنگ پسندی کا مؤید کیوں نہیں ہے۔ اس جرم کی اسے کتنی کڑی سزا بھگتنا پڑتی ہے ــــــ یہ روتیدادِ المناک ہے۔ اور رچرڈ کافمان نے اسی المیہ کو لکھا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا اور ابھی تک لکھا جا رہا ہے۔ رچرڈ کافمان نے اس جنگ کو عام آدمی کے حوالے سے دیکھا اور لکھا ہے اور اسی خصوصیت کی بنا پر یہ ناول موجودہ دور کے ممتاز اور شہکار ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

شہر خاموش ہے۔ چند لمحے پہلے شہر سنسناتی گولیوں، بموں کے دھماکوں اور مرنے والوں کی چیخوں سے گونج اور لرز رہا تھا۔ یہ سب آوازیں مر گئی ہیں یا شاید میں بہرہ ہو گیا ہوں؟ گہری تاریکی میں ہاتھ پھیلا کر میں نے اپنے سامنے لیٹے ہوئے انسان کو چھوا ہے۔ میرے ہاتھ گاڑھے خون سے بھر گئے ہیں۔ خون، میں نے محسوس کیا ہے اگرچہ اس کی رنگت دکھائی نہیں دیتی، ہو سکتا ہے کیچڑ ہو ــــــ میں نے کیچڑ اور خون کے وہم کو دل سے نکال کر بے حس اور مردہ انسان کی جیبوں میں ہاتھ ڈال دیے ہیں۔ مجھے کھانے کو کچھ چاہیے۔ میں کئی دنوں سے بھوکا ہوں ــــــ روٹی کے ایک نوالے کو ترس گیا ہوں ــــــ

"ماریا ــــــ ماریا ــــــ" میں چیخنے لگا ہوں

"ماریا ــــــ

مجھے روٹی کا ٹکڑا مل گیا ہے۔ کاش تم چند گھنٹے اور زندہ رہ سکتیں ــــــ"

میری چیخ کے ساتھ ہی ایک بار پھر دھماکوں، گولیوں اور چیخوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ میرے جسم پر ملبہ گرنے لگا۔ میں جان بچانے کے لئے تاریکی میں بھاگا۔ ٹھوکریں کھاتا، گرتا پڑتا، اس کھنڈر سے باہر نکلا۔ روٹی کا وہ ٹکڑا جو میں نے لاش کی جیب سے نکالا تھا، اسی افراتفری میں کہیں گر گیا ــــــ

میں نے گھپ اندھیرے میں کان کے پردوں کو پھاڑتی ہوئی آوازوں میں سوچا، مجھے زندہ رہنا ہے یا مر جانا چاہیے زندہ رہنے کے لئے جد و جہد کی ضرورت تھی۔ اور برلن میں یہ رات موت بن کر آئی تھی۔ شہر کا کونہ کونہ دھماکوں سے گونج رہا تھا۔ وہ دارالحکومت جو دنیا کا دارالخلافہ بننے والا تھا اب راکھ کے ڈھیر کی طرح نظر آ رہا تھا۔ عمارتوں سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے، کبھی کبھی کسی عمارت سے آگ کے شعلے یوں اپنے سر اٹھاتے، جیسے عفریت ہوں اور سارے شہر کو جلا کر راکھ کر دیں گے۔

شہر مر چکا ہے ــــــ شہر زندہ ہو رہا ہے ــــ برلن فتح کیا جا چکا ہے ــــــ صبح کی دھندلی روشنی میں ہر طرف بربادی اور تباہی کے نشان نظر آ رہے ہیں " ہٹلر اس وقت کیا کر رہا ہوگا ؟" میرے ذہن میں ایک خیال آیا ــــ ہاں ــــ جرمنی کا آقا ہٹلر اس وقت کس حال میں ہوگا ؟

میں پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا ہوں ــــ میرے قہقہوں کی آواز میں میری بھوکی انتڑیوں کی نقاہت واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔

"ماریا ــــ ماریا ــــ" میں ایک گرے ہوئے دروازے کے قریب بیٹھ گیا ہوں، چاروں طرف دھواں ہے آگ ہے، اور انسانوں کی لاشیں ہیں۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں۔ میلے آنسو۔ میں ماریا کو یاد کر رہا ہوں ماریا ــــ ماریا ــــ"

ہم ایک پرسکون چھوٹے سے محلے میں رہتے تھے میں اور ماریا، میری بیوی ــــ ہم امیر تھے نہ غریب، بس دو وقت اچھا خاصا کھانے کو مل جاتا تھا۔ مہینے میں ایک بار تھیٹر دیکھنے کے لئے بھی چلے جایا کرتے تھے۔ مجھے اپنے دفتر میں کم گو اور محنتی کلرک سمجھا جاتا تھا۔ دفتر میں جب ہٹلر کی فتوحات کا ذکر بلند آواز اور فخریہ لہجے میں کیا جاتا تو میں سر جھکائے اپنے کام میں مگن رہتا۔ مجھے ہٹلر سے ہمدردی تھی نہ نفرت، میں تو ایک عام آدمی تھا جو بڑے آدمیوں کے بڑے بڑے کارناموں اور فیصلوں کو سمجھنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا۔ صبح گھر سے نکلتے وقت میں ہر روز سوچا کرتا کہ جب شام کو واپس گھر لوٹوں گا تو ماریا میری راہ دیکھ رہی ہوگی۔ مجھے ہر روز کے جلسوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مجھے اپنی بیوی سے پیار تھا جو میرے بچے کی ماں بننے والی تھی جس کے سرخ اور کھلے ہوئے چہرے کی مسکراہٹ میرے لئے دنیا کی سب سے بڑی خوشی اور قسمت تھی ــــ

جب میرے افسر اعلیٰ نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کیا تو میں بالکل خالی الذہن تھا۔ سال میں ایک دو بار کسی وضاحت یا غلطی کے سلسلے میں بڑے صاحب کے دفتر میں پیشی ہوئی جایا کرتی تھی۔ اس لئے میں پورے سکون کے ساتھ نپے تلے قدموں سے اپنے بڑے صاحب کے دفتر میں داخل ہوا۔ حلاف معمول بڑے صاحب نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ نہیں کیا۔ میں ادب سے کھڑا ہو گیا۔

" ہمیں تمھاری خدمات کی مزید ضرورت نہیں ہے ۔ خزانچی سے اپنا حساب لے لو اور دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کو چارج دے دو" بڑے صاحب نے خشک لہجے میں کہا۔ میں گم صم اپنے بڑے صاحب کو دیکھتا رہا۔

"جناب ــــ میرا قصور؟"

"قصور ــــ" صاحب طنز سے مسکرایا" میں نہیں جانتا مجھے ذاتی طور پر تم سے کوئی شکایت نہیں ہے مگر سرکاری احکام ــــ" اس نے اپنے الفاظ چبا لئے " تم جا سکتے ہو"

برآمدے میں دفتر کا سپرنٹنڈنٹ میرا انتظار کر رہا تھا چند منٹوں میں میرا حساب بیباق کر دیا گیا۔ اور میں، جس نے پچھلے آٹھ سال سے اس دفتر میں بڑی محنت سے اپنے فرائض انجام دئے تھے، اسے دفتر سے نکال دیا گیا ــــ میرا قصور کیا تھا؟ مجھے کسی نے نہ بتایا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟

میں شام تک گلیوں اور بازاروں میں گھومتا رہا۔ اور اس "کیوں" کا جواب تلاش کرتا رہا۔ میں محنتی تھا۔ کام میں کبھی غفلت نہ کی تھی۔ پھر مجھے کیوں نکالا گیا۔ بڑے صاحب کا نامکمل جملہ میرے کانوں میں گونجنے لگتا "مگر سرکاری احکام ــــ"

گھر کے دروازے کے اندر داخل ہونے سے پہلے میں ایک لمحے کو ٹھٹکا۔ میں نے معمول کی طرح اپنے چہرے کو پرسکون

بنانے کی کوشش کی۔ دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ گھر سنسان پڑا تھا ـــــ ماریا غائب تھی ـــــ "کسی کام سے باہر چلی گئی ہو گی" میں نے اپنے آپ کو تسلی دی۔ مگر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ شام گہری ہو گئی ـــــ رات آ گئی اور میں چپ بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔ بے حس۔ گم صم۔ ماریا کہاں گئی؟

آدھی رات گذر گئی ـــــ ماریا کمرے میں داخل ہوئی۔ لباس میلا ہوا۔ رخساروں پر انگلیوں کے نشان، ہونٹ کٹے ہوئے۔ بال بکھرے ہوئے ـــــ آنکھیں سوجی ہوئیں اور سرخ ـــــ میں لپکا "ماریا ـــــ تمہیں کیا ہوا؟ تم کہاں گئی تھیں؟" اس وقت یہ بھول چکا تھا کہ مجھے آج کسی قصور کے بغیر ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ ماریا بے جان ممی کی طرح مجھے گھورتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور دہشت تھی۔ میں نے اسے جھنجوڑ دیا۔ "ماریا، مجھے بتاؤ، تمہیں کس نے پریشان کیا ہے؟ ـــــ میں خوفناک انتقام لوں گا"

وہ ہنسی ـــــ دہشت ناک ہنسی "انتقام ـــــ خوفناک انتقام! تم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ـــــ تم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ـــــ" وہ دیوانوں کی طرح ہنسنے لگی۔ میں نے اسے سہارا دے کر بستر پر لٹا دیا۔ اس کے زخم صاف کئے اور پھر اُسے خلاء میں گھورتے ہوئے چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اس وقت جب میرا بڑا صاحب مجھے نوکری سے جواب دے رہا تھا، ہٹلر کی خفیہ پولیس کے کارکن ماریا کو اپنے ساتھ لئے جا رہے تھے۔ خفیہ پولیس کے ہیڈ کوارٹر میں اسے زدوکوب کیا گیا۔ اس کی بے عزتی کی گئی۔ خفیہ پولیس کو میرے "سیاسی کردار" پر شک تھا۔ میں ان کے نزدیک ہٹلر اور جرمنی کا وفادار نہیں تھا۔ کیونکہ میں نے جلسوں اور جلوسوں میں "ہٹلر زندہ باد" کے نعرے کبھی نہیں لگائے تھے۔ میرے دفتر کے ایک ساتھی کلرک نے میرے "سیاسی کردار" کے بارے میں خفیہ پولیس کو اطلاع دی تھی۔ جب انھوں نے ماریا کو بے دردی سے اذیتیں دے کر رہا کیا تو اسے حکم دیا گیا کہ وہ مجھے یعنی اپنے شوہر کو چھوڑ دے۔ اور سرگرم نازی عورتوں کی تنظیم میں دن رات کام کرے۔ ماریا کو بتایا گیا تھا کہ مجھے ملازمت سے نکال دیا گیا ہے اور چند دنوں میں میرے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔

صبح کے ملگجے اُجالوں میں ماریا میرے کمرے میں آ کر مجھے سب کچھ بتا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بلر پیٹ کے سارے نشان ابھرے ہوئے تھے۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں خون تھا ـــــ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بیچارگی سے دیکھا۔ ہم دونوں ایک بڑی مشین کے دو حقیر پرزے تھے، جنھیں یہ مشین پیلنے والی تھی۔ اس مشین کے شکنجے سے بچ نکلنا آسان نہ تھا۔ میں نے آنسو پیتے ہوئے ماریا کا سرد ہاتھ تھام لیا۔ ماریا کانپنے لگی۔ اس کی وفا کا امتحان اور آزمائش کی گھڑی آ چکی تھی۔ وہ میری آنکھوں میں سب کچھ پڑھ چکی تھی۔ ایک طرف میں تھا۔ اس کے ہونے والے بچے کا باپ ـــــ حکومت کی نظر میں معتوب ـــــ اور دوسری طرف وہ تھی ـــــ ایک مجبور عورت ـــــ جسے اس کے شوہر سے جدا کیا جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ ماریا کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ سرد ہاتھ حرارت سے گرم ہونے لگا۔ اور خوف زدہ آنکھوں میں عزم کی چمک نظر آنے لگی ـــــ

میں ایک دروازے کے سامنے کھڑا ہوں۔ ماریا میرے ساتھ لگی ہوئی کانپ رہی ہے۔ یہ کپکپاہٹ سردی کی نہیں خوف سے پیدا ہوتی ہے۔ میں پُرامید ہوں۔ ہم برلن سے

سوئیل دُور چھوٹے سے قصبے میں بچتے بچاتے پہنچ گئے ہیں۔ میں فرٹز سے کبھی مایوس نہیں ہوا ـــــ اور جب گھر کے مالک فرٹز نے دروازہ کھولا تو میری شکل دیکھتے ہی مجھے سینے سے لگا لیا۔ ماریا کے ہاتھ کو بوسہ دے کر وہ ہمیں گھر کے اندر لے گیا۔ ہمیں دیکھ کر اس کا چہرہ کھلا جا رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی کافی تیار کی اور پھر کافی کے پیالے سامنے رکھ کر ہم بیٹھ گئے ـــــ

فرٹز کا کھلا ہوا چہرہ آہستہ آہستہ سیاہ پڑنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا ایک ایک لفظ سیاہی کا ایک دھبہ ہو، جو فرٹز کے چہرے کو سیاہ کئے جا رہا ہو۔ جب میں اپنی بپتا سُنا چکا تو فرٹز چند منٹوں تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر گلا صاف کر کے بولا " مارک ـــــ حالات بہت نازک ہیں۔"

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا " ہاں ـــــ حالات بہت نازک ہیں" میں نے اس کی بات دہرائی " مگر دوستی، رفاقت ....؟" میں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

" میں سمجھتا ہوں" وہ تیزی سے بولا " مگر اپنے آپ کو خطرے میں نہیں ڈالا جا سکتا" ماریا نے میری طرف مایوس نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے والے تھے۔ میں نے منہ پھیر لیا ـــــ

" بہرحال ـــــ تم لوگ ـــــ آرام کرو، میں سوچتا ہوں۔ صبح تک کے لئے خدا حافظ"

فرٹز کے ساتھ کتنی امیدیں وابستہ تھیں۔ اس سے تو میں ہمدردی حاصل کرنے کے لئے آیا تھا مگر فرٹز ـــــ مجھے شش و پنج میں چھوڑ کر چلا گیا ـــــ

یہ رات میں نے اور ماریا نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ میں جب بھی اس کی طرف دیکھتا، اسے جاگتے ہوئے پایا۔ ہر لمحہ میرے دل میں یہ خیال آ رہا تھا کہ فرٹز کا فیصلہ میرے حق میں ہوگا۔ وہ جب کوئی فیصلہ کرنے لگے گا تو میری محبت، میری دوستی اس کے دل کو نرم کر دے گی۔ وہ نوجوانی اور طالب علمی کے دنوں کو کیسے بھلا سکتا ہے جو ہم دونوں نے ایک ساتھ گزارے تھے۔

دن نکل آیا۔ فرٹز اپنا فیصلہ سنانے نہ آیا۔ مجھ پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ میرا سر چکرانے لگا تھا۔ دس بجے کے قریب گھر کی ملازمہ ناشتے کی ٹرے اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ ٹرے میں ایک لفافہ پڑا ہوا تھا ـــــ میں نے جلدی سے لفافہ اٹھایا۔ کاغذ پر پنسل سے ایک جملہ لکھا ہوا تھا

" مارک، میں مجبور ہوں۔ یہی مدد کر سکتا ہوں ـــــ "

کاغذ کے ساتھ ایک ہزار روپے کا نوٹ منسلک تھا۔

میں نے بے بسی کے ساتھ رقعہ ماریا کی طرف بڑھا دیا۔ اور اپنے چہرے کو ہاتھوں سے ڈھانپ کر اپنے آنسو چھپانے لگا۔ فرٹز نے میری دوستی، رفاقت اور محبت کی قیمت ایک ہزار روپے مقرر کی تھی۔ میں نے اس قیمت کو ٹھکرا دیا ہوتا۔ مجھ میں اتنی ہمت ہی کہاں تھی۔ ایک ایک پائی کی ضرورت تھی، اور ہم اپنے گھر سے اس افراتفری سے بھاگے تھے کہ اپنا کچھ سامان بھی فروخت نہ کر سکے تھے ـــــ

ہزاروں، لاکھوں گھروں میں کمرے خالی تھے۔

ان گنت ماؤں کے بیٹے میدانِ جنگ میں لڑ رہے تھے اور ہٹلر کے اشارے پر اپنی جانیں قربان کر رہے تھے مگر اتنے بڑے ملک میں ہم دو انسانوں کے لئے کوئی جگہ نہ تھی محفوظ اور پُر امن جگہ، جہاں میری بیوی اس بچے کو جنم دے سکتی جسے وہ مصیبت کے عالم میں اٹھائے اٹھائے پھر رہی تھی

بیس میل آگے ـــــ ایک اور قصبہ ـــــ جان نہ پہچان ـــــ ہوٹلوں میں شناختی کاغذات کی جانچ پڑتال، ہر شخص شک و شبہے سے دیکھ رہا تھا۔ رات بھر ٹھہرنے کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں۔ ریلوے سٹیشنوں پر خفیہ پولیس اور

باوردی پولیس کے آدمی ہر شخص کو گھورتے ——— ہم نے کئی راتیں کھلے کھیتوں میں گزاریں۔ ماریا کی حالت خراب ہوتی جارہی تھی۔ ہر روز ہمیں نیا ٹھکانا تلاش کرنا پڑتا۔ میں پاگل ہو رہا تھا۔ خودکشی کی ترکیبیں سوچ رہا تھا۔

خشک نالے میں مَیں نے دیا سلائی کے آگے ہاتھ رکھ کر ماچس جلائی اور سگریٹ سُلگایا۔ آسمان پر گدلے بادل جمع ہو رہے تھے اور دُور دُور تک بارش سے بچنے کے لئے کوئی جگہ نظر نہ آرہی تھی۔ ماریا درد سے کراہ رہی تھی۔ وہ بار بار اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹتی ——— میں پیار سے اس کا سر سہلانے لگا۔ اس کے خوبصورت سنہرے بالوں کی رنگت اُڑ رہی تھی۔ نرم اور ریشمیں بال کُمھلا رہے اور سخت ہو رہے تھے۔ میں نے دل میں سوچا ——— "اس زندگی سے موت اچھی ہے" گہری تاریکی میں بھی شاید ماریا میرے خیالات کو بھانپ گئی۔ اور عورت کی فطری رجائیت کے جذبے سے کہنے لگی "مارک ——— انسان کو ہمت نہیں ہارنا چاہئیے"

"انسان ——— ہمت ———" میں کانپ اٹھا۔

"ماریا ——— جہاں جنگل کا قانون نافذ ہو، جہاں کوئی انسان نہ ہو، اور چاروں طرف بھیڑئیے نظر آرہے ہوں وہاں انسان کب تک خالی خولی ہمت سے کام چلا سکتا ہے"

ماریا نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ گہری خاموشی میں صرف جھینگر میرے سوال کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ میں نے آہستہ سے پوچھا "ماریا، سو گئی ہو؟"

"نہیں تو" وہ نرمی سے بولی "مارک، میں سوچ رہی ہوں کہ اس دنیا میں انسان کو امن اور چین سے جینے کیوں نہیں دیا جاتا؟ میں سوچ رہی ہوں، میرے پیٹ میں جو انسان پل رہا ہے وہ کس دُنیا میں آنکھ کھولے گا؟ کیا اُسے بھی یہی دنیا دیکھنا پڑے گی، جہاں انسان، انسان کا خون بہا رہا ہے؟"

چند لمحوں کے لئے میں صبر اور ضبط کا دامن چھوڑ بیٹھا۔ "ماریا، یہ سوال ہٹلر سے پوچھو جس نے دُنیا کو جنگ کے جہنم میں جھونک دیا ہے۔ جس نے بستیاں ویران کر دی ہیں اور ماؤں کی گودیں اجاڑ دی ہیں۔ ہمارا بچہ اس دنیا میں آنکھ کھولے گا وہ اس بدصورت دنیا کا ایک حصہ بنے گا، جہاں جنگ پسند قوم کا کوئی امن پسند شہری زندہ نہیں رہ سکتا"

ماریا نے سختی سے میرا بازو پکڑ لیا۔ اس وقت میں بک رہا تھا۔ میرے منہ سے جھاگ نکلنے لگا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا۔ "مارک ——— ہمارا بچہ اس دنیا میں جنم نہیں لے گا ——— تم نے سُنا نہیں کہ جرمنی کو ہر میدان میں شکست ہو رہی ہے جس دن ہمارا بچہ جنم لے گا، دنیا سے جنگ کے بادل چھٹ چکے ہوں گے ———"

ماریا چپ ہو گئی۔ جیسے گہرے خیالوں میں کھو گئی ہو۔ طویل خاموشی کے بعد ماریا نے مجھ سے پوچھا "مارک ——— سو گئے؟" میں چپ رہا ——— ماریا اپنے آپ سے کہنے لگی "کاش میں اس زمانے میں پیدا نہ ہوتی ———" میرے دل سے ایک آواز اُبھری "کاش ہم ہٹلر کے عہد میں پیدا نہ ہوتے ———"

زندگی کتنی پیاری ہے ——— اس کا اندازہ مجھے انہی دنوں میں ہوا۔ موت کے خوف سے میں کسی کے پاس ملازمت کے لئے نہ جاتا تھا۔ اور ہماری پونجی آہستہ آہستہ ختم ہوتی جارہی تھی۔ کھانے پینے کی معمولی چیزوں کے نرخ آسمان کو چھو رہے تھے۔ ہر چیز کی قلت تھی اور انسان بھوکے مر رہے تھے کیونکہ ساری خوراک اُن فوجیوں کو بھیجی جارہی تھی جو متحدین سے ہر میدان میں شکست کھا رہے تھے۔ کبھی کبھی میں ان لوگوں کے بارے میں سوچتا جو ایک جنگ پسند ڈکٹیٹر کے اشارے پر اپنی جانیں ضائع کر رہے تھے تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میرا دکھ کم ہو گیا ہے۔ انسان کتنا خودغرض ہے۔ اپنے سے زیادہ

دکھی انسان کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

ماریا گھل گھل کر ہڈیوں کا پنجر نظر آنے لگی بچت کے لئے ہم اب دن میں ایک بار کھانا کھاتے تھے۔ ایک ایک لقمہ چبا کر نگلا جاتا۔ مٹ میلی اور سڑی باسی روٹی کا بھورا زمین پر گر جاتا تو اُسے اٹھا کر پیٹ کے دوزخ میں ڈال لیا جاتا۔ مجھے ہر وقت بھوک لگی رہتی۔ میں ان دنوں کے تصور سے لرز جاتا اور دُکھ کی زندگی لمبی ہوتی چلی جا رہی تھی۔

چند دنوں کے بعد ہمارے پاس ایک پائی تک نہ رہی، ماریا سے اب دو قدم بھی چلا نہ جاتا تھا۔ ادھر اس کے دن قریب آ رہے تھے اور ہم آوارہ گردوں اور بھٹکتا لوگوں کی طرح دربدر ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ فاقے کا دوسرا دن آیا تو میں جھنجھلا اٹھا۔ اب مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ رہی تھی کہ ماریا کی آنکھوں سے آنکھیں چار کر سکوں۔ اس کی آنکھوں کی روشنی دُھندلا رہی تھی۔ گہری، شفاف آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور ان آنکھوں میں ایک سوال ہوتا۔ ایسا سوال جس کا جواب میرے پاس نہیں تھا ——

ہم برلن سے صرف دس میل دُور تھے۔ ایک ویران سے کھیت میں گھاس کے کچھ تنکے بچھا کر میں نے ماریا کے لئے "بستر" تیار کیا۔ اُسے لٹا کر نرمی سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور بولا "ماریا —— میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں —— جلدی لوٹ آؤں گا —— یہاں سے قریب ہی ——" ماریا نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا —— اور شہر کی طرف چل پڑا!

یہ کیسی رات تھی —— برلن جو رات کو روشنیوں سے جگمگایا کرتا تھا، اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ دھماکوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بازار سنسان تھے، اور گلیاں ویران۔ پولیس کے آدمی اِدھر اُدھر کتوں کی طرح پھر رہے تھے جیسے شکاری کی بُو سونگھ رہے ہوں ——

میں ایک گھر کے دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ مکان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے آہستہ سے کواڑ کو دھکا دیا۔ دروازہ کھل گیا۔ میں دبے قدموں اندر داخل ہوا۔ مکان کے اندر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چند منٹوں میں مجھے یقین ہو گیا کہ اس مکان کے مکین یہاں سے جا چکے ہیں۔ میں جلدی سے باورچی خانے کی طرف دوڑا۔ ایک ایک الماری کی تلاشی لی۔ گھر میں کھانے کے لئے کچھ نہ تھا۔ جب میں خالی مکان سے باہر نکلا، تو ایک قدم بھی چلنا محال ہو رہا تھا۔ میں سستانے کے لئے اندھیرے میں رُک گیا۔ پولیس کے دو آدمی میرے قریب سے گزرے۔ "روسی شہر کے قریب پہنچ چکے ہیں —— ایک نے کہا۔

"چپ —— کوئی سُن لے گا" دوسرا بولا۔

میرے کانوں میں ماریا کے الفاظ گونجنے لگے "جب ہمارا بچّہ جنم لے گا تو یہ دُنیا بدل چکی ہو گی" میرے جسم کی تھکان ختم ہو گئی۔ میں تازہ دم، تیز طرار اور چست ہو گیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور ایک دوسرے مکان میں داخل ہو گیا۔ ایک کمرے میں مدھم روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے ہمّت کی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ مدھم روشنی میں ایک بوڑھی عورت دو بچّوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ دونوں بچّے اس کے گھٹنوں سے لگے ہوئے تھے۔ آواز سُن کر بوڑھی عورت چونکی اور خوف سے بولی "کون ہو تم؟"

چند لمحوں کے لئے میرے حلق سے کوئی آواز نہ نکلی۔

"کون ہو تم، یہاں کیوں آئے ہو؟" اس کا لہجہ قدرے نرم پڑ چکا تھا۔ شاید اُسے میری ہیئت کذائی پر رحم آ گیا تھا۔ "میں بھوکا ہوں —— میری بیوی بیمار ہے۔ بھوکی ہے ——" میری آواز رندھ گئی۔ بوڑھی عورت آہستہ سے اٹھی۔ ایک

الماری کو کھولا۔ اور چند نوٹ میرے ہاتھ پر رکھ دیتے۔ "یہ لو ـــــ ان سے روٹی خرید لو۔"

میری آنکھوں کے سامنے سنسان اور ویران بازار گھوم گئے۔ اس وقت کہاں سے روٹی مل سکتی تھی؟ "مجھے پیسے نہیں چاہئیں۔ روٹی چاہئے ـــــ خدا کے لئے ـــــ"

بوڑھی عورت نے میری طرف غور سے دیکھا الماری کی طرف بڑھی، ایک خانے سے روٹی کا پاؤ بھر ٹکڑا اٹھا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ "ان بچوں کی طرف دیکھو، یہ میرے پوتے ہیں۔ ان کے باپ جنگ میں مارے گئے ہیں ـــ وہ اب کبھی واپس نہیں آئیں گے، گھر میں زیادہ روٹی نہیں ہے اور جانے کل کیا ہونے والا ہے۔ میں اپنے اُن بیٹوں کی نشانیوں کو زندہ رکھنا چاہتی ہوں جو ہٹلر کے پاگل پن کا شکار ہو گئے ـــ جاؤ ـــ اب جاؤ۔"

مجھے ماریا کا خیال آیا جسے میں بھلا بیٹھا تھا۔ اور اس بچے کے تصور سے میری رُوح لرز اٹھی جسے ماریا جنم دینے والی تھی۔ میں باہر کی طرف بھاگا۔

"رک جاؤ ـــ" کسی نے مجھے کندھے سے پکڑ لیا۔ "یہ کیا لئے جا رہے ہو؟" سپاہی نے میرے ہاتھوں سے روٹی چھین لی اور مجھے دھکا دے کر گرا دیا۔ میں اُٹھا اور بھاگ کر اُسے پکڑ لیا۔ "خدا کے لئے مجھ پر یہ ظلم نہ کرو۔ دو دن کے بعد مجھے روٹی کا یہ ٹکڑا نصیب ہوا ہے۔ میری بیوی بھوک سے مر رہی ہے۔ خدا کے لئے ـــ روٹی واپس دے دو۔"

"کون سی روٹی؟" وہ ہنس کر بولا۔ "کیسی روٹی؟"

"کمینے، ظالم، بدمعاش، ہٹلر کے غلام۔" میں کہنے لگا "وہی روٹی جو تم نے مجھ سے چھینی ہے۔" سپاہی نے میری گردن پر دو ہاتھ مارے۔ اور میں زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ "اُلّو، پاجی، احمق، عقل کے اندھے، تم نے روٹی کو چھپا کیوں نہیں لیا تھا۔ روٹی ہاتھ میں لے کر کیوں چل آئے تھے۔ پاجی ـــ"

میں گرتا پڑتا اٹھا ـــ اور ٹھوکریں کھاتا ہوا واپس چل نکلا۔ دھماکوں اور گولیوں کی آوازوں سے بے خبر، تیزی سے چلتا رہا۔ مجھے ماریا کے پاس پہنچنے کی جلدی تھی۔ جب میں کھیت کے قریب پہنچا تو رات کا آخری پہر تھا چند گھنٹوں میں صبح ہونے والی تھی۔ میں نڈھال اور تھکا ہوا کھیت میں گر پڑا جانے کب تک بے ہوش پڑا رہا۔ ہوش آیا تو پھر اپنے آپ کو کوستا ہوا بھاگا۔ میں نے اندھیرے میں کسی چیز سے ٹھوکر کھائی اور گر پڑا ـــ

میرے ہاتھ کسی گیلی چیز سے بھر گئے ـــ خون کی بُو سے جی متلی کرنے لگا ـــ میں ہوش کھونے والا تھا۔ اس رات کی ذلتوں اور صعوبتوں نے مجھے نیم جاں کر دیا تھا۔ میں نے ہاتھوں سے ماریا کو ٹٹولا ـــ سرد جسم ـــ سرد، ٹھٹھرا ہوا مردہ جسم ـــ اور اس کے پیروں میں وہ بچہ پڑا ہوا تھا جسے نئی اور خوبصورت دنیا دیکھنی تھی ـــ ننھا سا بچہ ـــ چند گھنٹوں کا مُردہ ـــ بے جان ـــ ٹھٹھرا ہوا گوشت کا بے جان ٹکڑا۔ میں نے گوشت کے اس ٹکڑے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ میرے ہاتھ خون سے لتھڑ گئے۔ ٹھنڈے جمے ہوئے خون سے ـــ میرے اپنے خون سے ـــ ماریا کے خون سے ـــ

ماریا نے کہا تھا: "جب ہمارا بچہ جنم لے گا تو یہ دُنیا بدل چکی ہو گی۔" وہ کتنی بچی، کتنی کھری تھی۔ یہ دنیا نہیں بدلی تھی۔ وہ روٹی کے چند لقموں کے لئے ترس کر مر گئی تھی۔ اور اس کے بچے کے سر پر چھت نہ تھی، کھلا آسمان تھا۔ اس کے بچے نے اس دُنیا میں آنکھ کھول کر سب سے پہلے دھماکوں

کی آواز سُنی تھی ـــــ اور شاید وہ دھماکوں کے خوف سے ہی ڈر کر مر گیا تھا۔ اس ننھی سی معصوم روح نے اس دنیا میں تو زندہ رہنا گوارا نہیں کیا تھا جہاں ہٹلر جیسے لوگ حکومت کرتے ہیں ـــــ

یہ میرا بیٹا تھا ـــــ میرا بیٹا ـــــ میں نے اپنے بیٹے کو سینے سے لگایا اور اس کی مُردہ ماں کے قریب بیٹھ گیا اور بے ہوش ہو گیا۔

بموں کے دھماکوں، برستی ہوئی گولیوں کی سنسناتی ہوئی آوازوں نے مجھے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ میں نے اپنے بیٹے کو سینے سے اُتار کر اس کی ماں کے پہلو میں لٹا دیا اور برلن کی طرف چل پڑا ـــــ شہر فتح ہو چکا ہے۔ جنگ یہیں سے شروع ہوئی تھی اور یہیں پہ ختم ہوئی ہے اور روٹی کا ٹکڑا مجھ سے پھر چھن گیا ہے۔

میں ہنس رہا تھا ـــــ میں ہنس رہا ہوں۔ برستی گولیوں اور گرتے ہوئے مکانوں کی آوازوں میں ـــــ دھڑام ـــــ دھڑام ـــــ ہاہا ـــــ میں ہنس رہا ہوں اور ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں ـــــ

کسی نے میرا بازو پکڑ لیا ہے ـــــ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔ یہ آدمی کیا کہہ رہا ہے ـــــ میں سن رہا ہوں ـــــ الفاظ میرے کانوں سے گزر کر دل تک پہنچ رہے ہیں۔

"میں قسم کھاتا ہوں۔ میں نے اپنے مکان کی ایک ایک اینٹ اپنے ہاتھ سے رکھی تھی۔ میں نے بارہ سالوں میں اپنے مکان کو مکمل کیا تھا۔ میں ہر روز کارخانے کی چھٹی کر کے اپنا مکان بنانے چلا جاتا تھا۔ لوگ مجھ پر ہنستے تھے کہ بھلا اکیلا آدمی مکان بنا سکتا ہے۔ بھائی میں نے بارہ سال میں اپنا مکان بنا لیا ـــــ پورے بارہ سال میں ـــــ اور وہ مکان چند منٹوں میں بم گرنے سے گر پڑا ہے ـــــ بارہ سال ـــــ چند منٹ ـــــ ذرا سوچو تو ـــــ"

پاگل ـــــ بے وقوف ـــــ احمق ـــــ اپنے مکان کو رو رہا ہے ـــــ ہاہا ـــــ دنیا میں کیسے کیسے احمق بستے ہیں ـــــ مار دیا ـــــ یہ آدمی مکان کو رو رہا ہے، اور ـــــ میں اس روٹی کے ٹکڑے کو ـــــ جو اب پھر مجھ سے چھن گیا ہے ـــــ مار دیا ـــــ میں بھی بھوکا مروں گا۔ اگر تمہیں روٹی نہیں ملی تو میں بھی بھوکا مر رہا ہوں ـــــ ہاہا ـــــ روٹی ـــــ موت ـــــ ہمارا بچہ ـــــ نئی دنیا ـــــ ہاہا ـــــ ہا!

جب آدمی پر حکومت و سلطنت کرنے کا نشہ طاری ہو جاتا ہے تو یہ اس کے دماغ کو اتنا بگاڑ دیتا ہے کہ شراب کا نشہ بھی اتنا نہیں بگاڑ سکتا۔ شراب کی مستی سے سرشار انسان اپنوں اور بیگانوں کی تمیز کھو دیتا ہے۔ حکومت و سلطنت کے نشے سے چور ہونے والا آدمی اپنوں اور بیگانوں کی تمیز کھو دینے کے ساتھ خدا اور رسول کو بھی بھول جاتا ہے۔ اپنی کرسی کی حفاظت میں حق کا دامن چھوڑ کر ناحق کی رعایت کرنے لگتا ہے۔ عوام کے مفاد پر ہتھوڑا مار مار کر اپنا اور صرف اپنا مفاد چاہتا ہے۔

جاسوس محل





ایک خوفناک ناول
ٹھنڈی
انگلیاں
نیلے
ہونٹ
کتاب : THE DEADLY WOMAN
مصنف : جان ڈی کیفر
تلخیص: ضیاء الدین فاروقی

اب مجھے صحیح معنوں میں اس بات کا پتہ چلا ہے کہ انتظار کی گھڑیاں کس قدر جان لیوا ہوتی ہیں۔ میں ساحلِ سمندر کی گیلی اور ٹھنڈی ریت پر کھڑا ہوں۔ خنک ہوا چل رہی ہے۔ آسمان پر سورج کا نشان تک نظر نہیں آتا۔ فضا میں ہر طرف دُھند چھائی ہوئی ہے۔ یہ موسم ساحل پر گھومنے کا نہیں۔ ایسے وقتوں میں تو انسان آتشدان کے سامنے کرسی ڈال کر کوئی دلچسپ ناول پڑھنا چاہتا ہے، لیکن میں مجبور ہوں۔ مجھے یہیں انتظار کرنا ہے۔ سردی میرے جسم میں سرائیت کرتی جا رہی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کچھ دیر میں برف کا ڈلا بن جاؤں گا، لیکن میرے سامنے جو تین سپاہی زمین کھود رہے ہیں، ان کی پیشانیاں پسینے سے تر ہیں اور وہ لمبے لمبے سانس لے رہے ہیں۔ یکے بعد دیگرے انھوں نے اپنے کوٹ اتار پھینکے ہیں اور گڑھے کو گہرا کرتے چلے جا رہے ہیں۔

نہ جانے یہ کھدائی کب ختم ہوگی ؟

جارج میرے قریب ہی کھڑا ہے۔ ہم دونوں کیلئے انھوں نے ایک ہی ہتھکڑی استعمال کی ہے۔ میرا بایاں ہاتھ اور جارج کا دایاں ہاتھ قانون کی گرفت میں ہے۔ جارج کی حالت قابلِ رحم ہے۔ گڑھا گہرا ہونے کے ساتھ اس کے جوش اور جذبے میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے منہ سے جھاگ بہہ نکلا ہے اور وہ بُری طرح چلا رہا ہے۔ کبھی کبھار اس کی چیخیں تھم جاتی ہیں اور وہ سپاہیوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے،

”اور کھودو، تیزی سے کھودو، وہ یہیں ہے، میں جانتا ہوں وہ یہیں ہوگا۔“

اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی ہیں جیسے اس سارے ڈرامے کا مرکزی کردار وہی ہے۔ عالمِ جوش میں اس کے کندھے لرز رہے ہیں۔ گردن کی رگیں پھولی ہوئی ہیں اور مضبوط ہاتھ جو میرے ہاتھوں سے کم و بیش ایک چوتھائی بڑے ہوں گے۔ بے چینی میں اپنی مٹھیاں کھول اور بند کر رہے ہیں۔ اچانک بارش ہونے لگی۔

پانی کے موٹے موٹے قطرے جارج کے چہرے پر سے بہتے ہوئے اس کی خشخشی داڑھی بھگو رہے ہیں۔ اس پر یقیناً پاگل پن کا دورہ پڑا ہے۔ وہ انسپکٹر کے منع کرنے کے باوجود از خود کھدائی میں شریک ہونا چاہتا ہے۔ میں ایک طویل قامت اور سخت کینڈے کا انسان ہوں، لیکن وہ تو دیو کا دیو ہے۔ میں سوچتا ہوں اس قدر مضبوط جسم کے باوجود گزشتہ چند ماہ کے دوران میں اس نے جس طرز عمل کا مظاہرہ کیا وہ اسے بکری کے بچے سے بھی زیادہ ڈرپوک اور بے بس ظاہر کرتا ہے۔ نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا، وہ ایک پتلی کی طرح اپنی مالکہ کے احکام پر ناچتا رہا، لیکن اسے بُرا بھلا کہنے سے پہلے مجھے اپنے آپ پر نظر ڈالنی چاہیے۔ میں جو کچھ عرصہ قبل مانٹسوری اسکول کے اعلیٰ استاد کی حیثیت سے معاشرے کا قابلِ احترام فرد تھا۔ آج کس قدر ذلیل و رسوا ہو چکا ہوں۔ اس وقت میرا کوئی شاگرد دیکھ لے تو اُسے کتنا رنج ہو۔ بچّے تو مجھے ایک نہایت شفیق اور معزز انسان کے رُوپ میں دیکھ چکے ہیں۔ ان کے معصوم ذہن مجھے ایک مجرم کے رُوپ میں کیسے قبول کر سکتے ہیں ! لیکن میں کب تک ان کی نظروں سے چھپوں گا — کل جب اخبار میں میرا نام اور تصویر شائع ہوگی، تو شہر کے بچّوں پر جیسے بجلی ٹوٹ پڑے گی۔

میں یقیناً احمق ہوں، احمق نہ ہوتا، تو ذرا آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اس دلدل میں کیوں گرتا۔ انیتا کا پھیلایا ہوا شیطانی جال ایک دلدل ہی تھا اور اس دلدل میں جو بھی گرا، دوبارہ نہ اُٹھ سکا۔ پہلے نیلسن، پھر جارج، اور سب سے آخر میں میں۔ ہم سب کتنے احمق تھے، سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنے آپ کو انیتا سے دُور نہ رکھ سکے اور اب ہم یہاں سے ڈرے مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑے ہیں۔ ایک لاش ہمارے پاس رکھی ہے اور ریت میں ایک گڑھا کھودا جا رہا ہے جس میں سے دوسری لاش نکلنے کی توقع ہے۔ میرا سر چکراتا جا رہا ہے۔ حواس قابو میں نہیں رہے۔ جس قدر

میں گزشتہ واقعات پر غور کرتا ہوں، اسی قدر ذہن ماؤف ہوتا جاتا ہے۔ یہ بات میری اپنی سمجھ سے بالاتر ہے کہ جب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ انیتا عورت نہیں شیطان کی چیلی ہے، تو فوراً اس کا پیچھا کیوں نہ چھوڑ دیا، میں کیوں اس کے مکان میں رہا۔ میں نے کیوں نہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سے قطع تعلق کر لیا۔ انسان تقدیر کے آگے بے بس ہے۔ شاید ذلیل و خوار ہونا میری قسمت میں لکھا تھا! ورنہ ایک بار جھلسنے کے بعد کوئی شخص آگ کی طرف نہیں جاتا۔

انیتا سے میری پہلی ملاقات کارمل بیچ پر ہوئی تھی جو سان فرانسسکو سے کم و بیش سو میل کے فاصلے پر ایک خوبصورت ساحلی تفریح گاہ ہے۔ اس روز جب میں وہاں سمندر کی ٹھنڈی ہوا کھا رہا تھا، ایک دل دوز حادثے نے تفریح کی غرض سے آنے والے مردوں اور عورتوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ایک خوش و خرم جوڑے نے گرم ریت میں ایک گڑھا کھود رکھا تھا۔ وہ سب اس کی تہہ میں بیٹھے تھے۔ بیوی اور بچے سمندر میں نہانے کی غرض سے باہر نکلے، تو گڑھے کی دیواریں گر پڑیں اور خاوند ریت میں دب گیا۔ بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ میں بھی گڑھے کی طرف بھاگا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے ریت کو ادھر ادھر ہٹانے لگا، لیکن بہت دیر ہو گئی اور وہ شخص دم گھٹ جانے کی وجہ سے مر گیا۔ عین اس وقت میں نے انیتا کو دیکھا۔ اس کا قد لمبا اور رنگ کھلتا ہوا تھا، چہرہ جاذبِ نظر ہونے کے باوجود آنکھوں میں حیرت اور قدرے وحشت سی تھی۔ لباس نہایت بیش قیمت تھا اور حرکات و سکنات سے اندازہ ہوتا تھا اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ نِن کا راز خطوط میں ڈھلا ہوا جسم شدید قسم کی نسوانی کشش کا حامل تھا۔ ایک اور بات جس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا، اس کی بے حسی تھی۔ جی ہاں، اس کے چہرے پر رنج والم کا شائبہ تک نہ تھا، حالانکہ ایسی خوبصورت جگہ ایک صحت مند مرد کی اچانک موت اور اس کے بیوی بچوں کی آہ و زاری کی وجہ سے ہر کس و ناکس آزردہ نظر آ رہا تھا۔ بعض عورتیں تو رونے لگی تھیں، لیکن انیتا ایک شانِ بے نیازی سے گڑھے کے پاس کھڑی تھی اور اگر میں غلطی پر نہیں ہوں، تو ہلکی سی مسکراہٹ کی وجہ سے اس کے رخساروں میں چھوٹے چھوٹے گڑھے بن رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا وہ خوش ہے، اس سانحے پر اسے دلی مسرت ہو رہی ہے اور وہ کوشش کے باوجود اپنے دلی جذبات پر قابو نہیں پا سکی۔

لوگ لاش اٹھا کر سڑک کی طرف چلے گئے۔ وہ عورت جس کے مقدر میں بیوہ ہونا لکھا تھا اور وہ ہنستے کھیلتے بچے جو آن کی آن میں شفقتِ پدری سے محروم ہو گئے تھے، غم سے اس قدر نڈھال ہو رہے تھے کہ سڑک تک پہنچانے کے لئے کچھ لڑکوں کو انہیں سہارا دینا پڑا۔ میں گڑھے کے کنارے بیٹھا رہا۔ میرے ہاتھ ریت سے بھرے ہوئے تھے، لیکن میں نے انہیں صاف کرنے کی کوشش نہ کی۔ اچانک حادثے سے میرا دل رنج میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک یوں لگا کوئی میرے سامنے کھڑا ہے۔ سر اٹھا کر دیکھا، یہ انیتا تھی۔ وہی طویل قامت اور خوبصورت عورت، جسے کچھ عرصے پہلے میں نے لاش پر مسکراتے دیکھا تھا میرے دل میں اس کے متعلق کچھ اچھے خیالات نہ تھے۔ وہ یقیناً انتہائی لاپروا اور بے رحم نظر آتی تھی، لیکن نہ جانے کیوں، کچھ دیر تک میں نے اس سے باتیں کیں، تو یوں محسوس ہوا جیسے دل بے اختیار اس کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہے۔ کوشش کے باوجود میں اپنے آپ پر قابو نہ پا سکا یوں محسوس ہوتا تھا اسے پسند کرنے لگا ہوں۔ یاد رہے میری عمر پچیس برس کی ہے اور میں ایک صحت مند نوجوان ہوں۔ غیر شادی شدہ ہونے کی وجہ سے میرا اس کی طرف متوجہ ہونا فطری امر تھا۔

وہ کچھ دیر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی رہی،

پھر اس کی نظریں میرے ہاتھوں پر جم گئیں۔ میں نے جلدی سے اپنے ریت سے بھرے ہوئے ہاتھ چھپا لیے۔ وہ منہ پھیر کر بڑی بے نیازی سے بولی:

"کتنی شاندار موت تھی اس کی۔ سر کے بالوں میں، ہاتھوں پر، جسم پر، آنکھوں اور کانوں میں، منہ کے اندر، ریت ہی ریت بھری تھی، سفید اور چمکدار ریت۔ بالکل چاندی کا بنا ہوا بت نظر آتا تھا۔ شاید تم نے اس کے ہاتھ نہیں دیکھے، بڑے بہت ہی مضبوط ہاتھ تھے۔ ویسے تمہارے ہاتھ بھی مضبوط ہیں اور عام ہاتھوں سے بڑے۔ مجھے مضبوط ہاتھوں والے مرد بہت پسند ہیں۔"

جواب دینے کی غرض سے میں نے پھر اس کی طرف دیکھا اور نظر ایک چمکتی ہوئی لمبی سوئی پر پڑی جو نہانے کے لباس میں سینے کی بائیں جانب ایک پٹی میں لگی ہوئی تھی۔ باتیں کرتے وقت اس نے غیر شعوری طور پر اپنا ہاتھ اٹھایا اور سوئی چھونے لگی۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا، اس کی عجیب و غریب حرکتوں کے باوجود اس اجنبی عورت کو شام کے کھانے کی دعوت دے ڈالی۔ اس رات ایک شاندار ہوٹل سے کھانا کھا کر اپنے گھر لوٹا تو انیتا میرے ذہن پر قبضہ کر چکی تھی۔ اگلے روز ہماری پھر ملاقات ہوئی؛ اس سے اگلے روز ہم نے رات کا کھانا ایک ساتھ کھایا اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ انیتا سویڈن کی رہنے والی تھی اور جیسا کہ اس نے مجھے بتایا، مجھے دیکھ کر اسے اپنا شوہر نیلسن یاد آ گیا تھا۔ نیلسن کی آنکھیں، بال، ہاتھ اور چہرے کے نقوش مجھ سے مشابہ تھے۔ ایک روز جب میں نے نیلسن کے بارے میں تفصیل پوچھنا چاہی، تو انیتا بولی۔

"وہ مجھے چھوڑ چکا ہے، شادی سے ایک برس بعد وہ اچانک غائب ہو گیا تھا۔ میں نے عدالت میں دعویٰ دائر کیا، عدالت نے اس کے نام نوٹس جاری کیا اور وہ حاضر نہ ہوا، تو یک طرفہ کارروائی کے طور پر مجھے طلاق بھی مل گئی۔ اب میں بہت خوش ہوں، نیلسن مجھے پسند نہیں تھا۔ وہ مجھے بہت مارتا تھا اور اس کے ہاتھ، سنجیدہ اس کے ہاتھ تمہارے ہاتھوں سے بھی زیادہ مضبوط تھے۔"

اس نے مجھے اپنی اور نیلسن کی تصویر بھی دکھائی۔ نیلسن ایک ہنس مکھ موٹا تازہ آدمی تھا۔ قد انیتا سے چھوٹا۔ سارے جسم میں نمایاں ترین چیز اس کے ہاتھ تھے۔ یہ ہاتھ جسم کی مناسبت سے بہت بڑے تھے، کھردرے، سخت اور بالوں سے بھرے ہوئے۔ انیتا تصویر میں بجھی بجھی سی نظر آ رہی تھی۔ پہلے پہل جب میں نے تصویر پر نظر ڈالی، تو انیتا کے لباس میں لگی ہوئی وہ لمبی سوئی نہ دیکھ سکا، لیکن بعد میں جب غور کیا، تو معلوم ہوا کہ سوئی انیتا کے فراک میں سے باہر جھانک رہی ہے۔ یہ وہی سوئی تھی جسے میں نے کارل بیچ پر گڑھے کے کنارے پہلی مرتبہ انیتا کے نہانے کے لباس میں دیکھا تھا۔

"انیتا، یہ تم اپنے پاس ہر وقت ایک لمبی فولادی سوئی کیوں رکھتی ہو؟" ایک روز جب ہم باغ میں گھوم رہے تھے، تو میں نے سوال کیا۔

"اس لیے کہ یہ میری ہے۔" وہ تیزی سے بولی۔ میں اس کا مطلب نہ سمجھ سکا، لیکن دوبارہ سوال کرنے کا موقع نہ ملا۔ اس نے گفتگو کا رخ بدل دیا تھا۔

میرا خیال ہے اس روز پہلی مرتبہ میں نے سنجیدگی سے اس کے بارے میں سوچا تھا، وہ کون ہے، کیا چاہتی ہے، کس طرح رہتی ہے، ہر وقت اپنے پاس فولادی سوئی رکھنے کا مطلب کیا ہے؟ یہ اور بہت سے دوسرے سوالات مجھے پریشان کر رہے تھے، لیکن تیرا و چاہت کا جو مجھے اس کے بارے میں کوئی بری بات سوچنے کا موقع نہ دیتی تھی اور میں از خود اس کی ہر عجیب و غریب حرکت کی توجیہہ تلاش کر لیتا تھا۔

میں نے کئی بار انیتا سے شادی کی درخواست کی، مگر وہ

ہنس کر ٹال دیتی۔ ایک اور بات جس کا مجھے شدت سے احساس ہُوا، یہ کہ مجھے اس کا بہت خیال ہے، لیکن اُسے میری زیادہ پروا نہیں۔ اکثر اوقات مجھ سے باتیں کرتے وقت وہ اچانک خاموش ہو جاتی جیسے اسے کسی خیال نے بے چین کر رکھا ہے۔ ایسے اوقات میں اس کا رویہ بہت عجیب ہوتا تھا۔ دو ایک بار تو اس نے مجھے نیلسن کے نام سے پکارا۔ میں یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اس کے جذبات کو ٹھیس نہ لگ جائے۔ مجھے بہرحال اس کی ذات عزیز تھی اور میں ہر قیمت پر اُسے شریکِ زندگی بنانا چاہتا تھا۔

ایک روز انیتا مجھے اپنے گھر لے گئی۔ اس سے پہلے ہم کسی کیفے یا پارک میں ملا کرتے تھے۔ کارنل بیچ کے پاس ہی اس کا گھر تھا، بہت وسیع اور بڑا ہی خوب صورت۔ کھلی چھت کی کیڈلک کار بڑے دروازے پر پہنچی، تو ادھیڑ عمر کے ایک مرد نے دروازہ کھولا۔ اُس کے سر کے بال اُلجھے ہوئے تھے، سارا جسم بالوں سے ڈھکا ہوا تھا، اس لئے آدمی سے زیادہ وہ گوریلا نظر آتا تھا۔ اس کا نام جارج تھا اور وہ انیتا کا بیک وقت سکرٹری، ملازم، بیرا، خانساماں اور مالی تھا۔ انیتا نے اس سے میرا تعارف کرایا، جارج نے میرا ہاتھ گرمجوشی سے دبایا، لیکن اُس کے لہجے اور آنکھوں سے میں سمجھ گیا اُسے میرا یہاں آنا پسند نہیں۔ ایک بار میں نے یہ بھی محسوس کیا وہ انیتا کو چاہتا ہے اور مجھ سے رقابت محسوس کر رہا ہے۔ اندر کمرے میں جا کر انیتا نے بتایا؛

میں نے نیلسن کے غائب ہونے سے چند ہفتے قبل اسے ملازم رکھا تھا، لیکن نیلسن نے اسے پسند نہیں کیا۔ کئی مرتبہ اس نے مجھ پر زور دیا کہ جارج کو برطرف کر دوں، لیکن میں بھلا اس کی بات کیوں مانتی۔ جارج میرا تھا۔ کہنے کا مطلب یہ کہ جارج میرا ملازم تھا اور اس گھر میں واحد ایسی شے تھی جس پر میں اپنا حق جتا سکتی تھی۔ وہ مونسٹری میں ماہی گیروں کی کشتی پر ملازم تھا اسے دیکھتے ہی میں اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ میری خدمت کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ تم نے دیکھا اس کے ہاتھ کتنے لمبے اور مضبوط ہیں، نیلسن کے ہاتھوں سے بھی زیادہ۔ اُف خدایا! نیلسن اپنے بڑے بڑے ہاتھوں سے میری کس قدر پٹائی کرتا تھا۔ اس کے برعکس جارج کے متعلق مجھے یقین تھا جو حکم دوں گی وہ اسے بجا لائے گا۔ ایک مضبوط ہاتھوں والے کو اپنے حکم پر چلانا میرے لئے بہت مسرت انگیز بات ہے؛

پھر وہی ہاتھ، میں چڑ سا گیا۔ آخر اسے مضبوط ہاتھوں سے اتنا عشق کیوں ہے۔ شاید اسے مجھ سے نہیں، میرے مضبوط ہاتھوں سے پیار تھا۔ نیلسن، پھر جارج اور اب میں۔ ہم سب ایک ہی زلف کے اسیر تھے۔ اس نے نیلسن کے ساتھ کیا سلوک کیا، جارج اب تک اس کے پاس کیوں ہے اور نیلسن اسے چھوڑ کر غائب کیوں ہو گیا؛ میں ان سوالات پر غور کرنا چاہتا تھا، میری عقل بار بار مجھے تنبیہہ کرتی تھی، لیکن دل کے ہاتھوں اس قدر مجبور تھا کہ انیتا کی خوبصورتی کے سوا کسی شے کے بارے میں سوچنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ جلد ہی ہماری نسبت طے ہو گئی اور میں نے سارے شکوک حرفِ غلط کی طرح ذہن سے مٹا دئے۔

انیتا کا مکان ایک قلعے کی مانند تھا۔ اس کی قدیم طرز کی محرابی کھڑکیاں، اونچی چھتیں، بڑے بڑے کارنس، طویل برآمدے اور پرانی طرز کا قدیم، مگر آرام دہ اور بیش قیمت فرنیچر اٹھارھویں صدی کی یاد تازہ کرتا تھا۔ انیتا کا کمرہ ساحلِ سمندر کی طرف تھا، اس کی کھڑکیوں میں سے ہر وقت سمندری لہریں ساحل کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آتیں۔ ایک بات جس کا مجھے ان دنوں بھی احساس تھا، انیتا پوری کوشش کرتی تھی کہ گفتگو کا رُخ اس کی ذات کی طرف نہ آنے پائے۔ نیلسن، جارج اور اپنے سوا وہ دنیا کے ہر موضوع پر بلا تکان گفتگو کرتی تھی اور اس وقت بھی جب وہ یہاں میرے پاس نہیں، اور اس کی وجہ سے میں ساحل کی ریت پر تنہا کھڑا ہوں، یہ تسلیم کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ وہ نہایت ذہین

اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی اور قدیم تاریخ کے بارے میں اس کا علم ناقابلِ یقین حد تک وسیع تھا۔

ناتوں کے دوران میں جب کبھی وہ مجھے چائے کا کپ دیتی یا کوئی چیز میرے ہاتھ سے پکڑتی اور اس کی انگلیاں میرے ورزشی، چوڑے مضبوط ہاتھوں سے چھو جاتیں، تو اُس کا سارا جسم کانپ اٹھتا۔ پھر وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتی، اپنی نازک، عنز ملی اور لمبی لمبی انگلیاں اس پر پھیرنے لگتی۔ ایک بار جب میں نے غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ اُس سے چھڑا لیا، تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور اس کا ہاتھ فوراً اپنی سوئی کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت تک مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ میں نے فوراً اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا اور معذرت چاہی۔

انیتا کی خواہش کے مطابق ہماری شادی بہت سادہ طریقے پر ہوئی۔ وہ طبعاً تنہائی پسند تھی اور بھیڑ بھاڑ کو پسند نہ کرتی تھی۔ شادی کے بعد میں نے اپنا مختصر سا سامان لیا اور انیتا کے ہاں منتقل ہو گیا۔ شادی کے پہلے دنوں میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا؛ البتہ انیتا کی یہ عادت کہ وہ ہر وقت سوئی کو اپنے پاس رکھتی تھی یہاں تک کہ رات کے وقت بستر میں بھی اپنے لباس سے علیحدہ نہ کرتی، میرے لیے بہت تکلیف دہ تھی۔

یہ بیان کرنا میرے لیے خاصا مشکل ہے کہ سب سے پہلے مجھے انیتا سے خوف کب اور کس طرح محسوس ہوا۔ میرا خیال ہے اس کے لیے کسی ایک لمحے کا تعین ممکن نہیں۔ یہ خوف آہستہ آہستہ پیدا ہوا اور ایک رات جب میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں شہر جانے کے لیے گھر سے نکلا اور مکان کے پچھلے حصے میں جہاں باغ کے ایک کونے میں گیراج بنا ہوا تھا اپنی کار لینے کے لیے گیا، تو اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے گرد ایک جال بُنا جا رہا ہے اور میں ایک بے بس پرندے کی طرح اس جال میں قید ہو چکا ہوں۔ گیراج کے قریب ہی ایک چھوٹے سے کوارٹر میں جارج کی رہائش تھی۔ میں گیراج میں داخل ہونے لگا، تو میری نظر اس پر پڑی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا ساحل کی طرف جا رہا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر مڑا اور ہاتھ سے مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ جب سے ہماری شادی ہوئی تھی، میں نے اُسے ہمیشہ عجیب و غریب حرکتیں کرتے دیکھا تھا اور مجھے یقین تھا اس کا ذہنی توازن بگڑ چکا ہے۔ لیکن رفع استعجاب کے لیے میں اس کے پیچھے چل دیا۔

ساحل کی ریت پر وہ دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ یہ بالکل وہی جگہ تھی جہاں اس وقت میں کھڑا ہوں اور جہاں سپاہی کھدائی کر رہے ہیں۔ ریت میں اُس نے ایک چھوٹا سا پودا لگا رکھا تھا۔ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا،

"یہ پودا کھوپڑی میں اُگتا ہے۔ میں نے خود اسے کھوپڑی میں بویا تھا۔ اب تو اس پر پھول بھی آ گئے ہیں۔"

"تمھاری طبیعت خراب ہے، میرے خیال میں تمھیں آرام کرنا چاہیے، میں کسی ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔"

"ہرگز نہیں، مجھے کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔ میں تم سے نفرت کرتا ہوں، مجھے انیتا سے بھی نفرت ہے، وہ بہت بُری عورت ہے۔ آج رات بھی اس نے مجھے ایک ایسا کام کرنے کا حکم دیا جو نہایت گھناؤنا ہے، لیکن میں اس کی بات نہیں مانوں گا، میں پہلے ہی اس کی بات مان کر پچھتا رہا ہوں۔"

کچھ دیر خاموش رہ کر وہ بولا:

"مسٹر نیلسن روزانہ مجھ سے بات چیت کرتے ہیں، اس بار وہ آئے، تو میں تمھیں ان سے ملاؤں گا۔"

"پاگل مت بنو۔ نیلسن یہاں سے جا چکا ہے، وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اس کا انیتا سے جھگڑا ہو گیا تھا۔" میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تم میری بات کیوں نہیں سمجھتے۔ اس زمین پر ہاتھ پھیرو،

تھیں اس میں ٹھنڈی انگلیاں محسوس ہوں گی۔ ہاں ہاں، ٹھنڈی انگلیاں اور نیلے ہونٹ بھی۔ نیلسن کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے، اس رات بارش ہو رہی تھی۔" وہ رُک رُک کر بولا۔

"مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میں سیگ کے لئے گڑھا کھود رہا ہوں۔"

سیگ، انیتا کے پالتو کتے کا نام تھا۔ میں نے پوچھا،

"کیا ہوا سیگ کو؟"

جواب ملا،

"وہ مر جائے گا۔"

"لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ ہمارے کمرے میں مزے سے بستر پر بیٹھا تھا۔"

"میرا وقت ضائع مت کرو، اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔ مسٹر نیلسن آنے ہی والے ہوں گے۔ میں اُن کے آنے سے پہلے اپنا کام ختم کرنا چاہتا ہوں۔" اس کا لہجہ انتہائی سخت تھا۔

میں خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا اور کار لے کر باہر نکل گیا۔

اگلے روز ایک بجے لوٹا۔ تو انیتا نے مجھے یہ خبر سُنائی کہ رات سیگ اچانک بیمار ہوا اور مر گیا۔ جارج نے اُسے ریت میں دفن کر دیا ہے۔"

"لیکن کل رات میں نے اُسے دیکھا، تو وہ بالکل ٹھیک تھا، اس کے باوجود جارج ساحل پر اس کے لئے گڑھا کھود رہا تھا۔ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

انیتا نے میری طرف غصے سے دیکھا اور اس کا ہاتھ فوراً لباس میں چھپی ہوئی سُوئی کی طرف اُٹھ گیا۔ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی،

"یہ کتا میرا نہیں، نیلسن کا تھا اور مجھے ہر وہ چیز ناپسند ہے جسے نیلسن پسند کرتا ہو۔"

اس کا رنگ لمحہ بہ لمحہ بدل رہا تھا، اس لئے میں نے ہاں سے ٹل جانے میں ہی مصلحت سمجھی۔

اسی شام جب ہم باغ میں چائے پی رہے تھے، انیتا نے میرے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،

"تمھارے ہاتھ بہت مضبوط ہیں، مگر کبھی مجھ پر ہاتھ نہ اٹھانا، ورنہ ......" اچانک خاموش ہو گئی، پھر اس کا لہجہ بدل گیا اور وہ مسکراتے ہوئے بولی،

"تمھارے یہ ہاتھ میرے ہیں اور تم میری مرضی کے بغیر انھیں استعمال نہیں کر سکتے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ یکایک اٹھی اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

رات کو جب میں کھانے کے بعد ذرا ٹہلنے کی خاطر ساحل کی طرف نکلا، تو جارج پھر میری طرف آیا۔

"آج رات مسٹر نیلسن مجھ سے ملنے آئیں گے، وہ مجھ سے ایک خاص کام لینا چاہتے ہیں۔ جانتے ہو وہ کام کیا ہے؟" یہ کہہ کر اس نے میری طرف۔ کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"مسٹر نیلسن کو تم سے نفرت ہے، مسٹر نیلسن کو ہر اس شخص سے نفرت ہے جو مالکن کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہو، سُنا تم نے ......"

اُس کی باتوں سے مجھے خوف آنے لگا اور میں فوراً واپس آ گیا۔ جب میں اپنے بستر میں لیٹا تو انیتا پردے کے پیچھے کپڑے بدل رہی تھی، میرے سامنے اس نے فولاد کی چمکدار سوئی لباس میں سے نکال کر شب خوابی کے کپڑوں میں چھپالی۔ گزشتہ دنوں کے واقعات سے میں ذہنی طور پر خاصا پریشان ہو چکا تھا، سُوئی کو دیکھ کر میری قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ میں نے اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے صرف اتنا کہا،

"تمھاری یہ عادت میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تم یہ منحوس سوئی ہر وقت اپنے پاس

کیوں رکھتی ہو؟ بات کے وقت تمہیں کس سے خطرہ در پیش ہے؟ یہ بکواس ختم کرو، ورنہ میں تم سے یہ سوئی چھین لوں گا۔"

"ایسا ہرگز نہ کرنا، خدا کے لئے سوئی کے بارے میں کچھ نہ کہنا، میں اسے اپنے آپ سے جدا نہیں کر سکتی۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور پھر میں تمہارے ذاتی معاملات میں دخل نہیں دیتی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"دیکھو نا۔" وہ بات بناتے ہوئے بولی۔ "تم ہر وقت اپنے پاس سگریٹ رکھتے ہو، لیکن میں نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔"

"میں سگریٹ پیتا ہوں، لیکن تم سوئی کہاں استعمال کرتی ہو؟" مجھ پر جیسے غصے کا بھوت سوار تھا۔

"میں میں اسے حفاظت کیلئے اپنے پاس رکھتی ہوں۔"

"یہ غلط ہے، تم یہاں ہر طرح سے محفوظ ہو، پھر یہ کوئی پستول تو ہے نہیں، ایک سوئی سے بھلا تم اپنی حفاظت کیسے کر سکتی ہو؟ اس منحوس شے کو فوراً باہر پھینک دو۔"

"ہرگز نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتی۔" وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔

اچانک ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ میں تو محض سوئی چھیننے کے لئے آگے بڑھا تھا، لیکن اس نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ سوئی لباس میں سے نکالی اور پوری قوت سے میرے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں گھونپ دی۔

اس وقت جبکہ میں یہاں کھڑا ہوں اور میرا ایک ہاتھ ہتھکڑی میں ہے، وہ جگہ درد کر رہی ہے جہاں انیتا نے سوئی چبھوئی تھی۔

درد کی شدت سے میری چیخ نکل گئی۔ اس نے ایک جھٹکے سے میری ہتھیلی میں سے سوئی کھینچ لی اور اوندھے منہ بستر پر لیٹ کر رونے لگی۔ مجھے غصہ تو بہت آیا، لیکن میں نے اپنے اوپر ضبط کیا اور ہتھیلی کا زخم دھونے اور دوا وغیرہ لگانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے کمرے سے باہر جاتے دیکھ کر انیتا تڑپ کر اٹھی اور مجھ سے آکر لپٹ گئی۔ وہ بار بار مجھ سے معافی مانگ رہی تھی۔ میں نے کچھ کہے بغیر اسے ایک طرف ہٹایا اور سٹور کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہتھیلی پر پٹی باندھ کر لوٹا، تو وہ ابھی تک رو رہی تھی۔

"ٹونی، خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ میں کبھی تم پر ہاتھ اٹھانا چاہتی ہو۔ تم تو جانتے ہو، میں نے پہلے بھی کئی مرتبہ منت کی تھی، مجھ پر ہاتھ نہ اٹھانا۔"

اس وقت تک میرا غصہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے پوچھا:

"انیتا، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تمہیں کوئی نفسیاتی مرض ہے۔ کل میں کسی اچھے سے ماہر نفسیات سے وقت لوں گا اور ہم اس کے پاس چلیں گے۔ مجھ پر اعتماد کرو اور بتاؤ تمہیں کیا پریشانی ہے؟" وہ کچھ سوچ کر بولی۔

"ایک لمحے کے لئے مجھے یوں لگا جیسے تم نیلسن ہو ٹونی! میرا باپ بہت مالدار تھا، اس کے ہاتھ بڑے مضبوط تھے اور وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ میری ماں کے مرنے کے بعد وہ بُری صحبت میں پڑ گیا۔ اس نے اپنی ساری دولت جوئے خانے میں ضائع کر دی ــــ جب وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا، تو ایک روز شراب کے نشے میں دُھت میرے کمرے میں آیا اور مجھ سے وہ ہار مانگنے کی کوشش کی جو ماں نے مجھے تحفہ دیا تھا۔ میرے انکار پر وہ مشتعل ہو گیا اور زندگی میں پہلی بار میری خوب پٹائی کی۔ بابا! اس نے مجھے اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس قدر مارا کہ میں بے ہوش ہو گئی۔ اُس کے جانے کے بعد گھر سے نکل کھڑی ہوئی اور کئی ماہ اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔ ایک روز پتہ چلا میرا باپ ایک حادثے میں مارا گیا ہے۔ مجھے بہت دُکھ ہوا۔ میں اس سے محبت کرتی تھی۔ اس ایک واقعے کے سوا جس کے بعد میں نے گھر چھوڑ دیا تھا، وہ ہمیشہ مجھ سے محبت و شفقت کا سلوک کرتا رہا تھا۔ انہی دنوں

مجھے نیلسن ملا۔ وہ بہت مالدار تھا لیکن سچ جانو مجھے اُس کی دولت سے کوئی دلچسپی نہ تھی، میں تو محض اُس کے ہاتھوں کی دیوانی تھی۔ اُس کے ہاتھ بھی میرے والد کے ہاتھوں کی طرح مضبوط اور چوڑے تھے۔ اس نے مجھ سے شادی کی درخواست کی، جسے میں نے قبول کر لیا ـــــ لیکن ہم دونوں زیادہ دیر تک خوش نہ رہ سکے۔ اس کی اور میری طبیعتوں میں بہت فرق تھا، ایک روز کسی بات پر مشتعل ہو کر اس نے میرے منہ پر ایک تھپڑ مارا۔ مجھے فوراً وہ وقت یاد آ گیا جب میرے باپ نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے میری پٹائی کی تھی۔ ہاتھ، طاقتور اور مضبوط ہاتھ میری کمزوری تھی، لیکن میں چاہتی تھی ایسے ہاتھوں والا مجھ سے محبت کرے، میری بات مانے، مجھ سے شفقت کا برتاؤ کرے، میری ضروریات کا خیال رکھے۔ غرض میرے لئے ہر وہ کام کرے جو اچھے دنوں میں میرے ابا کرتے تھے، لیکن نیلسن نے میری آرزوؤں کے تمام محل مسمار کر دیئے۔ مجھے اس سے نفرت ہو گئی، میں اس کی شکل دیکھنے کی روادار نہ رہی، لیکن وہ مجھے طلاق دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے مجھے دھمکی دی کہ میں نے طلاق کا لفظ بھی منہ سے نکالا، تو مجھے جان سے مار دے گا۔ یہ گھر میرے لئے قیدخانہ بن گیا اور میں سسک سسک کر زندگی گزارنے لگی۔

کچھ عرصے بعد ایک بار پھر مجھے مضبوط ہاتھوں کی تلاش ہوئی جو میرے اشاروں پر چل سکیں۔ میں نے جارج کو ڈھونڈ نکالا۔ گو اس کے دماغ میں کچھ نقص تھا لیکن ہاتھ بڑے بڑے اور مضبوط تھے۔ میں نے خطیر رقم دے کر اس بات پر رضامند کر لیا کہ وہ میرے پاس رہے۔ خدا گواہ ہے میں نے جارج کو کبھی بُری نظر سے نہیں دیکھا اور سچ پوچھو تو وہ اس قابل ہے ہی نہیں کہ ایک تعلیم یافتہ اور مالدار عورت اس سے بات کرنا بھی پسند کرے، لیکن میں خوش تھی کہ وہ ہر کام میری مرضی سے کرتا ہے۔ میں اسے جو حکم دیتی وہ اسے بجا لاتا۔ نیلسن اس کا مطلب غلط سمجھا اور بار بار مجھے جارج کو نکالنے کے لئے کہا۔ میرے انکار پر اس نے پھر میری پٹائی کی لیکن کئی بار پٹنے کے باوجود میں نے جارج کو ملازمت سے الگ نہ کیا اور نہ جارج مجھے چھوڑ کر گیا۔ تنگ آ کر نیلسن کہیں غائب ہو گیا، کیونکہ اُسے معلوم تھا میں جان دے دوں گی، مگر جارج کو گھر سے نہ نکالوں گی۔ طلاق لینے کے بعد تم مجھے مل گئے۔ تمھارے ہاتھ بھی ویسے ہیں جیسے میں چاہتی ہوں اور تم مجھ سے محبت بھی کرتے ہو، مگر خدا کے لئے ٹونی، کبھی مجھ پر ہاتھ نہ اٹھانا، ورنہ میں تمھاری جان لے لوں گی یا خود مر جاؤں گی۔"

یہ کہہ کر وہ میرے قدموں میں گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اچانک اس کی نظر سوئی پر جا پڑی، اس پر ہاتھ پھیر کر اس نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا اور پھر اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ پوری قوت سے چیخ رہی تھی۔ کبھی ہنستی، تو کبھی روتی۔ میں خوف زدہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی حالت یقیناً قابلِ رحم تھی۔ میں ڈاکٹر کو بلانے کے لئے گھر سے نکلا اور تیزی سے گیراج کی طرف چلنے لگا۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ اچانک جارج کے قہقہوں اور چیخوں نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ آواز ستال کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں اُس کی طرف لپکا۔ وہ اُسی جگہ جہاں اب کھدائی ہو رہی ہے، دوزانو بیٹھا تھا اور ایک پودے کو بار بار چوم رہا تھا۔

"مسٹر نیلسن، اپنی قبر سے نکل آؤ مسٹر نیلسن، وہ بہت بُری ہے، اس نے اپنی سوئی سے تمھارا کتا بھی مار ڈالا......"

"جارج، یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" میں نے اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا: "کیا نیلسن مر چکا ہے؟"

"ہاں، وہ مر چکا ہے اور اس جگہ دفن ہے۔" وہ آنسو بہاتے ہوئے بولا۔

میرے سارے جسم میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا پہلے پولیس کو اطلاع کروں یا ڈاکٹر کو بلاؤں۔ کیا واقعی

نیلسن مر چکا ہے اور اگر جارج ٹھیک کہہ رہا ہے تو اس کا قاتل کون ہے، جارج یا انیتا؟

آخر میں نے فیصلہ کیا پولیس کو بلانے سے پہلے انیتا سے چند سوال کروں، میں گھر کی طرف دوڑا۔ خواب گاہ میں داخل ہوا، تو انیتا بستر پر اوندھے منہ پڑی تھی۔

"انیتا" میں نے پوری قوت سے آواز دی۔

"نیلسن، خدا کے لئے مجھے مت مارو، خدا کے لئے....."

"میں نیلسن نہیں، ڈونی ہوں۔ انیتا ہوش میں آؤ۔ جارج پر پاگل پن کا دورہ پڑا ہے، وہ چلا چلا کر کہہ رہا ہے کہ نیلسن مر چکا ہے اور ساحل پر اس کی قبر ہے۔"

جواب دینے کے بجائے اس نے اپنی سوئی اٹھائی اور میری طرف بڑھی، اس کی آنکھوں میں وحشت کے آثار تھے۔

"رک جاؤ انیتا، میں نیلسن نہیں، ڈونی ہوں۔ نیلسن مر چکا ہے اور تم دونوں میں سے کسی نے اسے مارا ہے۔" میں چلایا ___ لیکن انیتا اپنا وار کر چکی تھی۔ سوئی میری بائیں کلائی میں پیوست ہو گئی۔ اس نے جلدی سے سوئی نکالی اور دوبارہ وار کرنا چاہا۔ میں نے داہنے ہاتھ سے اس کے منہ پر ایک تھپڑ مارا۔ وہ چیخی،

"نیلسن، مجھے مت مارو۔"

میں نے دوسرا تھپڑ مارا۔ اس کے منہ سے کف بہنے لگا، وہ مجھے ایک طرف دھکیل کر جارج کو آوازیں دیتی ہوئی باہر بھاگی۔ میں اس کے پیچھے دوڑا۔

جارج، اسے مار ڈالو، میں حکم دیتی ہوں ڈونی کو مار ڈالو اسی طرح جیسے تم نے نیلسن کو مارا تھا۔" وہ جارج کے قریب پہنچ کر بولی، مگر جارج نے لپک کر اسے دبوچ لیا اور پوری قوت سے اس کا گلا دبانے لگا۔ میں نے چھڑانے کی بہت کوشش کی، مگر میری بائیں ہتھیلی اور دایاں بازو زخمی تھے، دیکھتے ہی دیکھتے انیتا نے دم توڑ دیا۔ جارج کے مضبوط ہاتھوں نے اس کا گلا گھونٹ دیا تھا اور اب جارج پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتا ہوا کہہ رہا تھا

"میں نے مسٹر نیلسن کا بدلہ لے لیا، میں نے شیطان کی بیٹی کو مار ڈالا۔ اب میں اس کا غلام نہیں رہوں گا، اب میں اس کے کہنے پر کسی کو قتل نہیں کروں گا۔"

چند راہگیر جو قریبی سڑک پر جا رہے تھے، شور سن کر ہماری طرف بڑھے اور پھر تھوڑی دیر بعد شاید ان میں سے کسی نے پولیس کو بلا لیا۔ پولیس نے انیتا کی لاش پر قبضہ کر لیا۔ جارج کا دماغ چل نکلا تھا کیونکہ جس جس طرح اپنے جرم کی روداد بیان کر رہا تھا۔ اس نے ریت میں سے کتے کا مردہ جسم نکالا اور انسپکٹر کو دکھاتے ہوئے بولا،

"یہ کتا نیلسن کی تجربات تھا۔ انیتا کے کہنے پر میں نے اسے مار ڈالا اور ریت میں دفنا دیا، تاکہ مسٹر نیلسن کی لاش برآمد نہ ہو جائے۔ انیتا کے کہنے پر میں نے مسٹر نیلسن کا گلا گھونٹا تھا اور پھر وہ اسے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئی تھی۔ ساری رات وہ مسٹر نیلسن کی لاش کے پاس بیٹھی رہی۔ اس نے دروازہ مقفل کر لیا تھا۔ صبح اس نے لاش میرے حوالے کر دی اور میں نے اسے دفن کر دیا۔ وہ بہت بری تھی بہت ہی بری۔"

اور اب جارج میرے پہلو میں کھڑا ہے، سپاہی اس کی بتائی ہوئی جگہ پر گڑھا کھود رہے ہیں اور وہ اچھل اچھل کر انہیں جلدی کرنے کو کہہ رہا ہے۔ اور خدایا! نیلسن کی لاش برآمد ہو گئی ہے۔ دو ماہ سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود لاش تر و تازہ ہے، شاید یہ ٹھنڈی ریت کی وجہ سے ہے۔ انسپکٹر لاش کا سرسری معائنہ کرتے ہوئے کہہ رہا ہے "مقتول کے سارے جسم میں چھوٹے چھوٹے سوراخ ہیں جیسے کسی نوکدار شے سے چھید کیا ہو لیکن حیرت ہے کہ سوراخوں سے خون باہر نہیں نکلا۔"

میں فوراً سمجھ گیا ہوں انیتا نیلسن کی لاش اپنے کمرے میں کیوں لے گئی تھی اور اسے انسانی گوشت میں سوئی گھونپنے اور پھر اس سے باہر نکالنے کی اتنی مشق کیوں تھی۔ رات بھر وہ نیلسن کی لاش پر یہی مشق تو کرتی رہی تھی۔


وہ
اسلام کی طرف
بڑھتا رہا
کتاب :- THE TALE OF EVIRENDY
مصنف : JACOB. O
تلخیص : انسر جمشید

اس عیسائی نوجوان کا نام 'ولیم سن' تھا، اور یہ داستان ۱۸۸۵ء کی ہے ـــــ وہ ایک جہاز میں خلاصی تھا ـــــ اس کی عمر بہت کم تھی، اس کے باپ کی درشتی نے اسے کش مکش کی زندگی میں ڈھکیل دیا تھا لیکن وہ اپنی بحری ملازمت کے دوران محبت کو بھی ڈھونڈتا رہا اور صداقت کو بھی تلاش کرتا رہا اور پھر ایک دن اس نے اسلام کی تعلیم پڑھی بھی اور دیکھ بھی لی ـــــ اسے ایک تسکین مل گئی لیکن اس کے بعد اسے قدم قدم پر نئی سازشوں کا شکار ہونا پڑا ـــــ سازشوں کی یہ کہانی دلچسپ بھی ہے اور حیرت انگیز بھی ـــــ لیکن پھر ـــــ۔

ایک دن وہ مسلمان ہوگیا، اس نے اسلام کو اپنا لیا، اسے زندگی کا ہر ممکن سکون مل گیا ـــــ یہ تلخیص اسی کی داستان کی ہے ـــــ۔

ـــــ سلامت علی مہدی

ایونڈری سمندر کی ہموار سطح پر خراماں خراماں چلا جارہا تھا۔ سردیوں کے دن تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جسم میں تیر بن کر پیوست ہوئے جاتے تھے۔ "ایونڈری" برسٹل سے چلا تھا اور آسٹریلیا جارہا تھا ـــــ جہاز کا عملہ اپنے اپنے کام میں مصروف تھا۔ "لڑکے چپّل کو رگڑ رگڑ کر چمکا دو۔" بڑے ملاح نے تیرہ برس کے ایک نوعمر لڑکے کو حکم دیا۔

یہ لڑکا چند روز پہلے بھرتی ہوا تھا اور خدوخال سے بڑا ضدی اور سرکش معلوم ہوتا تھا۔ وہ اب تک یہ بے کیف کام ٹالتا آرہا تھا۔ اس نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے بڑے ملاح کو دیکھا: "میں مانجھنے سمندر میں نہیں آیا ہوں۔" لڑکے نے جواب دیا۔ اس کی آواز میں سرکشی کروٹیں لے رہی تھی۔ بڑا ملاح اس جواب پر بھنّا گیا، اس کا جی چاہا ایک زوردار لات جمادے، لیکن اس کی لات بس اٹھ کر رہ گئی۔ "کہیں اس کا خمیازہ نہ بھگتنا پڑے" وہ سوچنے لگا۔ "ایونڈری جس کمپنی کا جہاز ہے، لڑکے کا چچا اس کمپنی میں ایک اعلیٰ عہدیدار ہے۔"

بڑے ملاح نے فرسٹ میٹ سے شکایت کی۔ وہ اس لڑکے کا نگران اور ضابطہ پسند سخت گیر افسر تھا۔ حکم عدولی اس کے نزدیک ناقابلِ معافی جرم تھا۔

"ولیمسن! مستول کی چوٹی پر چڑھ جاؤ اور حکمِ ثانی تک وہیں بیٹھے رہو۔" فرسٹ میٹ نے گرجدار آواز میں حکم صادر کر دیا۔

یہ ۱۸۸۵ء کا ذکر ہے۔ ان دنوں سرکش نوآموزوں کو مستول پر باندھ کر بٹھا دینے کی سزا نہایت مؤثر سمجھی جاتی تھی۔ بڑے بڑے ضدیوں کے کس بل نکل جاتے تھے۔ ولیمسن کی حالت سخت ناگفتہ بہ تھی۔ وہ صبح سے شام تک بحرِ اوقیانوس کے شدید سرد موسم میں مستول پر ٹنگا رہا۔ اندھیرا ہونے پر اسے نیچے اترنے کی اجازت ملی۔ اس کے اعضا سُن ہو چکے تھے اور اس میں چلنے پھرنے کی سکت نہ رہی تھی۔

"دوسرے ملاحوں نے اسے سہارا دے کر اتارا۔ "دیکھو لڑکے آئندہ حکم عدولی کی تو پھر ایسی ہی سزا ملے گی۔" اس نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ ولیمسن کے دانت سردی سے بج رہے تھے۔ اس کی زبان سے صرف چار الفاظ نکلے: "یہ کام نہیں جناب!" ولیمسن کی اکڑفوں بدستور قائم تھی۔

ولیمسن کی یہی سرکشی اُسے سمندر میں لائی تھی۔ وہ ایک نٹ کھٹ لڑکا تھا شرارت اُس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ قدرت نے اسے طاقت قوتِ عمل اور جرأت وہمت فیاضی سے عطا کی تھی، نچلا تو اس سے بیٹھا ہی نہ جاتا تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس کی شرارتوں اور منچلے پن میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اس کا باپ نہایت سخت گیر تھا۔ نظم وضبط کا حد درجہ پابند۔ پڑھنے لکھنے میں ولیمسن بالکل کورا تھا۔ اُدھر استادوں کی سختی اور اِدھر گھر پر باپ کے کڑے ڈسپلن اور مارپیٹ نے اُسے ضدی اور سرکش بنادیا۔ پہلے وہ سکول سے غیر حاضر رہا اور پھر گھر سے بھی بھاگنا شروع کر دیا۔

ولیمسن گھر اور سکول دونوں جگہ ایک مسئلہ بن چکا تھا۔ وہ ہاتھ سے نکلا جارہا تھا۔ اس کا چچا "انکل ڈک" ایک جہازران کمپنی کا چیف ایگزیکٹو افسر تھا۔ اُس نے مشورہ دیا:

"اُسے سمندر پر بھیج دو، اس کی سختیاں کچھ مدت سہے گا، تو آپ دُرست ہوجائے گا۔"

ولیمسن کا باپ بھی کپتان رہ چکا تھا، اُسے اپنے بچوں کے لیے یہ زندگی پسند نہ تھی۔ مگر اس مسئلے کا کوئی اور حل بھی تو نہ تھا ــــــ!

ولیمسن کی ضد کامیاب رہی، اُسے پھر کسی نے چیتل چکانے کو نہ کہا، سمندر کی زندگی بڑی کٹھن تھی اور وہ جلد ہی اس کٹھن زندگی کا عادی ہوگیا، لیکن جہازران ساتھیوں کا مخالفانہ رویہ اُس کے لئے سخت سوہانِ روح تھا۔ کپتان لانڈ اور فرسٹ میٹ سے لے کر ادنیٰ افسر تک سب اس کے ساتھ سختی سے پیش آتے تھے۔ جہاز میں تین اپرنٹس اور بھی تھے۔ وہ عمر میں اُس سے بڑے تھے، مگر مشکل ترین کام اُسی کو دیا جاتا۔ افسروں کی بے مہری نے ان تینوں لڑکوں کو اس پر دلیر کر دیا تھا۔ وہ بھی اُس پر افسری جتلاتے تھے۔

بکل کو تو گویا اس سے باپ مارے کا بَیر تھا۔ وہ اسے طرح طرح سے دق کرتا اور چاہتا کہ وہ جو حکم دے، اسے ولیمسن پوری نیاز مندی سے بجالائے۔ ولیمسن ایسے سرکش لڑکے کے لیے یہ بات ناقابلِ قبول تھی۔ نتیجہ یہ کہ دونوں میں ہاتھا پائی ہونے لگی۔ شام کے وقت تقریباً روزانہ اکھاڑا جم جاتا اور مُکّے بازی ہوتی۔ ولیمسن چھوٹا بھی تھا اور بکل کے مقابلے میں کمزور بھی، اس لئے مار بھی اسی کے حصّے میں آتی۔ افسر آنکھ چُرا کر نکل جاتے۔ ولیمسن مار بھی کھاتا اور نشانۂ تضحیک بھی بنتا۔ اس کا چہرہ، ناک اور کان سُوج گئے تھے اور آنکھ کے پاس نیل پڑگیا تھا۔ وہ شکایت کرتا تو جواب ملتا:

"آدمی مار کھا کر ہی بڑا ہوتا ہے۔"

آئے دن کی مارپیٹ نے اس کے اندر جوشِ انتقام پیدا کر دیا۔ ایک روز نہ جانے اُس میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ وہ بکل پر خونخوار بلڈ ہاؤنڈ کی طرح ٹوٹ پڑا، اور پھر اُسے وہ ماردی کہ چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ بکل اس کے قدموں میں پامال پڑا تھا۔ اس کے چہرے اور ناک سے خون بہہ رہا تھا ــــــ ولیمسن میں ایک فاتح کی شان جلوہ گر تھی، اس نے برسوں کی زیادتی کا انتقام لے لیا تھا۔

ایک دوسرے واقعے نے اس کی زندگی بالکل بدل کر رکھ دی۔ ایلونڈری سڈنی اور نیوکیسل میں سامان اُتار کر سان ڈائیگو جارہا تھا۔ ولیمسن عرشے کے کمرے میں مصروفِ کار تھا۔ باہر ہوا کے رُخ پر سیکنڈ میٹ کھڑا تھا۔ اتنے میں فرسٹ میٹ آیا اور اُس سے باتیں کرنے لگا۔ ولیمسن کے کان کھڑے ہوگئے کیونکہ اسی کا ذکر ہو رہا تھا۔ شاید انھیں خبر نہیں تھی کہ ولیمسن قریب ہی موجود ہے۔

"تم اور بڑے میاں ولیمسن کا حوصلہ توڑنے پر تُلے ہوئے ہو۔" سیکنڈ میٹ کہہ رہا تھا (بڑے میاں سے مُراد کپتان لانڈ تھا)۔ "حالانکہ تمھیں اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔

لڑکا بڑا ہی ذہین ہے، ایسا اپرنٹس تو ہمیں آج تک نہیں ملا۔"

"ہاں چھوکرا بُرا نہیں ہے۔" فرسٹ میٹ نے اعتراف کیا۔ "اسی کا بھلا مقصود ہے۔ ساحل پر ایک اسامی اس کی منتظر ہے، برشل واپس جاتے ہی اس پر لگ جائے گا۔ اس کا باپ اور چچا دونوں نہیں چاہتے کہ وہ عمر بھر سمندروں میں مارا مارا پھرتا رہے۔ ہمیں ہدایت تھی کہ اُسے خوب دق کریں اور کٹھن سے کٹھن کام لیں تاکہ وہ اس زندگی سے بیزار ہو جائے۔"

ولیمسن پر رازِ نہاں آشکارا ہو گیا۔ سارے واقعات اُس کے لوحِ ذہن پر اُبھر آئے۔ یہ سب کچھ اس کے باپ اور چچا کی ہدایت پر ہو رہا تھا۔ اُسے سخت صدمہ پہنچا، اس کے دل میں باپ اور چچا کے خلاف نفرت کا لاوا کھولنے لگا۔ اس نے فیصلہ کر لیا "وہ عمر بھر گھر کا مُنہ نہ دیکھے گا!"

۲

الانڈری سان ڈائیگو پہنچا۔ ہر شخص جہاز سے اُتر کر ٹانگیں سیدھی کرنے کے لئے بے چین تھا۔ کام کاج سے فراغت پانے کے بعد جہاز رانوں کو سیر سپاٹے کے لئے شہر جانے کی اجازت مل گئی۔ کپتان لائنڈ نے ولیمسن اور سینیئر اپرنٹس کو بلایا۔ دونوں کو دو دو ڈالر دیئے۔ دونوں جیب میں رقم ڈالے ساحل پر آئے۔ سینیئر اپرنٹس گلچھرے اُڑانے کے لئے جلد ہی ولیمسن سے الگ ہو گیا۔ ولیمسن چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ تیز تیز شمال کی طرف چل پڑا۔ شام کے قریب ایک بستی میں پہنچا۔ کچھ دن وہاں ٹھہرا اور پھر آگے روانہ ہو گیا۔

اب اس کا یہ معمول بن گیا تھا کہ چند روز وہ کسی بستی یا مزرعہ میں ٹھہرتا، محنت مزدوری کر کے کچھ رقم کماتا اور پھر آگے کی راہ لیتا۔

لاس اینجلز سے چند میل دُور جنوب میں ایک مزرعہ پر وہ خاصی مدت رہا۔ یہاں اُس نے پہلے ایک ٹامی گن اور پھر شاٹ گن خریدی۔ سیر و شکار اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ لاس اینجلز کی زندگی خوش گوار تھی۔ مگر اس میں کوئی تنوع نہ تھا۔ وہ اس ماحول سے اُکتا چکا تھا لیکن ابھی وہ فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ کہاں جائے۔ اچانک ایک نئی آرزو کی کرن اس کے دل و دماغ میں جگمگا اٹھی۔ اس کے ذہن پر بچپن کی ایک دُھندلی سی تصویر اُبھر آئی۔ اس کی خالہ بہت شفیق اور مہربان تھیں اور اس سے بہت پیار کرتی تھیں۔ ان کی شادی مسٹر ہاورڈ سے ہوئی تھی شادی کے بعد دونوں میاں بیوی کیلی فورنیا میں آ کر بس گئے تھے۔ اُس نے اُن کی تلاش شروع کر دی۔ آخر پتا چلا کہ کوئی پچاس میل دُور ایک جگہ "سویٹ واٹر رینچ" ہے۔ اُس کے مالک ہاورڈ ہیں۔ ایک موہوم سی اُمید لئے وہ نکل کھڑا ہوا۔

مسز ہاورڈ اس کے خالو ہی نکلے۔ مسز ہاورڈ ولیمسن کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئیں۔ بڑی محبت سے پیش آئیں۔ مسٹر ہاورڈ کا سلوک بھی مشفقانہ تھا۔ سویٹ واٹر رینچ کی زندگی بڑے مزے کی زندگی تھی۔ ہر قسم کی آزادی میسر تھی۔ کھانے پینے کو اچھا اور کافی ملتا تھا۔

ولیمسن دن کے وقت گوالوں کے ساتھ مویشی چَراتا۔ اور راتیں کیلی فورنیا کے تاروں بھرے آسمان کے نیچے کھیتوں میں گزارتا۔ عمدہ غذا، کھلی ہوا اور پُر مشقت کام نے اُسے ایک چوڑا چکلا اور مضبوط آدمی بنا دیا۔ رینچ کی فضا ولیمسن کو مستقبل کے لئے تیار کر رہی تھی۔ یہیں اس نے مُنہ زور گھوڑوں کو قابو میں لانا اور ان پر سوار ہونا سیکھا اور یہیں اسے وہ حیات آفریں جوش و جذبہ اور رنگ ڈھنگ ملا جس سے مستقبل کی راہ آسان اور دل کش بن گئی۔

یہ پُرلطف زندگی بھی زنجیرِ پا نہ بن سکی۔ انہی دنوں نوادا میں سونا دریافت ہوا تھا اور بہت سے قسمت آزما اور مہم پسند لوگ اپنا اثاثہ بیچ کر نوادا جا رہے تھے۔ ولیمسن بھی اپنی جمع پونجی لیکر

چل کھڑا ہوا۔ مگر راستے میں اُچکوں کے ہاتھوں لُٹ گیا۔ صبح سو کر اٹھا، تو نہ جوتے تھے اور نہ جیب میں جو کچھ تھا ہر شے غائب تھی، تاہم اس نے ہمت نہ ہاری۔ رستے میں محنت مزدوری کر کے اس نے اپنا سفر جاری رکھا اور آخر کار دو ساتھیوں کے ساتھ نواد پہنچ گیا اور ایک قطعہ زمین لے کر قسمت آزمائی شروع کر دی۔

کان کنی بڑا ہی کٹھن کام تھا۔ سونا نکلا تو سہی۔ مگر محنت کے مقابلے میں نہایت قلیل، چنانچہ جب ایک شخص نے انھیں اس کان کے لئے چھ سو ڈالر کی پیش کش کی، تو انھوں نے بڑی خوشی سے سودا کر لیا۔ ولیمس اپنے حصے کے دو سو ڈالر لے کر ــــــــ سان فرانسسکو پہنچا۔

اب ولیمس کی حالت اُس جہاز کی طرح تھی جس کا لنگر تھا، نہ کوئی منزل۔ بورڈے، پرتگال، نیویارک، فلاڈلفیا، سان فرانسسکو، کیلیفورنیا غرض وہ جگہ جگہ پھرتا رہا ــــ اس دوران میں پیٹ پالنے کے لئے طرح طرح کے پاپڑ بیلے، ٹکے بازی بھی کی اور سوانگ بھی رچائے۔

ایک مرتبہ ایک شکاری جہاز کے ملاحوں کے ہتھے چڑھ گیا اور ایک عرصے تک پہلے بیگار میں اور پھر تنخواہ پر قطب شمالی کے سمندروں میں وہیل کا شکار کھیلتا رہا۔ آخر پانچ برس کے بعد اس کی زندگی کا جہاز جزیرہ پونیپ کے ساحل پر لگا، لیکن یہ بھی ایک عارضی منزل ثابت ہوئی ــــــــ!

شکاری جہاز کا کپتان ولسن، ولیمس کی صلاحیتوں، جفاکشی اور دیانتداری سے بہت متاثر ہوا۔ اُس نے جزیرۂ پونیپ میں ایک تجارتی مرکز کھولا جس کے لئے اُسے ایک دیانتدار اور محنتی انچارج کی ضرورت تھی۔ اس کی نگاہِ انتخاب ولیمس پر پڑی۔ ولیمس نے اُس کی یہ پیش کش فوراً ہی قبول کر لی۔ ولسن کا کاروبار جلد ہی چمک اٹھا۔ وہ پونیپ اور گرد و پیش کے جزائر سے ناریل اور گری کا تیل جہاز پر لاد کر آسٹریلیا، چین اور دوسرے جنوبی ملکوں کا سفر کرتا اور وہاں سے کپڑے کی گانٹھیں، بندوقیں اور دوسری اشیا لاتا۔

جزیرہ پونیپ سپین کی نوآبادی تھی۔ اہل ہسپانیہ نے اگرچہ مقامی باشندوں کو مغلوب کر لیا تھا، لیکن وہ بار بار بغاوت کرتے تھے۔ ولیمس کے ابتدائی مہینے آرام سے گزرے۔ دکان میں تین بندوقیں بھی تھیں جنھیں فروخت کرنے کی اجازت اس نے ہسپانوی حکام سے لے لی تھی۔ یہی بندوقیں ولیمس کے لئے مصیبت بن گئیں۔

ولیمس نے آتے ہی بھانپ لیا کہ مقامی باشندوں میں ہسپانوی حاکموں کے خلاف بے چینی پائی جاتی ہے۔ یہ آگ اندر ہی اندر سُلگتی رہی اور پھر ایک دن بھڑک اٹھی۔ ہسپانوی فوجوں نے بڑی بے دردی سے بغاوت کچل دی۔ بے شمار پونیپی مارے گئے اور سینکڑوں گرفتار کر لئے گئے۔ بغاوت کی خبر سنتے ہی ولیمس نے پہلا کام یہ کیا کہ جیسوئٹ مشن کے دو پادریوں کو گواہ بنا کر بندوقیں دُکان میں بند کر دیں اور تالا لگا دیا۔ اس بات کو کئی روز گزر گئے۔

ولیمس ایک ڈونگا کشتی میں سوار ہو کر کچھ سامان خریدنے کے لئے ایک قریبی جزیرے کی طرف جا رہا تھا کہ ہسپانوی حکام نے اسے گرفتار کر کے جنگی جہاز میں پہنچا دیا جو ساحل پر لنگر انداز تھا۔ اس نے ہر چند احتجاج کیا مگر اس کی ایک نہ سُنی گئی۔ جنگی جہاز کے کمانڈر نے بتایا کہ اس پر مقامی باشندوں کے ہاتھ غیر قانونی طور پر بندوقیں بیچنے اور بغاوت کی آگ پر تیل چھڑکنے کا الزام ہے۔

اس نے ارتکاب جرم سے انکار کیا، اُس کے پاس ہسپانوی گورنر کا اجازت نامہ دُکان میں موجود تھا لیکن اس کی ہر چیخ پکار بے اثر ثابت ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد مقامی باشندوں کے چار رہنما بیڑیوں میں جکڑے ہوئے لائے گئے۔ رات کے

وقت جنگی جہاز منیلا روانہ ہوگیا ــــــ !

منیلا کا قید خانہ قیدیوں سے بھرا ہوا تھا، انھیں جس کوٹھڑی میں رکھا گیا، وہ احاطے کے عین وسط میں تھی، چاروں طرف سے کھلی، صرف مضبوط سلاخیں لگی ہوئی تھیں، بیس پچیس قیدی گندے کچے فرش پر گٹھڑی بنے پڑے تھے۔ آدھی رات کے قریب سنتری ہاتھوں میں لالٹین لئے دروازے پر نمودار ہوئے اور ایک قیدی کو گھسیٹ لے گئے۔ یہ قیدی دوبارہ دیکھنے میں نہ آیا۔

کوٹھڑی میں قدم رکھتے ہی ولیمسن کا ماتھا ٹھنکا۔ قیدیوں کی بات چیت سے پتا چلا کہ "یہ پھانسی گھر" ہے۔ ہر دوسری تیسری رات سنتری آتے ہیں اور قیدیوں کو پھانسی دینے کے لئے لے جاتے ہیں۔ اس صورت حال نے ہر قیدی پر موت کا خوف سوار کر رکھا تھا۔ مسلسل خوف اور اس کیفیت نے اکثر قیدیوں کے اعصاب تباہ کر دیے ہیں۔

قید و بند کے یہ دن ولیمسن نے مسلسل ذہنی کرب میں گزارے۔ تین دن تک وہ بالکل بھوکا رہا۔ سنتری کھانا لے کر آتے اور دوسرے قیدیوں کو دے کر چلے جاتے، کوئی اس کی طرف نگاہ غلط بھی نہ ڈالتا، جیسے وہ وہاں موجود ہی نہیں۔ یہی حالت ان چار بدنصیب قیدیوں کی تھی جو اس کے ساتھ پونیپ سے لائے گئے تھے۔ اکثر قیدی فلپینی تھے، یہ کوہستانی لوگ تھے اور ہسپانوی استعمار کے آگے ابھی تک سپر انداز نہیں ہوئے تھے۔ چوتھے روز اُسے کھانا ملا۔ اسی روز جیل کے گورنر کے سامنے اس کی پیشی ہوئی۔

جیل کا گورنر وضع قطع اور چہرے مہرے سے نہایت معقول اور شریف آدمی نظر آتا تھا۔

"تمھارا نام ولیم رچرڈ ولیمسن ہے؟" اس نے سامنے رکھے ہوئے کاغذات کا جائزہ لینے کے بعد رواں اور شگفتہ انگریزی میں پوچھا۔ اس کے لہجے میں حد درجہ نرمی اور شیرینی تھی۔ ولیمسن کی ہمت بندھ گئی اور اس کے دل میں امید کی شمع جگمگا اٹھی۔

"تم پر ہسپانوی عملداری میں باغیوں کا ساتھ دینے اور ان کی اعانت کرنے کا الزام ہے۔ منیلا میں ایک ہسپانوی جج کی عدالت میں تم پر مقدمہ چلایا جائے گا۔"

ولیمسن سرو قد کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا۔

"کب؟" اس نے پوچھا۔

"شاید چند مہینے لگ جائیں، عدالتیں آج کل بے حد مصروف ہیں۔ تمھیں اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے خاصا وقت مل جائے گا۔ جب تک مقدمہ نہیں چلتا تمھیں دوسرے قیدیوں کے ساتھ مشقت کرنا ہوگی۔"

گورنر کی آواز بدستور نرم اور مشفقانہ تھی۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا، گویا پیشی ختم ہوگئی، لیکن ولیمسن نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کی۔

"یہ غلط ہے کہ میں نے بغاوت میں حصہ لیا ہے۔ میں برطانوی رعایا ہوں، مجھے قونصل سے ملنے کا حق دیا جائے ـــــ" اس نے کہا۔

"بندوبست ہو سکا، تو ہم دیکھیں گے" ـــــ گورنر نے جواب دیا۔

"نہیں، ابھی بندوبست ہونا چاہیے۔ آپ مقدمہ چلائے بغیر مجھے مہینوں قید نہیں رکھ سکتے۔ میں صرف انصاف چاہتا ہوں۔"

"اطمینان رکھو، انصاف ہوگا۔ آج تم مشقتیوں کے ساتھ کام کرو گے۔"

"میں مشقت نہیں کروں گا۔ میں اپنا حق چاہتا ہوں، مجھے برطانوی قونصل سے ملنے کی اجازت دی جائے۔"

"تم کام نہیں کرو گے؟" گورنر کا لہجہ بدستور نرم تھا، مگر جھلاہٹ صاف ہویدا تھی "سارجنٹ پیڈرو، ذرا اسے بتاؤ کام کیسے نہیں کرتے۔" گورنر نے ایک ناٹے بھاری بھرکم سپاہی سے

ہسپانوی زبان میں مخاطب ہو کر کہا۔

سارجنٹ کے کھردرے اور درشت چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ حکم کی تعمیل میں جھک گیا۔

پیشی ختم ہو گئی۔ پھانسی گھر کے احاطے میں قیدی دو لمبی قطاریں بنائے ایک طویل زنجیر میں بندھے کھڑے تھے، خطرناک قیدیوں کی ٹولی الگ تھی، ان کے پاؤں میں بیڑیاں بھی ڈال دی گئی تھیں۔ ہر قیدی اس لمبی زنجیر کے ساتھ ایک چھوٹی سی زنجیر سے الگ بندھا ہوا تھا اس چھوٹی زنجیر کے سرے پر ایک ایک بھاری سا گولا تھا، جسے ہر شخص نے اپنے ہاتھ میں اٹھا رکھا تھا۔ سارجنٹ پیڈرو نے بردے سے اشارہ کیا۔ ولیمسن سمجھ گیا اسے آخری موقع دیا جا رہا ہے۔ مگر اس نے پھر انکار کیا۔ قیدی روانہ ہو گئے۔ ولیمسن انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ ابھی تک غصے سے کھول رہا تھا۔

ولیمسن کی تو روح فنا ہو گئی۔ وہ ایک بڑے سے آہنی تالاب کے سامنے کھڑا تھا جس کی دیواریں چھ فٹ اونچی تھیں ان کے ساتھ ساتھ چھوٹی سی آہنی سیڑھی لگی تھی۔ سیڑھی کے قریب ایک موٹا اور لمبا سا عمودی آہنی ڈنڈا نظر آیا جس کے ساتھ ہتھا تھا۔ یہ تالاب کے اوپر چند فٹ تک چلا گیا تھا۔ کچھ فاصلے پر تالاب کی دیوار میں دو چوبی دروازے کھیتوں میں کھلتے تھے ـــــ ایک سنتری سیڑھی پر چڑھ کر تالاب میں کود گیا۔ سارجنٹ پیڈرو نے ولیمسن کو بھی تالاب میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ ولیمسن کھڑا رہا۔ دو سپاہیوں نے رائفلیں چھتیائیں۔ ولیمسن نے پھرتی سے حکم کی تعمیل کی۔ دونوں سنتری کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ تالاب کے اندر جو سنتری کھڑا تھا۔ اس نے ولیمسن کی ایک ٹانگ زنجیر میں باندھ دی اور خود تالاب سے باہر نکل گیا۔

ولیمسن یہ تو جانتا تھا کہ اسے حکم عدولی کی سزا ملے گی۔ مگر اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اسے انتہائی سفاکانہ عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ باہر سنتری ہسپانوی میں باتیں کر رہے تھے۔ اچانک تالاب میں سیلاب سا اُمڈ پڑا۔ چند منٹ کے اندر اندر پانی اس کے گھٹنوں تک پہنچ گیا۔ ہسپانوی اسے غرق کر کے چوہے کی موت مارنا چاہتے تھے۔ وہ لرز گیا۔ پانی بدستور بڑھ رہا تھا۔ اب وہ کمر تک ڈوب چکا تھا۔ وہ خوف کے مارے چلایا۔ سارجنٹ پیڈرو کا کریہہ اور سفاک چہرہ تالاب کے کنارے نمودار ہوا۔ اس نے کچھ کہا۔ مگر ولیمسن کو کچھ سنائی نہ دیا۔ پھر اس نے لوہے کے ہتھے کی طرف اشارہ کیا۔ ولیمسن کی جان میں جان آئی۔ اس نے ہاتھ بلند کر کے ڈنڈا پکڑ لیا اور رینگ گیا۔ لیکن وہ کب تک لٹکا رہ سکتا تھا، پانی بڑھ کر اس کے کندھوں تک پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔

موت کے خوف سے اس کا جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ پانی بڑھ رہا تھا، وہ پھر چلایا۔ لیکن اس کی آواز گونج کر رہ گئی۔ اس کی قوت برداشت جواب دیتی جا رہی تھی۔ اب پانی ٹھوڑی تک پہنچ گیا۔ بس دو چار منٹ میں اس کی زندگی کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ پانی کے بڑھنے کی رفتار حیرت انگیز طور پر تیز تھی ـــــ زندگی کے چند ہی سانس باقی تھے۔ پانی منہ کے قریب آ گیا۔ وہ پوری قوت سے چیخا:

"میں کام کروں گا، مجھے بچاؤ۔ میں کام کروں گا۔۔۔"

اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہو۔

"بالکل کتے، کام کرو گے؟" اس کے کانوں میں کہیں دور سے آواز آئی۔

"ہاں، ہاں" اس نے پورے جسم کا زور لگاتے ہوئے کہا مگر جیسے اس کی آواز سینے ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ تالاب کا چوبی دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پانی تیزی کے ساتھ نکلنے لگا۔ اس کی آواز سن لی گئی تھی۔ تالاب خالی ہو گیا اور ولیمسن کو سہارا دے کر باہر نکالا گیا۔ تالاب سے نکلتے ہی وہ بے سکت ہو کر گر پڑا۔

"احمق! جیل کے گورنر سے مذاق کرتے تھے؟ وہ احکام کی

تعمیل چاہتے ہیں۔" ایک لوواردا فسر نے تحکمانہ انداز میں نصیحت کی۔ مگر اب ولیمسن کو نصیحت کی ضرورت نہ تھی۔ اگلے روز وہ گودی تعمیر کرنے والے قیدیوں کی صف میں کھڑا تھا۔

ولیمسن کی زندگی کا یہ پہلا تجربہ تھا ــــــ نہایت اذیت ناک تجربہ۔ وہ بڑے بڑے پتھر اور شہتیر اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتا اور سستانے کی مہلت بھی نہ دی جاتی۔ بوجھ اٹھانے اٹھاتے سست پڑجاتا، تو بندوق کے کندوں سے خبر لی جاتی۔ وہ بھاگ نکلنے کے منصوبے باندھنے لگا۔ سنتری' قیدیوں کی سخت نگرانی کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک دو قیدیوں نے بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر انھیں گولی مار کر وہیں ٹھنڈا کر دیا گیا۔ برطانوی قونصل سے ملاقات یا مقدمہ چلنے کی امید بھی موہوم نظر آتی تھی۔

سوچ سوچ کر اس نے سنتریوں سے راہ و رسم پیدا کرنے اور انھیں اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا۔ کیلے فورنیا میں اس نے کچھ ٹوٹی پھوٹی ہسپانوی زبان سیکھ لی تھی۔ اس سے منصوبے کی تکمیل میں خاصی مدد ملی۔ اس نے اپنا طرزِ عمل یکسر بدل ڈالا۔ اب وہ ایک نمونے کا قیدی بن چکا تھا۔ اطاعت شعار، محنتی اور بے ضرر۔ اس نے ایک ایک سنتری کا نفسیاتی مطالعہ شروع کر دیا۔ آخر اس کی نظرِ انتخاب ایک سنتری پر پڑی۔ اس کا نام گول تھا۔ قیدی اسے اپولو کہا کرتے تھے۔ وہ میانے قد کا مستعد اور ہوشیار سپاہی تھا۔ قیدیوں کے ساتھ نرمی سے پیش آتا اور نسلی برتری کا احساس بھی رکھتا تھا۔ کسی سفید فام قیدی کو رنگدار مجرموں کے زمرے میں دیکھ کر اسے سخت غصہ آجاتا۔

ولیمسن نے اس کے ساتھ رسم و راہ پیدا کر لی۔ باتوں باتوں میں اسے پتہ چلا کر گول اس کے ساتھ گہری ہمدردی رکھتا ہے، اس کے نزدیک کسی انگریز یا امریکی کو فلپینیوں کے ساتھ قید رکھنا ہسپانوی مفاد کے منافی تھا۔ گول کو رشوت دے کر کام نکالا جا سکتا تھا۔ مگر وہ رشوت کہاں سے لائے؟ منیلا میں اس کا ایک بھی شناسا نہ تھا، اس کی صرف ایک سہیلی تھی، اور وہ تھی مایوسی!

ولیمسن ایک اور قیدی کے ساتھ حسبِ دستور نئی گودی کے قریب کام کر رہا تھا۔ بندرگاہ کو جانے والی سڑک کے ساتھ شہتیروں کا ایک بہت بڑا انبار تھا۔ دونوں قیدی بھاری شہتیر اٹھا کر زیرِ تعمیر گودی میں پہنچا رہے تھے۔ مسلح سنتری پہرہ دے رہے تھے۔ چند راہگیر قیدیوں کو کام کرتے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ یہ لوگ زیادہ تر ملاح تھے۔ شہتیروں کے قریب سارجنٹ پیڈرو کھڑا تھا۔ بھرا ہوا پستول اس کے کندھے سے لٹک رہا تھا۔

"جلدی کرو، جلدی۔"

سارجنٹ قیدیوں پر برسا اور پھر ایک طرف ہو کر سگرٹ سلگانے لگا۔ جونہی اس کی نگاہ قیدیوں پر سے ہٹی، ایک امریکی ملاح تماشائیوں کے ہجوم میں سے آگے بڑھا۔

" انھیں کہیں چھپا لو۔" وہ آہستہ سے بولا اور کوئی چیز ولیمسن کے ہاتھ میں تھما دی۔ ولیمسن نے انھیں جلدی سے چھپا لیا یہ دو ڈالر تھے، خوشی سے ولیمسن کا چہرہ دمک اٹھا۔ اب وہ اپولو کے ساتھ اپنی آزادی کا سودا کر سکتا ہے۔

دو ڈالر کام کر گئے۔ اسی رات بیت الخلا جانے کے بہانے ولیمسن نے اپولو سے کھل کر بات کی۔ اپولو کو اس سے ہمدردی تھی۔ دو ڈالر دیکھتے ہی اس نے ولیمسن کو ہر ممکن مدد دینے کا وعدہ کیا۔ وہ اپنی کوٹھڑی میں چلا آیا اور اپولو گشت پر نکل گیا۔

ولیمسن کو رات بھر نیند نہ آئی۔ اس کے خیالات امید و بیم کی لہروں پر ہچکولے کھاتے رہے۔

اگلی صبح جیل خانے کے احاطے میں قیدی کام پر جانے کے لیے صف بستہ کھڑے ہو گئے۔ سنتری چکر کاٹ کر قیدیوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ اپولو بھی ان کے ساتھ تھا۔ اگرچہ اس روز اس کی چھٹی

تھی۔ مگر وہ بڑا سرگرم نظر آرہا تھا۔ اچانک ولیمس کے پاس پہنچا وہ زنجیر ہاتھ میں لئے مستعد کھڑا تھا۔ پلوٹو نے اس کی کلائی پر زنجیر کا ایک حلقہ زور سے دبایا جیسے وہ اسے مضبوط کر رہا ہو اور پھر آگے نکل گیا۔

اس نے آزادی کی کنجی ولیمس کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ اب تالا کھول کر بھاگ نکلنا اس کا اپنا کام تھا۔ جیل کا پھاٹک کھلا اور قیدی مارچ کرتے ہوئے گودی کی طرف روانہ ہوگئے۔ بیشتر قیدیوں نے زنجیریں ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھیں، تاکہ کلائی نہ چھل جائے، اس لئے ولیمس پر کسی کو شک نہ گزرا۔ سبھی سنتری یہ سمجھتے رہے کہ وہ بھی زنجیر میں بندھا ہوا ہے۔

ولیمس صبح شام سڑک پر سے گزرتے وقت بغلی گلیاں اور ان کی عمارتیں غور سے دیکھتا جاتا تھا۔ ایک گلی میں چند گز دور بڑی سی عمارت پر امریکی پرچم لہرا رہا تھا۔ یہ امریکی قونصل کا دفتر تھا۔ اس عمارت میں پناہ لینے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔ ولیمس جونہی اس بغلی گلی کے نزدیک پہنچا، اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ایک نظر سنتریوں پر ڈالی، وہ کندھوں پر رائفلیں لٹکائے مطمئن چلے جارہے تھے۔ گلی کے نکڑ پر پہنچتے ہی ولیمس نے زنجیر گرادی، اور بھاگ کھڑا ہوا۔ چند سنتریوں نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھ لیا۔ پھر کیا تھا؛ گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ بازار میں بھگدڑ مچ گئی۔ راہگیر گولیوں کی زد سے بچنے کے لئے زمین پر لیٹ گئے۔ ولیمس ہجوم کو چیرتا اور لیٹے ہوئے لوگوں کو پھلانگتا ہوا گلی میں داخل ہوگیا۔ گولیاں، اس کے سر کے اوپر اور دائیں بائیں سے سنسناتی ہوئی نکل رہی تھیں۔ ولیمس اندھا دھند دوڑتا ہوا امریکی قونصل خانے میں گھس گیا۔

قونصل مسٹر رسل ویب برآمدے میں بیٹھے تھے۔ ولیمس ان کے پیچھے جا کھڑا ہوا، اور چلّایا: "مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔"

مسٹر ویب نے کوئی جواب نہ دیا تاہم ولیمس کو فوراً اندر کمرے میں دھکیل دیا اور بڑا چوبی پھاٹک بند کروادیا۔

اتنے میں ہسپانوی سنتری بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ زور زور سے چیخنے کے ساتھ ساتھ لاتوں اور بندوقوں کے کندوں سے دھڑا دھڑ دروازہ کوٹ رہے تھے۔ لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم باہر جمع ہوگیا۔ مسٹر ویب نے جنگلے میں سے جھانک کر پوچھا:

"یہ کیسا شور ہے؟"

"ایک انگریز مجرم بھاگ کر یہاں آگھسا ہے، اُسے ہمارے حوالے کرو، اس نے سپین کی عملداری میں بغاوت پھیلائی تھی۔" پیڈرو نے جواب دیا۔

"منیلا کے گورنر سے وارنٹ لے کر آؤ، ورنہ اسے تمھارے حوالے نہیں کیا جائے گا۔" مسٹر ویب نے کہا۔

سنتری چنگھاڑنے لگے۔ اتنے میں ایک ہسپانوی افسر بھی پہنچ گیا۔ مگر مسٹر ویب کا ایک ہی جواب تھا "منیلا کے گورنر سے وارنٹ لے کر آؤ۔" وہ بے نیل مرام چلے گئے۔ اب مسٹر ویب ولیمس کی طرف متوجہ ہوئے:

"اب کہو، کیا قصہ ہے؟"

ولیمس نے شروع سے آخر تک ساری داستان بیان کردی۔ مسٹر ویب خاموش سنتے رہے، پھر بولے:

"تم ٹھیک کہتے ہو، مجھے تم پر اعتماد ہے۔ یہ ہسپانوی ایسے ہی بدمعاش ہیں۔ مگر تم برطانوی رعایا ہو، اس لئے برطانوی قونصل کو مطلع کرنا ضروری ہے۔"

"میرا اُن سے یہی مطالبہ تھا۔ مگر انھوں نے انکار کردیا۔"

"تم یہاں بیٹھو، اس عمارت کے اندر کوئی تمھارا بال بیکا نہیں کرسکتا۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

مسٹر ویب دیر تک غائب رہے۔ غصے میں بھرے ہوئے واپس آئے:

"برطانوی قونصل نے مداخلت کرنے سے صاف انکار

کر دیا ہے۔ وہ مجرموں کی پشت پناہی کر کے نئی الجھن مول نہیں لینا چاہتا۔" مسٹر ویب نے ساری رُوداد کہہ دی۔ ولیمسن کا رنگ فق ہو گیا۔ چند لمحوں بعد مسٹر ویب پھر مخاطب ہوئے: "گھبراؤ نہیں میں تمھیں ان بدمعاشوں کے ہاتھ نہ لگنے دُوں گا۔ میں خود کوئی انتظام کرتا ہوں۔"

مسٹر ویب پھر کہیں چلے گئے۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد خوش خرم لوٹے: "انتظام ہو گیا ہے، بندرگاہ میں ایک برطانوی جہاز کھڑا ہے، اس کا کپتان تمھیں منیلا سے چوری چھپے نکال لیجائے گا۔"

سُورج غروب ہو چکا تھا۔ منیلا کے گلی کوچے سنسان اور تاریک تھے، البتہ بندرگاہ کے قریب بہت رونق تھی۔ اچانک شور بلند ہوا، ایک فائرمین شراب کے نشے میں فحش گیت الاپ رہا تھا۔ پھر تڑاتڑ کی آوازیں آئیں۔ لوگوں نے دیکھا کسی جہاز کا کپتان ایک فائرمین پر مکّے برسا رہا ہے۔ شرابی فائرمین گالیاں بکنے لگا اور پھر غرّایا: "میں تمھیں کچا چبا جاؤں گا۔" کپتان نے اس کے جبڑے پر ایک زوردار مکّا جڑ دیا۔ بندرگاہ پر ہر شام ایسے مناظر دیکھنے میں آتے تھے۔ کپتان گرّنی اور فائرمین ولیمسن کا سوانگ کامیاب رہا۔

ولیمسن جہاز میں بے روک ٹوک سوار ہو گیا۔ البتہ اس سوانگ میں اس کا حلیہ بُری طرح بگڑ گیا اور چہرے پر کئی زخم آئے۔ وہ اپنے بارے میں مطمئن ہو گیا، لیکن "ایلولنڈ" لنگر اُٹھانے ہی کو تھا کہ ہسپانوی فوج اور پولیس پہنچ گئی۔ انھوں نے جہاز کا کونا کونا چھان مارا۔ مسافروں اور عملے کو خوب دیکھا بھالا۔ ولیمسن انجن کی بھٹی میں کوئلہ جھونک رہا تھا، اس کا جسم اور کپڑے سیاہ ہو چکے تھے۔ سارجنٹ پیڈرو نے اسے بڑے غور سے دیکھا۔ مگر سُوجا ہوا چہرہ اور زخمی آنکھ اسے بچا گئی، ہسپانوی چلے گئے اور جہاز روانہ ہو گیا۔ ولیمسن کی جان میں جان آئی۔ وہ اب آزاد فضا میں آ گیا تھا۔

۳

ایلولنڈ ہانگ کانگ جا رہا تھا، ولیمسن بھی اسی شہر میں اُتر گیا۔ کپتان گرّنی نے اسے رُخصت ہوتے وقت پانچ ڈالر دیئے۔ وہ کئی دن تک ہانگ کانگ، کولون اور چین کے ساحلی علاقوں میں گھومتا رہا۔ پھر پی اینڈ او کمپنی کے جہاز "چوزان" میں کوارٹر ماسٹر لگ گیا۔ چُوزان بمبئی جا رہا تھا۔ اس نے بھی ادھر ہی کا قصد کیا۔ وہاں پہنچ کر خوب آوارہ گردی کی۔ کئی لوگوں سے جان پہچان ہو گئی۔ ایک شناسا نے اسے انڈین پولیس میں بھرتی ہو جانے کا مشورہ دیا، لیکن وہ عرب کی افسانوی سرزمین دیکھنے کا بے حد مشتاق تھا جس کا ذکر اس نے جہازرانوں سے سُنا تھا، چنانچہ اس نے پی اینڈ او کمپنی میں مستقل ملازمت کر لی۔ چوزان سے اُسے کمپنی کے دوسرے جہاز "سیام" میں بھیج دیا گیا جو بمبئی سے عدن جا رہا تھا۔

"ایس ایس سیام" کی نوکری ولیمسن کی زندگی میں ایک زبردست انقلاب کا پیش خیمہ بن گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے یہ سارا اہتمام اسی مقصد کے لئے کیا تھا۔ جہاز میں ایک مختصر سی لائبریری تھی۔ ولیمسن کا رُجحان مطالعے کی طرف شروع ہی سے تھا۔ جسے نئے نئے ملکوں کی سیر و سیاحت نے اور بھی اُبھار دیا تھا۔ اتفاق سے یہاں اسلام کے موضوع پر ایک کتاب ہاتھ آ گئی۔ کتاب کا مصنف لورپول کا ایک وکیل کولیم تھا۔

کولیم مسلمان ہو گیا تھا اور اس کا اسلامی نام عبداللہ تھا، اس کتاب میں اس نے اپنے مسلمان ہونے کی داستان اور اسلامی تعلیمات کی حقّانیت بیان کی تھی۔ کتاب کے مطالعے سے ولیمسن کو یوں محسوس ہوا کہ وہ جس آبِ حیات کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا، اس کتاب نے اُس آبِ حیات کی نشاندہی کر دی ہے۔ یہ کتاب اس نے بار بار پڑھی اور ہر بار اس کا ذہن ایمانی کیفیت سے لذّت یاب ہوا۔

عدن کی بندرگاہ پر اسسٹنٹ ریذیڈنٹ کرنل سیسی کی طرف سے ایک پیغامبر اس کا منتظر کھڑا تھا۔ کرنل شیسی نے اسے بلایا تھا۔ ولیمسن اس بلاوے پر سخت حیران ہوا، کیونکہ وہ کرنل سے بالکل ناواقف تھا۔ جہاز کے کپتان سے اجازت لیکر وہ برٹش ریذیڈنسی پہنچا۔ کرنل اس سے بڑی گرمجوشی سے ملا۔

"نوجوان، تمھارا باپ میرا دوست ہے، مجھے اس کا خط کل ہی ملا ہے، اس نے لکھا ہے کہ تمھارا خیال انڈین پولیس میں شامل ہونے کا ہے۔"

ولیمسن نے خالہ کے کہنے پر اپنے والد کے ساتھ خط کتابت کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ آخری خط اس نے منیلا کے عذاب خانے سے نجات پانے کے بعد بمبئی پہنچ کر لکھا، اسی میں اس نے انڈین پولیس میں شامل ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

"جی ہاں، خیال تو ہے۔" ولیمسن نے کہا۔

"خوب، عدن کانسٹبلری انڈین پولیس ہی کا ایک حصہ ہے۔ یہاں ایک جگہ خالی ہے، نوکری کرو گے؟"

ولیمسن کے لئے یہ ایک زریں موقعہ تھا۔ قدرت نے خود اس کے لئے عربوں کے درمیان رہنے کا انتظام کر دیا تھا۔ وہ فوراً آمادہ ہو گیا اور چند روز بعد "سیام" سے مستعفی ہو کر پولیس میں کانسٹبل بھرتی ہو گیا۔

۴

پولیس کی نوکری ولیمسن کے لئے نئے فرائض اور نئے مشاغل لے کر آئی۔ ولیمسن کی تنخواہ پچاس روپے ماہانہ تھی اور وردی اور رہائش مفت۔ اس نے چند ماہ کے اندر اندر خاصی رقم پس انداز کر لی اور جلد ہی ایک عربی گھوڑا خرید لیا۔ پولیس کی نوکری ولیمسن کے لئے کچھ ایسی کٹھن نہ تھی۔ اپنی جسمانی ساخت کی بدولت وہ شدید ترین گرمی برداشت کر سکتا تھا۔ تفریح اور مطالعے کے لئے اسے کافی وقت مل جاتا۔ اسی زمانے میں صومالی ساحل پر زائلہ میں برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی جسے کچلنے کے لئے پولیس کا دستہ بھیج گیا۔

ولیمسن اس دستے میں شامل تھا۔ بغاوت جلد ہی فرو ہو گئی۔ پولیس پارٹی دو تین مہینے وہیں رہی۔ اس مہم میں ولیمسن کو جو ترجمان دیا گیا، اس کا نام حسن علی تھا، وہ صومالی تھا، اور بڑا ہی پرجوش مسلمان۔ وہ آسٹریلیا کا سفر کر چکا تھا اور خاصی اچھی انگریزی بول لیتا تھا۔ عربی میں تو وہ بڑی روانی سے باتیں کرتا، اسے جب پتہ چلا کہ ولیمسن کو اسلام سے گہری دلچسپی ہے، تو وہ اکثر اسلام کے موضوعات پر گفتگو کرنے لگا۔ یہ شناسائی بعد میں، گہری دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ حسن علی نے اسے عدن کے ممتاز اور ذی اثر عربوں سے متعارف کرایا۔

ولیمسن جلد ہی ان میں گھل مل گیا اور اسلام کی طرف اس کا رجحان کھل کر سامنے آ گیا۔ ہندوستان کی طرح عدن میں بھی حکمران طبقہ مقامی باشندوں سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ کسی سفید فام کا عربوں کے ساتھ اس طرح گھل مل کر رہنا ولیمسن کے افسروں کو سخت ناگوار گزرا۔ بات کرنل شیسی تک پہنچی جس کی سفارش پر اسے پولیس میں رکھا گیا تھا۔ کرنل نے اسے بلا بھیجا اور خاصی دیر تک فہمائش کرتا رہا۔

"رنگدار لوگوں سے میل جول سفید فاموں کے لئے زیبا نہیں، آخر حاکمانہ رکھ رکھاؤ بھی تو کوئی چیز ہے۔"

ولیمسن خاموش نہ رہ سکا "عرب رنگداروں کے زمرے میں نہیں آتے۔" اس نے کہا۔

"ممکن ہے ایسا ہی ہو۔" کرنل نے جواب دیا "مگر میں تمھارے بھلے کی بات کہتا ہوں، تمھیں دوست منتخب کرنے میں زیادہ احتیاط برتنی چاہیئے، اور ہاں یہ بھی سنا ہے کہ تم مسلمان ہونا چاہتے ہو؟"

"میں سوچ تو رہا ہوں۔ مگر ایک شیخ نے مشورہ دیا ہے

کہ میں عجلت میں کوئی فیصلہ نہ کروں۔" ولیمسن نے بڑی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"یہ ایک معقول مشورہ ہے۔" کرنل نے کہا "تم عیسائی گھرانے میں پیدا ہوئے اور پرورش پائی، تمھارے باپ کو پتا چلا تو اُسے کتنا صدمہ ہوگا۔ تمھیں مذہب سے اگر مَس ہے تو کسی پادری کے پاس جاؤ۔ یہ عجیب و غریب خیالات دماغ سے نکال دو۔"

اس نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا اور اس کی تعلیمات میں رُوح و قلب کے اطمینان کا سامان موجود پایا۔ کرنل کی نصیحت اس کے نزدیک ایک ایسے بزرگ کی نصیحت تھی جسے نوجوان نسل کے مسائل سے زیادہ صرف اپنے نقطۂ نظر سے سروکار ہوتا ہے۔

پولیس میں ولیمسن نے اپنا کیریر بنالیا۔ صومالیہ کی مہم اور اس کے بعد تین جرمن جاسوسوں کے گرفتار کرانے میں اس نے اپنی ذہانت اور عمدہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ اس کے افسروں کی نگاہیں اس پر پڑنے لگیں۔ وہ ان باتوں سے بے نیاز ہوکر سال بھر تک اسلامی کُتب کا مطالعہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ تمام شکوک و شبہات دُور ہوگئے۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ خواہ کچھ ہو، وہ اب اسلام ضرور قبول کرے گا۔

اس فیصلے کے بعد اس نے نومسلموں کے سے جوش و جذبے کے ساتھ دوسروں کو بھی اس رُوحانی فیض میں حصے دار بننے کی دعوت دی۔ اس نے برسٹل میں اپنے والد کو ایک طویل خط لکھا۔ ایک اور خط اس نے کیلیفورنیا میں اپنی خالہ کو بھیجا۔ ان دونوں کو جب یہ خطوط ملے، تو انھیں سخت صدمہ پہنچا۔ ایک تیسرا خط اس نے منیلا میں امریکی قونصل مسٹر رسل ویب کے نام تحریر کیا۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ صرف ولیمسن کا خط موثر ثابت ہوا، بہرحال مسٹر ویب نے آگے چل کر منیلا چھوڑ دیا اور مسلمان ہوگئے۔ حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کی اور پھر امریکہ جاکر اسلام کی دعوت و تبلیغ میں مصروف ہوگئے۔ انھوں نے اسلام پر کئی کتابیں بھی لکھیں۔

ولیمسن چھٹی لے کر لحج کے سلطان فاضل ابن علی کے پاس چلا گیا۔ وہاں کئی دن مہمان رہا، مقررہ دن ایک شاندار تقریب منعقد ہوئی جس میں اس نے لحج کے قاضی کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا۔ سلطان نے اس کا اسلامی نام عبداللہ فاضل رکھا اور اسے اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا۔ اس نے اپنے اخلاص کا ثبوت دینے کے لیے ختنہ بھی کروایا۔

اب اس کی نظر میں پولیس کی نوکری کی کوئی اہمیت نہ تھی، حج کا موسم قریب تھا اور لحج سے ایک قافلہ جانے والا تھا۔ عبداللہ فاضل کے دل میں مقدس شہروں کی زیارت کا شوق تیز تر ہوگیا، لیکن اس کا روپیہ پیسہ اور کپڑے عدن میں تھے، بڑے تذبذب کے بعد وہ عدن چلا آیا۔

عدن کی فضا افسردہ سی تھی، اس کے ساتھی اور افسر بڑی رُکھائی سے پیش آئے۔ اس کی ایک ایک سرگرمی اور ارادے سے برطانوی خفیہ پولیس پوری طرح واقف تھی۔ عدن کے فوجی گورنر جنرل ہوگ، کرنل شیسی اور اعلیٰ پولیس افسر سب پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ عبداللہ فاضل کو نہ صرف حج پر جانے سے روک دیا گیا، بلکہ لحج کے سلطان کو بھی دھمکی دی گئی کہ اگر نوجوان کانسٹبل قافلۂ حجاج میں شامل ہوا، تو اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ ولیمسن نے درخواست دی کہ اسے فوری طور پر ملازمت سے سبکدوش کر دیا جائے۔ مگر اس کی درخواست رد کر دی گئی، جواب ملا کہ "تم ہندوستان جاکر ہی سبکدوش ہوسکتے ہو۔" عبداللہ ولیمسن ہندوستان جانے پر مجبور ہوگیا۔ سلطان لحج کو پتا چلا، تو اس نے ہدیۃً تین سو روپے بھیج دیے۔

عبداللہ ولیمسن ہندوستان جا رہا تھا۔ مگر اس کا دل عرب میں تھا۔ جہاز کا فاصلہ عدن سے جتنا بڑھتا جاتا، عرب واپس پہنچنے کی آتشِ شوق اتنی ہی بھڑکتی جاتی تھی۔

ہندوستان پہنچ کر عبداللہ فاضل ولیمین ایک عجیب پریشانی میں گھر گیا۔ اسے ملازمت سے تو فوراً سبکدوش کر دیا گیا، لیکن بمبئی کے برطانوی حکام بدستور اس کے معاملات میں دلچسپی لیتے رہے۔ وہ اُسے واپس انگلستان بھیجنا چاہتے تھے۔ مگر قانوناً ایسا نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ انھوں نے طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے کام لینے کی کوشش کی۔

پہلے اُسے انگلستان مُفت لے جانے کی پیش کش ہوئی، پھر کہا گیا کہ یہاں کی آب و ہوا تمھارے مزاج کے موافق نہیں، تم آسٹریلیا یا امریکہ چلے جاؤ، تمھارے سفر کا انتظام کر دیا جائے گا، مگر ولیمین نے صاف انکار کر دیا۔ جب اس نے عرب جانے والے جہاز میں سیٹ مخصوص کرانا چاہی، تو جواب ملا "کوئی جگہ نہیں۔" اس نے مختلف جہازوں میں ملّاح، فائرمین، بلکہ خلاصی تک کے لئے درخواستیں دیں۔ مگر جہاز کے کپتان کو کوئی ضرورت نہ تھی، جہاز کے مالکوں کو حکومت نے ہدایات جاری کر دیں کہ انگلستان، امریکہ یا آسٹریلیا کے سوا اسے کسی حالت میں بھی سفر کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اس نے عرب میں برطانوی خفیہ پولیس کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ مگر اس پیش کش کا کوئی جواب نہ ملا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر اس نے دوسرے ذرائع سوچنے شروع کر دیئے۔ عبداللہ ولیمین صرف عرب جانے والے جہاز پر سوار نہیں ہو سکتا تھا، اس کی اور کسی بات پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ اس نے بندرگاہ پر کلرکی کر لی اور نہایت مطمئن زندگی بسر کرنے لگا۔

بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ وہ بمبئی ہی میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ حکّام کو اس کی قیام گاہ کا تو علم تھا۔ مگر شہر میں اس کے گھومنے پھرنے پر نہ تو کوئی پابندی تھی، اور نہ اس کی نگرانی کی جاتی تھی، ان دنوں موصل، بغداد، بصرہ اور کویت سے گھوڑوں کے تاجر بمبئی آتے جاتے رہتے تھے۔ اُس نے ان سے رابطہ پیدا کر لیا، ان میں سے ایک دو تھوڑی بہت انگریزی بول لیتے تھے۔ اسے بھی ٹوٹی پھوٹی عربی آگئی تھی، اُس نے انھیں اپنا سارا قصّہ کہہ سنایا اور مشورہ طلب کیا۔

بات چیت سے پتا چلا کہ برٹش انڈیا کمپنی نے اپنے جہاز میں گھوڑوں کے تاجروں کو خصوصی مراعات دے رکھی ہیں۔ عراق، عرب سے لائے جانے والے بہترین گھوڑوں پر کمپنی، تاجر کو آمد و رفت کا ایک فرسٹ کلاس ٹکٹ مفت دیتی ہے۔ ہر دو گھوڑوں کے ساتھ ایک سائیس کو سیٹرج میں مُفت سفر کرنے کی اجازت ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ کسی عرب تاجر کو ہندوستان میں کچھ عرصے رہنا ہوتا، وہ اپنا آدھا واپسی ٹکٹ کسی کے ہاتھ بیچ دیتا تھا۔

عبداللہ نے سوچا جہاز ران کمپنیوں کو جُل دیا جا سکتا ہے۔ اس نے بصرے کے ایک عرب سائیس سے تیس روپے میں بصرے کا ٹکٹ خرید لیا۔ ٹکٹ عبداللہ علی کے نام کا تھا۔ چونکہ ان دنوں پاسپورٹ وغیرہ کا سلسلہ نہ تھا، اس لئے عبداللہ فاضل کسی خاص زحمت کے بغیر سفر کر سکتا تھا۔ اُسے جہاز پر سوار ہوتے وقت کچھ بھی دِقّت پیش نہ آئی۔ اس نے عربی لباس پہن رکھا تھا جو اُس نے عدن میں خریدا تھا۔ دھوپ میں سنولائے ہوئے چہرے اور ہلکی سی ٹیڑھی ناک سے وہ پورا عرب معلوم ہوتا تھا۔

بندرگاہ کے حکّام، پولیس اور جہاز کے افسروں کسی کو گمان تک نہ ہوا کہ کوئی سفید فام "بنکورا" پر سوار ہوا ہے۔ بنکورا بصرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ عبداللہ فاضل نے کھلے سمندر میں پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا، لیکن برطانوی راج کے عفریت نے دُور دُور تک اپنے چنگل گاڑ رکھے تھے۔

"بنکورا" خلیج فارس کی بندرگاہ بُوشہر سے دُور گہرے سمندر میں لنگر ڈالے کھڑا تھا۔ جہاز کا کپتان لانچ

بیٹھ کر کمپنی کے دفتر گیا، خاصی دیر کے بعد واپس آیا اور جہاز کی تلاشی شروع ہو گئی۔ پتا چلا کہ بمبئی سے ایک "گورا عرب" سوار ہوا ہے، اس کی تلاشی ہو رہی ہے، آخر گورا عرب پکڑا گیا۔ جہاز کے کپتان نے چبھتی ہوئی نظروں سے جائزہ لیا:

"کیا تمھارا نام ولیمسن ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں!"

"تو پھر تمھارا سارا منصوبہ تلپٹ ہو گیا ہے۔ بوشہر میں پولیٹیکل افسر نے مجھے بلایا تھا، اسے ہندوستان سے تمھارے متعلق اطلاع ملی ہے، مجھے حکم ہوا ہے کہ تمھیں بصرے میں آنے نہ دوں ــــ"

ولیمسن اندر ہی اندر کھولنے لگا: "میں نے کوئی جرم نہیں کیا، مجھے روکنے والا کون ہوتا ہے؟ کسی کو میری آزادی پر قدغن لگانے کا کوئی حق نہیں۔"

"میں کچھ نہیں جانتا، میرا کام تمھیں بمبئی واپس لے جا کر چھوڑ دینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔"

عبداللہ ولیمسن نے دورانِ سفر میں بہت سے عرب تاجروں سے واقفیت پیدا کر لی تھی۔ انھی میں موتیوں کے ایک تاجر یوسف ابراہیم تھے، ان کا شمار کویت کے ممتاز شیوخ میں ہوتا تھا۔ ولیمسن نے ان سے اس نئی اُفتاد کا ذکر کیا۔ وہ دیر تک خاموش رہے، پھر کہنے لگے:

"کیا یہ ضروری ہے کہ تم بصرے ہی جاؤ، ہمارے ساتھ کویت کیوں نہیں چلتے؟ تم ہمارے دینی بھائی ہو۔ ہمارے ساتھ آؤ اور ہمارے مہمان بن کر رہو، کوئی تمھیں زک نہ پہنچا سکے گا۔"

"لیکن کیسے؟"

"یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ کویت میں جہاز ساحل سے دور کھڑا ہوتا ہے۔ ہمیں لینے کے لیے ہماری اپنی کشتی آئے گی، تم بھیس بدل کر بآسانی ساحل پر پہنچ سکتے ہو۔"

آخر کویت آ گیا۔ عبداللہ ولیمسن نے اپنا عربی لباس اُتار کر ایک کویتی کا لباس پہن لیا۔ عبا کالے رنگ کی تھی اور عقال بھی مختلف تھا۔ اس کے عرب دوستوں نے اس کا صندوق اور دوسرا سامان اُٹھا لیا۔ اگرچہ جہاز کے دو تین افسر کھڑے مسافروں کو کشتیوں میں سوار ہوتا دیکھ رہے تھے مگر عبداللہ ولیمسن پر کسی کو شبہ نہ ہوا۔ شیخ یوسف ابراہیم کی کشتی ساحل کی طرف روانہ ہو گئی اور "بنکورا" سامان اُتارنے کے بعد اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

۵

کویت میں نوجوان عبداللہ نے اپنی عرب زندگی کا آغاز کیا۔ سات برس کی جہاں گردی کے بعد اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ شفیق اور مہربان مادرِ وطن کی آغوش میں آ گیا ہے۔ اب وہ مطمئن تھا۔ برطانوی راج کی دسترس سے دُور۔ اب وہ عرب رسم و رواج، عربی زبان اور اسلامی تعلیمات پوری آزادی سے سیکھ سکتا تھا۔ چند روز ہی میں وہ وضع قطع، ڈھنگ، اور شب و روز کے مشاغل کے اعتبار سے ایک پیدائشی عرب بن گیا ــــ چند ہفتوں کے بعد اس نے شیخ یوسف سے بصرہ جانے کی اجازت چاہی۔ شیخ یوسف اس کے اصرار پر رضامند ہو گئے۔ بصرے کے بسّام گھرانے کے ساتھ شیخ کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ اس نے ان کے نام ایک تعارفی خط لکھ دیا۔ انھی دنوں شیخ کا ایک چھوٹا جہاز سامانِ تجارت لے کر بُوجا رہا تھا جو شط العرب کے دہانے پر واقع ہے۔ عبداللہ ولیمسن اس جہاز میں سوار ہو گیا۔ کویت کے دوستوں نے اسے بڑی افسردہ دلی اور نیک تمناؤں کے ساتھ رُخصت کیا۔

بصرے میں بسّام کے گھرانے سے ہر شخص واقف تھا۔ انھوں نے عبداللہ ولیمسن کو بصد شوق و مسرت "اہلاً و سہلاً" کہا اور مہمان خانے میں جگہ دی۔ شام کے وقت وہ اپنے میزبانوں کے

ہاں بیٹھا تھا اور قہوے کا دور چل رہا تھا۔ دیر تک اس کے مستقبل پر غور ہوتا رہا۔ آخر خاندان کے بڑے بوڑھے نے کہا:

"عبداللہ، میرا گھر حاضر ہے۔ ہم تمھیں اپنے گھرانے کا ایک فرد سمجھیں گے۔ علم دین کی تحصیل ایک نیک مقصد ہے۔ ہمارے ہاں سال، دو سال جب تک چاہو رہو اور پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ دین کی تعلیم حاصل کرو۔"

بصرہ ان دنوں ایک چھوٹا سا عرب قصبہ تھا۔ عراق پر ترک حکمرانی کرتے تھے۔ مغربی اثرات کے بہت کم نقوش دیکھنے میں آتے تھے۔ قصبے کی سڑکیں کچی تھیں اور بصرے سے باہر جانے والے راستے محض پگڈنڈیاں۔ بصرے کی زندگی ولیمسن کے لئے نہایت خوش آئند تھی۔ بسّامیوں کا مہمان ہونے کی وجہ سے اس کی شناسائی بصرے کے تمام اہم خاندانوں سے ہوگئی۔ وہ کبھی کبھار صحرا میں بدوؤں کے خیموں پر جاتا اور کئی کئی دن ان کے ساتھ رہتا۔ اب وہ عربی روانی سے بولنے لگا تھا اور بدوؤں کے عادات و خصائل اور رسوم و رواج سے خاصا واقف ہو چکا تھا۔ اونٹ کی سواری بھی اس نے سیکھ لی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ بات عام ہوگئی کہ بصرے میں عربوں کے ساتھ ایک "گورا" سکونت پذیر ہے۔

ایک دن سہ پہر کے وقت برطانوی قونصل خانے سے ایک ترجمان آیا۔ خط میں برطانوی قونصل نے لکھا تھا:

"میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ برطانوی رعایا ہونے کی حیثیت سے برطانوی قونصل خانے میں آکر اپنی آمد کی اطلاع دو۔"

عبداللہ ولیمسن نے اس کا جواب ہی نہ دیا۔ ترجمان سے زبانی صرف اتنا کہا: "اپنے آقا سے کہہ دو، میں نہیں آؤں گا۔" برطانوی قونصل خانے میں قدم رکھنے کے معنی برطانوی علاقے میں داخل ہونے کے تھے۔

عبداللہ ولیمسن کا خیال تھا کہ معاملہ رفع دفع ہو چکا ہے اور وہ عربوں کے درمیان بالکل محفوظ ہے، لیکن برطانوی قونصل کے پاس ایک حربہ اور تھا۔ اگلے روز بصرہ کے ترک والی (گورنر) محمدی پاشا سے ملا۔ گورنر برطانیہ کے ساتھ جھگڑا مول لینے سے ہمیشہ احتراز کرتا تھا۔

ترک گورنر نے حکم دیا کہ خیریت چاہتے ہو تو اس گورے کو برطانوی قونصل کے حوالے کر دو۔ اس پر عرب بھی گرم ہوگئے۔ انھوں نے اپنا مہمان گورنر یا برطانوی قونصل کے حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا:

"وہ ہمارا مہمان ہے، ہم اس کی حفاظت کریں گے۔ خواہ ہمیں قربان ہونا پڑے۔" یہ ان کا دو ٹوک جواب تھا۔

عبداللہ ولیمسن اپنے محسن میزبانوں کو کسی مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بصرے سے چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ بسّامیوں نے اسے بڑے تاسف اور ملال کے ساتھ رخصت کیا۔ عبداللہ ایک عرب دوست کے پاس زبیر چلا گیا۔ وہاں سے اس نے شیخ یوسف ابراہیم کو ایک خط لکھا۔ شیخ نے اسے اپنے پاس کویت بلا لیا۔

عبداللہ بصرہ، زبیر اور کویت میں کوئی دو سال رہا۔ اس عرصے میں اس نے اپنا اکثر وقت عربی اور اسلامی تعلیمات سیکھنے میں گزارا۔ شیخ سردی اور بہار کا موسم صحرا میں گزارتا تھا۔ عبداللہ ولیمسن بھی اس کے ساتھ رہتا اور سیر و شکار میں حصہ لیتا۔ اس دوران میں صحرائی بدوؤں سے ملنے جلنے کے مواقع میسر آئے۔ ہر نیا دن اپنے دامن میں نئی دلچسپیوں اور معلومات کا سامان لے کر آتا۔ یہیں اس نے گھوڑے اور اونٹ پالنا اور شکروں سے شکار کرنا سیکھا۔ اب وہ ایک پختہ کار بدو بن چکا تھا۔

۶

پو پھٹ رہی تھی۔ دور سے موذن کی آواز سنائی دی۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ زائرین نیند سے بیدار ہوگئے۔ عبداللہ ولیمسن

ـسب معمول نماز باجماعت ادا کی، اب صبح کی روشنی پھیلنے لگی۔
ـسجد نبویؐ کے بلند مینارے نظر آرہے تھے۔ مدینۃ النبیؐ اب
ـفرلانگ دُور رہ گیا تھا۔ رات جب قافلے نے پڑاؤ ڈالا
ـعبداللہ ولیمسن پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ وہ
ـلے کے ساتھ آٹھ سو میل کا سفر طے کر کے آیا تھا۔ دوسروں
ـرح وہ بھی اس طویل سفر سے، جس میں کئی مرتبہ انھیں
ـبے بدوؤں سے جنگ کرنی پڑی تھی، سخت تھک چکا تھا
ـں کا جی چاہتا تھا کہ قافلہ اپنا سفر جاری رکھے اور وہ اس
ـں شہر میں جلد سے جلد پہنچ جائے جو اسلام کا مرکز ہے اور
ـا اللہ کے آخری نبیؐ استراحت فرما ہیں۔ وہ نبیِ آخر جن کی
ـات نے اس کے دل اور دماغ کی دُنیا بدل ڈالی تھی، ان
ـاسے رُوحانی اطمینان اور کردار کی پاکیزگی اور بلندی ملی

تھی، مسلمان ہونے کے فوراً بعد وہ اس عظیم و مقدس اور نا زنخ
ساز شہر کی زیارت کرنا چاہتا تھا، لیکن اسے کئی بار زبردستی
روک دیا گیا تھا، پھر اس کے رستے میں نئی نئی رکاوٹیں کھڑی
کی گئیں۔ مگر وہ اِن سب رکاوٹوں کو دور کرنے کے بعد اب
اپنے مقدس شہر کی طرف بڑھ رہا تھا —— اس کو پورا یقین
تھا کہ وہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہے اور اب اس کی دنیا بھی
سنور چکی ہے اور عاقبت بھی۔

وہ جب مدینۃ النبی میں داخل ہوا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر
رو رہا تھا —— آج اس کے دل کی سب سے بڑی تمنا
پوری ہو چکی تھی۔

یہ اس کی آخری منزل تھی ——.

محراب دوستوں کے لئے —— ایک ضروری اعلان

ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے جو لوگ ملازمت، کاروبار یا تعلیم کے سلسلے میں آج کل غیر ممالک میں مقیم ہیں اور وہ اردو زبان جانتے ہیں ان کو محراب اردو ڈائجسٹ سے متعارف کرایا جائے اس لئے اگر آپ ہمیں اپنے ایسے تمام عزیزوں اور دوستوں کے مکمل پتے لکھ کر روانہ کر دیں جو غیر ممالک میں رہتے ہیں تو ہم ان تمام پتوں پر محراب کا ایک پرچہ بطور نمونہ بھجوا دیں گے۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ آپ کے یہ دوست اور عزیز ہمارا یہ تحفہ پاکر واقعی دلی مسرت محسوس کریں گے اور محراب ان کی تنہائیوں کا بہترین ساتھی ثابت ہو گا۔

ہم محراب اردو ڈائجسٹ کو ساری دُنیا میں پھیلانا چاہتے ہیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب آپ ہم سے تعاون کرتے رہیں

—— منیجر

کتاب : THE ROAD
مصنف : جان ۔ ایل
تلخیص : باسط محمّد

خون بہتا رہا



ریلوے لائن بنتی رہی



"اچھی طرح سوچ لو نارتھ کیرولینا کے پہاڑوں کا سینہ چیر کر ریل کے لیے راستہ بنانا اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھتے ہو۔ ہم تمہیں ہر ممکن امداد دیں گے، لیکن کام بہرحال تمہیں انجام دینا ہے۔ یہ نہ ہو کہ حکومت کا روپیہ بھی ضائع ہو اور ریل کی پٹڑی کے لیے راستہ بھی نہ بن سکے۔ اس صورت میں نقصان کی ذمے داری تمہارے سر ہو گی۔ کہو، کیا تمہیں یہ شرط منظور ہے؟" محکمۂ ریل کے سربراہ نے ویدربی رائٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"سو فی صد۔" ویدربی نے یقین اور اعتماد سے جواب دیا۔

تالیوں کے شور میں سربراہِ اعلیٰ نے دستخط کیے اور حکم نامہ ویدربی کے حوالے کر دیا۔

یہ ستمبر ۱۸۶۲ء کا ذکر ہے۔ ویدربی رائٹ نارتھ کیرولینا کا باشندہ تھا۔ اپنی محنت اور لگن کے سبب ترقی کرتا ہوا محکمۂ ریل کے چیف انجینیر کے عہدے پر فائز ہوا۔ اس نے نارتھ کیرولینا کو ریل کے ذریعے دوسرے بڑے شہروں سے ملانے کی تجویز پیش کی۔ دراصل وہ خود اس علاقے کا رہنے والا تھا۔ ریل نہ ہونے کی وجہ سے یہ پہاڑی علاقہ اب تک متمدن دنیا سے کٹا ہوا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ جلد سے جلد ریل کی پٹڑی بن جائے تاکہ اس کے بھائی بند آسانی سے بڑے بڑے شہروں میں آ جا سکیں۔ یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔ مزدوروں کی فراہمی سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ ویدربی کا خیال تھا علاقے کے لوگ رضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو پیش کریں گے، مگر اسے سخت مایوسی ہوئی۔ نارتھ کیرولینا کے قدامت پسند باشندے سرے سے ریل کے خلاف تھے۔ وہ سمجھتے تھے نقل و حمل کا یہ سلسلہ ان کے آرام اور یکسوئی میں دخل انداز ہو گا۔ مزدوروں کی تلاش واقعی ایسا مسئلہ تھا جس نے ویدربی کی نیندیں حرام کر دیں۔ شہر سے کوئی مزدور اس دور دراز علاقے میں جانے کو تیار نہ تھا اور مقامی باشندے تعاون پر آمادہ نہ تھے۔ فرہاد بے چارا تو اکیلا ہی تیشہ لے کر نہر کھودنے چل کھڑا ہوا تھا، لیکن یہاں سینکڑوں فرہادوں کی ضرورت تھی، ایسے فرہادوں کی جو عالی ظرف ہوں اور ناکامی کی صورت میں سروں پر تیشے مار کر اپنے آپ کو ختم نہ کریں۔

بہت سوچ بچار کے بعد ویدربی نے پہاڑی لوگوں کو ایک دعوت پر بلانے کی ٹھانی۔ پروگرام یہ تھا کہ کھانے کے بعد وہ لوگوں کے سامنے منصوبے کی اہمیت بیان کرے گا اور مدد مانگے گا، لیکن ہوا اس کے بالکل برعکس۔ کھانے کے دوران میں وہ آپس میں بحث کرنے لگے اور جلد ہی نوبت سر پھٹول تک پہنچ گئی۔ معاملہ اس حد تک بڑھتے دیکھ کر ویدربی کو مجبوراً ایک طرف ہونا پڑا ورنہ عین ممکن تھا کہ اس ہنگامے میں اس کی ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔ پہاڑی لوگوں سے مایوس ہو کر ویدربی نے محکمۂ جیل سے رابطہ قائم کیا۔ نتیجہ حسبِ خواہش نکلا اور اسے ریل کا راستہ بنانے کے لیے چھ سو قیدی مل گئے۔ دو سو قیدیوں کی پہلی کھیپ دو ایک روز میں پہنچنے والی تھی۔ ویدربی نے جلد جلد سارے انتظامات مکمل کیے اور ریل کے آخری اسٹیشن پر قیدیوں کی پذیرائی کے لیے پہنچ گیا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دور بہت دور سے چھک چھک کی آواز سنائی دی۔ آہستہ آہستہ گاڑی قریب آتی چلی گئی، پھر بریک لگنے کا شور اٹھا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے سب لوگ بھاپ سے بچنے کے لیے ادھر ادھر بھاگے۔ ویدربی کا اسسٹنٹ ایک ڈبے سے نکلا اور مودبانہ لہجے میں بولا:

"جناب، فی الحال صرف ڈیڑھ سو قیدی مل سکے ہیں۔ باقی قیدی پھر آئیں گے۔"

"اور ان کے محافظ؟" ویدربی نے سوال کیا۔

"وہ آخری ڈبے میں ہیں۔"

ویدربی اپنے ساتھیوں کو لے کر آخری ڈبے کی طرف بڑھا۔ کھڑکی میں سے جھانکا۔ چالیس کے قریب انسان نما صورتیں فرش پر بیٹھی تھیں۔ بال بڑھے ہوئے، کپڑے میلے اور بدبودار، آنکھوں

میں وحشت اور نفرت کے جذبات۔ سب زنجیروں میں بندھے تھے۔ بیشتر تاش کھیل رہے تھے۔ ویدربی نے انہیں آواز دے کر متوجہ کرنا چاہا، لیکن ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور وہ مزے سے تاش کھیلتے رہے۔ اسسٹنٹ انجینئر بیب کاک نے قریب پڑا ہوا لکڑی کا ایک لٹھ اٹھایا اور ڈبّے پر دے مارا۔ آواز سن کر ایک قیدی اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ بدبو کا ایک بھبکا آیا اور ویدربی گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا۔

"محافظوں کا یہ عالم ہے، تو قیدیوں کی حالت خدا جانے کیا ہوگی۔" وہ اپنے ایک ساتھی سے دبی زبان میں بولا۔

ان میں سے ہر ایک کے جسم پر خراشیں تھیں۔ کئیوں کے سر اور پیشانیاں زخمی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا راستے بھر آپس میں دھینگا مشتی ہوتی رہی ہے۔ محافظِ اعلیٰ ہیکی، گارڈ کے ڈبّے میں تھا۔ ویدربی نے اسے بلا بھیجا۔ وہ آتے ہی بپھرے کر محافظوں پر پل پڑا۔ محافظوں نے تاش کے پتے جیبوں میں اڑسے اور ایک ایک کر کے ڈبّے سے کودنے لگے۔ ویدربی کا اندازہ صحیح تھا۔ قیدی محافظوں سے بھی سخت جان نکلے۔ محافظوں نے ان پہ اتنے کوڑے برسائے کہ بعض کی کھال تک ادھڑ گئی، تب کہیں جا کر وہ ڈبّوں میں سے اترنے پر رضامند ہوئے۔ مقامی باشندے دم سادھے یہ منظر دیکھ رہے تھے اور ویدربی سوچ رہا تھا کہ ان شیطانوں سے کس طرح کام لے گا۔ تین ڈبّے کھولے جا چکے تھے، چوتھا بھی تک بند تھا۔

"اس ڈبّے میں کیا ہے؟" اس نے محافظِ اعلیٰ سے سوال کیا۔

"چالیس عورتیں۔"

"عورتیں، وہ کس لیے؟ ہمیں تو ڈیڑھ سو آدمی چاہییں۔"

"جناب، وہ مردوں کا کھانا پکائیں گی، جیل خانے والوں نے بھیجی ہیں یہ"

ڈبّے کا دروازہ کھولا گیا اور عورتیں باہر آئیں۔ ان کے کپڑے تار تار ہو چکے تھے۔ بعض ابھی تک ایک دوسرے سے لڑ رہی تھیں۔ ہیکی کی ایک ڈانٹ پر وہ سہم گئیں اور خاموشی سے ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔ ان میں سے چند ایک اپنی گردنیں کہ بار بار کھجلا رہی تھیں۔ ویدربی نے سب سے پہلے قیدیوں کو چائے پلائی، پھر ایک مختصر سی تقریر میں انہیں کام کی اہمیت سے آگاہ کرتے ہوئے کہا:

"آپ میں سے جو لوگ محنت اور خلوص سے کام کریں گے، میں ان کی سفارش کروں گا۔ میں نے جیل خانے والوں سے وعدہ لیا ہے کہ جو لوگ محنت سے کام کریں، ان کی سزا میں تخفیف کر دی جائے۔ ہم آپ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہونے دیں گے، لیکن اس کے لیے آپ کو ڈٹ کر کام کرنا ہوگا۔ میرا مقولہ ہے، ڈٹ کر کام کرو اور ڈٹ کر کھاؤ۔ زخمیوں یا مریضوں کے لیے طبی امداد کا بندوبست ہوگا اور وقتاً فوقتاً پارٹیاں، کھیل تماشے اور مقابلے ہوں گے تاکہ اس ویران جگہ میں دلچسپی کا سامان پیدا ہو۔ یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ آپ ایک عظیم مقصد کے لیے یہاں آئے ہیں۔ آپ کا کارنامہ تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ کام کی تکمیل پر ہم یہاں ایک پتھر نصب کریں گے جس پر آپ کی محنت اور جانفشانی کو خراجِ تحسین پیش کیا جائے گا۔ آنے والی نسلیں آپ کا نام عزت و احترام سے لیں گی۔ جب اس علاقے کے لوگ بغیر کسی مشکل کے ریل گاڑی میں ہر جگہ آ جا سکیں گے، تو وہ آپ کو کبھی فراموش نہ کریں گے۔ آپ ان کے ہیرو ہوں گے۔ مجھے امید ہے آپ میری بات سمجھ گئے ہیں۔"

اس تقریر کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ عورتیں کھانا پکانے میں مصروف ہو گئیں۔ مرد کدالیں منتخب کرنے لگے۔ جلد ہی کام شروع ہو گیا۔ قیدیوں کی دیکھا دیکھی بعض مقامی لوگ بھی کام میں شامل ہو گئے۔ سارے علاقے میں درخت اُگتے ہی اُگنے چلے گئے تھے۔

دس۔ روفٹ تنظر کے درخت گرتے، تو دُور دُور تک آواز سنائی دیتی۔ ایک ایک گیلی کو کھینچنے کے لیے دس دس گھوڑے جوتے جاتے تھے۔ مزدور پسینے میں شرابور ہو جاتے اور گھوڑوں کی ٹانگیں لرزنے لگتیں۔ بہر حال کام بڑی تیز رفتاری سے ہو رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ویدربی کے حسنِ سلوک سے مزدوروں پر بڑا اثر ہوا تھا۔ اب وہ نہ لڑتے جھگڑتے تھے۔ رات کو موسیقی کی محفلیں جمتیں۔ کئی قیدی بہت اچھا گاتے تھے۔ بعض ساز ندے بھی تھے۔

ایک روز چٹان کے نیچے دلدلی مٹی کی دبیز تہہ ملی۔ اس تہہ پر ریل کی لائن تعمیر نہ ہو سکتی تھی۔ ویدربی نے دلدل کھودنے کا حکم دیا۔ مزدور عاجز آ گئے۔ جوں جوں کھودتے نیچے سے اور مٹی ابل کر اوپر آ جاتی۔ بعض اوقات تو گھوڑوں کے قدم دلدل میں دھنس جاتے اور مزدور بڑی مشکل سے انہیں کھینچ کر باہر نکالتے۔ پندرہ روز گزر گئے مگر دلدل کی صفائی نہ ہو سکی۔ تنگ آکر ویدربی نے دلدل نکالنے والی مشین کا آرڈر دیا۔ چند روز کام بند رہا۔ مشین پہنچنے پر کام پھر شروع ہوا۔ دلدل ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ دس دن گزر گئے۔ مزدور صبح سے شام تک کام میں مصروف رہتے۔ انہیں تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ ایک رات جب دن بھر کی مشقت سے تھک کر سب لوگ گہری نیند سو رہے تھے، ایک دھماکا ہوا۔ چاند کی روشنی میں دیکھا، تو معلوم ہوا کہ مشین لڑھک کر دلدل میں جا گری ہے۔ ویدربی اپنے دونوں ماتحتوں منیڈا اور جیب کاک کے ساتھ دلدل کی طرف دوڑا۔ مشین آہستہ آہستہ دلدل میں غرق ہو رہی تھی۔ بدنصیب ڈرائیور بولٹن اس کے اوپر سو رہا تھا۔ مشین کے گرتے ہی وہ اٹھ بیٹھا اور مدد کے لیے پکارنے لگا۔ لیکن کوئی اس کی مدد نہ کر سکا اور وہ مشین کے ساتھ ہی دلدل میں دھنس گیا۔

اگلے روز مزدوروں نے کام پر جانے سے انکار کر دیا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے مزدوروں میں اکثریت قیدیوں کی تھی۔ تاہم کچھ مقامی لوگ بھی تھے جو ویدربی کی ذاتی کوششوں سے کام پر آمادہ ہوئے تھے۔ ان مقامی باشندوں نے کھلم کھلا کہنا شروع کر دیا کہ اس علاقے میں ریل کی پٹری بچھانا ناممکن ہے، کیونکہ دیوتاؤں کو اپنے آرام میں خلل اندازی کرنے والے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ انہوں نے قیدیوں کو بھی بہکا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سب مزدور اپنا اپنا سامان باندھنے لگے۔ ویدربی نے محافظوں کے افسر اور پولیس کے دستے کو انہیں روکنے کا حکم دیا، لیکن وہ لوگ انتہائی خوف زدہ تھے۔ سینکڑوں مزدوروں کے سامنے بھلا وہ کیا چیز تھے۔ مزدور چاہتے، تو ان کی ہڈی پسلی ایک کر دیتے۔ صورتِ حال بڑی نازک تھی۔ اس ویران اور بے آباد علاقے میں خود ویدربی اور اس کے ساتھیوں کی جانیں خطرے میں تھیں۔ مزدور کسی وقت بھی غصے میں آ کر انہیں موت کے گھاٹ اتار سکتے تھے۔

آخر ویدربی کو ایک تدبیر سوجھی۔ اس نے سب مزدوروں کو جمع کیا اور ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے اعلان کیا کہ کل سے وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کام پر موجود رہے گا۔ مزدور آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے۔ ویدربی نے حکمتِ عملی سے کام لے کر انہیں منانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ آخر مزدور اس شرط پر مان گئے کہ وہ اس وقت تک دلدل میں کام کرنے کو تیار نہ ہوں گے جب تک ان کی حفاظت کا معقول بندوبست نہ ہو جائے گا۔ اگلی صبح ویدربی نے خود بیلچہ سنبھالا اور مزدوروں کے ساتھ کام کرنے لگا۔ کئی دن کی جان توڑ مشقت کے بعد دلدل میں دھنسی ہوئی مشین نکالی گئی۔ ڈرائیور کی لاش بھی مل گئی۔ مشین کو قابلِ استعمال بنانے میں سات روز صرف ہوئے۔ نیا ڈرائیور آیا اور کام پھر سے ہونے لگا۔ دلدل میں ایک قریبی ندی سے پانی چھوڑ دیا گیا۔ بھربھری مٹی کی نسبت کیچڑ نکالنا زیادہ آسان تھا۔ مزدور کیچڑ کی بالٹیاں بھرتے اور دور لے جا کر خالی کر دیتے۔ کام بڑا کٹھن تھا۔ سخت جسمانی محنت کے ساتھ دھول سے اٹھتی ہوئی

ہونے سے کئی مزدور بیمار پڑ گئے۔ قیدیوں کی طبیعت میں چڑچڑا پن
آ گیا۔ بات بات پر وہ آپس میں لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے اور
ایک آدھ مزدور زخمی ہو جاتا۔ زخمیوں اور بیماروں کے لیے
ایک ڈاکٹر اور دواؤں کے دو چھوٹے چھوٹے صندوق ناکافی
تھے۔ ویدربی نے ہیڈ آفس کو لکھا اور جیل خانے والوں کی
طرف سے ایک اور ڈاکٹر پہنچ گیا۔ محکمہ صحت نے مزید دوائیں بھجوائیں
...ختم تھی کہ وبا پھیل گئی اور بائیس مزدور جاں بحق ہو گئے۔
آلودہ فضا میں رہنے سے صحتیں جواب دینے لگی تھیں۔
...عقل مندی کا ثبوت دیا اور ایک ہفتے کے لیے کام بند
...لوگ دلدل سے ذرا ہٹ کر نسبتاً کھلی اور صاف جگہ
...ویدربی نے لہو گرم رکھنے کا ایک دلچسپ بہانہ ڈھونڈا۔ دو مختلف
...کے باہمی کشتی اور دوڑ کے مقابلے کرانے کا حکم دیا۔
...کھیل کے اصولوں کی پروا کیے بغیر لڑے۔ ایک طوفان
...اٹھا جو ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ کئی مزدور زخمی ہوئے، بہت
سی ہڈیاں ٹوٹیں۔ ایک حبشی مزدور ہنسلی کی ہڈی پر چوٹ لگنے
سے مر گیا، تاہم مجموعی طور پر تدبیر کارگر ثابت ہوئی اور مزدوروں
میں جوش و خروش پھیل گیا۔ سات دن تک زوردار تفریح منانے کے
بعد دوبارہ کام پر گئے، تو ان کا مزاج بہت شگفتہ تھا اور وہ
...دکھائی دے رہے تھے۔ دلدل کا باقی ماندہ کام تین ہفتوں میں ختم
ہو گیا۔

اب ایک پہاڑی ندی پر پل بنانے کا کام شروع ہوا۔
...تین جانیں تلف ہو گئیں۔ مرنے والوں میں ایک نوعمر
لڑکی بھی تھی۔ یہ لڑکی بڑی معصوم اور نٹ کھٹ تھی۔ سوتیلی
ماں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر قتل کے ارادے سے حملہ کیا، گرفتار
کر لی گئی۔ قیدیوں کے لیے کھانا لے جا رہی تھی کہ پاؤں
پھسلا اور وہ پانی میں گر پڑی۔ اس سے پیشتر کہ اسے وہاں سے نکال
کر ہسپتال میں پہنچایا جاتا، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دنیا
سے دور جا چکی تھی۔ دنیا —— جہاں اسے باپ کی سخت گیری اور
سوتیلی ماں کی مار پیٹ کے سوا کچھ نہ ملا تھا۔ ویدربی نے مرنے والوں
کی تدفین میں خود حصہ لیا۔ لیکن یہ واقعہ زیادہ اہم نہ تھا،
کیونکہ اس سے پیشتر بھی وقتاً فوقتاً مزدور ختم ہوتے ہی رہتے تھے
لیکن شر پسند عناصر کو سر اٹھانے کا موقع مل گیا اور انھوں نے
ایک بار پھر ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ ویدربی چاہتا تھا افہام و تفہیم کے
ذریعے سارے مسائل حل کرے۔ لیکن انہی دنوں اسے ہیڈ کوارٹر
سے بلاوا آیا اور وہ اپنے نائب کمر شنیڈ کو ضروری ہدایات دے کر رخصت
ہو گیا۔ اس کی غیر موجودگی میں کمر شنیڈ نے بہت سختی سے کام لینا شروع کیا۔
ویدربی کی نسبت وہ کم ظرف اور تجربہ کار تھا۔ مزدوروں کی باتیں سن
کر اس کا خون کھولنے لگتا۔ اس نے فتنہ ختم کرنے کو حکم دیا کہ قیدی
مزدوروں کو زنجیروں میں جکڑ دیا جائے۔ حکم کی تعمیل کی گئی ——
زنجیروں کی وجہ سے وہ بھاگ نہ سکتے تھے۔ دن بھر زنجیریں پہنے
کام کرتے اور رات کو آزاد کر دیے جاتے۔ جس کیمپ میں انہیں
ٹھہرایا گیا تھا، اس کے چاروں طرف محافظ دستے کے سپاہی
بندوقیں ہاتھوں میں لیے پہرہ دیتے۔ تشدد، سخت گیری اور قید و بند
کے نتائج اچھے ثابت نہ ہوئے، مزدور ایک ایک کر کے بھاگنے
لگے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ بعض مزدور جاتے وقت اپنے ساتھ
محافظ دستے کے سپاہیوں کو بھی لے گئے۔ کڑی نگرانی کے باوجود
مزدور کسی نہ کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتے تھے
دو مزدور پولیس کا نشانہ بنے، ایک سپاہی کو گلا گھونٹ کر مار دیا گیا
غرض ویدربی واپس آیا، تو صورتِ حال بگڑ چکی تھی۔ مزدوروں
نے جان بوجھ کر ایک بلڈوزر مشین ندی میں گرا دی تھی کہ کمر شنیڈ نے
انہیں سزا دینا چاہی، تو کھلم کھلا بغاوت کے حالات پیدا ہو گئے۔
ویدربی نے آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مزدوروں کی زنجیریں
کھلوا دیں۔ قیدیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، تاہم ابھی
تک وہ مطمئن نہ تھے۔ ویدربی نے سب کو جمع کیا۔ ان کی محنت

اور جفاکشی کی تعریف کی اور آخر میں بولا:

"آپ لوگوں کی شکایات دور کرنا ہمارا فرض ہے آپ ہمیں صلاح مشورہ دیجیے اور پھر بتائیے کہ آپ کو کام کے سلسلے میں کیا مشکلیں ہیں۔ ہم اس کام کو جلد از جلد ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کے ذہن میں کچھ ایسی تجاویز ہوں جن سے کام کا معیار بہتر بنایا جا سکے اور آپ کو بھی زیادہ تکلیف نہ ہو، تو ضرور بتائیے۔ ہم آپ کی تجاویز پر غور کریں گے اور جو لوگ قابل عمل اور مفید تجاویز پیش کریں گے، انہیں انعام بھی دیا جائے گا۔"

اس تقریر کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اگلے ایک ہفتے تک ویڈبلی کو شکایات ملتی رہیں۔ اس نے جائز مطالبات مان لیے اور ناجائز مطالبات کرنے والوں کو تھوڑا صبر کرنے کا مشورہ دیا۔ اپنی حکمت عملی اور تدبر کی وجہ سے وہ چھ سات سو مزدوروں کو ایک بار پھر رضامند کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

سرنگیں کھودنے کا وقت آ پہنچا تھا۔ یہ منصوبے کا سب سے مشکل حصہ تھا۔ ویڈبلی، کمبرلینڈ اور بیب کاک ان چٹانوں کا جائزہ لے رہے تھے جن میں سے سرنگ گزارنا تھی۔ چٹان میں بارود کے لیے چھید کیے جا چکے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا اس لیے ویڈبلی نے خود آگے بڑھ کر سوراخوں میں بارود بھری، فلیتہ لگایا اور احتیاط سے تار کو ایک دوسری چٹان کی اوٹ میں لے گیا۔ یہاں اس کے کہنے پر کمبرلینڈ نے فلیتے کو آگ دکھائی۔ بیب کاک گنتی گننے لگا۔ دس، بیس، تیس، چالیس، دو سو تک پہنچ گیا، لیکن بارود نے آگ نہ پکڑی۔ یہ بڑی تشویش کی بات تھی۔ بارودی سرنگ کے پاس جانا موت کو دعوت دینے سے کم نہ تھا اور جائے بغیر چارا بھی نہ تھا۔ جانے کب بھک سے اڑ جائے۔ آخر ویڈبلی ہمت کر کے آگے بڑھا۔ اس کے سامنے اپنی بیوی اور بچے کی تصویریں لہرا گئیں۔ یہ سوچ کر کہ سرنگ پھٹ گئی، تو کیا ہو گا! اس نے جھرجھری لی اور دبے پاؤں چلتا ہوا بارود کے پاس پہنچا۔ دوبارہ بارود بھرتے وقت اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ واپس آتے ہوئے بھی ہر قدم پر وہ لرز جاتا۔ مگر قسمت اچھی تھی کہ محفوظ مقام پر پہنچ گیا۔ ایک دھماکا ہوا اور چٹان کے پرخچے اڑ گئے۔ مزدور کھرپے، گاڑیاں لے کر آگے بڑھے اور پتھر باہر نکالنے لگے۔ چند روز میں وہ لوگ چٹان کے اندر کافی دور تک چلے گئے ـــــ اب دن کے وقت بھی روشنی کی ضرورت پڑتی تھی۔ دھماکے کی گرد بیٹھتے ہی چند مزدور مشعلیں لے کر اندر گھس جاتے۔ ان کے پیچھے پیچھے خچروں والے ہوتے تھے جو کٹے پھٹے پتھر اٹھاتے اور خچروں پر لاد کر باہر لے جاتے تھے۔

سنگ ریزے اٹھاتے اٹھاتے مزدوروں کے ہاتھ چھلنی ہو چکے تھے۔ کام کے بعد وہ باہر نکلتے، تو محسوس ہوتا جیسے قبر کی گہرائیوں میں جان پڑ گئی ہے۔ سرنگ کی ہوا میں ویسے بھی پتھر کے ذرات تھے۔ دن بھر ایسی ہوا میں سانس لینے سے اکثر مزدوروں کو کھانسی کی شکایت ہو گئی۔ ایک مزدور تو کھانستے کھانستے خون تھوکنے لگا اور چند گھنٹے بعد وہ چل بسا۔ اس واقعے کے بعد مزدور خوفزدہ ہو گئے۔ اب وہ سرنگ میں ڈرتے ڈرتے داخل ہوتے تھے۔ ویڈبلی نے ڈیوٹی کے اوقات کم کر دیے، پھر بھی ان پر اثر نہ ہوا۔ تنگ آ کر ویڈبلی نے حکم دیا کہ جو شخص کام سے انکار کرے اسے باندھ کر ڈال دیا جائے۔ پھر بھی آمادہ نہ ہو تو محافظ کوڑوں سے کھال ادھیڑ ڈالیں۔ اگلے دن وہ ہوتا اور پتھر۔ معلوم ہوتا تھا پتھروں سے فرار ممکن نہیں ہے۔ چٹان آہستہ آہستہ سخت ہوتی چلی گئی۔ اگلے ہفتے میں پانچ آدمی موت کا شکار ہوئے۔

ویڈبلی ہر قیمت پر سرنگ مکمل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اعلان کر دیا "چاہے کچھ ہو، کام بند نہیں ہو گا۔"

ایک دن وہ اپنے خیمے میں بیٹھا نقشے پر غور کر رہا تھا کہ ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور بولا:

"جناب! باہر طوفان آ رہا ہے۔ سرنگ خطرے میں ہے۔"

ویدربی تنہا سرنگ کی طرف دوڑا۔ تیز ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ دھند کی وجہ سے دکھائی نہ دیتا تھا۔ ایک ڈھلوان سے گزرتے ہوئے اچانک اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ لڑھکنیاں کھاتا ہوا ایک کھڈ میں جا گرا۔ تھوڑی دیر بعد ہوش آیا۔ تو درد سے اس کی چیخیں نکل گئیں۔ اس کی بائیں ٹانگ ٹوٹ چکی تھی اور خون پتھروں پر بہہ رہا تھا۔ اس نے کسی کو مدد کے لیے بلانا چاہا۔ مگر کھڈ بہت گہرائی میں تھی اور دور بہت دور اوپر ہلکی سی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ برف گرنے لگی تھی، اس لیے وہ اٹھا اور گرتا پڑتا ایک کھوہ کی طرف چلا جو کچھ فاصلے پر نظر آ رہی تھی۔ کھوہ میں پہنچتے ہی وہ پھر بے ہوش ہو گیا۔

ادھر کیمپ والے اس مغالطے میں تھے کہ ویدربی سرنگ کی طرف گیا ہے۔ سرنگ میں اس کے نائب کمبرلینڈ کا خیال تھا کہ ویدربی کیمپ میں ہو گا۔ غرض کسی کو خیال نہ آیا اور رات گزر گئی۔ دوسری صبح ملازم چائے لے کر ویدربی کے کمرے میں پہنچا، تو معلوم ہوا کہ وہ غائب ہے۔ سرنگ والوں سے رابطہ پیدا کیا گیا۔ پتہ چلا کہ وہ رات وہاں پہنچا ہی نہیں۔ اب اس کی تلاش ہونے لگی۔ چھوٹی چھوٹی پارٹیاں پہاڑوں میں چاروں طرف پھیل گئیں۔ رات کی برف باری سے راستے بند ہو گئے تھے۔ مصیبت یہ تھی کہ مزدوروں کو بھیجا نہ جا سکتا تھا کیونکہ انہیں فرار ہونے کا موقع مل جاتا۔ سارا کام ان مقامی لڑکوں پر چھوڑ دیا گیا تھا جو رضاکارانہ طور پر کبھی کبھار کام میں شریک ہونے کے لیے آ جاتے تھے۔ کمبرلینڈ خود بھی کتے لے کر ویدربی کی تلاش میں نکلا۔ دوپہر تک مارا مارا پھرتا رہا، لیکن ویدربی کہیں نظر نہ آیا۔ نوعمر لڑکوں کی ایک ٹولی اتفاقاً اس کھڈ کے پاس سے گزری جس میں ویدربی گرا تھا۔ ویدربی نیم بے ہوشی کی حالت میں کراہ رہا تھا۔ لڑکوں نے جھک کر دیکھا اور ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ اتفاقاً انہیں ویدربی کے پاؤں نظر آئے۔ کھڈ کی گہرائی کم و بیش ڈیڑھ سو فٹ تھی۔ دو لڑکے بڑی احتیاط سے نیچے اترے۔ کھڈ میں گھپ اندھیرا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں وہ غار کے منہ تک پہنچے۔ اچانک ایک لڑکے کی چیخ نکل گئی۔

"کیا ہے؟" دوسرے نے گھبرا کر پوچھا۔

"سانپ۔"

پہلے لڑکے نے غور سے دیکھا۔ ڈر کے مارے اس کا سارا جسم کانپ اٹھا۔ غار کے منہ پر بے شمار سانپ بل کھا رہے تھے۔ ان کی تعداد بلا مبالغہ سو ڈیڑھ سو سے کم نہ تھی۔ ایک لمحے کے لیے لڑکوں کو خیال آیا کہ فرار ہو جائیں لیکن ویدربی کی محبت اور شفقت اس خیال پر غالب آ گئی۔ وہ دونوں زمین پر لیٹ گئے اور رینگتے ہوئے آہستہ آہستہ غار کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ چیونٹی کی چال سے یہ فاصلہ طے کر رہے تھے تاکہ سانپوں کو کسی متحرک شے کی موجودگی کا احساس نہ ہو۔ غار کے پاس جا کر وہ رک گئے۔ دل زور زور سے دھڑک رہے تھے۔ سر اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ وہ جانتے تھے اور سانپ ہی سانپ ہوں گے۔ ایک لڑکے نے ویدربی کا ہاتھ چھو کر اسے جگانے کی کوشش کی لیکن ویدربی تڑپ اٹھا۔ کھڈ میں گرنے سے اس کی بائیں ٹانگ ٹوٹ چکی تھی۔ لڑکوں نے چیخوں کی پروا نہ کرتے ہوئے پوری قوت سے اسے باہر گھسیٹ لیا اور غار سے دور لے گئے۔ اس دوران میں کھڈ سے باہر پہنچے بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ انہوں نے رسوں کی مدد سے بے ہوش ویدربی کو اوپر کھینچ لیا۔ ڈاکٹر چیشر کی معیت میں ویدربی کو گھر بھیج دیا گیا۔ اس کی بیوی لارڈ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ڈاکٹر چیشر نے تسلی دیتے ہوئے کہا:

"فکر نہ کرو، وہ جلد اچھے ہو جائیں گے۔ انہیں صرف توجہ اور آرام کی ضرورت ہے۔"

لارڈ نے ایک وفا شعار بیوی کی طرح شب و روز اس کی خدمت کی۔ اسے اپنی مسیحائی پر ناز تھا۔ پانچویں روز ویدربی

نے آنکھیں کھولیں۔ تو اس کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔ زخم بہت گہرے تھے اور دنوں سے ٹھیک ہوتے نظر نہ آتے تھے۔ ویدربی چاہتا تھا جلد از جلد واپس کام پر چلا جائے، لیکن ڈاکٹر نے سختی سے منع کر دیا۔ اب وہ دن بھر بستر میں پڑا ہوا خواب دیکھتا — اس کا خواب کام کرنا تھا — اس کی زندگی اور ریلوے لائن آپس میں لازم و ملزوم تھے۔ ریلوے لائن سانپ کی مانند تھی — اور یہ سانپ پہاڑوں کے گرد کنڈلی مارے مزدوروں کو ڈسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب وہ ان ڈراؤنے خوابوں سے بیدار ہوتا تو لارڈ ڈن کی لڑکی پاس بیٹھی دیکھ رہی ہوتی تھی۔ لارڈ ڈن پاس ہوتا، تو اس کو دیکھ کر گلے میں بانہیں ڈال دیتا۔ ایک دن لنڈن اس کی عیادت کو آیا اور اس کی زبانی معلوم ہوا کہ مزدوروں نے اس کے غم میں کرسمس بھی نہیں منائی۔ ویدربی کو ایسا لگا جیسے سب مزدور اس کے بچے ہیں۔ تکلیف میں انسان کے احساسات بہت لطیف ہو جاتے ہیں۔

ادھر ویدربی کی غیر حاضری میں کام کی رفتار بہت سست پڑ گئی تھی۔ بارش کے طوفانوں کی وجہ سے ہفتے میں تین چار دن سے زیادہ کام نہ ہوتا تھا۔ ویدربی کی ٹانگ ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہو چکی تھی۔ تاہم وہ بیساکھی کے سہارے چل پھر سکتا تھا۔ اس نے ڈاکٹر سے کام پر جانے کی اجازت لی۔ کام کی تکمیل کے لیے مزید تین ماہ کا وقفہ مانگا اور دو سو آدمی اور لے کر پھر سے ریلوے پر پہنچ گیا۔ بہار کا موسم تھا۔ ماحول میں جیسے جان سی پڑ گئی تھی۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ اور رونق ہی رونق تھی۔ ویدربی نے آتے ہی مزدوروں سے نئے سرے سے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ ویدربی نے اگلے ہی دن سے کام کی رفتار تیز کر دی۔ دو ہفتے کے بعد اس نے لنڈن کو بلا کر کہا:

"میں چاہتا ہوں جس جگہ تک سرنگ بنا کرتے آئے ہو وہاں تک ریل کی پٹڑی بچھا دیں تاکہ ریل گاڑی آ سکے۔ انجن سے ہماری بہت سی مشکلات دور ہو جائیں گی۔ پتھروں کو گدھوں پر لادنے کے بجائے ہم گاڑی کے ڈبوں میں لاد سکیں گے۔ کام جلدی ہو گا اور جلدی ختم ہو۔ تمہاری کیا رائے ہے؟"

"بالکل ٹھیک — لیکن اس کام کے لیے کم از کم ماہ کا عرصہ درکار ہے۔"

"اگر ہم سارے مزدور اس کام پر لگا دیں تو؟"

"اس صورت میں پندرہ دن کے اندر اندر ریل سرنگ تک آ سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے سرنگ کا کام رکوا دو اور سارے کو مناسب ہدایات دو۔"

مزدوروں نے بہت محنت کی اور پندرہ کے صرف بارہ دن میں ریلوے لائن آخری سٹیشن سے لے کر پہنچ گئی۔ ویدربی بہت خوش تھا۔ پہلی گاڑی جس میں ایک انجن اور تین ڈبے شامل تھے، دور چھک چھک کرتی ہوئی آ یہ آواز سن کر مزدوروں کی آنکھیں بھی چمکنے لگیں۔ سرنگ کوئی ڈیڑھ فرلانگ پہلے ریلوے لائن ایک بلند پہاڑی گزرتی تھی۔ اس پہاڑی کی ایک طرف بہت نیچی وادی میں ندی بہتی تھی۔ دوسری طرف ایک اور چٹان تھی جس پر اپنے ساتھیوں سمیت کھڑا تھا۔ ریل گاڑی کے چٹان پر پہنچتے ایک دھماکا ہوا اور پتھر کا وہ راستہ جس پر سے ریل گاڑی گز ٹوٹ کر ندی میں گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی انجن اور تینوں ڈ کئی سو فٹ کی بلندی سے ندی میں جا گرے۔ انجن ڈرا علاوہ محکمہ ریل کے تیرہ آدمی بھی تھے جو اس المناک میں ختم ہو گئے۔

ریل گاڑی کے حادثے نے مزدوروں پر بہت گہرا اس سے پہلے بھی یہ باتیں سننے میں آتی رہی تھیں کہ اس میں ریلوے لائن نہیں بن سکتی اور یہ کہ یہاں کے دیوتا اس ک

ے ناراض ہیں، لیکن ریل گاڑی کے ندی میں گرنے سے ان توہمات کو شہ ملی اور لوگ کھلم کھلا ویدربی کی مخالفت کرنے لگے۔ ویدربی اس حادثے سے افسردہ ضرور تھا، لیکن کسی قیمت پر منصوبے کو ترک کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس نے فوراً ہی پہاڑوں کا نئے سرے سے سروے کیا اور ندی کے ساتھ ساتھ ریل کی پٹڑی بچھانے کے بجائے چٹانیں کاٹ کر راستہ بنانے کا تہیہ کیا۔ یہ کام پہلے سے بھی مشکل تھا۔ مزدور بددل ہو چکے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ دیوتا اس کام سے خوش نہیں ہیں، اس لیے یہ کبھی مکمل نہیں ہو سکتا۔ ویدربی کو سخت گیری اختیار کرنی پڑی۔

اس پہاڑ کا نام سوانوز تھا ــــ دو ہزار فٹ لمبی سوانوز سرنگ میں کام ہونے لگا۔ کئی روز سے ایک قیدی مزدور الیساؤ کو گھر کی یاد ستا رہی تھی۔ ویدربی نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ کام کے اختتام پر اس کی سفارش کی جائے گی اور وہ قید سے چھوٹ جائے گا، مگر یہ کام بھی تو کمبخت شیطان کی آنت ہو گیا تھا۔ ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا، وہ بھاگنے کا منصوبہ بنانے لگا۔ پیدل فرار ہونے میں یہ قباحت تھی کہ ایک تو راستے سے ناواقف تھا، شکاری کتے زمین کو سونگھ کر کھوج لگا لیتے تھے۔ اس نے سوچا وہ آخری بوگی جس میں عورتیں کھانا پکاتی ہیں، خوب رہے گی۔

ایک شام ابھی چند عورتیں بوگی ہی میں تھیں کہ وہ ٹھوکر ہٹا کر بوگی کی چھت پر چڑھ بیٹھا۔ ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ بوگی ڈھلوان کے رخ تیزی سے پھسلنے لگی۔ عورتیں اس ناگہانی آفت کے لیے تیار نہ تھیں۔ ان کی چیخیں نکل گئیں۔ سارے کیمپ والے باہر نکل آئے، مگر اس وقت تک بوگی لڑھک کر بہت دور جا چکی تھی۔ دوسری قیامت یہ آئی کہ بوگی نے چولھوں سے آگ پکڑ لی۔ عورتوں کی چیخ پکار، جلتی ہوئی بوگی اور اس پر بڑی شان سے کھڑا ہوا الیساؤ۔ یہ ڈبا جہاں جہاں سے بھی گزرا، ایک ہنگامہ بپا کرتا گیا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ریب کاک سٹیشن تک اس کی رفتار سست پڑ گئی تھی اور وہاں کے مزدوروں نے لائن پر دوڑ کر گیلیاں رکھ دیں، ورنہ بیٹھے بٹھائے ایک اور مصیبت آن پڑتی۔

محکمے کی طرف سے وقت پر کام ختم کرنے کی یاد دہانیاں آ رہی تھیں۔ ویدربی کے منصوبے کے تحت مئی میں چھیانوے فٹ سرنگ کھودی جاتی، تو کام وقت پر ختم ہو سکتا تھا۔ ان دنوں وہ کڑی نگرانی کرا رہا تھا۔ کام کی رفتار بھی حوصلہ شکن نہ تھی پھر بھی اخباروں نے تبصرے شروع کر دیے تھے کہ ریلوے لائن اپنے وقت پر مکمل نہیں ہو سکے گی۔ کچھ بھی ہو ویدربی کو اپنی قیادت پر اعتماد تھا۔

کام مشکل بھی تھا اور صبر آزما بھی۔ روزانہ چار چھ آدمی حادثے کا شکار ہو جاتے۔ ان حادثوں میں ایک تو کارکن کم ہوتے، دوسرے مزدوروں میں بددلی پھیلتی۔ ایک دن ویدربی کو اطلاع ملی کہ ایک اور بڑا حادثہ ہوا ہے۔ وہ سرنگ کے دروازے پر پہنچا۔ لاشیں چھکڑوں پر لاد کر باہر نکالی جا رہی تھیں۔ بیری نام کا قلی سرنگ سے باہر آیا اور ویدربی کو ہاتھ سے پکڑ کر کھینچنے لگا:

"آؤ انجینیر صاحب، تمہیں اپنی قبر دکھلاؤں۔"

"نہیں، ابھی نہیں۔" ویدربی نے کہا۔

"ہم تو گویا انسان ہی نہیں۔" وہ بڑبڑاتا ہوا چل دیا۔

قیدیوں میں بغاوت کے جراثیم پھر پیدا ہو رہے تھے۔ مقامی لوگوں کی پیشین گوئی تھی کہ اس بار سردیاں بہت سخت گزریں گی اور ایسا ہی ہوا۔ سردیوں کی آمد کے ساتھ ہی جسم کو سن کرنے والی یخ ہوائیں اور موسلا دھار بارشیں شروع ہو گئیں۔ فصل اچھی ہو گئی تھی، اس لیے مقامی لوگ ڈھونڈے سے بھی نہ ملتے تھے۔ رہے قیدی، تو وہ بقول ریب کاک ٹوٹ چکے تھے۔ بظاہر منصوبہ مکمل ہونے کی کوئی علامات نہ تھیں، مگر ویدربی قطعاً ہراساں نہ تھا۔ ایک روز شام کی چائے پیتے ہوئے

کمبرلینڈ اور ڈرائیور شمل کی موجودگی میں اس نے تجویز پیش کی کہ اگر کسی طرح پہلی سرنگ سے سوانو نوسرنگ تک کھدائی کرنے والی مشین لائی جا سکے تو کام وقت پر مکمل ہو سکتا ہے۔ شمل نے بڑی شد و مد سے اس کی مخالفت کی۔ اس کے خیال میں ایک تو اتنی دور سے بھاری بھرکم مشین لانا ممکن نہ تھا، دوسرے اس کے پرزے ٹوٹنے کا احتمال تھا۔ مگر ویدربی آسانی سے ہار ماننے والا نہ تھا۔ وہ رات بھر غور کرتا رہا۔

صبح اس نے سو خچر، بارہ بیل، بیس گھوڑے اور ڈیڑھ سو آدمی جمع کر لیے۔ سکیم یہ تھی کہ مشین کے پہیوں کو لکڑی کے تختوں پر لڑھکاتے ہوئے سوانو نوسرنگ تک لایا جائے۔ ڈیڑھ میل کا یہ فاصلہ گویا ہفت خواں طے کرنا تھا۔ سب سے مشکل کام یہ تھا کہ مشین کا توازن ٹھیک رہے۔ بڑی مشکل سے مشین کے پہیے تختوں پر چڑھائے جا سکے۔ اس کے بعد مزدور، جانوروں کی مدد سے انچ انچ کر کے مشین کو سرکانے لگے۔ جانوروں کی ٹانگیں کانپ کانپ جاتی تھیں اور آدمیوں کا سانس اکھڑنے لگتا تھا۔ ایک دفعہ جو ذرا سی ڈھلوان پر مشین اچانک لڑھکی، دو آدمیوں کی ٹانگیں اس کے بھاری بھرکم پہیوں کے نیچے آ گئیں۔ بڑی مشکل سے انہیں نکال کر ڈاکٹر کے پاس بھیجا گیا۔ دن بھر کے جان لیوا کام کے بعد اس رات مزدوروں کا جوڑ جوڑ دکھتا رہا۔ صبح اٹھے، تو پھر وہی مصیبت۔

سب سے مشکل مرحلہ آن پہنچا۔ مشین کو پہاڑی ندی کے اس پار لے جانا تھا۔ دونوں کناروں پر لکڑی کی گیلیاں ایک دوسرے کے ساتھ لا کر رکھی گئیں۔ مزدوروں نے بڑی کوشش کر کے مشین کو ان پر چڑھایا۔ ندی کے وسط میں پہنچے تھے کہ مشین کا ایک پہیہ نکل کر پانی میں جا پڑا۔ مشین ندی کے پار پہنچانے کے بعد پہیہ نکالنے کے لیے ایک آدمی زنجیر لے کر ندی میں اترا، مگر پانی کے بہاؤ کے سامنے توازن برقرار نہ رکھ سکا اور پتھروں سے ٹکرا کر مر گیا۔ آخر پانچ سات مزدوروں نے بڑی مشکل سے وہ پہیہ نکال کر مشین میں فٹ کیا۔

اچانک ہی زوروں کی بارش ہونے لگی، تختے پھسل پھسل جاتے تھے، زنجیریں اور رسے کھینچتے کھینچتے قیدیوں کے ہاتھوں سے خون رسنے لگا۔ مگر ویدربی کا حکم تھا کہ کام جاری رہے۔ شام ہو گئی تھی اور سوانو نوسرنگ کی بتیاں نظر آ رہی تھیں۔ مزدوروں میں اس قدر جوش تھا کہ "زور لگا کے ہیا، شاباش جوان ہیا" کے نعروں سے پہاڑیاں گونج اٹھیں۔ کیچڑ میں پیر دھنسا کر انہوں نے پوری قوت سے مشین کو دھکیلا۔ جوش میں آ کر ویدربی بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔

اور منزل واقعی آ گئی — مگر کس طرح اور کس قیمت پر۔ زنجیروں، رسوں اور مشین کے پہیوں پر مزدوروں کا خون "ان کی قربانی کی داستان لکھ رہا تھا۔

مقامی لوگ اس معجزے کو دیکھنے جوق در جوق آنے لگے۔ اخباروں نے اداریے لکھے اور محکمے کی طرف سے مبارکباد کے پیغاموں کا ڈھیر لگ گیا۔

مشین آ جانے کی وجہ سے مشقت کم ہو گئی تھی۔ کام کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ اس کارنامے کی خوشی میں ویدربی نے ایک جشن کا اہتمام بھی کیا۔

سردیوں کی بارش میں مشقت سے مزدوروں پر بڑا برا اثر پڑا۔ انفلوئنزا اور نمونیا عام ہو گیا۔ روزانہ پانچ سات آدمی ان عارضوں کا شکار ہو جاتے۔ ہفتے میں دو ایک موتیں بھی ہونے لگیں۔ ان حالات میں کام مکمل ہونے میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ اس نئی افتاد نے ویدربی کو سنگدلی کی حد تک سخت مزاج بنا دیا تھا۔ وہ ہر قیمت پر کام مکمل کرنا چاہتا تھا۔ جوں جوں منزل قریب آ رہی تھی، اس کے جوش و خروش میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بعض اوقات تو وہ کام کی تکمیل کی دھن میں پاگل پن کی حد تک ظالم بن جاتا۔ وہ چاہتا تھا مزدور دن رات ایک کر دیں اور کل کا کام بھی آج ہی ختم ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ بیماری کے باوجود وہ مزدوروں کو ہسپتال نہ بھیجتا تھا۔ ایک روز ڈاکٹر چیشر نے اسے

بلا بھیجا۔ وہ شام کو وہاں پہنچا۔ عارضی ہسپتال میں صرف مریض پڑے کراہ رہے تھے۔ ڈاکٹر جیفر بولا:

"دیکھیے انجینیر صاحب، انسانی جان ہر کام سے قیمتی ہے۔ میرے کیمپ کا حال آپ دیکھ رہے ہیں۔ اندیشہ ہے کہ اگر مناسب خوراک اور مدافعتی انتظامات نہ کیے گئے، تو وبا شدت اختیار کر جائے گی اور ایک ایک کرکے آپ کے سارے مزدور پڑ رہیں گے۔"

"میرے خیال میں یہ سب ڈھونگ ہے۔ ان میں سے اکثر تندرست ہیں اور کام سے بچنے کے لیے بیمار بن گئے ہیں۔" ویدربی نے مٹھیاں کستے ہوئے کہا۔

"آپ اسے ڈھونگ کہتے ہیں۔ مہینے بھر میں اب تک ساٹھ آدمی نمونیے سے مر چکے ہیں۔ میری رائے میں آپ مزدوروں کی خوراک بہتر بنائیں۔ دلدلی سرنگوں میں کام فوراً رکوا دیں، زیادہ سردی کے دن کام نہ ہو اور کسی مزدور کے سر اور سینے میں خفیف سا درد ہو، تو اس کو فوراً ہسپتال بھجوا دیں۔"

ویدربی نے نہایت بے پروائی سے اس کی بات سنی اور زیر لب بولا: "کام ہر قیمت پر ختم ہونا چاہیے۔"

"مگر میری بات کا جواب نہیں دیا آپ نے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"میں اس پر غور کروں گا۔"

"دیکھیے، غور کا وقت نہیں ہے، فوری عمل کی ضرورت ہے۔"

"میں سر دست کچھ نہیں کہہ سکتا، کام بہر حال ختم کرنا ہے۔" ویدربی کو غصہ آ گیا۔

"آخر آپ ان غریبوں کی جان کے پیچھے کیوں ہاتھ دھو کر پڑے ہیں؟" ڈاکٹر نے افسردگی سے کہا، مگر ویدربی سنی ان سنی کرتے ہوئے کیمپ کی طرف چل دیا۔

کیمپ پہنچتے ہی وہ کمبرلینڈ سے بولا: "ڈاکٹر کا تو دماغ خراب ہے۔ صرف چھ ہفتے کا کام رہ گیا ہے اور وہ نئی نئی منطقیں لڑا رہا ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ قیدی اتنے منحوس ثابت ہوں گے۔ یہ سب کچھ ان کے جرائم کی نحوست کی وجہ سے ہے۔ خود میری بھی تو ایک ٹانگ جاتی رہی۔" کمبرلینڈ حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، میرے دوست، کبھی کبھی جنگل کے وحشی جانوروں کی طرح پتھر کے یہ بے جان پہاڑ بھی انتقام پر اتر آتے ہیں اور ان کے انتقام کا انجام موت ہوتا ہے۔ . . . . . . اب کے میں یقیناً اس انتقام کا نشانہ بنوں گا . . . . اور پھر . . . پھر مجھے بیساکھی کی ضرورت نہ رہے گی۔" ویدربی کی آواز میں دکھ کا عنصر غالب تھا۔ کمبرلینڈ نے سوچا:

"معلوم ہوتا ہے دماغ چل نکلا ہے۔"

ڈاکٹر نے فوریمن کے ہاتھ ایک رپورٹ اندر بھیجی۔ اب تک اکیاسی مزدور نمونیے اور چالیس انفلوئنزے کا شکار ہو چکے تھے۔ ویدربی رپورٹ پڑھ کر فوریمن سے بولا:

"اس ڈاکٹر کے بچے کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اچھے بھلے آدمی کو بیمار بنا دیتا ہے۔ فوریمن، تم نتائج سے بے پروا ہو کر کام جاری رکھو اور کسی کی شکایت پر غور نہ کرو۔"

ڈاکٹر خود آیا: "انجینیر، خدارا کام بند کر دو اور نہ یہ کچھے لوگ بھی مر جائیں گے۔ سرنگیں انہیں نگل رہی ہیں، ناقص غذا ان کے لیے زہر کا کام دے رہی ہے۔ یہ قتلِ عام ہے انجینیر!" وہ بچوں کی طرح رو پڑا۔

"ڈاکٹر صاحب، میری سمجھ میں نہیں آتا، کام کسی طرح روک دوں!" ویدربی کی آواز جذبات سے قطعی عاری تھی۔

"میں محکمے سے شکایت کروں گا!" ڈاکٹر نے گویا دھمکی دی۔

"بڑے شوق سے۔" ویدربی نے کہا اور ڈاکٹر پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا۔

ڈاکٹر کی شکایت پر مارچ میں محکمے کی طرف سے جائزہ لینے کے لیے ایک کمیشن آیا۔ پتہ چلا ڈاکٹر کی شکایت اپنی جگہ بجا ہے، مگر ویدربی کا بھی زیادہ قصور نہیں۔ بہت سی بحث اور

رڈوکد کے بعد طے پایا کہ اگرچہ کام بہت تھوڑا سا رہ گیا ہے، تاہم مزید اموات سے بچنے کے لیے قیدیوں کو واپس بھیج دیا جائے اور ویدربی کو آرام کی خاطر زبردستی چھٹی دی جائے۔ ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ویدربی نے پہلے ہی چھٹی کی درخواست دے دی وہ بہت افسردہ، بیمار اور نڈھال نظر آتا تھا۔

ویدربی کے بعد کمبرلینڈ ہی سب سے سینئر افسر تھا۔ ساری ذمہ داریاں اس پر آن پڑیں۔ بیمار، مرنے والے بھاگنے والے غائب اور تندرست قیدیوں کی فہرستیں تیار کرنا اور اس کے مطابق مطلوبہ لوگوں کو واپس بھیجنا اس کے فرائض میں شامل تھا وہ یہ فرائض دل سے ادا نہیں کر رہا تھا کیونکہ اس کے خیال میں بس سارا کام دھرے کا دھرا رہ گیا تھا تاہم ایک روز جب اسے احکامات ملے کہ پچیس قیدیوں کے عملے کے ساتھ تاتکمیل سرنگ کی نگرانی کے لیے تاحکم ثانی وہیں ٹھہرے تو اس کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔ قیدیوں کو واپس بھیجنے کے بعد ایک روز اس نے عام دعوت کا اہتمام کیا اور دعوت کے اختتام پر زوردار تقریر کی جس میں مقامی لوگوں کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ سرنگ کے باقیماندہ کام میں ہاتھ بٹائیں۔ اب کام رہ بھی کیا گیا تھا۔ پچیس تیس گز کی کھدائی اور تھی چنانچہ کام شروع کر دیا گیا۔

مشین اور آدمی ایک دفعہ پھر کھدائی میں مصروف ہو گئے۔ بارود پھاڑ کر چٹانیں اڑائی جاتیں اور چھکڑوں پر پتھر ڈھو ڈھو کر باہر لائے جاتے۔

اور ایک دن ... کتنا مبارک دن تھا وہ ... چٹان پھٹنے کے ساتھ ہی روزن سے باہر کی دنیا نظر آنے لگی۔ مزدور دفور مسرت میں رقص کرنے لگے۔ مقامی لوگوں نے پہلے ہی سے تفریح کے سامان جمع کر رکھے تھے۔ دو تین روز جشن کی کیفیت رہی۔ کام مکمل ہو گیا تھا چند ہی دنوں میں ریل کی پٹڑی بچھا دی گئی۔ سرنگ کی ادھر ہی طرف دور تک ہموار رہتم مرتبع دکھائی دیتے رہی تھی جس پر پٹڑی بچھانا بہت آسان تھا۔ کمبرلینڈ نے فوراً ویدربی کو تار بھیجا۔ ویدربی آرام کر رہا تھا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ زیادہ کام کے باعث اس کے اعصاب کمزور ہو گئے ہیں۔ کمبرلینڈ کے اصرار پر وہ بیوی بچوں سمیت آیا اور پہاڑی باشندوں نے اپنے روایتی انداز میں ان کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ ویدربی بہت خوش دکھائی دیتا تھا مگر جب کوئی اس کے سامنے سرنگ کا ذکر کرتا، اس کے چہرے سے ناگواری کی علامات ظاہر ہونے لگتیں۔ سرنگ اس کی چڑ بن گئی تھی۔

ایک دن وہ کمبرلینڈ کے ساتھ سیر کو نکلا۔ باتیں کرتے ہوئے وہ دور نکل گئے۔ ویدربی کو خیال ہی نہ رہا کہ وہ سرنگ کے دہانے پر پہنچ گیا ہے۔ عام حالات میں وہ اس طرف کا رخ نہ کرتا تھا، مگر آج وہ بے دھیانی میں یہاں چلا آیا اور جب اس نے سرنگ کے اس پار روشنی دیکھی، تو گویا اس پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔

"اُف میرے خدایا، سرنگ مکمل ہو گئی ہے، شکر ہے تیرا، احسان ہے تیرا" وہ اپنی بیساکھی پر لڑکھڑاتا ہوا بھاگا چلا جا رہا تھا۔

کمبرلینڈ نے محکمے کو ریلوے لائن مکمل ہونے کی باقاعدہ اطلاع دے دی چند ہی روز بعد پہلی گاڑی انہی مزدور قیدیوں سے بھری ہوئی آئی جنہوں نے خون پسینہ ایک کر کے یہ عظیم الشان کارنامہ انجام دیا تھا۔ گاڑی میں ویدربی اور کمبرلینڈ بھی موجود تھے انہیں اپنی کاوشوں کا ایک ایک چپہ یاد تھا۔ گاڑی فراٹے بھرتی جا رہی تھی اور سواری کے اس لطف کے مقابلے میں ساری مصیبتیں ہیچ معلوم ہوتی تھیں۔

ایک خواب کی تعبیر ان کے سامنے تھی۔ ☆☆☆

نپولین کے آخری دن



کتاب : LAST DAYS OF AN EMPEROR

مصنف : ریرڈ لکلسن

تانیص: شمیم الیسفی

نپولین دنیا کے چند مشہور ترین بادشاہوں میں سے ایک تھا، وہ صرف ایک بادشاہ ہی نہیں تھا ایک بہادر اور بے مثال فوجی جنرل بھی تھا، لیکن طاقت اور شہرت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچنے کے بعد اسے زوال آگیا اور اس طرح آیا کہ اس کی زندگی کے آخری دن ایک تاریخ بن گئے۔ یہ تلخیص اس کی زندگی کے آخری دنوں کی ہے ——

سلامت علی مہدی

شام پرسکون تھی۔ سمندر کے کنارے کچھ جوڑے محوِ خرام تھے۔ شہر روشنیوں سے جگمگانے لگا تھا۔ گھڑیال نے جب آدھی رات گزرنے کا اعلان کیا تو اس وقت بادِ صرصر کا ایک جھونکا کچھ ایسی کیف و مستی لئے ہوئے آیا کہ جس نے سونے والوں کی نیندیں کچھ اور گہری کر دیں۔

اور اسی وقت سمندر کے سینے پر جزیرہ ایلبا کی طرف سے ایک کشتی فرانس کی ساحل کی طرف ایسے بڑھنی شروع ہوئی جیسے کوئی نئی نویلی دلہن اپنی سسرال کی طرف قدم بڑھا رہی ہو۔ ہولے ہولے دھیرے دھیرے۔ یہ رات ۲۶ فروری ۱۸۱۵ء کی رات تھی۔ ملاحوں نے ستاروں سے جگمگاتی رات میں ایک کشتی کے بادبان دیکھے۔ لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ اس کشتی میں فرانس کا وہ عظیم جنرل سفر کر رہا ہے جس کو دوسروں نے اس کی گدی سے اتار کر جزیرہ ایلبا میں محبوس کر دیا تھا۔

دوسرے دن سمندری پولیس نے نہ جانے کیوں اور کیسے وہ بادبانی کشتی فرانس کے ساحل کی طرف بڑھ جانے دی۔ بہت ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ فرانس میں لوگ اپنے محبوب رہنما کو بھولنے لگے تھے۔ اور کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ سال بھر کے بعد نپولین اس طرح ساحل فرانس پر قدم رکھیگا۔

اس دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ذرا سا موقع پاتے ہی اپنی اہمیت دکھانے سے نہیں چوکتے۔ اور اس وقت کچھ ایسی ہی سیاسی گٹھ جوڑ کا سب سے بڑا مرکز دانا بنا ہوا تھا۔ اس جگہ جہاں دنیا بھر کے مسائل زیر بحث تھے، وہیں ایک معمولی سا مسئلہ یہ بھی تھا کہ نپولین سے کس طرح پیچھا چھڑایا جائے۔ بحث و مباحثہ میں قرعہ جزیرہ ایلبا کا نکلا اور پھر اتحادیوں نے اپنی فراخدلی کا اس طرح ثبوت دیا کہ انہوں نے نپولین کے 'شہنشاہ' کے خطاب کو برقرار رکھا۔ اور اسے فرانس بدر کر کے جزیرہ ایلبا میں رہنے پر مجبور کر دیا۔

۱۸۱۴ء کے دو مہینے اس بے تاج بادشاہ نے بڑے سکون سے گزارے۔ لیکن جب وہ اس سرزمین پر آیا تھا تو اس کو اپنی رعایا کو دیکھ کر بہت کوفت ہوئی تھی۔ وہ دن بھر ایلبا کے ساحل کے کنارے بحرِ روم میں کشتی بانی کرتا رہتا۔ چپ چاپ۔

لیکن اس کا دماغ ہر وقت اس خیال میں گم رہتا کہ اسے ایک دفعہ پھر فرانس کے تخت کو حاصل کرنا ہے کیسے ہوگا۔ کیوں کر ہوگا۔ اس کا دماغ ہر وقت انہیں الجھنوں میں مصروف رہتا۔ بالآخر بہت سوچ وچار کے

بعد اس نے فیصلہ کیا کہ اسے اپنی رعایا کو ایک دفعہ پھر ایک جگہ جمع کرنا چاہیے۔

چنانچہ اس نے سب سے پہلے ایک محکمۂ جنگ قائم کیا۔ ساحل سمندر کی نگرانی کچھ اور مضبوط کر دی۔ فوج کی تیاری اور اس کے اخراجات کا ایک خاکہ تیار کیا۔ مگر کمال کی بات یہ تھی کہ اس کے سوچنے کا انداز آج بھی وہی تھا جس کی وجہ سے فرانس چھوڑنا پڑا تھا۔

وہ سوچتا، پلان بناتا اور اس طرح احکامات جاری کرتا کہ مصاحبین کے لیے بجز ان احکامات کی تکمیل کے اور کوئی چارۂ کار نہ رہ جاتا۔ اس طرزِ عمل کا نتیجہ کہ جو کام بھی کیا جاتا اس میں بے دلی شامل رہتی۔ گویا رقص مجبوری تھا اور مصاحبین اس کے اشاروں پہ ناچ رہے تھے۔ کسی کو مجال نہیں تھی کہ کسی بات پر اعتراض کرسکتا یا کوئی مین میخ نکال سکتا۔ جزیرہ ایلبا نے زندگی میں پہلی مرتبہ حکومت کا کاروبار دیکھا تھا۔ انہیں سڑکیں صاف ہوتے دیکھ کر بڑا تعجب ہوتا۔ لیکن اس کے ساتھ انہیں یہ احساس برتری بھی پیدا ہو گیا تھا کہ وہ بھی باعزت لوگ ہیں۔ کیوں کہ نپولین نے کچھ لوگوں کو بہ طور سفیر اٹلی کے ساحلوں پر متعین کر دیا تھا۔ اس طرح ترقی اور تغیر کسی ایک ہی چیز سے نمایاں نہیں تھی بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں اس کے اثرات محسوس ہونے لگتے تھے۔

نپولین کو دیکھنے سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اس نے اپنا ماضی بھلا دیا ہو۔ لیکن حقیقت میں وہ قسمت کی ستم ظریفی پر کڑھتا تھا کہ وقت کے ظالم ہاتھوں نے اس سے شہنشاہ فرانس کا لقب چھین کر شہنشاہ ایلبا تک محدود کر دیا تھا اور پھر یہ کڑھن اس حد تک بڑھی کہ ۱۸۱۴ء کا سال ختم ہونے تک اس نے یہ حکم دے دیا کہ ایلبا کے ہر کاغذ سے شہنشاہ ایلبا کا لفظ مٹا دیا جائے

لیکن وقت کے ساتھ ساتھ نپولین کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ لوگ ایلبا آتے تھے تو اس سے ضرور ملتے اور وہ ان سے دنیا کے حالات معلوم کرتا رہتا۔ پھر بالآخر فروری ۱۸۱۵ء کو اس کے ایک ساتھی نے جس نے اٹلی کے جہازیوں کا سا روپ بھر رکھا تھا۔ اسے آکر بتایا۔ فرانس میں انقلاب کی جڑیں مضبوط ہو رہی ہیں لوگوں میں بے چینی بڑھتی جا رہی ہے اور شہنشاہ لوئیس ہشتم کو ہٹا دینے کی سازش پھیل رہی ہے۔

نپولین نے اس خبر کو سن کر فوراً اپنے چھوٹے سے بحری بیڑے کو ٹھیک ٹھاک اور تیار کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ اس طرح ایک ہفتہ بڑی مصروفیتوں اور تیاریوں کا رہا۔ چھ چھوٹی بڑی کشتیاں اس قابل کر لی گئیں، جو ایک ہزار سپاہیوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر سکیں۔

کچھ قدرت نے بھی نپولین کے ارادوں کی تکمیل میں مدد دی۔ کیوں کہ اتفاق سے اسی زمانے میں اتحادی فوجوں کا کمانڈر بھی کچھ مشوروں کے سلسلہ میں ساحل سے ہٹ کر اندرون ملک میں چلا گیا۔ اور اسی موقع سے فائدہ اٹھا کر نپولین چھبیس فروری کی رات کو اپنے آدمیوں کے ساتھ فرانس کے ساحل کی طرف بڑھا تھا۔

دوسرے دن چڑھتے ہوئے سورج کی روشنی نے نپولین کو بڑی فرحت دی۔ کیوں کہ دھوپ اس کی کمزوریوں میں سے ایک بڑی کمزوری تھی۔ اور اس نے ہمیشہ اس میں فرحت محسوس کی تھی۔ لیکن اس وقت بھی اس کے دماغ پہ یہی دھن سوار تھی کہ وہ اچانک فرانس کی ساحل پر اتر کر لوگوں کو متحیر کر دے۔

بظاہر اس کا یہ قدم نہ صرف بڑی جرأت ہی کا تھا بلکہ بے حد خطرناک بھی۔ لیکن اسے اپنی کامیابی کا اتنا

یقین تھا کہ اس نے علی الاعلان اپنے آدمیوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے مشن میں ضرور کامیاب ہوگا۔

دوسری طرف اس کے آدمیوں میں سے کچھ نے ساحلِ فرانس پہ نپولین کا یہ فرمان پھیلانا شروع کردیا تھا کہ ان کا بے تاج بادشاہ جسے اتحادیوں نے اپنے آدمی اور اپنا گھر چھوڑنے پر مجبور کردیا تھا فرانس کے عوام کی تکالیف سے بے خبر نہیں ہے۔ وہ ان کے رنج اور خوشی میں آج بھی اسی طرح شریک ہے۔ جیسے وہ اس وقت تھا جب وہ یہاں حکومت کر رہا تھا۔ ان کا ملک جن تکلیف دہ حالات سے گزر رہا ہے اس پر اس کا دل روتا ہے۔ اسی لئے وہ چاہتا ہے کہ جس صورت سے بھی ممکن ہو سکے حکومت کی باگ ڈور اس کے اپنے آدمیوں کے ہاتھ میں آجائے۔ کیوں کہ وہ ان کا پیدائشی حق ہے۔ مزید یہ کہ فرانس کی اسی آہ وزاری نے اسے اس بات پر اکسایا اور مجبور کردیا ہے کہ وہ ایک دفعہ پھر سمندر پار کرکے اپنے آدمیوں سے آملے۔ موجودہ حکمران دشمنوں کی شطرنج کا ایک ایسا مہرہ ہے جو اتحادیوں کی مرضی کے خلاف جنبش تک نہیں کرسکتا۔ اسے فرانس یا فرانس کے آدمیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ جو کچھ بھی ہے صرف اپنے لئے۔

اس کی دوسری اپیل امپیریل گارڈ کے فوجیوں کی طرف سے تھی جس میں درخواست کی گئی تھی کہ وہ دوبارہ اس سے آملیں۔ شہنشاہ چاہتا ہے کہ فوج کا ہر آدمی اس سے وفاداری کے حلف نامہ پر دستخط کرے۔

اس طرح جتنا دن بڑھتا جاتا تھا۔ نپولین میں شہنشاہیت کا رعب و دبدبہ بڑھتا جاتا تھا۔ چناں چہ اس روز اس کے ساتھیوں میں سے شاید ایک آدمی بھی ایسا نہیں رہا تھا جسے اس روز خطابات سے نہ نوازا گیا ہو۔

پھر پہلی مارچ کی صبح کو اس چھوٹے سے بحری بیڑے کو فرانس کا ساحل نظر آگیا۔ شہنشاہ اپنی پوری وردی زیب تن کئے ہوئے ڈیک پر کھڑا تھا۔ اور جس وقت پہلی مرتبہ بیڑے کے مستولوں پر فرانس کا جھنڈا لہرایا گیا۔ تو فوجیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے فوجی اعزاز کے ساتھ اس جھنڈے کو سلامی دی۔

اسی دن دوپہر کو انٹیب (ANTIBE) اور کینس (Cannes) کے درمیان خلیج جون (Juan) کے ساحل پر وہ بیڑا آلگا۔ دوسری طرف جب نپولین کے فرار ہونے کی خبر پھیلی تو اتحادیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ انہوں نے اسے تلاش کرنے کے لئے سخت ترین احکامات جاری کئے۔ لیکن سچ پوچھئے تو اب ہو ہی کیا سکتا تھا۔ نپولین نے بہرحال بازی جیت لی تھی۔

دنیا اپنے کاروبار میں مصروف تھی۔ وقت سے بے خبر، حالات سے بے پرواہ۔ لیکن دوسری طرف 'کینس' جانے والی سڑک پر پیڑوں کے درمیان ایک چوڑے شانوں کا انسان لمبا کوٹ زیب تن کئے بیٹھا ہوا بڑے غور سے جلتی ہوئی لکڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ رات سرد اور پرسکون تھی۔ لیکن اس کا دماغ ..... وہ سوچ رہا تھا کہ ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ فرانس پر خصوصاً اس وقت حملہ کیا جب چاروں طرف حالات پرسکون تھے۔ کہیں حماقت ثابت نہ ہو۔ اس کی نظروں میں وہ دو پارٹیاں بھی تھیں جنہیں اس نے اپنے تین فرمانوں کے ساتھ دو مختلف سمتوں میں روانہ کیا تھا۔ ان میں سے ایک پارٹی جو 'اینٹب' کی طرف روانہ کی گئی تھی۔ وہ شاید ختم کردی

گئی تھی۔ کیوں کہ جانے کے بعد اسے ان کی طرف سے کوئی پیغام موصول نہیں ہوا تھا۔ دوسری پارٹی 'کینس' کی طرف گئی تھی۔ مگر اس کے وہ فرمان جو وہ بہت مختصر اور واضح تھے۔ اس نے ہدایت دی تھی: "فضاؤں میں ایک بھی گولی کی آواز نہ گونجے۔ زمین پر خون کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکے، کیوں کہ میں اپنے تخت و تاج کو خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

پھر ایک دن ایک آدمی نے جب اسے یہ بتایا کہ جو پارٹی "اینٹب" کی طرف گئی تھی پکڑی گئی۔ اسے یہ مشورہ دیا کہ اس چھوٹے سے قصبے پر حملہ کر کے پارٹی کو چھڑا لیا جائے تو اس نے بُرا سا منہ بنانے پر اکتفا کیا۔ کیوں کہ اس وقت تو اسکے نزدیک وقت کی بڑی اہمیت تھی جسے وہ اپنے چند آدمیوں کو چھڑانے پر ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے اگر اس کے آدمی واقعی پکڑ ہی لئے گئے ہیں تو پھر اس کے معنی یہ تھے کہ ایلبا سے اس کے نکل بھاگنے کی خبر پھیل چکی ہے۔ اس کے لئے اس کے پاس صرف ایک ہی علاج تھا۔ اور وہ یہ کہ اسے اس خبر کے پھیلنے کی رفتار سے زیادہ تیز رفتاری سے اپنا سفر جاری رکھنا چاہیئے۔

بڑا ہی عجیب قافلہ تھا۔ جس میں فوجی بغیر ساز و سامان کے۔ ساتھ میں دو چار خچر جن پر چھوٹے چھوٹے بکسوں میں شہنشاہ کا خزانہ تھا۔ شہنشاہ گزر رہا تھا اور اس کا استقبال کرنے والا کوئی نہ تھا۔

اپنے چار دن کے سفر میں نپولین نے چار مرتبہ فوج کی بھرتی کی۔ اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ جیسے جیسے شمال کی طرف بڑھ رہا تھا، حالات سازگار ہوتے جارہے تھے۔ اس نے جو فرمان جاری کئے تھے وہ اپنا اثر دکھلانے لگے تھے۔ اب اس کے استقبال کے لئے مجمع جمع ہونے لگا تھا۔ اور لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اپنے آپ کو فوج کی بھرتی کے لئے پیش کر رہے تھے۔

پھر ایسے ہی چلتے چلتے جب وہ ایک موڑ پر پہنچے تو وہاں انہیں ایک فوجی دستے سے سابقہ پڑا، اور وہ جگہ ایسی تھی جہاں سے بغیر لڑائی کے گذرا نہیں جاسکتا تھا۔

شہنشاہ نے ہاتھ اٹھا کر اپنے آدمیوں کو روکا اور خود دشمنوں کے فوجی دستے کی طرف بڑھ گیا۔ ایک زیادہ جوشیلے کپتان نے جو اسے دیکھا تو اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "وہ دیکھو، وہ آدمی وہ رہا۔ جس کی ہم کو تلاش تھی۔ گولی چلاؤ۔" لیکن اس کے اس حکم کے باوجود بھی سناٹا ہی چھایا رہا۔

"گدھو!" ایک پر وقار آواز ابھری۔ "تم مجھے پہچانو۔ میں تمہارا شہنشاہ ہوں۔" جواب میں پھر بھی خاموشی رہی اور وہ پُر وقار آدمی اپنے کوٹ کے بٹن کھولتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

"اگر تم میں تھوڑی سی بھی شرافت اور انسانیت ہے۔" ایک تنہا آواز سنائی دے رہی تھی۔ "تو تم میں سے کون ایسا ہے جو خود اپنے شہنشاہ پر گولی چلائے گا؟" اس للکار نے اس تکلیف دہ سناٹے کو توڑ دیا۔ اور فضا میں "شہنشاہ زندہ باد۔ شہنشاہ پائندہ باد۔" کی آوازیں گونجنے لگیں۔ پھر لوگوں کی عقیدت مندی اس حد تک بڑھی کہ انہوں نے بڑھ کر اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ کچھ نے اس کے کوٹ کو ہاتھ لگا کر اپنی پیاس بجھائی۔ کچھ نے اس کی تلوار چھو کر اپنی عقیدت مندی

کا اظہار کیا۔ اور کچھ ایسے بھی نکلے، جنہوں نے اس کے قدموں کو چھو کر اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ اس طرح ایک بڑے امتحان کا وقت ختم ہو گیا۔ اور یہ بات پایۂ یقین کو پہنچ گئی کہ اس فوجی دستے کا ہر آدمی نپولین کا وفادار ہے۔

نپولین کو یقین تھا کہ کانگریس کا اجلاس ختم ہو چکا ہوگا۔ حالاں کہ اس کا یہ اندازہ غلط تھا۔ کیوں کہ جس وقت اس کے ایلبا سے بچ نکلنے کی خبر وائنا پہنچی ہے تو اس وقت حکومت کے کرتا دھرتا سب ہی ایک جگہ جمع تھے۔ اور انہوں نے ایک گھنٹے کے صلاح و مشورے کے بعد ہی یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ انہیں ایک دفعہ پھر فرانس اور نپولین کے خلاف نبرد آزمائی کرنی ہے۔ کیوں کہ وہ نپولین اور اس کے ارادوں سے بخوبی واقف تھے۔

برطانوی حکومت نے باوجود ان تمام مالی مشکلات کے جو لڑائی کے نتائج میں ظہور پذیر ہوئی ہیں یہ طے کیا کہ وہ اس وقت تک اتحادیوں کو پچاس لاکھ پونڈ دیتی رہے گی جب تک جنگ جاری رہے گی اور جسے اتحادیوں کی حکومت کے ہر ممبر نے بطور شکر گزاری کے منظور کر لیا تھا۔

روس، آسٹریا، برطانیہ، پروسا، فرانس، اسپین، پرتگال اور سویڈن کی حکومتوں نے مل کر نپولین کو دنیا کی امن کے لئے سب سے بڑا خطرہ مانا اور اسی کے ساتھ اس عہد نامے پر دستخط کئے۔ وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے، جب تک وہ اس دشمن انسانیت کو نیست و نابود نہیں کر دیں گے۔ اور اس معاملہ میں وہ آخر تک ایک دوسرے کی مدد کرتے رہیں گے۔

اس طرح یورپ کی ہر توپ اور بندوق کا رخ صرف ایک نشانہ پر مرکوز ہو کر رہ گیا۔ ٹیلی رینڈ نے (Talleyrand) جو فرانس کا مانا ہوا سیاست داں تھا، اس بات پر سب کو راضی کر لیا تھا کہ اگر جنگ ہونی ہی ہے تو وہ صرف ایک سر پھرے انسان کے خلاف ہوگی۔ اس آدمی کی قوم اور ملک نفرت اور لڑائی کے جذبے سے مستثنیٰ سمجھے جائیں گے۔ دوسری طرف نپولین چودہ ہزار آدمیوں کے ساتھ شمال کی طرف بڑھ رہا تھا۔

فرانس میں دوبارہ قدم رکھنے کے ایک ہفتے بعد تک تو اس کا رویہ صلح کن رہا۔ لیکن گرینویل کے بعد سے اس میں پھر رعونت پیدا ہو گئی۔ کیوں کہ لیون (Lyon) کی سڑکوں پر اسے ہزاروں مشعلوں کے درمیان سے گزارا جا رہا تھا۔

اٹھارہ مارچ کو اسے ان سڑکوں پر چلتے ہوئے سترہ دن گزر چکے تھے۔ اور ان سترہ دنوں میں ہی یہ حالت ہو گئی تھی کہ وہ جدھر سے بھی گزرتا تھا۔ عوام تالیوں سے اس کا استقبال کرتے۔ اسے شاہی آداب سے نوازتے، گارڈ آف آنر پیش کئے جاتے۔ حالاں کہ وہ جس انقلاب کا بانی تھا یہ تمام شان و شوکت اس کے منافی نہیں۔ وہ جب جب اپنی گاڑی میں چلتا تو بھولے بھالے عوام خوشی کے گیت گاتے ہوئے اس کی گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتے۔ پیرس کی طرف بڑھتے ہوئے عوام کا امنڈتا ہوا سمندر اس کا استقبال کر رہا تھا جسے دیکھ کر یہ گمان ہوتا کہ جیسے عوام خوشی میں پاگل ہو گئے ہوں۔

اس زمانے میں یہ غلط فہمی بھی عام تھی کہ ٹیولیریز (Tuileries) پر بڑی آسانی سے قبضہ ہو جائے گا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ معتمد بادشاہ کو کانگریس کے ممبروں کے ساتھ ایک کھلی جگہ میں بیٹھ کر باغی سے ملنے

جانا چاہئے۔ ان کے نزدیک نپولین کی بڑھتی ہوئی شہرت کا یہی ایک توڑ ہے۔ مگر ساتھ ہی عوام میں اس باغی کی ہردل عزیزی کا یہ عالم تھا کہ کچھ مسخروں نے قلعے کی ریلنگ پر ایک نوٹس لٹکا دیا تھا۔ لکھا تھا:

"نپولین کی طرف سے شہنشاہ لوئیس کے نام"۔
"میرے دوست، میرے پاس کافی فوج ہے، اس لئے مزید فوج بھیجنے کی تکلیف نہ کرنا۔"

شہر میں لوگوں نے بادشاہ کی تصویریں دکانوں اور مکانوں سے ہٹا دی تھیں اور ان کی جگہ تھی اور باز کے نشان نے لے لی تھی۔ جو نپولین کا نشان تھا۔ اور اب بادشاہ کے فوجوں کی نپولین سے بڑھتی ہوئی ہمدردی بھی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی۔

اتوار کی رات کو نپولین شہر سے صرف پچاس میل دور رہ گیا تھا۔ دوسری طرف بادشاہ کے وزرا رخت سفر باندھ رہے تھے۔ آدھی رات کے قریب کچھ گاڑیاں ٹیولرِز کے قریب آکر کھڑی ہو گئی تھیں۔ پھر جب تک بادشاہ محل سے نکل کر آیا اس وقت تک ایک عجیب سی خاموشی چھائی رہی۔ لوگ پُر آشوب آنکھوں سے بادشاہ کو دیکھ رہے تھے۔ جو محل سے نکل کر گاڑی میں آ بیٹھا تھا۔ جو اسے دور بہت دور لے جانے والی تھی۔

دوسرے دن شام کو نو بجے فوجی شور مچا مچا کر ایک گاڑی کو گھیرے میں لے کر چل رہے تھے۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ گاڑی ایک میدان میں آکر رک گئی۔ جہاں گاڑی میں سے ایک آدمی کو نکالا گیا۔ اور اس کو کندھوں پر بٹھا لیا گیا۔ اس کے چاروں طرف وردی پہنے ہوئے آدمیوں کا ہجوم تھا۔ اور اس طرح گاڑی سے نکالا جانے والا آدمی نپولین تھا۔ وہ اس وقت ہونٹوں پر پُرسکون مسکراہٹ لئے آنکھیں بند کئے لوگوں کے لوگوں کے کندھوں پر سوار ٹیولرِز کے محل کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ پھاٹک میں داخلے کے بعد اسے کندھوں سے اتار دیا گیا۔ اس طرح جب کچھ شور و شغب کچھ کم ہوا تو نپولین نے وزارت بنانے کے کام کو سنبھالا۔ 'ریل' کو پولیس انچارج بنایا تو وہ پُر غرور انداز میں بولا۔ "میں کل اپنی جگہ پہنچ جاؤں گا۔"

"نہیں، تمہیں آج ہی جانا ہے۔" شہنشاہ نے بھڑک کر جواب دیا۔

اس وقت محل اور اس کے چاروں طرف خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ چاروں طرف رات کی سیاہی پھیل ہوئی تھی۔ میدان میں کہیں کہیں گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ اور کچھ تھکے ہارے سپاہی اپنی وردیاں پہنے ہی میدان میں سو کر تھکن اتار رہے تھے۔

دوسرے دن جب پیرس کے لوگوں کی آنکھ کھلی تو وہ نئے دورِ حکومت میں تھے اور یہ دورِ حکومت اس آدمی کا تھا، جس نے صرف تین دن پہلے ہی ساحلِ فرانس پر قدم رکھا تھا۔ اس طرح اگر ایک طرف نئے معمار پرانے دورِ حکومت کو لانے میں معروف تھے تو دوسری طرف نپولین کا حریف اپنا منہ چھپائے شمالی فرانس کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔

شروع شروع میں تو نپولین نے اپنے رویے سے یہ ظاہر کیا کہ جیسے وہ عوامی شہنشاہ ہے۔ اپنے مزاج اور اپنی طبیعت کے برخلاف مدبر اور خاموش۔ یعنی وہ تھوڑا تھوڑی دیر کے بعد عوام کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے انہیں درشن دینے کے لئے بالکنی پر آتا رہا۔ شہر

میں نکلتا تو بغیر کسی شان و شوکت کے کہیں کہیں وہ اپنی گاڑی سے اتر کر عوام کا شکریہ بھی ادا کرتا۔ لیکن تا بکہ . . . .

کچھ ہی دنوں کے بعد یہ سب کچھ اسے وبال جان معلوم ہونے لگا۔ اور اس کا رویہ بدل گیا۔ وہ بولتا تو پرانے نپولین کی جھلکیاں دکھائی دینے لگتیں وہ جھنجلا کر کہتا۔ "ان حماقتوں نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر رکھ دئے ہیں۔ عوام چاہتے ہیں کہ شہنشاہ انہیں اپنا دایاں ہاتھ کاٹ کر دے دے جس سے اسے حکومت کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔"

اور دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر کہیں نپولین واقعی اپنے ارادوں میں کامیاب ہو جاتا، تو یہ بات یقینی تھی کہ فرانس کو یورپ کو سنبھالنے کے لئے اس کے داہنے ہاتھ کی ضرورت پڑ جاتی کیوں کہ بیس سال جنگ و جدل اور انقلاب نے برطانیہ، روس، آسٹریا، پروسیا، اسپین، پرتگال اور سوئڈن کو اتنا تھکا ڈالا تھا کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے تھے "چوں کہ نپولین نے انسانیت سے اپنا ہر رشتہ توڑ ڈالا ہے۔ اس لئے اس سے کسی قسم کی صلح کی گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ وہ جب تک زندہ ہے اس زمین پر صبر و سکون ناممکن ہے۔" ساتھ ہی نپولین نے دوسرے ملکوں سے بھی اپیل کی تھی کہ وہ فرانس کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی نہ کریں۔ اور اس کام کے لئے اس نے بہت سے آدمیوں کو ادھر اُدھر بھیجا۔ مگر جس ملک میں بھی اس کے آدمی گئے انہیں سرحد پر ہی روک لیا گیا۔ اور جو خطوط اس نے بطور اپیل حکومتوں کے نام لکھے تھے۔ انہیں ردی کی ٹوکریوں میں پھینک دیا گیا۔ چنانچہ اس طریقے سے ناامید ہو کر اس نے یہ اعلان کیا کہ اس کے خلاف اگر دوسرے ممالک کی حکومتیں کوئی گٹھ جوڑ نہ کریں اور کسی قسم کی کوئی گڑبڑ نہ پھیلائیں تو فرانس کی حکومت دوسری حکومتوں کی سلامتی اور امن و سکون قائم رکھنے کی گارنٹی دے سکتی ہے۔ دنیا والوں نے نپولین کے اس خوش کن اعلان کو سُنا، مگر انہوں نے اس کے ساتھ بھی وہی رویہ رکھا جو اس کے خط کے ساتھ ہوا تھا۔

جب حکومتیں کسی کے خطوط کا جواب نہ دیں، تو ایسی صورت میں کوئی پالیسی بنانا اور اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ چناں چہ دوسری حکومتوں کے اس رویہ نے اسے بہت دل برداشتہ کیا۔ اور اس نے اپنی حکومت کے چوتھے روز ہی اپنے وزیر دفاع کو بلا کر یہ احکامات دئے کہ سال کے آخر تک چار لاکھ رائفل مین تیار کئے جائیں۔ اس کے ساتھی ان احکامات کی اہمیت خوب سمجھتے تھے۔ چناں چہ پیرس میں اس کے قیام کے ایک ہفتہ بعد ہی سرحدوں پر پوری سات ڈویژن فوج مکمل کرنے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

لیکن بدقسمتی سے یہ انتظامات بھی اسے مطمئن نہ کر سکے۔ کیوں کہ اس کے لئے ابھی بہت سی الجھنیں باقی تھیں۔ جن میں اس کے لئے سب سے بڑی الجھن بغاوت کی تھی۔ اسے اس کو بہت سختی سے کچلنا تھا۔ دوسرے اسے اپنے ملک کو ایک نیا قانون بھی دینا تھا۔ پھر دوسری حکومتوں کو اپنی پالیسی اور رویہ سے بھی مطمئن کرنا تھا۔ اسی لئے وہ سوچتا تھا کہ جب تک پورے ملک پر اس کی مکمل فتح نہیں ہو جاتی۔ اس وقت تک حالات کا استحصار ناممکن ہے اور شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے ہر معاملہ کو فوجی نقطۂ نظر سے دیکھا۔

برخلاف اس کے اتحادیوں کے لئے ایسی کوئی الجھن

نہیں تھی اور ان کی فوجیں دھیرے دھیرے فرانس کی سرحدوں کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ آلپس کی چوٹیوں سے لے کر شمالی سمندر تک۔ اور نپولین یہ سوچ رہا تھا کہ کس محاذ سے لڑائی کا آغاز کرے۔ اسے ابھی یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ فرانس کے عوام پر شمالی خطے میں حفظ ما تقدم کی لڑائی کا کیا اثر ہوگا۔ اسی لئے وہ سوچتا تھا کہ اگر جنگ ہونی ہی ہے تو کوئی صورت ایسی ہو جائے کہ وہ لڑائی کا آغاز بلجیم کے میدانوں میں کرے۔

اس کے شروع کے انتظامات اتنے خفیہ اور اتنی تیزی سے ہوئے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ فرانس کے پورٹ بند کر دئے گئے تھے۔ گاڑیاں جاتیں تو انہیں سرحدوں پر روک کر تلاشیاں لی جاتیں۔ حتیٰ کہ عوام کے لئے بغیر اجازت سرحد پار کرنا تک ممنوع قرار دیدیا گیا۔

یہ وقت شہنشاہ کے لئے بڑے جذباتی ہیجان کا تھا اس کی فوجی طاقت صرف ایک لاکھ پچیس ہزار آدمیوں پر مشتمل تھی۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی تھا کہ ہر فوجی شہنشاہ پر دل و جان سے قربان ہونے کو تیار تھا۔

اور پھر پندرہ جون جمعرات کی صبح کو بلجیم کے بیس میل لمبے سرحدی علاقے پر بالآخر محاذ کھول دیا گیا۔ مگر بدقسمتی سے محاذ بھی کھلا تو ایسی سرحد پر جہاں دشمن کی فوج ساٹھ میل لمبے سرحدی علاقے میں تیار تھی۔

اس حملے کی خبر 'برسلز' میں دوپہر کے قریب پہنچی اور دس بجے تک ڈیوک آف ولنگٹن کو یہ اطلاع بھی پہنچ گئی۔ نپولین کا سارا زور اسی محاذ پر مرکوز ہے۔ پھر بھی عوام کو دکھانے کے لئے تاکہ ان میں اس خبر سے کسی قسم کی گھبراہٹ نہ پھیلے۔ وہ ڈچز آف رچمنڈ کے یہاں اس بال روم ڈانس میں جا پہنچا جو ڈچز کے یہاں بڑی

شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوا تھا۔ مگر ساتھ ہی اس نے اپنے افسروں سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ ڈانس کے دوران اتنی خاموشی سے نکل جائیں۔ دیکھنے والوں کو کسی قسم کا احساس نہ ہونے پائے۔ پھر محل میں کھانے کے بعد وہ اپنے میزبان سے بولا۔

"نپولین کم بخت نے عجیب مصیبت پیدا کر رکھی ہے۔"

"تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو" میزبان نے پوچھا۔

"میں نے اپنی فوج کو حکم دیدیا ہے کہ وہ "کواترے براس" پر مرکوز ہو جائیں۔" ڈیوک نے جواب دیا۔ "لیکن میں اس کو وہیں روکنا نہیں چاہتا، بلکہ اسے یہاں تک لاکر لڑنا چاہتا ہوں۔"

اس نے یہ کہا اور جیب سے ایک نقشہ نکال کر اپنے میزبان کو دکھایا۔ اور انگلی کے اشارے سے بتایا کہ وہ کہاں لڑنا چاہتا ہے۔ اور وہ جگہ 'واٹرلو' کا علاقہ تھا۔ ڈیوک نے ڈچز کو بتایا اور پھر اپنے گھر جاکر سو رہا۔

دوسرے دن نپولین کے حکم کے بموجب 'جنرل نے' نے چار ہزار آدمیوں کو 'کواترے براس' کے محاذ پر اتحادیوں کو پسپا کرنے کے لئے مامور کر دیا۔

خود نپولین نے 'پروسیوں' پر بھرپور وار کیا۔ تین بجے دن سے کافی رات گئے تک گھمسان کی لڑائی چلتی رہی۔ نتیجہ میں فرانس کے گیارہ ہزار آدمی کام آئے۔

آدھی رات کو 'پروسین' جنرل نے چاندنی رات میں اپنے ماتحتوں کے ساتھ کانفرنس کی اور اس میں یہ طے کیا کہ ان کی فوج کو اپنے محاذ سے پیچھے ہٹ جانا چاہئے۔ 'ولنگٹن' کو جب اس بات کی اطلاع ملی تو اس نے

بھی یہی رائے دی کہ انہیں پیچھے ہٹ کر دوسرا مورچہ سنبھال لینا چاہیئے۔ جو 'واٹرلو' کے عین سامنے تھا۔

لیکن دوسری طرف ایسے وقت فرانسیسیوں کی سستی بڑی تعجب خیز تھی۔ جب کہ ان کا شہنشاہ بذات خود 'پدوسین' فوج کے خلاف جی جان سے نبرد آزما تھا۔ اور ان کی اس سستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ 'برسل' کی طرف پیش قدمی شروع کر دی اور پھر اتوار کی صبح کو مارشل نے وہ اپنی سوئی ہوئی فوج کے آگے آ کھڑا ہوا۔ 'واٹرلو' کے سامنے دشمن کی توپوں کی اگلتی ہوئی آگ کو دیکھ رہا تھا۔

ولنگٹن کی فوجی پوزیشن حالاں کہ بہت مضبوط تھی۔ لیکن پھر بھی اسے یہ پریشانی تھی کہ اس کے پاس صرف ترسٹھ ہزار آدمی تھے اور ان میں سے بھی بیالیس ہزار آدمی دوسری حکومتوں کے تھے۔ یعنی برطانوی، ڈچ، ہنادیرین، بلجین سپاہی تھے جن کی بڑے قاعدے سے صف آرائی کی گئی تھی۔ اور اسے یہ امتزاج بڑا عجیب سا معلوم ہو رہا تھا۔

برخلاف اس کے نپولین کی فوج بہتر ہزار آدمیوں پر مشتمل تھی۔ ولنگٹن کے پاس صرف ایک سو چھپن توپیں تھیں۔ جب کہ نپولین کے پاس توپوں کی تعداد دو سو ساٹھ تھی ان حالات میں نپولین کو اپنی فتح کا یقین کامل تھا اور اسی لئے صبح آٹھ بجے ناشتے کے بعد اس نے اپنے سامنے نقشہ پھیلاتے ہوئے کہا تھا کہ فتح کے نوّے فیصدی چانس اس کے حق میں ہیں۔ ولنگٹن ناکارہ جنرل ہے اور برطانوی فوج بزدل۔ ہمارے لئے اس لڑائی کی اہمیت پکنک سے زیادہ نہیں ہے۔ ہم آج کی رات 'برسل' میں گزاریں گے۔ اسے اپنی فتح کا اتنا یقین تھا کہ اس نے بلجیم کے لوگوں کے نام فرمان تک لکھ کر رکھ چھوڑا تھا۔ فرمان میں کہا گیا تھا:

"ان کے شہنشاہ نے ان کی پکار سن لی ہے اور اس نے ان کی محبت کے احترام میں انہیں فرانسیسی شہری بنانا منظور کر لیا ہے۔"

آگے چل کر فرمان میں کہا گیا تھا،

"جنگ کے دیوتا نے اس جنگ کا فیصلہ اس طرح کیا ہے کہ اسے فتح اور دشمن کو شکست نصیب ہو۔"

اب شمال کی طرف سے فوج نے 'برسل' کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ نپولین نے آخری مرتبہ فوج کی سلامی لی۔ اور جیسے ہی بینڈ نے قومی ترانہ شروع کیا، تو شہنشاہ کے سامنے ہوائی جہازوں میں غوطے کھا کھا کر سلامی دی۔ ڈرم بج رہے تھے۔ فوج کے دستے شہنشاہ کو سلامی دیتے ہوئے گزر رہے تھے۔ لوگ خوشی سے تالیاں پیٹ رہے تھے۔ کرچوں پر شہنشاہ کے جھنڈے لہرا رہے تھے، کچھ لوگ ناچتے گاتے گزر رہے تھے غرض 'پلیٹو' پر اس وقت عجیب گہما گہمی تھی۔ لوگ شہنشاہ کی عظمت اور وفاداری میں اتنا شور مچا رہے تھے کہ گھاٹی میں ایک میل دور تک ان کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اور شہنشاہ پُر غرور انداز میں کھڑا ہوا گزرتے ہوئے فوجی دستوں کو اس طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جہاں اتحادی فوج ان کی منتظر تھی۔

اٹھارہ جون کو ساڑھے گیارہ بجے دوپہر سے توپوں کے دہانے کھل گئے۔ اور ٹھیک اس وقت جبکہ شہنشاہ 'برسل' پر بھرپور وار کرنے کے لئے تیار تھا اسے اپنی داہنی

طرف تقریباً چار میل دُور پر کچھ کالے کالے دھبے حرکت کرتے ہوئے نظر آئے۔ اس کے ماتحتوں نے بھی انہیں دیکھا لیکن وہ اس بات پر مصر تھے کہ یہ بادلوں کے کچھ ٹکڑے ہیں۔ جو ہوا کے دوش پر حرکت کر رہے ہیں۔ مگر چند منٹ بعد ہی ان کی یہ غلط فہمی اس وقت دور ہو گئی جب ان کے سامنے ایک 'پروسین' قیدی کو لایا گیا۔ اس قیدی نے اسے بتایا کہ 'پروسین' فوجیں شہنشاہ کے داہنی طرف اس حصے کی طرف بڑھ رہی ہیں جس محاذ کی طرف ان کی طرف سے بچاؤ کی کوئی کارروائی نہیں کی گئی تھی۔ مگر اس اطلاع کے باوجود بھی نپولین مطمئن نظر آرہا تھا۔ "آج صبح کو بھی" وہ اپنے کمانڈر انچیف 'سولٹ' سے کہہ رہا تھا۔ ہماری فتح نوے فیصدی یقینی تھی۔ مگر اس اطلاع نے اسے ساٹھ فیصدی میں بدل دیا ہے۔"

ایک بجے کے بعد اس نے ایک چھوٹا توپخانہ اور ایک فوجی دستہ پروسینوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے روانہ کیا۔ اس کے توپ خانے نے بے تحاشہ آگ برسائی۔ لیکن دشمن کی فوج پھر بھی اپنے محاذ پر جمی رہی۔

اب ولنگٹن نے بھی لائف گارڈ کو یہ کہہ کر بڑھایا۔ "دوستو، ہمارے ملک کی عزت اور عظمت کا انحصار تمہاری بہادری پر ہے۔" اور پھر جب انہوں نے اپنی بہادری سے جنگ کا نقشہ بدل دیا۔ تو وہ ان کی بہادری کی تعریف کر کے انہیں بڑھاوا دے رہا تھا۔

کچھ ہی دُوری پر نپولین اپنی کمر کے پیچھے ہاتھ رکھے تیزی سے چہل قدمی کر رہا تھا۔ میز پر نقشے پھیلے ہوئے تھے۔ جنہیں وہ بار بار رک کر دیکھتا۔ اور پھر ٹہلنے لگتا۔ معیزل نے "کا خیال تھا کہ اس نے دشمن کی فوج کی پسپائی دیکھی ہے اس لئے اس وقت نپولین کی یہ حالت ہے۔ اور اگر واقعی ایسا ہے تو پھر اسے فوج کو مزید کمک پہنچا دینا چاہیئے۔ چنانچہ اس جذباتی انسان نے اتحادیوں کے خلاف مزید چالیس اسکویڈرن جھونک دیئے۔

یہ سماں بھی بڑا عجیب تھا۔ چمکتے ہوئے ہتھیاروں سے لیس فوج بڑھ رہی تھی۔ لیکن جب تھوڑی دیر بعد ہی دشمن کی فوجوں نے انہیں سنگینوں پر رکھ لیا تو اس وقت سب کے جوش و خروش پر اوس پڑ گئی۔ شہنشاہ نے غصے اور جھنجلاہٹ کی حالت میں اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اور اب اسے یقین ہو گیا کہ اس کے جنرل نے کمک بے وقت پہنچائی۔ لیکن اب جب کہ حملہ کر ہی دیا گیا ہے تو پھر اسے مزید تقویت پہنچانی بہت ضروری ہے۔ اس طرح مزید دستے یکے بعد دیگرے جاتے رہے۔ اور دوپہر اسی حالت میں گزر گیا۔ شہنشاہ کی فوج کٹتی رہی اور اتحادیوں نے اپنا محاذ نہیں چھوڑا۔

اس وقت سے فائدہ اٹھا کر "پروسینوں" نے داہنی سمت پر زور دینا شروع کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسی فوج کا دھیان دھیرے دھیرے داہنی طرف بڑھتا چلا گیا۔

سات بجے شام کو ولنگٹن بذات خود آخری مرتبہ اپنی فوجی پوزیشن دیکھنے نکلا۔ اور گھاٹی کے اس پار شہنشاہ کی فوج آخری بھرپور وار کرنے کے لئے بڑھ رہی تھی۔ پھر توپ خانے کی اگلتی ہوئی آگ سے بچا ہوا ایک خستہ حال دستہ نکلنے کے لئے "رج" تک آپہنچا۔

"ہاں، "میٹ لینڈ" ڈلوک کی آواز ابھری

"اب تمہارا وقت ہے۔"
اسی کے ساتھ بندوقوں اور توپوں نے آگ اگلی۔ اور نتیجے میں پورا دستہ خاک و خون میں لت پت کر دیا گیا۔ سارا میدان دھوئیں سے بھر گیا اور جب وہ دھواں صاف ہوا تو معلوم ہوا کہ ایک دوسرے دستے نے سر سے کفن باندھ کر آگے بڑھنے کی ہمت کی ہے۔
شہنشاہ نے دیکھا اور سمجھ لیا کہ جنگ ختم ہو گئی۔ اس وقت اس کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ پھر اس نے اپنے آدمیوں سے کہا۔
"ہماری شکست ہو گئی۔ چلو یہاں سے نکل چلیں۔"
اب اتحادی فوجیں بڑھتی چلی آ رہی تھیں جھٹ پٹا ہو چکا تھا۔ اور شہنشاہ اپنی فوج کے آخری دستے کو لئے ہوئے میدانِ جنگ میں بھاگ رہا تھا۔
انیس جون تک شمال میں نپولین کی فوج کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا تھا۔ اور پھر 'واٹرلو' کی جنگ کے دو چار دن بعد ہی اس کے ایک منسٹر کے اس مطالبے نے اسے تخت سے دست بردار ہو جانا چاہیئے۔ اسے حیرت میں ڈال دیا۔ نپولین نے جب یہ سنا تو فرانسیسیوں کی بزدلی اور غداری کا رونا رو کر انہیں بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ جس پر 'لافیتے' نے طنزیہ لہجہ اختیار کر کے اسے ان ہزاروں لاکھوں بہادروں کی یاد دلائی، جنہوں نے اس کی وفاداری میں پندرہ سال تک اپنی جانیں نچھاور کی تھیں۔ اور پھر دوسرے ہی دن نپولین نے پژمردہ آواز میں تخت سے دست برداری کا اعلان کر دیا اور اعلان نامے پر دستخط کر دیئے۔
سب کچھ تو ہو گیا تھا۔ لیکن ایک سوال ابھی تشنہ تھی۔ اور وہ یہ کہ خود اس کا کیا ہو۔ اس کے دماغ میں رہ رہ کر امریکہ ابھرتا۔ وہ سوچتا تھا وہ امریکہ چلا جائیگا۔ ۲۹ جون جمعرات کی صبح کو دو منسٹر اس کے پاس اس حکم نامے کے ساتھ پہنچے کہ اسے سینٹ ہیلینا جانا ہے۔ وہ ابھی اس فیصلے اور انتظامات پر بات ہی کر رہے تھے کہ فرانسیسی فوج کا ایک دستہ جو سڑک سے گزر رہا تھا، اس نے نعرہ لگایا، "شہنشاہ زندہ باد"
یہ سن کر کمرے میں مکمل خاموشی طاری ہو گئی نپولین نے تیزی سے ایک نقشہ اٹھایا۔ کچھ نشانات ادھر اُدھر کئے اور بولا۔ "مٹھی بھر دشمنوں کو اس بات کی اجازت نہیں دینی چاہیئے کہ وہ فرانس کو فتح کر لیں۔ میں اب بھی دشمن کی پیش قدمی کو روک سکتا ہوں، اس کے بعد پھر میں امریکہ چلا جاؤں گا۔ اور اپنی باقی زندگی وہیں گزار دونگا۔"
اس نے یہ کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد ان لوگوں نے جب اسے پھر دیکھا تو اس وقت وہ اپنی پوری فوجی وردی میں تھا۔
لیکن منسٹروں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پھر اپنے سوال کا اعادہ کیا۔ اور اب نپولین کے سامنے کوئی چارۂ کار نہ رہ گیا۔ چنانچہ اس نے ان کے فیصلے کے آگے سر خم کر دیا۔
اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے وہ اس کمرے میں تنہا رہا۔ جہاں جوزیفائین نے دم توڑا تھا اور پھر وہ اس گھر کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر باہر نکل آیا۔ اس نے جاتے وقت تلوار تک ساتھ نہ لی۔ باہر پہلے ہی سے ایک گاڑی تیار کھڑی تھی۔ وہ اس میں وہ بیٹھ کر مختلف سڑکوں، جنگلوں اور سمندر سے ہوتا ہوا اکتوبر میں ایک روز اس تاریک جزیرہ میں آ پہنچا۔ جہاں کچھ دنوں بعد زندگی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ●



الجیریا کی
راہِ آزادی کے کانٹے



کتاب:
THE VICTORY

مصنف:
ہینری الیگ

تلخیص:
تنویر ناصر

پیش لفظ

الجزائر کو آزاد ہوئے عرصہ گزر چکا ہے، لیکن حریت پسند مسلمانانِ الجزائر کی عزیمت و جرأت اور بے مثال قربانیوں کی یاد تازہ ہے۔ ان کی سرفروشانہ جد وجہد کو تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔ یہ چھوٹی سی دردناک کتاب ایک فرانسیسی اخبار نویس ہنری الیگ کی بصیرت افروز تصنیف ہے جس نے الجزائر کے وطن پرستوں کی آزادی کی جد وجہد میں "دائم درہم سخن قدم" ہر ممکن طور پر عملی شرکت کی۔ الجزائر کی جنگِ آزادی میں فرانس کے اکثر دانشور، ادبا، شعرا ار دہشت پسندوں کے جبر و ظلم کے خلاف تحریری و عملی احتجاج کرتے رہے۔ ہنری الیگ الجزائر کے اخبار "ری پبلکن" کا ایڈیٹر رہ چکا ہے۔ وہ الجزائر میں فرانسیسی دہشت پسند جماعت کے (جو الجزائر کی آزادی کے سخت خلاف تھی) زندانِ لعنت میں اسیر رہا اور انسان دوستی کے جرم میں عذاب انگیز اذیتوں میں مبتلا رہا۔

اس کتاب کا دیباچہ ژاں پال سارتر فرانس کے شہرۂ آفاق دانشور ادیب نے لکھا جس کا عنوان "فتح" رکھا جس کی پاداش میں انھیں عرصۂ دراز کے لئے ملک بدر کر دیا گیا تھا۔ سارتر اپنے دیباچے میں لکھتا ہے کہ: ۱۹۴۳ء میں جرمن دہشت پسند (گستاپو) کے ظلم و تشدد سے سارا فرانس درد و کرب سے چلا رہا تھا۔ اس وقت یہ بات تصور میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ کبھی روز ہمارے نام پر لوگوں پر اسی طرح ظلم ڈھایا جائے گا۔ سارتر اس کے لئے فرانس کی حکومت کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے اور لکھتا ہے کہ موجودہ حالات نے اہلِ یورپ کو انسانیت سے گرا دیا اور ان کی اصطلاح میں الجزائر میں آدمیت کا مطلب مسلمانوں پر برتری اور فوقیت حاصل کرنا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم نے عربوں سے ان کی ایک ایک چیز چھین لی، انھیں اپنے سے دھتکار دیا، پھر ہمیں کیا حق ہے کہ ان کی آزادی چھین کر بیٹھ رہیں۔ اس میں بھی فتح مسلمانوں کی ہے کیونکہ وہ اپنے حق کی راہ پر قربان ہو رہے ہیں اور فرانس ذلیل ہو رہا ہے۔ سارتر حالات سے مایوس بھی نہیں، اس لئے مزید لکھتا ہے کہ "ہنری الیگ نے ہمیں مایوسی اور ندامت سے نجات دلائی ہے اس لئے کہ وہ خود مظلوم ہے، اس نے ظلم پر فتح پائی ہے۔ اگرچہ اس پر ظلم ڈھانے والے اس کے بھائی ہیں مگر ہمیں فخر ہے کہ ہنری فرانسیسی ہے۔" ——— سلامت علی مہدی

اس عریض و وسیع اور ہولناک قید خانے میں جس کی ہر کوٹھری میں لاتعداد دکھی انسان بند ہیں، کسی کے متعلق بات کرنا بھی جرم ہے۔ جن بدنصیبوں کو موت کا پروانہ مل چکا ہے، وہ سب سے نچلی منزل میں بند ہیں۔ ان دنوں آٹھ دھتکارے ہوئے انسان، جن کی زندگی نے انسانیت کے نام کو زندہ رکھا ہے، اکٹھے ایک زنجیر میں پابستہ اپنے انجام کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہر رات ان کے دل میں یہ خدشہ ہوتا ہے کہ آنے والی صبح ان کے لئے موت کا پیغام لائے گی۔ ان کے دلوں میں ہوک سی اٹھتی ہے اور وہ اپنے خدا سے یہ دعا مانگ کر آنکھیں بند کرتے ہیں کہ آنے والی صبح کچھ نہ ہو۔ پھر بھی جیل کے اس حصے سے پُرسوز اور وجد آفریں عربی نغموں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ وہ نغمے جو اپنے وطن کی آزادی کے لئے جد وجہد کرنے والے مردانِ حُر کے دلوں سے نکلتے ہیں۔ جسمانی اذیتیں اور عذاب تو یہاں عام ہیں، شاید ہی کوئی قیدی ان سے

بچ سکا ہو۔ سب سے پہلا سوال یہاں آنے والے نئے قیدیوں سے ہم یہی کرتے ہیں (اگر ہمیں ان سے بات کرنے کا موقع مل جائے) کہ وہ کب گرفتار کئے گئے؟ جاسوسوں میں سے کس نے انہیں عذاب دیا۔ میری ذات کا مسئلہ منظر عام پر آنے کی وجہ سے ذرا مختلف ہو گیا اور اسے عوام و خواص کی حمایت حاصل ہو گئی۔ گو میں نے اپنی عرضداشت یا اس مختصر کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، کوئی نئی یا عجیب باتیں نہیں۔ ایسی بے شمار مثالیں الجزائر کی خونی جنگ کی داستان میں ملتی ہیں۔

مجھے گرفتار ہوئے تین ماہ سے بھی زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے، اس عرصے میں میں نے اتنی تکلیفیں سہی ہیں، اتنے وحشیانہ مظالم دیکھے ہیں کہ اگر مجھے اس بات کا یقین نہ ہوتا کہ سچائی کو ظاہر کرنے سے شاید میں امن قائم کرنے کے مقصد کو قریب لا سکوں گا تو میں کبھی ان سوہانِ روح اور طویل شب و روز کے ذکر میں زبان نہ کھول سکتا۔

تقریباً ایک ماہ تک میں تمام رات ان زندہ گڑ انسانوں کی چیخیں سنتا رہا ہوں جنھیں عذاب پہنچائے جاتے ہیں۔ ان دکھی دلوں کی پکار میں کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔ میں نے ان قیدیوں کو چھت پر سے انتہائی بے رحمی سے پھینکتے ہوئے دیکھا، جن کے جسم میں ازحد وحشیانہ عذاب اور مار پیٹ کے بعد زندگی کی ایک رمق بھی باقی نہ رہ گئی تھی جو بمشکل سے قدیم عربی زبان میں کسی دعا کا پہلا حرف ہی ادا کر سکے۔ مجھے یہاں اور ہولناک حادثات کا علم بھی ہوتا رہا۔ مجھے میرے دوست ماریس آدین کی پراسرار گمشدگی کا پتہ چلا۔ آدین کو مجھ سے ۲۴ گھنٹے قبل گرفتار کیا گیا تھا اور اسے انہیں عذاب کے فرشتوں نے اذیتیں پہنچائی تھیں جنھوں نے بعد میں میرا چارج لیا۔ آدین کو اسی طرح غائب کیا گیا جس طرح اس سے پیشتر جمعیت علماء کے صدر شیخ طبسی SHEIKH TEBESSI ڈاکٹر شریف ظاہر اور بہت سے دوسرے مجاہدین کو غائب کیا جا چکا تھا۔

میرے ایک اور دوست دی شیلی پر جسمانی عذاب کا ایک عجیب طریقہ آزمایا گیا تھا۔ اسے برہنہ کر کے تانبے کی کرسی سے باندھ دیا اور کرسی میں برقی رَو چھوڑ دی۔ اس کی دونوں ٹانگوں پر ابھی تک جلے ہوئے زخموں کے نشان ہیں۔ جیل کے برآمدے میں نئے قیدیوں میں محمد صفت کو دیکھا یہ الجزائر کی اسلامی عدالت کے رجسٹرار تھے۔ یہ تقریباً ۳۴ دن پیرا ٹروپس کے ساتھ رہے، جنھوں نے ان کی زبان آگ سے جلا دی۔ وہ اچھی طرح بول بھی نہ سکتے تھے انھوں نے مجھے اپنی چربی نکلی جھلسی ہوئی سیاہ زبان بھی دکھائی۔ میری ملاقات کچھ اور لوگوں سے بھی ہوئی جن میں ایک قصبہ بولام کا سوداگر بھی تھا۔ جب ہم سب کو جیل کی گاڑی میں فوجی عدالت لے جایا جا رہا تھا تو اس نے مجھے اپنی ٹانگیں دکھائیں جن پر ظالموں نے چھری سے گوشت اتار کر لمبے اور گہرے گھاؤ کر دئیے تھے۔ اس نوجوان سوداگر کا قصور یہ تھا کہ اس نے ایک حریت پسند کو پناہ دی تھی۔

دیوار کی دوسری جانب کا حصہ عورتوں کے لئے مخصوص تھا ان نوجوان، نوعمر اور قابل فخر دختران وطن میں جو سب کی سب بہیمانہ اذیتوں کا شکار ہوئیں اور جن پر ذرہ برابر بھی رحم نہ کیا گیا، جمیلہ بوہارد، نسیمہ حبال، ملکیہ خین، لیوسی کسکاس اور بہت سی دلیر لڑکیاں تھیں جن کے ساتھ درندہ صفت وحشیوں نے ہر قسم کی ذلیل حرکت روا رکھی ان کو مارا پیٹا جاتا، ان کو برہنہ پھرایا جاتا۔ ان نوجوان بچیوں پر بھی راز اگلوانے کے لئے پانی اور بجلی کے عذاب انگیز طریقے آزمائے جاتے۔ ان میں سے ایک غیور مجاہدہ نے حاملہ ہونے کے بعد موت کو ترجیح دی۔

یہ وہ حقائق ہیں جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور ان مظالم کا تو ذکر ہی کیا جو میں نے نہیں دیکھے ہوں گے، جن کا اندازہ بھی مشکل ہے۔ ان میں اکثر لوگ ایسے بھی ہیں، جو اتنی تکلیفیں اٹھانے کے باوجود فرانسیسیوں اور الجزائریوں کے درمیان مستقبل کے امن و دوستی پر یقین رکھتے ہیں۔

۱۲ رجون کی شام کو چار بجے لفٹیننٹ "شا" پیرا ٹروپس کا ایک آدمی اور ایک پولیس کانسٹیبل آدین کے گھر مجھے گرفتار کرنے آئے (جو الجزائر یونیورسٹی کے شعبۂ سائنس میں کام کرتا تھا)۔ اس سے ایک دن پہلے ہی پولیس آدین کو گرفتار کر کے لے گئی تھی اور خفیہ طور پر ایک جاسوس کو وہیں تعینات کر دیا گیا تھا۔ دوسرے دن اسی جاسوس نے میرے لئے دروازہ کھولا تو میں اس کے شکنجے میں پھنس چکا تھا۔ ہر چند میں نے فرار کی ناکام کوشش کی مگر جاسوس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور مجھے جلدی ہی زیر کر لیا گیا۔ جاسوس بے حد سراسیمہ ہو رہا تھا، اس نے فون کیا تاکہ سب کام جلد ہو جائے۔ اس دوران میں وہ مجھ پر کڑی نگرانی کرتا رہا۔ جیسے ہی لفٹیننٹ داخل ہوا میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ کس قماش کا آدمی ہے۔ بڑا سا سر جس کے نیچے چھوٹا سا تکونی چہرہ جو لومڑی سے مشابہ تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بڑی سفاکی سے ہونٹ بھینچ کر مسکرایا اور طنزیہ لہجے میں مخاطب ہوا، "بہت خوب پھنسے"۔ وہ ہر لفظ پر زور دے کر، چبا چبا کر ادا کر رہا تھا۔ "یہ ہنری ایلے ہیں، الجی ری پبلکین کے سابق ایڈیٹر!" پھر وہ ایک دم میری طرف مڑ کر پوچھنے لگا، "تم کہاں چھپے ہوئے تھے؟"

"یہ میں تمہیں ہرگز نہیں بتاؤں گا۔" میں نے خاموشی سے جواب دیا۔

اس نے مسکرا کر سر اٹھایا اور نہایت اعتماد کے ساتھ بولا۔ "ہم ابھی تمہارے لئے ایک چھوٹا سا سوال نامہ تیار کریں گے مجھے یقین ہے، تب تمہیں اپنا ارادہ بدلنا پڑے گا۔"

اس کے اشارے پر پیرا ٹروپس مجھے ہتھکڑیاں لگا کر سیڑھیوں سے نیچے گلی میں لے گئے، جہاں لفٹیننٹ کی گاڑی گلی کے دوسرے سرے پر کھڑی تھی۔ ان لوگوں نے مجھے پچھلی سیٹ پر بٹھایا۔ میرے پاس ایک "پیرا" بیٹھ گیا جس کی اسٹین گن کی تیز نوک راستے بھر میری پسلیوں میں چبھتی رہی اور وہ مجھے بار بار تنبیہ کرتا رہا کہ اگر میں نے کوئی بے ہودہ حرکت کی تو ان کے پاس مجھے سیدھا کرنے کے لئے بہت سے حربے ہیں۔ وہ مجھے شہر کے بالائی حصے میں لے گئے۔ تھوڑی دیر کے لئے ہماری گاڑی راستے میں ایک جگہ رکی (جو یقیناً پیرا ز کا ایک اڈہ تھا) یہاں لفٹیننٹ شا تنہا اندر گیا۔ اس کے بعد شیطونیت کے راستے چلیس الیار سے گزر کر ہماری کار ایک وسیع اور نامکمل عمارت کے سامنے رک گئی۔ عمارت کے سامنے کا گراؤنڈ فوجی گاڑیوں، جیپوں اور لاریوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ مجھے اوپر والی منزل میں لے گئے۔ لفٹیننٹ شا میرے آگے آگے تھا اور پیرا میرے پیچھے۔ دیواروں میں جگہ جگہ لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ سیڑھیوں پر کوئی ستون یا ریلنگ نہیں تھی۔ سلیٹی رنگ کی چھتوں میں بجلی کے نامکمل تار لٹک رہے تھے۔ سیڑھیوں پر پیرا ز کی آمد و رفت جاری تھی۔ میلے پھٹے ہوئے کپڑے اور گئی کئی دن کی بڑھی ہوئی داڑھیوں والے عربوں کو سامنے سے دھکیلتے ہوئے، ان پر حقارت سے ہنستے، قہقہے لگاتے ہوئے اپنے بھاری بھاری جوتوں سے بے ہنگم شور مچاتے ہوئے وہ جلدی جلدی ادھر ادھر آجا رہے تھے۔ مجھے جلد ہی پتہ چل گیا کہ میں بوزریعہ کی چوکی کے مرکز "دی تری" میں ہوں۔ اب مجھے پتہ چل گیا کہ میرے ساتھ اس ظلمت کدے یا کال کوٹھڑی میں کیا ہونے والا ہے۔ آخر وہ مجھے تیسری یا چوتھی منزل کے ایک بڑے سے کمرے

میں لے گئے جو غالباً ڈرائنگ روم تھا۔ یہاں بہت سی کرسیاں ایک طرف پڑی تھیں۔ دیواروں پر ان الجزائری محبانِ وطن کی تصویریں لگی ہوئی تھیں جن کو ابھی گرفتار نہیں کیا گیا تھا۔ درمیان والی میز پر ایک ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ کھڑکی کے پاس لفٹیننٹ آیر کھڑا تھا۔ اس کا جسم آہنی دیوار کی مانند تھا جس پر چھوٹا سا سر، موٹے موٹے گالوں پر نیم خوابیدہ آنکھیں اور بہت باریک آواز عجیب سی معلوم ہوتی تھی۔ میرے ہاتھوں سے ہتھکڑیاں اتار لی گئیں۔ لفٹیننٹ شا میرے قریب آیا اور بہت نرمی سے کہنے لگا، ہم تمہیں ایک موقع اور دے رہے ہیں۔ یہ کاغذ اور پنسل لو اور ان سب سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب لکھ دو۔ "تم کہاں رہتے ہو؟ فرار کے زمانے میں کس نے تمہیں پناہ دی تھی؟ وہاں تمہاری کن کن لوگوں سے ملاقات ہوئی اور" وہاں ان سب کی سرگرمیاں کیا تھیں، وغیرہ؟ میں نے وہی نفی میں جواب دیا جو میں لفٹیننٹ شا کو راستے میں دے چکا تھا۔ یہ کہ میں گرفتاری سے قبل روپوش ہو گیا تھا کیونکہ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ میری گرفتاری کے احکام صادر ہو چکے ہیں۔ اس دوران میں میں اپنی صفائی کے کاغذات کی تیاری کرتا رہا اور اسی سلسلے میں پیرس میں، میں جن لوگوں سے ملا تھا ان کے نام بتائے اور صاف صاف کہہ دیا کہ اس کے سوا میرے پاس تمہیں بتانے کو کچھ نہیں اور نہ میں تمہارے ان سوالوں کے جواب لکھنے کو تیار ہوں۔ یہ خیال بھی دل میں نہ لانا کہ جن لوگوں نے مجھے اتنی جرأت اور محبت سے پناہ دی، ان کے متعلق میں تمہیں کچھ بتا دوں گا۔ دونوں لفٹیننٹ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر طنزاً مسکرائے۔ "میرے خیال میں اب ہمیں وقت ضائع نہ کرنا چاہیئے" شا نے کہا۔ جس پر آیر نے رضامندی کا اظہار کیا۔ میں بھی دل سے اُن سے متفق تھا، کیونکہ جسمانی اذیت تو بہر حال مجھے بھگتنی ہی تھی جلد یا بدیر۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ خواہ مخواہ تاریکی اور تذبذب میں ڈرتے رہنے سے بہتر تھا کہ بدترین حالات کا جلد از جلد سامنا کر لیا جائے۔

شا ٹیلی فون کے پاس گیا اور کسی سے کہنے لگا، سب تیاریاں مکمل کر لو، اس دفعہ گھاگ آدمی ہے اور تو کو جلدی سے میرے پاس بھیج دو۔

تھوڑی دیر میں تو بھی آ گیا۔ وہ تنگ پیشانی اور رنگے ہوئے بالوں والا، چھوٹے قد کا پچیس سالہ نوجوان تھا۔ مسکراتا ہوا سیدھا میرے پاس آیا، "اچھا تو تم ہو ہمارے گاہک"۔ اس کے بعد وہ مجھے ایک منزل نیچے لے گیا۔ ہم برآمدے کے بائیں طرف ایک چھوٹے سے کمرے میں گئے جسے شاید مستقبل میں باورچی خانہ بنایا جائے کیونکہ یہ کھانے پکانے کے تمام ضروری لوازمات سے آراستہ، مگر نامکمل تھا۔ پچھلی دیوار کے شیشے کے دروازوں کو ڈبوں سے بند کر کے، کمرے میں اندھیرا کیا ہوا تھا۔

تو نے مجھے کپڑے اتارنے کو کہا۔ جس پر میں نے عمل نہیں کیا تو کہنے لگا اگر تم خود نہیں اتارو گے تو ہمیں جبراً اتارنے پڑیں گے، کیونکہ یہ کام تو بہر حال ہمیں کرنا ہی ہے، جب میں کپڑے اتار رہا تھا تو پیراز یہ دیکھنے کے لئے باری باری اندر آتے رہے کہ تو کا نیا شکار کون ہے۔ انھیں یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوتی کہ ایک فرانسیسی اپنے ہم وطنوں کے خلاف ان ذلیل چوہوں (الجزائریوں) کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ وہ بار بار تو کو تحقیر آمیز لہجے میں اکساتے کہ تو تم اس کی ذرا اچھی طرح خاطر مدارات کرنا۔ تو نے زمین پر ایک تختہ بچھا دیا، جو پسینے اور قے سے چپک رہا تھا۔ مجھے تختے پر لٹا کر تو نے دو اور آدمیوں کے ساتھ مل کر میری کلائیاں اور گھٹنے چمڑے کی پیٹیوں سے تختے کے ساتھ کس کر باندھ دئیے۔ تو میری چھاتی کے پاس تختے کے دونوں طرف پاؤں رکھ کر دونوں ہاتھ اپنی کمر

پر رکھ کر ایسے کھڑا ہو گیا جیسے وہ فاتح ہے اور میں مفتوح۔
بہت تن کر اس نے شمالی افریقی لہجے میں کہا، یہاں بڑے بڑوں
کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں، تم کس کھیت کی مولی ہو۔ تمھیں بھی
ابھی سب کچھ اگلنا پڑے گا۔ ویسے گھبراؤ نہیں، الجیزائری
مردودوں کے مقابلے میں ہم فرانسیسیوں کے ساتھ بہتر سلوک
کرتے ہیں۔" اس درمیان میں ہیرا ز کے جوان میرے اردگرد
کھڑے گالیاں دیتے اور قہقہے لگاتے رہے۔ کبھی کہتے تمہارے
مسلمان دوست تمھیں آکر کیوں نہیں بچاتے؟ کبھی کہتے
"آہا آپ تو یوں پیس کر لیٹے ہیں جیسے بڑے آرام سے استراحت
فرما رہے ہوں۔" ایک اور خونخوار درندہ غرآیا۔ "اس مردود
کے ساتھ وقت ضائع نہ کرو، جتنی جلد ہو سکے اس کو ٹھکانے
لگا دو۔" کھڑکیوں کی درزوں سے آنیوالی سرد ہوا گیلے تختے
پر لگ کر میرے جسم کو گیلا کر رہی تھی، میرا جسم برف کی طرح یخ
ہو کر کانپنے لگا۔ تو ظالمانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا: "کیا خوف
سے کانپ رہے ہو؟ کوئی بات کرنا چاہتے ہو؟
میں نے کہا، "نہیں، مجھے ڈر نہیں، سردی لگ رہی
ہے۔" وہ بولا "تم ہیرو بننے کی کوشش کر رہے ہو، لیکن ابھی
پندرہ منٹ میں بک دوگے، ایک ایک بات اگل ڈالوگے۔"
میں ان درندوں کے درمیان سردی سے کپکپاتا،
ضبط اور تحمل سے لیٹا رہا۔ اسی وقت میں نے شا کو ایک اور
کیپٹن کے ساتھ آتے دیکھا۔ دبلا پتلا، لانبا اور پُروقار آدمی
کیپٹن ڈیسی تھا۔ وہ ہونٹ بھینچے شا کے پاس کھڑا رہا۔
شا نے پھر اپنا سوال دوہرایا۔ "میں اپنی بات پر
قائم ہوں۔" میں نے اپنا جواب دوہرایا۔ اس پر شا بہت
خوش ہو کر بولا "خوب" تو پھر ہم اپنا کام جاری رکھ سکتے
ہیں۔ چلو دوسرے کمرے میں چلیں۔ وہاں روشنی ہے اور
کام اچھی طرح ہو سکے گا۔"

چار جوان مجھے تختے سمیت اٹھا کر دوسرے کمرے
میں لے گئے۔ سب لوگ لکڑی کے ڈبوں پر بیٹھ گئے۔ شا نے
تو سے ایک میگنٹو MAGNETO لی اور میری آنکھوں
کے قریب رکھ کر بولا۔ "جانتے ہو یہ کیا ہے؟ تم نے اکثر اس
کے متعلق سنا ہوگا، کیونکہ تم تو کئی مضمون بھی اس پر لکھ
چکے ہو۔"
میں نے چلا کر کہا، تمھیں یہ وحشیانہ طریقے استعمال
کرنے کا کوئی حق نہیں، وہ ہنس پڑا۔ "یہ تمھیں ابھی معلوم
ہو جائے گا۔"
میں نے پھر کہا، "اگر تم میرے خلاف کوئی الزام عائد
کرتے ہو تو باقاعدہ کارروائی کرو اور مجھے قانون کے حوالے
کردو۔" اس پر سب لوگوں نے وحشیانہ قہقہے لگانے شروع
کردئے۔ مجھے بھی یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ میرا احتجاج ہی
فضول ہے بلکہ ان وحشیوں کے سامنے قانون کے احترام
کا ذکر کرنا بھی حماقت ہے، لیکن میں ان کو بتا دینا چاہتا
تھا کہ ان کی ان گیدڑ بھبکیوں کا مجھ پر ذرہ برابر اثر نہیں ہوا۔
شا کا اشارہ پاتے ہی ایک "ہیرا" میرے سینے پر بیٹھ
گیا۔ اس کے چہرے سے اس لڑکے کی سی خوشی کا اظہار
ہو رہا تھا جسے اس کا پسندیدہ کھیل کھیلنے کی اجازت مل گئی
ہو۔ دو اور درندے میری ٹانگوں پر دائیں بائیں بیٹھ گئے۔
تمام افسر میرے اردگرد کھڑے ہو گئے اور بھی بہت سے لوگ
صرف تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے۔
وہ "ہیرا" جو میرے سینے پر بیٹھا ہوا تھا، اس نے
متواتر مسکراتے ہوئے ELECTRODES کے کنارے
میری آنکھوں کے سامنے ہکوں سے جکڑ دئے۔ اس میں چھوٹے
چھوٹے لوہے کے کلپ لگے ہوئے تھے۔ ان دندانے دار نوکیلے
کلپوں کو ٹیلی فون انجینئر CROCODILE CLIPS کہتے ہیں۔

ایک کلپ میرے سیدھے کان کی نوک کے ساتھ اور دوسرا اسی طرف کی ایک انگلی پر چپکا دیا گیا۔ میں ایک دم تڑپ گیا اور پوری قوت سے چلایا۔ کیونکہ لفٹیننٹ شا نے میرے جسم میں برقی رو کا پہلا صدمہ دیا تھا۔ میرے کانوں میں سے بجلی کی سنسناہٹ جیسی آواز گزر گئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی سینے سے نکل پڑے گا۔

میں نے چیخیں مارتے ہوئے جسم کو اکڑا کر پیٹیاں توڑنے کی کوشش کی مگر ساری پیٹیاں میرے جسم میں کھب گئیں شا کے ہاتھ میں میگنٹو تھا جس سے وہ متواتر صدمے پہنچا رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی آواز گونج رہی تھی۔

"بتاؤ تم کہاں چھپے ہوئے تھے؟" مجھ پر تشنج طاری تھا۔ بہت ہمت اور کوشش سے اپنی اینٹھی ہوئی گردن اس کی طرف موڑ کر میں نے انتہائی نفرت سے کہا، "تم فضول کوشش کر رہے ہو تمہیں پچھتانا پڑے گا۔ لفٹیننٹ نے غصے میں آ کر میگنٹو کو آخری درجے پر موڑ دیا۔ میں درد و کرب سے چیختا چلاتا رہا۔ لفٹیننٹ شا نے ایک "پیرا" سے کہا، "یہ کمبخت بہت شور مچا رہا ہے۔ اس کا منہ کسی چیز سے بند کر دو۔" اس نے میری ہی قمیص کو گیند کی طرح بنا کر میرے منہ میں ٹھونس دیا۔ یہ بات میرے حق میں کسی حد تک اچھی ہی ثابت ہوئی، کیونکہ درد کی شدت میں میں پوری طاقت سے اپنی قمیص چباتا رہا جس سے میری تکلیف میں کچھ کمی ہو جاتی۔ ایک دم مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کوئی وحشی درندہ میرے جسم سے گوشت اتار رہا ہے۔ یہ صدمے اتنے سخت تھے کہ سب پیٹیاں ڈھیلی پڑ گئیں جن کو دوبارہ باندھنے کے لئے انہیں اپنا کام تھوڑی دیر کے لئے روکنا پڑا۔

اب کی بار لفٹیننٹ نے خود "پیرا" کی جگہ سنبھال لی۔ اس نے کلپ کو برقی تار سے الگ کر کے ننگا تار میرے سینے کے گرد کس کر باندھ دیا۔ میرا جسم برقی صدمات سے بُری طرح کانپ رہا تھا، مگر وہ لوگ ان صدموں کی شدت سے مطمئن نہیں تھے، کیونکہ انھوں نے میرے اوپر یخ پانی ڈالا۔ تاکہ صدموں کی شدت اور بڑھ جائے۔ میرا جسم سن ہو گیا اور ساتھ ہی سردی سے کپکپاہٹ بھی تیز ہو گئی۔ لفٹیننٹ شا اور اس کے ساتھی میرے قریب بیٹھے بیئر کی بوتلیں خالی کرتے رہے۔ لوہے کی تیز سلاخ سی میرے جسم کو مروڑ رہی تھی۔ درد کی شدت کم کرنے کے لئے میں نے اپنے منہ میں ٹھونسے ہوئے کپڑے کو بھی چبایا مگر بے سود۔

آخر کار پہلا عذاب ختم ہوا اور انھوں نے مجھے کھول دیا۔ ابھی میں نے اپنی پتلون اور بنیان ہی پہنا تھا کہ آیر نے میز سے میری ٹائی اٹھائی۔ پھر قہقہوں کے درمیان میرے گلے میں ٹائی کو رسی کی طرح ڈال کر مجھے کتے کی طرح گھسیٹتا ہوا ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔

"اچھا تو ابھی تک تمھارے ہوش ٹھکانے نہیں آئے" اس کے ساتھ ہی اس نے پوری طاقت سے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ کر دائیں بائیں مکے لگانے شروع کر دئے، جس سے میں زمین پر گر پڑتا، کبھی ادھر کبھی ادھر۔ وہ اسی طرح مارتے ہوئے بولا۔ "تم ختم ہو چکے، مر چکے ہو۔ تمہیں بولنا ہی پڑے گا۔" میرے ہوش و حواس غائب تھے۔ اگرچہ میری عینک گر پڑی تھی مگر قیمض پر چباتے ہوئے سوراخ ڈراؤنے خواب کی طرح منہ کھولے مجھے تک رہے تھے۔ مجھ میں کوئی احساس نہ تھا۔ صرف ایک نامعلوم نفرت کا پہاڑ میرے دل میں ابھر رہا تھا۔ آیر کی آواز مجھے پھر ہوش میں لے آئی۔ جو زور زور سے چلا رہا تھا، "تمہیں بولنا پڑے گا اگر تم آنے والے عذاب کی شدت سے بچنا چاہتے ہو تو جلدی سے

اُگل ڈالو۔" ایک دم دروازے میں مجھے اپنے دوست آدین کا سُتا ہوا زرد چہرہ نظر آیا۔ شا بولا "آدین اسے بتاؤ آئینولا عذاب کتنا سخت ہے؟" "تیری اس کو سہنا بہت کٹھن ہے۔" آدین بس اتنا کہہ سکا اور پھر فوراً وہ اسے گھسیٹ کر باہر لے گئے۔ آیر غصے سے بے قابو ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے گھسیٹ کر اپنا منہ میرے کان کے قریب کرکے بلند آواز سے کہا: "ذلیل کیڑے تجھے بولنا پڑے گا۔ تجھے بکنا پڑے گا۔ ہم نے ہند چین کی لڑائی لڑی ہے۔ ہم تیری طرح کے خبیث لوگوں سے اُگلوانا اچھی طرح جانتے ہیں۔ آخر میں سبھی بول پڑتے ہیں۔ تجھے بھی بولنا پڑے گا۔ تو گستاپو کو تو جانتا ہے نا؟" آیر کا چہرہ غصے سے اور بھی مسخ ہو رہا تھا جیسے اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو۔

"تم حرامی! جسمانی عذاب پر مضمون لکھتے ہو! اچھا اب تمھیں دسویں ڈویژن کے حوالے کریں گے۔" اور سب لوگ ہنسنے لگے، جس پر آیر کو اور شہ ملی۔ وہ اپنے گھٹنے میرے پیٹ پر رکھ کر میرے منہ پر گھونسے تھپڑ مارتے ہوئے بولا، جو کچھ ہم یہاں کر رہے ہیں، یہی فرانس میں کریں گے اور تمھارا جمہوریت کا خواب! اسے بھی ہم ہوا میں اڑا دیں گے۔ اتنا کہہ کر آیر نے لکڑی کا ایک ڈنڈا اُٹھا کر مجھے مارنا شروع کر دیا۔ ہر ضرب میرے تمام جسم کو ہلا کر رکھ دیتی۔ مگر میں نے پکا عہد کر لیا تھا کہ اپنے آپ کو گستاپو کہہ کر فخر کرنے والے وحشی درندوں کے آگے کبھی سر نہیں جھکاؤں گا۔ شا ہار مان کر بولا "اچھا جب تم خود ہی چاہتے ہو تو چلو تمھیں اب شیروں کے حوالے کر آتے ہیں۔"

"ان شیروں سے بھی میں مل چکا تھا۔ تاہم ان کی صلاحیتوں کا اندازہ ابھی نہیں ہوا تھا۔ آیر مجھے گھسیٹ کر پھر اسی پہلے والے کمرے میں لے گیا۔ پیچھے پیچھے ایک بیرا تختہ اور میگنٹو اُٹھائے آیا۔ جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تھے تو اسی وقت ایک برہنہ مسلمان کو ٹھوکریں مارتے ہوئے باہر لے جایا جا رہا تھا۔ تو نے مجھے دوبارہ تختے سے باندھ دیا۔ اس دفعہ ان کے پاس میگنٹو سے بھی بڑی مشین تھی اور جب اس نے اپنا کام شروع کیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کیے دیتی ہے۔ اس کے جھٹکے بجلی کے جھٹکوں سے مختلف تھے۔ میرے جسم میں ایک نئی قسم کا درد اٹھ رہا تھا، جیسے میرے پٹھے اینٹھ رہے ہوں۔ میں نے کس کر اپنے دانت اور آنکھیں بند کر لیں۔ تو مجھ پر جھک کر مسکراتے ہوئے بولا "تمھیں تیرنا آتا ہے؟ ہم تمھیں سکھانے لگے ہیں۔ وہ مجھے اٹھا کر باورچی خانے میں لے گئے جہاں انھوں نے مجھے اس طرح لٹایا کہ میرا سر نلکے کے نیچے سنک SINK میں تھا۔ دو بیراز نے تختے کا دوسرا سرا پکڑا ہوا تھا۔ باورچی خانے میں بہت اندھیرا تھا۔ پھر بھی میں اندھیرے میں لفٹیننٹ شا، آیر اور کیپٹن ڈی کے چہرے دیکھ سکتا تھا۔ تو نے نلکے کے اوپر ایک بڑی نلکی باندھی۔ پھر میرے سر پر ایک کپڑا لپیٹ دیا۔ کیپٹن ڈی کی تجویز پر لکڑی کا ایک ٹکڑا میرے منہ میں ایسے رکھ دیا گیا کہ میں منہ بند نہ کر سکوں۔ ٹیوب میرے منہ میں ڈال کر میری ناک اپنے ہاتھ سے بند کرکے اس نے نلکا کھولنے سے پہلے مجھ سے کہا کہ جب میں بات کرنا چاہوں تو اپنی انگلی ہلا دوں۔ یہ کہہ کر تو نے ایک دم نلکا کھول دیا۔ پانی ایک دم میری ناک، منہ اور سارے چہرے میں بھر گیا۔ شروع میں تو تھوڑا تھوڑا پانی حلق سے نیچے اتار کر میں سانس لینے کی کوشش کرتا رہا، مگر یہ ترکیب زیادہ دیر تک کامیاب نہ ہو سکی اور مجھے ایسا

محسوس ہوا جیسے میں ڈوب رہا ہوں۔ اب پہلی بار بہت عجیب طریقے سے موت کا ڈر مجھ پر چھا گیا۔ انتہائی جبر کے باوجود میں اپنی انگلیوں کو ہلنے سے نہ روک سکا۔ "ٹھہرو ٹھہرو! وہ بولنا چاہتا ہے۔" ایک آواز آئی۔ خواب کی طرح دھندلے دھندلے چہرے میرے قریب آئے۔ اب میں بڑی مشکل سے سانس لے سکتا تھا۔ کیپٹن پیٹ سے پانی نکالنے کے لئے ہلکے ہلکے گھونسے مارنے لگا۔ "اچھا بولو! کسی نے کہا۔ میری خاموشی دیکھ کر کوئی غرایا۔ "یہ ہم سے مذاق کر رہا ہے۔ ناکام پھر کھول دو۔" اس دفعہ میری مٹھیاں اس طرح کس کے بند کرلیں کہ میرے ناخن ہتھیلی میں کھب گئے۔

میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب انگلیاں ہرگز نہیں ہلنے دوں گا۔ دم گھٹ کر مرجانا بہتر ہے۔ میں نے محسوس کیا جیسے اب مجھ میں کسی چیز کا احساس نہیں رہا اور میں بے ہوش ہوگیا۔

جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میں ان پیراز کے درمیان بے سکت و برہنہ پڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ شا مجھ پر جھکا ہوا ہے۔ "ہوش میں آگیا ہے۔" اس نے کسی سے کہا۔ پھر میری طرف دیکھ کر کہا۔ "تم یہ نہ سمجھنا کہ ہر بار بے ہوش ہوکر چھٹکارا پا جاؤ گے۔" اس نے ایک جھٹکے سے مجھے کھینچ کر کھڑا کر دیا۔ میں توازن برقرار نہ رکھ سکا اور ان پر گر پڑا۔ مکوں اور ٹھوکروں کے ساتھ وہ مجھے ایک دوسرے پر گیند کی طرح پھینکنے لگے۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لئے ہاتھ پاؤں مارے تو کوئی بولا۔ "دیکھا، اس سؤر میں ابھی تک طاقت ہے۔ ابھی اس کی اکڑ نوں نہیں گئی۔ قہقہوں کے درمیان ایک اور آواز سنائی دی۔" ابھی تو ہم اسے بھونیں گے۔" یہ لفٹیننٹ شا تھا۔

انھوں نے مجھے باورچی خانے میں پھر دھکیل دیا اور رسّی پر لٹا کر ایک گیلا کپڑا میرے ٹخنوں پر لپیٹ دیا، پھر مجھے الٹا لٹکا کر چھت کے ساتھ رسّی باندھ دی۔ میری انگلیاں زمین کو چھو رہی تھیں۔ کافی دیر تک وہ مجھے ریت کی بوری کی طرح جھلا جھلا کر خوش ہوتے رہے۔ پھر تو نے ایک جلتی ہوئی مشعل میری آنکھوں کے سامنے کر دی اور پھر وہ کھڑا ہوکر مجھے جلانے لگا۔ اب میں شعلے اپنی ٹانگوں پر محسوس کر سکتا تھا۔ میری ٹانگوں کے بال جلنے لگے۔ میں نے تڑپ کر اپنے آپ کو ایک جھٹکے سے علیحدہ کرنا چاہا تو میرا سر زور سے تو کو لگا۔ غصے میں آکر تو نے بار بار مجھے جلانا شروع کر دیا۔ اس نے میری چھاتیوں کی نوکیں بھی جلانا شروع کر دیں۔ درد نے مجھے اتنا بے حس کر دیا کہ میرا تڑپنا اور کانپنا کچھ کم ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سارے افسر اور پیراز چلے گئے۔ صرف تو اور اس کے چند مددگار رہ گئے جو وقتاً فوقتاً میری انگلیوں کو اپنے بھاری بوٹوں تلے کچلتے اور مجھے مارتے ہے، جیسے وہ اپنی قوت کا احساس دلانا چاہتے ہوں۔

میں بہت مشکل سے آنکھیں کھول کر انھیں دیکھتا رہا تاکہ ان کے غیر متوقع حربوں سے بچ سکوں۔ اس وقت میں نے بہت کوشش کی کہ اپنے ٹخنوں میں چبھتے ہوئے زخموں اور چکراتے ہوئے الٹے سر کی بجائے کچھ اور سوچوں۔ کچھ دیر بعد شا غصے میں بھرا ہوا تیزی سے میرے پاس آیا اور وہی سوال کیا جو وہ سب کئی بار کر چکے تھے۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا، مگر کچھ نہ بولا۔ پھر اس نے تو سے کہا کہ کھول دو۔ تو میرے ٹخنوں سے بندھی ہوئی رسّی کھول رہا تھا۔ ایک اور آدمی ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچ رہا تھا۔ رسّی کھل گئی اور میں سر کے بل سیمنٹ کے فرش پر چت گر پڑا۔ میں نے بہت مشکل سے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میری ایڑیاں کٹ گئی ہوں۔ میری ٹانگیں تھر تھر

کانپ رہی تھیں۔ بہت مشکل سے میں نے بنیان اور پتلون پہنی اور گرتا پڑتا ان کے پیچھے پیچھے سیڑھیوں تک پہنچا۔ یہاں ایک اور پیرا آیا۔ اس نے مجھے دیوار کے پاس لاکر دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھا لیا۔ میں سردی اور تھکن سے کانپ رہا تھا۔ میرے دانت کڑکڑا رہے تھے۔ تو کا ساتھی جس نے باورچی خانے میں میری مرمت کی تھی۔ آیا اور بولا "چھوڑ دو" پیرا نے ایک دم وہیں چھوڑ دیا اور میں ٹھوکریں کھاتا اور دھکا ہوا زمین پر گر پڑا۔ "دیکھتے نہیں، بے چارہ بالکل بے ہوش ہو رہا ہے" کسی نے پیچھے سے فرانسیسی لہجے میں کہا۔ "اسے اب تو چھوڑ دو" یہ پہلی انسانی آواز تھی جو میں نے اس جہنم میں سُنی۔ تو کا سا تھی بڑی نفرت سے بولا "ہونہہ اس جیسے ذلیل چوہے کے ساتھ کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھنی چاہیئے" پھر مجھے ہتھکڑیاں لگا کر ایک کوٹھڑی میں پھینک دیا گیا۔ میں بڑی مشکل سے گھسٹتا ہوا چٹائی تک پہنچا، تاکہ پیٹ کے بل لیٹ سکوں، مگر چٹائی کے نیچے نوکیلے تاروں کا جال سا بچھا ہوا تھا، اور یہ کام بھی اسی آدمی کا تھا، کیونکہ وہ کوٹھڑی کے پاس کھڑا بڑے فخر سے یہ بات کسی کو بتا رہا تھا، اور پھر کسی نے کہا۔ "کچھ بھی ہو، اس نے آج کی رات اپنے ساتھیو کو بھاگنے کا موقع دیدیا ہے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہے۔" ہتھکڑیاں میرے گوشت میں گھسی جا رہی تھیں اور میرے ہاتھوں کو اس طرح جوڑ کر باندھا گیا تھا کہ وہ کندھوں تک مڑ گئے تھے۔ میں نے اپنی انگلیوں کے پورے سیمنٹ کی کھردری دیوار سے رگڑے تاکہ جما ہوا خون نکل جائے اور سوجے ہوئے ہاتھوں کو کچھ آرام مل سکے، مگر بے سُود۔ اس وقت قید خانے میں خاموشی تھی۔ میں نے سوچا آنے والی صبح کی اذیتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مجھے بھی تھوڑا سا آرام کر لینا چاہیئے۔ میں نے سونے کی بہت

کوشش کی، لیکن میرے جسم کا بند بند دکھ رہا تھا اور میں متواتر کانپ رہا تھا۔ میں نے کتنی بار پاؤں سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ آخر کوئی شخص آیا اور کرخت لہجے میں بولا:
کیا بات ہے!"

صبح کو وہی پیرا مجھے لینے آیا جس نے میرے لئے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ اس نے مجھے سیڑھیاں چڑھنے میں مدد دی عمارت کے اس حصے سے، جہاں وہ مجھے لے گیا، چیلیا بار کا ایک رخ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اندازہ کیا کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں سے الجزائر کے ہائی کورٹ کے جج علی بومینجیل کو دھکا دے کر مار ڈالا گیا اور بعد کو مشہور کر دیا گیا کہ اس نے بالکنی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔ سیڑھیاں اترنے کے بعد مجھے ایک تہہ خانے کی طرح کے تنگ و تاریک کمرے میں بند کر دیا۔ یہاں صرف ایک چھوٹی سی دراز سے کچھ ہوا اور روشنی آ رہی تھی۔ ابھی میں بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ ایرے آیا اور مجھے لے کر اپنے میجر کے پاس گیا جو دبلا پتلا بیمار سا آدمی تھا۔ میجر نے مجھے صرف اتنا کہا کہ تم جرنلسٹ ہو، تمہیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہمارا مقصد با خبر رہنا ہے۔

ابھی میں دوبارہ اس کوٹھڑی میں پہنچا ہی تھا کہ شاآ اور ایک پیرا میگنٹو لئے آ پہنچے۔ شاآ نے میرے منہ میں ٹھونسنے کے لئے ایک گندہ تولیہ نکالا جس پر ایرے نے کہا کہ ہم زمین سے تین منزلیں نیچے ہیں، اس لئے فرق نہیں پڑتا، چاہے یہ کتنا شور مچائے۔ میگنٹو لگا کر کبھی وہ اس کی گھنڈی وہ آخری درجے پر کر دیتے اور کبھی ایک دم نچلے درجے پر۔ انھوں نے مجھے باندھا بھی نہ تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اب مجھ میں تکلیف کا اتنا احساس نہیں رہا۔ میری چیخوں میں بھی کمی آ گئی تھی۔ قریب ہی کسی کمرے میں لاؤڈ اسپیکر پر ریکارڈ سنائی دے رہے تھے۔ میں شدت

تکلیف سے کبھی دائیں گرتا کبھی بائیں۔ یہ دیکھ کر شاآ نے ایک کلپ میرے چہرے پر لگا دیا جس سے جھٹکوں کی شدت اور بھی بڑھ گئی۔ کچھ دیر کے لئے یہ سلسلہ روک دیا گیا اور تاریں اسی طرح بے ہوش میرے گوشت کے ساتھ لٹکتی چھوڑ کر وہ چلے گئے اور میں بے ہوش ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد جب مجھے ہوش آیا تو محسوس ہوا جیسے ابھی ایک ساعت بھی نہیں گزری۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ کتنا وقت گزر گیا۔ اتنے میں آیر پھر آگیا اور پھر جھٹکے پہنچانا شروع کر دئے۔ میری خاموشی اور ضبط انھیں اور بھی پاگل بنائے دے رہے تھے۔ آیر کے دماغ میں ایک نئی ترکیب آئی۔ اس نے مجھے کھولنے کا حکم دیا۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ اس پر اس نے میری ناک بند کر دی اور مجھے سانس لینے کے لئے منہ کھولنا پڑا۔ آیر نے بجلی کا ننگا تار میرے حلق سے آگے تک ڈال دیا۔ اب شاآ کے ہاتھ میں میگنٹو تھا۔ میرا حلق، جبڑے، حتیٰ کہ چہرے کے تمام پٹھے اور رگیں اکڑ کر چوڑہ ہو گئیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میری آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہوں۔ رنگ رنگ کے خاکے اور ہیولے رقص کرتے نظر آنے لگے۔ ننگا تار میرے تالو کے ساتھ چپٹ گیا۔ یہ اذیت کی انتہا تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس سے زیادہ وہ کیا دکھ دے سکتے ہیں۔ مگر آیر مطمئن نہ تھا۔ اس نے شاآ سے میگنٹو لے کر بالکل ہلکا کر دیا۔ اس سے میرے دماغ کو بہت سکون ملا۔ بھینچے ہوئے جبڑے تار سے الگ ہو گئے۔ پھر ایکدم گھنڈی آخری درجے پر کر دی جس سے میری بُری حالت ہوگئی اور میں دیوانہ وار اپنا سر زمین پر پٹخنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ رک گئے۔ میرا چہرہ آپ ہی آپ جل رہا تھا۔ جب میں اپنے سامنے کھڑے تین ہیولوں کو پہچاننے کے قابل ہوا تو شاآ کو کہتے سُنا۔ "پھر کیا ارادہ ہے تمھارا؟" میں خاموش رہا۔ آیر نے غضبناک ہو کر میرے منہ پر پوری طاقت سے ایک تھپڑ لگایا۔ شاآ کے دماغ میں کوئی خطرناک بات آگئی تھی کیونکہ وہ خلافِ معمول بہت نرمی سے بولا۔ "اب ہمیں تمھاری بیوی کو بلانا پڑے گا۔ تمھارا کیا خیال ہے وہ یہ سب کچھ برداشت کرے گی؟"

آیر کو جیسے شہ مل گئی۔ وہ مجھ پر جھک کر طنزیہ لہجے میں بولا: "تم سمجھتے ہو کہ تمھارے بچے فرانس میں محفوظ ہیں۔ ہم جس وقت چاہیں انھیں یہاں بلا سکتے ہیں۔" یہ سن کر میرا جسم سُن ہوگیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ میری بیوی گلبرٹ کو بھی یہ اذیتیں پہنچا سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ دوسری کئی الجزائری خواتین کے ساتھ شرمناک سلوک کر چکے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے مادام طوری (مشہور و مقبول الجزائری اداکارہ) کو بھی ان کے شوہر کے سامنے بے حرمت کیا اور طرح طرح کی ناقابلِ بیان تکلیفیں پہنچائیں تاکہ وہ اعتراف پر مجبور ہو جائیں۔ ان کے اس نئے حربے سے میں اگرچہ بے حد خوف زدہ ہوگیا۔ مگر میں نے اپنا فیصلہ بالکل نہ بدلا۔ تھوڑی دیر بعد وہ مجھے تنہا چھوڑ کر چلے گئے، مگر میرا دماغی سکون بھی ساتھ لے گئے۔ یہ خیال مجھے پاگل بنائے جا رہا تھا کہ گلبرٹ کو بھی برہنہ اس تختے پر باندھ کر وہی عذاب انگیز اور شرمناک اذیتیں پہنچائیں گے جو مجھ پر ڈھائی جا چکی ہیں۔

تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مجھے دو تین بار اور اذیت پہنچائی گئی۔ ایک دفعہ شاآ پارٹی کے لیڈر کی تصویر لے کر آیا، جو آج کل روپوش ہیں اور مجھ سے پوچھنے لگا "گرفتار ہونے سے پہلے کی رات تم نے کہاں گزاری؟ اور یہ شخص کہاں روپوش ہے؟" لفٹیننٹ شاآ اور آیر دونوں جلدی

میں تھے کیونکہ وہ سوٹ پہن کر کہیں جانے کو تیار ہو کر آئے تھے اور مہذب قسم کے شہری لگ رہے تھے۔ میرا گلا خشک ہو گیا تھا جسے صاف کرنے کے لئے میں تھوڑا سا کھنکھارا۔ شاآ ناک منہ چڑھا کر بولا: "مجھے اس قسم کی غیر مہذبانہ حرکت پسند نہیں۔" اس کو اپنے کپڑے خراب ہونے کا بھی اندیشہ تھا اس لئے جلدی سے چلا گیا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ ایک اور دن بھی گذر گیا۔ اب تک تو محبِ وطن مسلمان مجاہدین بھاگنے میں کامیاب ہو گئے ہوں گے۔ اس خیال سے میرے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے ان وحشیوں پر اپنے مقصد کے لئے فتح پا ہی لی تھی۔ اتنی تکلیف کے باوجود میں سینہ تان کر دراز میں سے آتی ہوئی روشنی کی ننھی سی کرن کو پُر امید نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ دروازہ کھول کر انھوں نے کسی کو میرے اوپر پھینک دیا اور دروازہ بند کر کے چلے گئے۔ یہ ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا ایک نوجوان عرب لڑکا تھا۔ اس نے کپڑے بھی بہت اچھے پہنے ہوئے تھے۔ اس نے میری اذیت ناک حالت اور کپکپی کو محسوس کر کے اپنے نرم اور شفیق ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ کر بڑی محبت سے مجھے ہلنے سے روکنے کی کوشش کی جس سے میرے دُکھتے ہوئے سر اور کندھوں کو بہت آرام ملا۔ اس نے مجھے ٹانگیں پھیلانے اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھنے میں مدد دی اور اپنی شفقت آمیز شیریں آواز میں بولا: "بھائی آپ لیٹ جائیے نا۔" میں نے جلدی جلدی اس سے اپنا تعارف کرایا، اور اس سے کہا کہ اگر باہر جا سکو تو سب کو بتا دینا کہ مجھے یہاں مار ڈالا گیا ہے۔" ابھی میں اور بہت کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دروازہ کھلا اور وہ عرب لڑکے کو گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ میں نے کسی کو غصے

میں یہ کہتے ہوئے سُنا کہ تم نے اسے اس کے ساتھ کیوں بند کر دیا تھا۔ کچھ لمحے بعد دروازہ کھلا اور دو پہرے دار میرے جسم پر ٹارچ ڈال کر کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔ میں ان کی شکلیں نہ دیکھ سکا تاہم بھونکنے والے عذاب کے لئے تیار ہو گیا۔ لیکن انھوں نے مجھے چھوا تک نہیں۔ ایک جوان آواز نے کہا: "اف کتنی دردناک حالت ہے۔" دوسرا جیسے کچھ سوچتا ہوا گمبھیر آواز میں بولا: "ہاں ـــ انتہا ہے!" اور وہ دونوں چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد پھر آیر آیا۔ کبھی ٹارچ سے میری چھاتی کے بال جلاتا، کبھی ٹھوکریں مارتا، لیکن میں ہر قسم کے احساسات سے عاری بغیر پلک جھپکے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے خوفی سے اُسے دیکھتا رہا۔ میرا گلا، زبان اور جبڑے لکڑی کی طرح سخت اور کھردرے ہو گئے تھے۔ آیر پانی سے بھرا ہوا گلاس میری آنکھوں کے بالکل قریب لا کر بولا: "دو تین دن سے تمھیں پانی نہیں ملا۔ فکر نہ کرو کوئی چار دنوں میں جب تمھیں اپنا پیشاب بھی پینے کو نہ ملے گا تو پھر اطمینان سے مر جاؤ گے۔" اس نے پانی کا گلاس میرے سوکھے ہوئے خشک ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں نے اپنے ہونٹ تر کرنے کی ناکام کوشش کی جس پر آیر بے ہنگم قہقہے لگاتا ہوا بولا: "سب لڑکوں کو بلا لاؤ تاکہ وہ بھی یہ تماشا دیکھ لیں۔" اپنی کمزوری پر قابو پا کر میں نے اپنی نظریں پانی سے الگ کر لیں کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری تکلیف اور بے قراری ان کی تفریح کا سامان بنے۔ اس نے میری لاپروائی دیکھ کر ایک ہاتھ سے میری ناک پکڑ کر پانی میرے حلق میں انڈیل دیا۔ وہ پانی گندگی سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ منٹوں یا گھنٹوں کے بعد کیپٹن ڈی آیا۔ اس نے

یہ عذاب رکوایا اور میرے پاس ڈبے پر بیٹھ کر بہت نرمی سے باتیں کرتا رہا۔ وہ جن چیزوں کے متعلق باتیں کر رہا تھا ان کا تعلق بظاہر ان سوالوں سے نہ تھا جن کو سن کر میرے کان پک گئے تھے۔ لیکن جب اس نے چالاکی سے کہا۔ "اچھا تو آدین تمہارا بہت گہرا دوست ہے" تو میرے کان کھڑے ہوئے اور میں سمجھ گیا کہ یہ آہستہ آہستہ مجھ سے سب کچھ اگلوانا چاہتا ہے۔ میرے دماغ میں یہ ایک ہی خیال تھا کہ چاہے یہ مجھے مار ڈالیں مگر میں زبان تک نہ کھولوں گا۔ اس پر وہ بھی غصے میں آگیا اور پھر مکّے تھپڑ مارنا شروع کر دیئے تھوڑی دیر بعد ڈیٹی بھی تھک کر چلا گیا۔ اب آیر نے میگنٹو کا چارج سنبھالا۔ تمام وقت ایک "پیرا" کونے میں ریوالور لئے بیٹھا رہا جیسے کسی حکم کا انتظار کر رہا ہو۔ آیر کے پاس ہی زمین پر ایک عجیب سا اوزار پڑا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اب شاید میری انگلیوں کے ناخن الگ کرلئے جائیں گے۔ مجھے خود بہت حیرت ہوئی جبکہ میں نے دل میں ذرا سا خوف بھی محسوس نہ کیا، بلکہ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ میرے ہاتھوں میں صرف دس ناخن ہی تو ہیں، سو الگ کرلیں۔ جب وہ چلے گئے تو میں رینگتا ہوا اس اوزار تک پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ وہ تو لکڑی کی ایک نلکی سی تھی۔

ایک دن دروازہ کھلا اور تو دو اجنبی افسروں کے ساتھ داخل ہوا۔ ان میں سے ایک نے میرا اعتماد حاصل کرنے کے لئے دونوں ہاتھوں سے میرے شانے تھپتھپاتے ہوئے کہا "میں جنرل ایم۔ کا اڈی کانگ لفٹیننٹ ما ہوں۔ تمھیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ تم صرف چھتیس سال کے ہو اور یہ مرنے کی عمر نہیں۔" پھر وہ سب کو کوٹھڑی سے نکال کر انتہائی رازدارانہ انداز میں بولا: "اگر تم اس لئے نہیں بتاتے کہ تمھارے دوستوں کو پتہ چل جائے گا، تو فکر نہ کرو۔ ہم تمھاری حفاظت کریں گے۔ تم جو کچھ بھی ان کے متعلق جانتے ہو، مجھے بتا دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایک ہفتے کے اندر اندر تمھیں آرام سے تمھاری بیوی کے پاس فرانس پہنچا دیا جائے گا۔ اور نہیں بتاؤگے تو صورتِ حال بالکل مختلف ہوگی۔" وہ کہتا چلا گیا۔

"تم اپنے بیوی بچوں کو کیوں تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ دیکھو اگر تم نہیں بولو گے تو میں چلا جاؤں گا۔ مگر دوسرے لوگ آئیں گے اور وہ کیا کریں گے، یہ تم خود جانتے ہو۔" میں خاموش رہا۔ آخر وہ جانے لگا۔ اس کے چہرے پر تاسف تھا۔ جانے سے پہلے وہ ذرا رکا اور آہستہ سے بولا۔ "تم اپنے آپ کو ختم کرلو، اسی میں تمھاری بہتری ہے اور یہی تمھاری نجات کا واحد طریقہ ہے۔"

میں نے باہر سے اس کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ کوئی طاقت بھی اسے بولنے پر مجبور نہیں کرسکتی۔ یہ سب ایسے ہی فضول میں مرجانا پسند کریں گے مگر اپنے ساتھیوں کے متعلق ایک لفظ نہ کہیں گے۔

میں نے محسوس کیا کہ میں صبر آزما آزمائشوں کی آخری حد تک آپہنچا ہوں۔

اب مجھے ایک ایسی کوٹھڑی میں لے جایا گیا جو ایک ادھورا غسل خانہ تھی۔ ایک پیرا نے میرے ہاتھ پکڑے اور دوسرے نے گھٹنے، اور مجھے چٹائی پر لٹا دیا۔ اب ان میں بحث ہو رہی تھی کہ مجھے ہتھکڑیاں لگائی جائیں یا نہیں۔ ایک کا کہنا تھا کہ میں اتنا کمزور ہوں کہ ہل بھی نہیں سکتا۔ پھر ہتھکڑیاں لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر دوسرا کہہ رہا تھا کہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہئے۔ آخرکار انھوں نے ہتھکڑیاں لگا تو دیں مگر ہاتھ پشت پر کرکے

نہیں، بلکہ سامنے کی طرف، جس سے مجھے خاص طور پر سکون ملا۔ ان کے جانے کے بعد ایک نوجوان فرانسیسی پیرا آیا۔ اس نے ایک کمبل میرے گرد اچھی طرح لپیٹ دیا۔ تھوڑا سا پانی پلایا، گو مجھ میں پیاس کا احساس ختم ہو چکا تھا۔ وہ بہت مخلصانہ لہجے میں مجھ سے باتیں کرتا رہا کہ مجھ میں بڑی ہمت ہے جو اتنے عذاب سہہ کر بھی اپنے دوستوں کی خاطر نہ بولنے کا عہد قائم رکھا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا، آج کیا دن ہے۔ اس نے بتایا کہ جمعہ کی رات۔ مجھے یاد آیا۔ انھوں نے مجھے بدھ کے دن سے عذاب دینے شروع کئے تھے۔ باہر سے شور و غل کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک دم مجھے ساتھ والے کمرے سے کسی عورت کے بُری طرح رونے اور چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ میرا دل ڈوب گیا، کیونکہ وہ گلبرٹ کی آواز تھی۔ کئی دنوں کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ میری غلط فہمی تھی۔ اس تمام رات اور صبح تک چیخوں، گالیوں اور مار پیٹ کی آوازیں سنتا رہا۔ بعد میں روزانہ ایسی آوازیں سُن سُن کر مجھے احساس ہوا کہ یہاں کا معمول ہے بلکہ یہ درندے تو عام گفتگو اور شور میں امتیاز ہی نہیں کر سکتے۔

میں سویا نہیں مگر سورج نکلنے کے بعد کافی دیر تک اونگھتا رہا اور اس وقت ہوش میں آیا جب ایک پیرا میرے لئے گرم سوپ لے کر آیا۔ بدھ سے اب تک یہ پہلی چیز تھی، جو مجھے کھانے کو ملی، مگر میں چند چمچے بھی مشکل سے کھا سکا، کیونکہ میری زبان اور منہ جلا ہوا تھا۔ میرے جسم کے دوسرے زخم بھی ناسور بن گئے تھے۔ اور جب ایک پیرا نے میری ہتھکڑیاں اتار دیں تو مجھے معلوم ہوا کہ میرا الٹا بازو مفلوج ہو چکا ہے اور سیدھے ہاتھ کے کندھے میں اتنی تکلیف تھی کہ میں وہ ہاتھ ہلا بھی نہ سکتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک مسکراتا ہوا مجھے اطلاع دے گیا کہ میں کچھ "سائنٹیفک علاج" کے لئے تیار ہو جاؤں۔ اس کے جانے کے بعد اس کا ایک ساتھی ادھ کھلے دروازے میں سے منہ نکال کر طنزیہ لہجے میں بولا۔ "راضی باضی؟" "ہاں بالکل، میں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔" "تھوڑی دیر میں تم اپنے طریقے بھی آزما سکتے ہو۔"

پیر کے دن مجھے سیڑھیوں سے نیچے ہسپتال میں لے گئے۔ یہ ایک لمبے سے کمرے پر مشتمل تھا۔ جس میں بے شمار کھڑکیاں اور لاتعداد پلنگ پڑے ہوئے تھے۔ وہاں ایک نوجوان دُبلا پتلا فوجی ڈاکٹر موجود تھا۔ اس کے چہرے کی کھال بُری طرح سے شیو کرنے کی وجہ سے زخمی ہو رہی تھی۔ جونہی ہم داخل ہوئے وہ آگے بڑھ کر مجھ سے کہنے لگا۔ "تم ڈر تو نہیں رہے؟" "بالکل نہیں؟" میں نے جواب دیا۔ "فکر نہ کرو، میں تمھیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاؤں گا؟" اس نے دوبارہ یقین دلایا۔

انھوں نے مجھے ایک بستر پر لٹا دیا۔ ڈاکٹر مجھ پر جھک کر میری نبض دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ کچھ سراسیمہ ہے۔" یہ سُن کر میں اور گھبرا گیا کیونکہ وہ میرے احساسات کو سمجھ گیا تھا۔ اب وہ لوگ مجھ پر TROTH DRUGS کا استعمال کرنے والے تھے۔ میں اپنے آپ کو پوری کوشش سے سمجھانے لگا کہ اگر انسان میں قوتِ ارادی ہو تو اسے کوئی طاقت بھی اپنی مرضی کے خلاف بولنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ میں بار بار یہی بات دل میں دوہرا رہا تھا کہ وہ کسی صورت میں بھی مجھے شکست نہیں دے سکتے۔ آخر میں نے اپنے عقیدے اور اپنے ساتھیوں کے لئے اتنے عذاب سہے ہیں۔ اب بھی میں ان دواؤں کے مقابلے میں مضبوطی سے قائم رہوں گا۔ "ہیں میڈیکل اسسٹنٹ

کے لئے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا، جب وہ واپس آیا تو یوں لگتا تھا جیسے کسی تو بی ڈیوٹی یا گشت سے آیا ہے، کیونکہ اس نے فوجی وردی پہنی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کی بات سننے سے پہلے ہی شین گن کندھے سے اتارتے ہوئے بولا، "شروع ہی پانچ سینٹی میٹر کیوب دینا کیونکہ کچھ لوگ بہت مضبوط ہوتے ہیں۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا اور تہیہ کر لیا کہ میں یہی ظاہر کروں گا کہ مجھ میں مزاحمت کی طاقت نہیں ہے ورنہ زیادہ مقدار میں دوا دیں گے۔ میں سخت بے چین تھا اور سردی سے کانپ رہا تھا۔ میری قمیض شاید کسی کو پسند آگئی تھی۔ اس لئے میں کمر تک ننگا تھا۔ میرے اوپر کمبل ڈال دیا گیا۔ میڈیکل اسسٹنٹ نے میرے سیدھے ہاتھ کی رگ کو ربڑ کی نلکی سے باندھ دیا اور اس میں سوئی گھسیڑ دی۔ کمبل کے نیچے اپنے دوسرے اکڑے ہوئے بے حس ہاتھ کو میں نے پتلون کی جیب میں ڈال کر اپنے جسم کے ساتھ مضبوطی سے لگا لیا، کیونکہ میرا خیال تھا کہ جب تک مجھے اپنے جسم کا احساس رہے گا میں بے ہوش نہیں ہو سکوں گا اور مزاحمت کے لئے تیار رہوں گا۔ اسسٹنٹ نے آہستہ سے سرنج دبائی اور دوا آہستہ آہستہ میری شہ رگ کے خون میں قطرہ قطرہ داخل ہونے لگی۔ "شروع کر دو۔" ڈاکٹر نے اس سے کہا، پھر مجھ سے کہا۔ "آہستہ آہستہ گنو۔"

ایک دو تین ۔۔۔ میں نے دس تک گنتی گنی۔ پھر میں ایک دم رک گیا، جیسے میں سو گیا ہوں۔ میرا ذہن ہوشیار تھا اور میں بے ہوش سا ہو گیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر کے کہنے سے میں آگے گننے لگا۔ چودہ، پندرہ، سولہ۔ دو تین ہندسے میں نے جان بوجھ کر چھوڑ دیئے۔ انیس، بیس، اکیس۔" اور میں خاموش ہو گیا۔ ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا۔ "اب دوسرا ہاتھ لاؤ۔" میں نے کمبل کے نیچے سے اپنا سیدھا ہاتھ اپنی جیب میں ڈال کر ناخن ہتھیلی میں گاڑ لئے۔ تاکہ میں غافل نہ ہو جاؤں۔ لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود مجھے نیند آگئی۔ ڈاکٹر نے آہستہ سے میرے گال تھپتھپائے اور بہت دھیمی آواز سے دوستانہ لہجے میں بولا "ہنری، ہنری میں مارسل ہوں، تم اچھے تو ہو؟" میں نے بہت مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ پردے ڈال کر کمرے میں اندھیرا کر دیا گیا۔ میرے اردگرد بستروں پر افسر اور سپاہی خاموش بیٹھے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر کے ہاتھ میں ایک کاغذ ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اس میں وہ سب سوال لکھے ہوئے ہیں جو مجھ سے پوچھنا چاہتا ہے۔ میں ایک دم چوکنا ہو گیا اور کسی حد تک اپنے آپ کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ کچھ اس طرح مجھ سے باتیں کرنے لگا جیسے کوئی بے تکلف دوست اپنے بہت پرانے اور گہرے دوست سے باتیں کرتا ہے۔ "ہنری! تم کتنے عرصے سے اخبار میں کام کر رہے ہو؟" یہ بے ضرر سا سوال دوستانہ فضا پیدا کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔ میں نے خود کو ایک اخبار شائع کرنے کی مشکلات بیان کرتے سنا۔ پھر میں اسے بتانے لگا کہ صفحات کیسے تیار کئے جاتے ہیں۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں نشے میں ہوں اور میں نہیں بلکہ میرے اندر سے کوئی بول رہا ہے۔ تاہم مجھ میں ابھی اتنا ہوش تھا کہ یہ یاد رکھوں کہ میں اپنے بدترین دشمنوں کے چنگل میں ہوں اور وہ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں اپنے دوستوں کو مصیبت میں ڈال دوں۔ ڈاکٹر اپنے اسسٹنٹ سے سرگوشی میں بولا، تجربہ کامیاب ہو رہا ہے۔"

"ہنری مجھے تمہارے پاس اس لئے بھیجا گیا ہے کہ میں الیکس سے ملاقات کر سکوں۔" اس کے دوستانہ لہجے میں وہی سوال چھپا ہوا تھا جو مجھ سے بیسیوں بار عذاب دے دے کر پوچھا جا چکا تھا۔ میرا سر چکرانے لگا اور نیم بیہوشی

کی حالت میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں کبھی کسی گلی سے گزر رہا ہوں اور کبھی ایک کمرے میں ہوں، مگر مارشل ہر وقت میرے ساتھ ہے اور مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں اس کے سوال کا جواب دوں۔ میں نے دو بار بہت دقت سے آنکھیں کھولیں اور اس حد تک اپنے پر قابو پایا کہ دوبارہ بے ہوش نہ ہو جاؤں۔ "ایکس کہاں ہے ہنری؟" ڈاکٹر نے مجھے ہلا کر پوچھا۔

"حیرت ہے کہ اس سے ملنے کے لئے تمھیں میرے پاس بھیجا گیا ہے۔ حالانکہ مجھے بھی کوئی علم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ میری زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"جب وہ تم سے ملنا چاہتا ہے تو کیا کرتا ہے؟"

"اسے مجھ سے ملنے کی کیا ضرورت ہے، جبکہ میرا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے، مگر وہ تم سے ملنا چاہے تو کیا کرے گا؟" ڈاکٹر نے وہی بات دوہرائی۔

"آسان سی بات ہے وہ مجھے خط لکھ دے گا۔ اگرچہ مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اسے مجھ سے ملنے کی کوئی ضرورت ہو۔"

پھر مارشل نے مجھے اپنا پتہ بتاتے ہوئے کہا کہ تم بھی مجھے اپنا پتہ دے دو تاکہ وہ میرے ذریعے ایکس تک کوئی پیغام پہنچانا چاہے تو آسانی رہے۔ میں بہت تھک چکا تھا، اس لئے بہت بد اخلاقی سے بولا: "تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔ خدا حافظ۔ ان کو پتہ چل گیا کہ اب میں کسی صورت بھی زبان نہ کھولوں گا۔"

میری مرہم پٹی کر کے پرانی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ لیکن اب اس کوٹھڑی کی صفائی کی گئی تھی اور اس میں ایک لیمپ، بیڈ اور چٹائی تھی۔ دائیں طرف کی الماری کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے اندر ایک تار کا گچھا پڑا تھا۔ لیمپ بیڈ کے بالکل اوپر ایک کنڈا لگا ہوا تھا۔ مجھے ایک دم لفٹیننٹ شا کے الفاظ یاد آگئے جو اس نے جاتے ہوئے کہے تھے کہ تم اپنے آپ کو ختم کر لو۔ اسی میں تمھاری بہتری ہے اور یہی تمھاری نجات کا واحد طریقہ ہے۔ میں نے اپنے دل میں سوچا، آخر اتنے عذاب سہ کر بھی میں نے ہار نہیں کھائی تو اب خودکشی کر کے ان کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ میں آخر دم تک اس کا مقابلہ کروں گا۔

اب مجھے جس عمارت میں منتقل کیا گیا وہاں ایک کوٹھڑی میں پندرہ بیس مسلمان الجزائری قید کئے ہوئے تھے۔ یہاں مجھ پر کسی قسم کا ظلم نہیں کیا گیا۔ لیکن میں اپنی کوٹھڑی میں قفل کے سوراخ سے دوسرے مجاہدین پر ظلم ہوتے دیکھتا اور پتلی دیواروں کے سبب ان کی دردناک چیخیں سنتا۔ ایک رات میں نے اوپر کی منزل میں ایک بوڑھے مسلمان پر مظالم کا پہاڑ ٹوٹتے سنا۔ اذیت دینے والا چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "اپنی نماز مجھے ادا کر دو۔" دردناک چیخوں کے درمیان وہ بوڑھا فخر بھرے لہجے میں کہتا۔ "زندہ باد فرانس، زندہ باد فرانس۔" اس کے جواب کے ساتھ ساتھ عذاب کے فرشتوں کے قہقہے عمارت میں گونجتے رہے۔ ہر صبح یا شام جب میرا دروازہ آدھا کھل جاتا یا مجھے غسل خانے میں لے جایا جاتا تو بہت سے عرب قیدیوں کو دیکھتا جو مجھے دیکھ کر پہچان لیتے، کیونکہ ان میں سے اکثر نے مجھے اخبار کے جلسے یا کسی سیاسی اجتماع کے موقع پر دیکھا تھا۔ میں ہمیشہ کمر تک ننگا ہوتا۔ میرے پورے جسم پر چوٹوں کے نشان تھے اور سینہ اور ہاتھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ مجھے دیکھ کر اپنی اذیتوں کا خیال کرتے اور مجھے

تسلی دینے کے لئے پکار کر کہتے "یا اخی! حوصلہ رکھو" میں ان کی نظر میں اعتماد، دوستی اور اخوت کا علمبردار تھا۔ اور وہ جانتے تھے کہ میں ان ہی میں سے ایک ہونے پر فخر محسوس کرتا ہوں اور خاص طور پر اس وجہ سے کہ میں یورپ کا باشندہ ہوں۔

ایک ماہ وہیں رہنے کے بعد شا آیا اور بولا "تیار ہو جاؤ، ہم کہیں جا رہے ہیں۔" میں نے اپنا پھٹا ہوا میلا بنیان پہنے ہوئے اسے برآمدے میں کسی سے کہتے ہوئے سُنا کہ "آدن اور ہوجاج کو بھی باہر لے آؤ۔" میں نے اپنے آپ کو زندگی کے ان آخری لمحوں کے لئے تیار کر لیا مگر میں اس بات پر مطمئن تھا کہ میں اپنے ساتھیوں کے لئے سربلند مروں گا۔ پھر میں نے گولیوں کی طویل کڑک سُنی "آدن ـــ!" میں نے دل میں سوچا، اس دن مجھے کوئی لینے نہ آیا۔

میری داستان تمام ہوئی، مجھے عمر بھر اتنی مشکل چیز لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ جب میں یہ سوچتا ہوں کہ میں جس ڈراؤنے خواب کو پیچھے چھوڑ آیا ہوں، اس میں میرے کتنے ساتھی رہ گئے ہیں تو میرے ذہن میں سب واقعات تازہ ہو جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں ان تمام حریت پسند مجاہدین کا پیامی ہوں جو وطن کی آزادی کے لئے تذلیل برداشت کر رہے ہیں، اور یہ ان کی طرف سے مجھ پر فرض عاید ہوتا ہے کہ میں تمام دُنیا پر یہ خوفناک حقیقتیں آشکارا کر دوں۔

میں نے یہ تحریر پیرا شوٹ رجمنٹ چھوڑ دینے کے چار ماہ بعد الجزائر کے سول قید خانے کی کوٹھڑی نمبر ۲ میں مکمل کی ہے۔ چند روز ہوئے میں نے اس جیل کے صحن میں تین اور نوجوانوں کا خون ہوتے دیکھا۔ جب جلاد ان کو لینے گئے تو درد و کرب کی ایک صدا بلند ہوئی اور پھر بھیانک سکوت ہر طرف طاری ہو گیا۔ الجزائر کی رُوح پھڑپھڑائی اور اس کے آنسو اندھیرے میں چمکتے ہوئے میرے زنداں خانے کی سلاخوں پر ٹپک پڑے۔ پھانسی گھر کا دروازہ بند ہونے سے پہلے "زندہ باد الجزائر" کا نعرہ لگا جسے کوئی بند نہ کر سکا اور جب ان کو پھانسی پر چڑھایا جا رہا تھا تو زنانہ زنداں سے آزاد الجزائر کا ترانۂ ملی بلند ہوا۔

ہماری جدوجہد سے
مردانِ حُر کی صدائیں اُبھرتی ہیں۔
وہ آزادی کے طلبگار
ہمارے ملک کی خاطر
ہر شے جس سے مجھے پیار ہے تیرے لئے ہے
میری حیات تیرے لئے ہے
اے میرے وطن ـــ میرے وطن

میں یہ سب کچھ ان فرانسیسیوں سے کہنا چاہتا ہوں جو میری کتاب کا مطالعہ کریں گے۔ میں انھیں بتانا چاہتا ہوں کہ میرے الجزائری بھائی اپنے اذیت کوش ستمگروں کو ان عظیم فرانسیسی انسانوں کے ساتھ شامل نہیں کرتے جن سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا اور جن کے خلوص کو وہ عزیز رکھتے ہیں۔



قیدی

خان عبدالغفار خان کی آپ بیتی

جو ہندستان نے شاید فراموش کردی ہے

تصنیف: خان عبدالغفار خان
تلخیص: فیروز قریشی

خان عبدالغفار خان سے کون واقف نہیں، انھوں نے وطن کی آزادی کے لیے جو قربانیاں دیں اور جس طرح قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنی قید کی ایک سرگزشت بھی لکھی تھی ـــــ یہ اسی سرگزشت کی تلخیص ہے۔ بے حد دلچسپ اور بے حد سبق آموز ـــــ

سلامت علی مہدی

ایک دن میں چکی پیس رہا تھا اور بالٹی میں وہ ساگ پڑا ہوا تھا کہ جیل کے سپرنٹنڈنٹ صاحب آگئے۔ میں نے وہ ساگ دکھلا کر اُن سے کہا: "دیکھیے یہ دوپہر کو آیا تھا، میں نے اس کے آگے یہ ساگ رکھا تھا اور اس نے نہیں کھایا۔ یہ ساگ حیوان بھی نہیں کھاتے اسے آپ انسان کو دیتے ہیں۔"

یہ سپرنٹنڈنٹ، ڈاکٹر بھی تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا "یہ ساگ تو بہت اچھا ہے۔" اب میں اس بارے میں ان سے کیا کہتا۔ میں نے اس طرح کی دوسری بات چھیڑ دی۔ میں نے کہا "اچھا وہ سامنے کی چکی والا جو آدمی ہے ذرا اس کی بیڑیوں کو دیکھیے اور میری بیڑیاں بھی دیکھیے۔ وہ بھی بیس سیر گیہوں پیستا ہے اور میں بھی پیستا ہوں۔ وہ بھی چکی میں بند ہے اور میں بھی چکی میں بند ہوں۔ اس کا کیا جرم ہے اور میرا کیا جرم ہے؟ اور آپ کے اپنے دیش میں جو میری طرح کا قیدی ہوتا ہے اُس کے ساتھ کس قسم کا سلوک ہوتا ہے؟"

سپرنٹنڈنٹ نے مجھے کوئی جواب نہ دیا اور چلا گیا۔ دوسرے دن میری مشقت بدل دی۔ مجھے کارخانے بھیج دیا تاکہ لفافے بناؤں۔ ایک دن وہ سپرنٹنڈنٹ پھر اُدھر آئے۔ مجھ سے بولے "دو کچھ دن کے بعد مجھے اس چکی (کوٹھری) سے نکال دیں گے۔ اس کارخانے میں صوبہ سرحد کے تمام ضلعوں کے قیدی تھے بعض ایسے قیدی بھی تھے کہ وہ مشقت سے ڈرتے تھے۔ اور مشقت انھیں ایک بہت بڑی مصیبت نظر آتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ گنگارام کو رشوت دیتے تھے۔ میں نے انھیں اس کام سے منع کر دیا۔ اس سے گنگارام کی دوکان جب ٹھنڈی پڑ گئی تو وہ اس فکر میں مبتلا ہو گیا کہ مجھے کسی طرح اس جیل خانے سے منتقل کر دے میرے خلاف اُس نے سپرنٹنڈنٹ سے رپورٹ کر دی کہ میں جیل خانے میں اپنا پروپیگنڈہ کرتا ہوں اور ان کے لیے مشکلات پیدا کرتا ہوں اور اگر مجھے یہاں رکھا جائے گا تو وہ جیل خانے کا ڈسپلن قائم رکھنے سے معذور ہو جائے گا۔ اس طرح اُس نے میرے خلاف ایک مقدمہ سا بنا لیا۔

گنگارام کی رپورٹ کے سلسلے میں سپرنٹنڈنٹ صاحب ادھر آئے۔ انھوں نے مجھ سے چند استفسارات کیے اور انھیں معلوم ہو گیا کہ گنگارام جھوٹ بولتا ہے لیکن بیچ میں ڈسپلن کا سوال پیدا ہو گیا تھا۔ انگریز کے آگے اگر ڈسپلن کا نام لے لو تو پھر اس سے جو بھی کرانا چاہو کرا سکتے ہو۔ لہٰذا اسی ڈسپلن کی آڑ لے کر مجھے ڈیرہ غازی خاں کے جیل خانے میں منتقل کر دینے کے احکام جاری ہو گئے۔ میں نے دو مہینے پشاور کے جیل خانے میں گزارے تھے اور تقریباً دو ماہ ہی مجھے یہاں آئے ہوئے گزرے تھے۔ اسی عرصے میں میرا وزن پینتالیس پونڈ کم ہو گیا تھا۔ اور خراب خوراک کی وجہ سے میرے دانتوں کے مسوڑھے خراب ہو گئے تھے اور ان میں پائیریا کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔

ایک دن جیل خانے میں پولیس کی ایک موٹر آئی جس کے ارد گرد چاروں طرف پردے لگے ہوتے تھے۔ میرے پاؤں میں بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور گلے میں طوق پڑا تھا جیل کے تنگ اور چھوٹے لباس میں مجھے خود اپنی شکل عجیب نظر آتی تھی خدا

جائے۔ لوگوں کو میں کیا نظر آتا ہوں گا۔ غریب پردہ نشین خواتین کی مانند مجھے پردے کے اندر موٹر میں بٹھا دیا گیا اور دریا خاں پہنچا دیا گیا۔ ریل گاڑی ہمارے پہنچنے سے پہلے نکل گئی تھی، اس لئے رات کو اسٹیشن پر ہی ٹھہرنا پڑا۔ وہاں مجھے کسی کے نزدیک تک نہیں جانے دیا جاتا، اور نہ ہی کسی اور کو میرے پاس پھٹکنے دیا جاتا تھا۔ اور تو کیا میرے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں تک نہ کھولی گئیں۔

دوسرے دن جب گاڑی آئی تو مجھے زنانہ ڈبے میں بٹھایا گیا۔ راستے میں گاڑی جس اسٹیشن پر بھی پہنچتی مجھ پر اس قدر سخت پہرہ ہوتا کہ مجھے دیکھنے کے لئے کسی کو میرے قریب نہیں آنے دیا جاتا۔ بالآخر ہم غازی گھاٹ پہنچ گئے۔ وہاں مجھے لینے جو پولیس آئی ہوئی تھی اس کا افسر ہندو تھا۔ وہ میرے پاس آیا اور پٹھان گارڈ سے میرا چارج لے لیا۔ اس نے میری ہتھکڑی کھول دیں اور مجھ سے کہا کہ آیئے تھوڑا اسٹیشن پر گھوم پھر لیجئے۔ میں جب اس کے ساتھ ٹہل رہا تھا تو اس اثنا میں ہمارا وہ انچارج پولیس افسر آیا اور اس نے اس پولیس افسر سے کہا "ہائے ہائے یہ تم نے کیا کر رکھا ہے؟ مجھے تو تم نے غرق کر کے رکھ دیا ہے۔"

ہندو پولیس افسر نے جواب دیا "اب یہ میرے چارج میں ہیں اور ان کی ساری ذمہ داری میرے سر ہے۔ جاؤ تم فکر کس لئے کرتے ہو۔"

تھوڑی دیر کے بعد پولیس مجھے لے کر ڈیرہ غازی خاں کے لئے روانہ ہو گئی۔ دریا کے کنارے پہنچے۔ کشتی کے ذریعے جب ہم نے دریائے سندھ کو پار کر لیا تو یہاں تانگہ موجود تھا۔ اس میں ہم بیٹھ گئے اور ڈیرہ غازی خاں کے جیل خانے میں پہنچ گئے۔ میں جس وقت جیل خانے کے دروازے پر پہنچا اُس وقت وہاں عبدالرشید خاں جو کرنل عبدالمجید خاں کا لڑکا تھا، لالہ روپ چند انباری سے ملاقات کر رہا تھا، اور اُن کے ساتھ ان کے عزیز و اقارب آئے ہوئے تھے۔ پھر جب میں جیل خانے کے اندر چلا گیا تو انھوں نے مجھے کہا۔ ہم نے جب تمھیں پہلے پہل دیکھا تو ہمارا خیال تھا کہ یہ کوئی بہت بڑا راہزن، ڈاکو اور قاتل ہوگا جسے یہاں لے آئے ہیں۔ جیل خانے پہنچتے ہی میری بیڑیاں کاٹ دی گئیں۔ یہ ایک چھوٹا سا جیل خانہ تھا۔ اس میں پنجاب کے سیاسی قیدی تھے۔ ایک بارک میں سی کلاس کے قیدی تھے اور دوسری میں اسپیشل کلاس کے۔ ہمارے صوبے میں کوئی کلاس نہیں تھی۔ اس لئے مجھے سی کلاس کے قیدیوں میں رکھا گیا تھا۔

لیکن اس سی کلاس کی روٹی بہت اچھی تھی۔ جیل خانے کا سپرنٹنڈنٹ بہت اچھا آدمی تھا۔ وہ سیاسی قیدیوں کو گیہوں دیا کرتا تھا۔ وہ اسے خود صاف کیا کرتے تھے۔ اور خود ہی اس کا آٹا پیستے تھے پھر اپنے ہی ہاتھوں سے روٹی پکایا کرتے تھے۔ اور سالن بھی خود اپنے ہی ہاتھوں پکایا کرتے تھے۔

میرے لئے تو سب سے بڑی مصیبت وہ بیڑیاں تھیں جن سے کہ مجھے نجات مل گئی تھی۔ پھر سی کلاس کے سب قیدی سکھ اور ہندو تھے۔ یہ بہت پیارے اور خوش خلق لوگ تھے۔ میری تو بڑی آؤ بھگت کرتے تھے۔ اُن کی مشقت بان بٹنا تھی اور میں یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ سے کہہ دیا کہ مجھے اس کی بجائے کوئی اور کام دے دیا جائے۔ اسپیشل کلاس کے قیدیوں کو میرے بارے میں پتہ لگا تو انھوں نے بھی سپرنٹنڈنٹ کو میرے لئے زور دیا کہ مجھے ان کی بارک میں منتقل کر دیا جائے۔ سپرنٹنڈنٹ ایک بہت اچھا مسلمان تھا۔ اس نے ان ہی کی بارک میں بدل دیا اور مجھے چرخے کی مشقت لکھ دی۔ یہ مجھ پر خدا کا بےحد فضل و کرم تھا کہ مجھے ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے ڈیرہ غازی خاں کے جیل خانے میں منتقل کر دیا گیا۔ اگر مجھے وہیں رکھا جاتا تو مجھے یقین نہیں ہے کہ میں صحیح و سلامت رہ جاتا۔ وہاں مجھے ایسے شستہ و شائستہ ساتھیوں کی سوسائٹی کہاں ملتی تھی جس سے میں نے بڑا بھاری فائدہ اٹھایا اور سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ پنجاب

کے لوگوں سے میری جان پہچان ہوگئی اور اچھے تعلقات پیدا ہوگئے اس کے علاوہ ہم ایک دوسرے کے خیالات اور عقائد سے بھی واقف ہوگئے۔ اور جب یہ لوگ حالات سمجھ گئے تو انھوں نے اخبارات کے ذریعے میرے حق میں سرکار کے خلاف اس قدر زوردار احتجاج کیا کہ حکومت کچھ عرصے ہی کے بعد مجھے بھی اسپیشل کلاس میں رکھنے پر مجبور ہوگئی۔

ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں خراب خوراک کی وجہ سے میرے دانت خراب ہو گئے تھے۔ جب میں یہاں آگیا تو سپرنٹنڈنٹ نے مجھے علاج معالجہ کے واسطے لاہور سینٹرل جیل میں بھیج دیا۔ اس جیل خانے میں خلافت اور کانگریس دونوں کے قیدی تھے۔ میں بھی تو خلافت والوں میں سے ایک تھا اس لئے مجھے ان کے پاس نہ پہنچایا گیا اور مجھے اکیلے ہی ایک چکی یعنی قید تنہائی کی کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ جب خلافت والوں کو میرے حالات معلوم ہوئے تو انھوں نے شور مچایا اور دوسرے دن ہی مجھے چکی سے نکال لیا گیا اور انھیں سیاسی قیدیوں کے ساتھ یکجا کر دیا۔ اس جگہ آغا صفدر، ملک لال خاں، لالہ اچپت رائے اور اسی طرح بہت سے کانگریسی رہنما موجود تھے۔ مجھے ان سب کے ساتھ تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔ آغا صفدر، ملک لال خاں اور میں نے قرآن کا درس دینا شروع کر دیا۔

میں کچھ دن بعد پھر واپس ڈیرہ غازی خاں کے جیل خانے میں بھیج دیا گیا۔ ریل گاڑی میں پولیس کی حفاظت میں سفر شروع ہوا۔ ڈیرہ غازی خاں لاکر مجھے جیل کے ایک بارک میں بند کر دیا گیا۔ اس بارک میں مسلمان بہت تھوڑے تھے۔ ہندو اور سکھ بہت زیادہ تھے۔ اس جیل خانے میں ہمارے دن بڑے اچھے گزر رہے تھے اور پختونوں کے بارے میں انگریزوں نے جو بہت سی غلط فہمیاں ہندوؤں کے دلوں میں پیدا کر رکھی تھیں ان کی کسی قدر اصلاح ہوگئی۔ ایک دن میرا ایک ہندو دوست کہنے لگا: "میں ایک بات آپ سے پوچھتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ خفا نہیں ہوں گے۔" میں نے جواب دیا: "ہرگز نہیں۔"

ہندو دوست نے کہا: "میں نے سنا ہے کہ پٹھان انسان کا خون پیتے ہیں۔"

میں نے جواب دیا: "ہاں، ہاں خوب پیتے ہیں۔"

وہ چلّا سا اٹھا: "باپ رے باپ۔" اس نے پھر پوچھا: "یہ کیوں پیتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا: "اس لئے کہ یہ بہت ہی لذیذ ہوتا ہے۔"

وہ پھر چلّا اٹھا: "باپ رے باپ۔"

میں نے اب ذرا سنجیدہ لہجے میں ہندو دوست سے پوچھا "دوست! یہ بات تمھارے دماغ میں پیدا کیسے ہوئی ہے؟ کیا تم کبھی پٹھانوں کے دیش میں گئے ہو، تم نے پٹھان دیکھے بھی ہیں تمھارا ان سے کبھی واسطہ بھی پڑا ہے؟"

اس نے جواب دیا: "نہیں۔"

میں نے اس سے پوچھا: "تم پھر کیسے اس نتیجے پر پہنچ گئے ہو؟"

اس کا جواب اس کے پاس یہ تھا کہ "اس نے کسی کتاب میں پڑھا تھا۔"

کچھ دنوں بعد ہمیں خبر ملی کہ محکمہ جیل کا جرنیل دورے پر آیا ہے۔ اس کا نام کرنل واڈ تھا۔ یہ بڑا سخت طبیعت آدمی تھا اور اس کا قوم پرستوں سے تو خدا واسطے کا بیر تھا۔ غرض کہ ہر لحاظ سے بڑا خراب آدمی تھا۔ جس وقت وہ اس جیل کا معائنہ کرتا ہوا ہماری بارک میں داخل ہوا اور اس نے ہندوؤں کے سروں پر ٹوپیاں اور سکھوں کے سروں پر کالی پگڑیاں دیکھیں تو آگ بگولہ ہوگیا۔ وہ وارڈن پر برس پڑا کہ "اس چیز کی اجازت تم نے انھیں کیوں دی ہے؟"

ہمارا سپرنٹنڈنٹ بڑا اچھا آدمی تھا۔ وہ بھی انگریز ہی تھا۔

اس نے جرنیل سے کہا: "یہ ان کا نہیں میرا قصور ہے۔"

جرنیل چلا گیا اور جیل کے افسروں کو حکم دے گیا کہ وہ ان قیدیوں سے گاندھی ٹوپی اور کالی دستاریں لے لیں۔

دوسرے دن جب سپرنٹنڈنٹ اور وارڈر آئے تو ہمیں جرنیل کا یہ حکم سنایا گیا۔ سردار کھڑک سنگھ نے اُن سے کہا "ہم اسپیشل کلاس کے قیدی ہیں اور حکومت نے ہمیں اپنے کپڑے پہننے کی اجازت دے رکھی ہے۔ اس لئے یہ ہماری مرضی پر منحصر ہے کہ جس طرح کے کپڑے ہمیں پسند ہوں ویسے کپڑے ہم پہنیں۔ لہٰذا جرنیل صاحب کا یہ حکم ناجائز ہے اور یہ ہمارے اُن حقوق میں جو حکومت نے ہمیں دے رکھے ہیں بیجا مداخلت ہے۔"

لیکن اس بات پر انھوں نے کان نہ دھرے۔ انھوں نے کہا "ہم تو مجبور ہیں۔ ہم لوگ جرنیل صاحب کے حکم کی تعمیل کریں گے۔ لہٰذا ہم تم کو حکم دیتے ہیں کہ یہ ٹوپیاں اور پگڑیاں اُتار لو۔"

میں سی کلاس میں تھا اور سی کلاس قیدیوں کو تین ماہ بعد ایک ہی خط لکھنے کی اجازت ہوا کرتی تھی۔ اسی طرح تین مہینے بعد اس کے نام جیل خانے میں جو خط آتا تھا وہ اُسے دیا جاتا تھا۔ ایسی حالت میں اپنے علاقے کے حالات سے بہت کم باخبر ہوتا تھا۔ اس طرح تین ماہ کے بعد ایک قیدی کی اپنے لواحقین سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ ان حالات میں جو کبھی میری ملاقات کو آتا تھا تو وہ مجھے اپنے صوبے کے حالات سنا جاتا۔ ہماری جماعت نے اپنے علاقے میں زور و شور سے کام شروع کر رکھا تھا۔ اُن دنوں جلسوں کا زیادہ رواج نہیں تھا اور حکومت بھی کسی کو جلسوں میں نہیں جانے دیتی تھی۔ لوگ بھی ڈرتے تھے۔ ان حالات میں ہمارے ساتھی مسجدوں میں مجالس اور مولود شریف منعقد کرتے تھے اور ان ہی مجالس میں ہمارے کارکن تقریریں کیا کرتے تھے۔ اور ان میں زیادہ تر حصہ لینے والے

ہمارے اسکول کے طلباء ہوا کرتے تھے۔ اُس وقت غنی کی عمر نو سال تھی۔ وہ بہت اچھی قرأت کرتا تھا اور وہ ایک بڑا اچھا قاری تھا۔ غنی ایک بہت اچھا مقرر تھا اور بڑی شاندار تقریر کیا کرتا تھا۔ وہ اپنی تقریر کے آخر میں لوگوں سے یہ کہا کرتا تھا کہ "اے لوگو! آپ لوگ ذرا اس حکومت سے یہ تو پوچھیں کہ میرے باپ کو اس نے کس لئے قید کر رکھا ہے۔ آخر اُن کا گناہ کیا ہے اور انھوں نے کیا جرم کیا ہے؟"

ہمارے لوگوں پر ان باتوں کا بڑا اثر پڑتا تھا، لہٰذا وہ بڑے متاثر ہوتے اور ملک میں ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی۔ مختصر یہ کہ میری قید سے میری قوم کو بڑا فائدہ پہنچا۔ ایک تو اُن میں تعلیم کا شوق پیدا ہوگیا اور دوسرا اُن کے اندر سیاسی شعور آگیا۔ میری قید کی وجہ سے ہمارے اسکول سے لوگوں کی بڑی ہمدردی اور محبت پیدا ہوگئی اور وہ اسکول کے لئے امداد بھی مہیا کرتے۔

میری والدہ صاحبہ میرے لئے بہت غمگین اور اُداس رہا کرتی تھیں۔ اور جیل کے قواعد کے مطابق مجھے جب خط لکھنے کا موقع میسر آتا تو میں اپنی والدہ صاحبہ ہی کو خط لکھا کرتا تھا۔ میری والدہ صاحبہ کو ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ وہ میری ملاقات کو آئیں، لیکن وہ ضعیف العمر تھیں اور ڈیرہ غازی خاں ایک بہت دور افتادہ جگہ تھی اس کے علاوہ بیچ میں دریائے سندھ پڑتا تھا۔ وہ اتنا تکلیف دہ سفر تھا جو اُن کے لئے قابلِ برداشت نہیں تھا۔ اسلئے میں ہمیشہ اپنی ملاقات کے لئے آنے سے منع کر دیا تھا۔ لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ انھیں خداوند پاک مجھ سے ہمیشہ جدا کر دے گا۔

۱۹۲۳ء کے آخر میں وہ بیمار ہوئیں اور کچھ ہی دن کے بعد رحلت فرما گئیں۔ مجھے کسی نے بھی ان کی بیماری کی، یا وفات کی اطلاع تک نہ دی اور مجھ سے یہ خبر چھپائی گئی، لیکن مجھے اخبارات کے ذریعے علم ہو گیا اور میں بہت دکھی ہوا۔ جب میں رہا ہو کر اپنے گاؤں میں آیا تو میری بہن نے مجھے بتایا کہ آخری سانس لیتے وقت ماں

نے مجھے بہت یاد کیا ــــــــ وہ حالتِ نزع میں کہہ رہی تھیں "غفار اکدھر گیا ہے۔ وہ آیا ہے یا کہ نہیں آیا ہے؟" بس میرا ہی نام اُن کی زبان پر تھا کہ انھوں نے دم توڑ دیا۔

ڈیرہ غازی خاں کے قیدیوں میں سب سے لمبی قید میری تھی۔ میری قید تین سال کی تھی۔ اور دوسرے قیدیوں میں کوئی چھ مہینے کوئی نو مہینے، اور زیادہ سے زیادہ سال بھر کے لئے قید تھا جو مہینے تک اکثر سزا یافتہ قیدی ہمارے دیکھتے دیکھتے رہا ہو چکے تھے۔ اب سارے جیل خانے میں بس صرف میں ایک قیدی رہ گیا تھا۔ اسلئے مجھے میانوالی کے جیل خانے میں منتقل کر دیا گیا۔ میانوالی کا جیل خانہ بھی چھوٹا سا ہے۔ اس میں بارکیں نہیں ہیں۔ سب چکّیاں (قید تنہائی کی کوٹھریاں) ہیں۔ یہاں بھی کافی سیاسی قیدی تھے۔ کانگریس والے بھی تھے اور خلافت والے بھی، اور گوردوارے کے باغ کے قیدی بھی تھے لیکن یہ قیدی ڈیرہ غازی خاں کے قیدیوں میں سے یہاں منتقل کئے گئے تھے اور ان کے جیل والوں سے اچھے تعلقات تھے۔ اس جگہ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے علیٰحدہ علیٰحدہ لنگر تھے ہمارے لنگر کے انچارج مولانا اقبال تھے۔ یہ حضرت پانی پت کے رہنے والے تھے اور خلافت تحریک میں پانچ سال سے قید تھے۔ کھانا پکانے میں بڑے ماہر تھے لیکن ہانڈی میں مرچ بہت زیادہ ڈالتے تھے اور اس سے میرے لئے ایک بہت بڑی مصیبت پیدا کر دیتے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کا لڑکا اختر علی خاں بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس جگہ کا داروغہ بھی ایک عجیب انسان تھا۔ میانوالی میں سخت گرمی پڑتی ہے اور وہاں ریت بھی اُڑتی رہتی ہے جیل خانے میں ایک کنواں تھا۔ اس کا پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ داروغہ صاحب سیاسی قیدیوں کو نہلانے کے لئے وہاں لے جایا کرتا تھا۔ مجھے بھی وہ بہت کہا کرتا تھا لیکن میں نہیں جاتا تھا اور شام کو جب گنتی بند کی جاتی تھی تو جیل خانے کے درمیان ایک بُرج تھا جس کے چاروں طرف بیٹھنے کی اچھی جگہ تھی۔ داروغہ صاحب وہاں بیٹھا کرتا تھا اور ہمارے سیاسی قیدی بھی وہاں جا کر بیٹھتے تھے۔

۱۹۲۴ء میں میری قید کی میعاد ختم ہونے میں چند ایک دن رہ گئے تھے کہ داروغہ صاحب نے آکر مجھے اطلاع دی کہ مجھے پشاور منتقل کر دینے کے احکام جاری ہو گئے ہیں اور مجھے لینے کے لئے پولیس آگئی ہے اور دروازے میں بیٹھی ہوئی ہے۔ داروغہ کے کہنے پر میں نے اپنا سامان اٹھالیا اور دروازے کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے جیل کے ملازمین مجھے اسٹیشن پر لے گئے اور سفر شروع ہوا جب گاڑی خیرآباد پہنچی تو مجھے گاڑی سے اُتار دیا گیا اور پشاور کی پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ پشاور کی پولیس پر بڑی ہیبت چھا گئی۔ اُس نے موٹر چھوڑ دی۔ ایک تانگہ پکڑ لیا اور مجھے چارسدہ لے آئے اور وہاں کے اسسٹنٹ کمشنر کے سامنے مجھے پیش کر دیا۔ اس وقت چارسدہ کا اسسٹنٹ کمشنر دلاور خاں تھا۔ اس نے پولیس کو حکم دیا کہ وہ مجھے لے آئے اور میرے گاؤں میں پہنچا کر رہا کر دے۔

تین سال کے بعد میں جیل خانے سے رہا ہوا تھا۔ ان تین سالوں میں ہماری قوم بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ ہمارے مدرسے نے اچھی ترقی کر لی تھی۔ اس کامیابی کا سارا سہرا ہمارے اسکولوں کے لڑکوں اور استادوں کے سر پر تھا۔ انھوں نے میرے قید ہو جانے کے بعد ملک میں بڑا کام کیا تھا۔ گویا میری قید کا صحیح فائدہ اٹھایا تھا۔ یہ سب ان لوگوں کی محنت کی برکت تھی۔

ہمارے اسکول کا سالانہ جلسہ قریب تھا اور میرے آجانے کے باعث انھوں نے تاریخیں آگے ڈال دیں۔ خیر جلسہ بڑے اہتمام سے ہوا۔ اس میں ہزاروں لوگ شامل ہوئے اور لوگوں میں بہت پریم پیار اور جوش و خروش تھا۔ جلسے میں کافی تقریریں ہوئیں اور نظمیں بھی پڑھی گئیں۔ اس موقع پر قوم کی طرف سے مجھے ایک

تمغہ عطا کیا گیا اور "فخرِ افغان" کے لقب سے میری عزت افزائی کی گئی۔ میں نے اس جلسے میں ایک مختصر سی تقریر کی اور اپنی قوم کو میں نے شیر کے ایک بچے کا یہ قصہ سنایا۔

"ایک شیرنی تھی۔ اس نے بھیڑوں کے ریوڑ پر حملہ کر دیا۔ وہ حاملہ تھی۔ حملے کے دوران اس کے بچہ پیدا ہوا، وہ خود مر گئی اور اس کا بچہ ایک بھیڑ نے اپنے پیچھے لگا لیا۔ شیر کا یہ بچہ انہی بھیڑوں کے ریوڑ میں پیدا اور بڑا ہوا۔ اس نے بھیڑوں کی عادتیں اور خصلتیں سیکھ لیں۔ وہ بھیڑوں کے ساتھ ہی گھومتا پھرتا اور چرتا رہتا۔ ایک دن ایک شیر ادھر آنکلا اور اس نے ان بھیڑوں پر حملہ کر دیا۔ حملے کے وقت شیر نے دیکھا کہ ان بھیڑوں میں شیر کا ایک بچہ بھی ہے اور وہ بھی اس سے ڈر کر بھیڑوں کے ساتھ بھاگا جا رہا ہے اور بھیڑوں کے مانند باں باں کر رہا ہے۔ حملہ آور شیر کو یہ بات بہت عجیب نظر آئی کہ کہاں شیر کا بچہ اور کہاں یہ باں باں اور بھیڑ کا سا ڈرپوک پن۔ وہ شیر کے بچے کے قریب آیا اور اس نے شیر کے بچے کو بھیڑوں سے علیحدہ کر لیا، پھر اسے ایک تالاب پر لے گیا تاکہ وہ پانی کے اندر اپنا منہ دیکھ لے اور اسے معلوم ہو جائے کہ وہ بھیڑ نہیں بلکہ شیر ہے۔ شیر کے بچے نے جب پانی میں اپنا عکس دیکھا تو اسے حملہ آور شیر نے کہا "ارے کیا دیکھتا ہے، تو بھیڑ نہیں شیر ہے شیر، بھیں بھیں مت کر، شیر کی طرح دہاڑ۔" پھر کیا تھا اس شیر کے بچے کی غلط فہمی دور ہو گئی اور وہ زور زور سے دہاڑنے لگا۔ جنگل کانپ اٹھا اور بھیڑوں کا ریوڑ تو کیا دیگر بڑے بڑے جانوروں میں بھی بھگدڑ مچ گئی۔

یہ قصہ سنا کر میں نے گرج کر کہا: "اے پختونو! میں بھی تمہیں یہی کہتا ہوں کہ تم بھیڑیں نہ بنو، تم شیر بنو شیر۔ غلامی میں پلنے کی وجہ سے تم اپنی حقیقی طاقت کو بھول گئے ہو۔ اپنے آپ کو پہچانو، بھیں بھیں مت کرو اور شیروں کی طرح گرجو۔" میری اس تقریر سے حکومت بہت سٹپٹائی، مگر میری قوم بہت مسرور ہوئی اور اس پر اس کا جادو کی طرح اثر ہوا۔ جلسہ برخاست ہو گیا لیکن میری تقریر ہمیشہ لوگوں کے کانوں میں گونجتی رہی۔

مئی ۱۹۲۶ء میں میری بڑی بہن حج کو جا رہی تھی۔ اس نے مجھے بھی مجبور کیا کہ میں بھی اس کے ہمراہ حج کو جاؤں۔ چنانچہ میں اور میری بیوی دونوں اس کے ساتھ حج کیلئے روانہ ہوئے۔

اس سال سعودیوں نے محمد علی، شوکت علی اور ظفر علی خاں وغیرہ اور ہندوستان کے دوسرے بہت سے لیڈروں کو دعوت دی تھی اور ہندوستان سے بہت سے لیڈر وہاں پہنچے تھے۔ اس سال دنیا بھر کے مسلمانوں کا موتمر بھی ہوا تھا اور میں اس میں بھی شامل ہوا تھا۔

ہم حج سے فارغ ہو گئے۔ میری بہن مدینے چلی گئی اور وہاں سے اپنے وطن کو لوٹ گئی، لیکن میری طبیعت اچھی طرح علیل تھی۔ چنانچہ میں اور میری بیوی طائف چلے گئے۔ طائف حجاز میں ایک خوشگوار اور سرد مقام ہے۔ ہم کچھ دن یہاں ٹھہرے اور اس کے بعد مکّہ واپس آگئے۔ مکّہ پہنچ کر ہم نے کچھ دن وہاں گزارے، پھر جدّہ چلے آئے۔ جدّہ میں کچھ دن گزارنے کے بعد ہم لوگ مدینے چلے آئے۔ ہمارا سارا قافلہ چار عورتوں اور چھ مردوں پر مشتمل تھا۔ اس زمانے میں موٹریں نہیں ہوا کرتی تھیں اور سفر اونٹوں کے ذریعے ہوا کرتا تھا۔ منزل رات کو طے کی جاتی تھی۔ چاروں طرف دشت و بیاباں تھے۔ لیکن نجدیوں کی وجہ سے وہاں ایسا امن تھا کہ میں بیان کرنے میں قاصر ہوں۔

مدینے پہنچ کر ہم نے وہاں بھی کچھ دن گزارے اور وہاں سے ہم نے بیت المقدس جانے کا عزم کیا۔ اور ہم مدینہ سے رابغ چلے گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا بندرگاہ ہے۔ تیسرے دن جہاز آیا۔ ہم لوگ اس میں بیٹھ گئے اور سوئز کے مقام پر اس

سے اُتر پڑے۔ سوئز سے ہم بذریعہ ریل گاڑی بیت المقدس پہنچ گئے۔ بیت المقدس میں میری اہلیہ زباد شاہ خاں کی پہلی بیوی جب سنہ ۱۹۱۱ء میں رحلت فرما گئیں تو اس کے بعد آپ نے پھر سنہ ۱۹۱۲ء شادی کی۔ اُن کی یہ وہی اہلیہ محترمہ تھیں جو سیڑھی سے گر پڑی اور جاں بحق ہو گئی۔ وہ اپنے پیچھے دو بچے ایک لڑکا اور ایک لڑکی چھوڑ گئی۔ مجھے اس کی جُدائی کا بڑا سخت صدمہ تھا، کیونکہ وہ میری رفیقۂ حیات تھی اور اس کے بعد میں نے پھر شادی نہیں کی۔ حالانکہ میں جوان تھا۔ اور اسکی بڑی وجہ یہ تھی کہ میرے دل میں ملک وملت کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ اور میں شادی کے لئے تیار نہیں تھا۔ کچھ دن میں نے فلسطین میں گزار دیئے اور اس جگہ کے مشہور مقامات دیکھے۔ پھر اس جگہ سے میں نے لبنان، شام اور عراق کی سیاحت کی۔ نجف اور کربلا کی زیارت بھی کی اور بغداد میں چند دن گزارنے کے بعد بصرے چلا گیا اور پھر وہاں سے اپنے گاؤں واپس آگیا۔

ہمارے صوبے میں ایک بھی قومی اخبار نہیں تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ پختونوں کے لئے ان کی اپنی زبان میں ایک اخبار جاری کیا جائے۔ صحیح معنی میں قومی اخبار ہو اور قوم کی ملکیت ہو۔ اس مقصد کے لئے بڑی جدوجہد کے بعد مئی سنہ ۱۹۲۸ء میں میں اپنے اس عزم میں کامیاب ہوا۔ "پشتون" کے نام سے میں نے اخبار شائع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب پختونوں کو اپنی زبان سے کسی قسم کا اُنس و محبت نہ تھی اور نہ ہی وہ یہ بات جانتے تھے کہ یہ ہماری اپنی زبان ہے، حالانکہ ہر ایک قوم اپنی زبان سے پہچانی جاتی ہے۔ اور اپنی زبان سے ہی کوئی قوم قوم ہوتی ہے اپنی زبان کے بغیر کوئی بھی قوم دنیا میں ترقی نہیں کر سکتی اور جو بھی قوم اپنی زبان کو بُھلا دیتی ہے وہ قوم صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔

ایسے ہی حالات میں "پشتون" اخبار جاری ہوا اور بہت جلد پشتونوں میں ہر دلعزیز ہو گیا اور دنیا کے ہر حصے میں جہاں کہیں پشتون رہتے ہیں وہ اُسے منگواتے تھے۔ امریکہ میں رہنے والے پشتونوں نے تو اس اخبار کی اشاعت کو فروغ دینے میں نمایاں امداد کی اور نہ صرف انھوں نے اس کی اشاعت بڑھانے میں ہی نہیں بلکہ اس کی مالی معاونت بہم پہنچانے میں بھی حصہ لیا۔ میں نے تو یہ سُنا ہے کہ امان اللہ خاں کے وقت میں افغانستان میں یہ اخبار بہت ہر دلعزیز تھا اور اس نے لوگوں میں پشتو زبان کے ساتھ اتنی محبت و پیار پیدا کیا تھا کہ امان اللہ خاں اور ان کے ساتھیوں نے بھی پشتو کا ایک اخبار افغانستان سے بھی جاری کیا تھا جس کا نام "د پشتون ژغ" (صدائے پشتون) تھا۔ امان اللہ خاں کا خود پشتو زبان سے اتنا شوق پیدا ہو گیا تھا کہ بقول کسے اس نے فرمان جاری کر دیا تھا کہ تین سال کے اندر اندر ہر ایک سرکاری ملازم پشتو سیکھ لے کیونکہ تین سال کے بعد پشتو سرکاری اور قومی زبان بن جائے گی۔ انگریزوں نے اُسے ان کاموں کے کرنے کی مہلت نہ دی۔ کہا جاتا ہے کہ "د پشتون ژغ" کے ابھی دو پرچے ہی نکلے تھے کہ فرنگیوں نے نام نہاد مذہبی پیشواؤں کے ذریعے افغانستان میں آگ لگا دی اور امان اللہ خاں کو افغانستان سے باہر نکلوا کر ہی دم لیا اور اُسے اٹلی چلے جانا پڑا۔

افغانستان کی بربادی کو ہم لوگ اپنی تباہی تصور کرتے تھے اور انگریزوں نے افغانستان کو ہماری وجہ سے تباہ کیا۔ کیونکہ افغانستان کی ترقی کا اثر سیدھا ہم پر پڑتا تھا اور فرنگی نہیں چاہتے تھے۔ ہم سے جتنا بھی ہو سکتا تھا، چاہے مالی طور پر یا جانی طور پر، ہم نے اُس مصیبت میں افغانستان کی امداد کی ہے اور اس وقت تک اپنی امداد جاری رکھی جب تک کہ نادر خاں کامیاب نہ ہو گیا۔

میں افغانستان کے انقلاب کے زمانے میں اُسکے حق میں پروپیگنڈا کرنے اور امداد فراہم کرنے کے لئے ہندوستان

گیا تھا۔ پنجاب میں میں نے ڈاکٹر اقبال، ظفر علی خاں، ملک لال خاں اور ایسے ہی دوسرے بہت سے مسلمان لیڈروں سے ملاقات کی تھی۔

لاہور سے پھر میں لکھنؤ چلا گیا۔ لکھنؤ میں کانگریس کا جلسہ تھا اور اس میں گاندھی جی اور جواہر لال بھی شریک ہوئے تھے۔ — یہ ۱۹۲۸ء کا ذکر ہے میرا یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے گاندھی جی اور جواہر لال سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ان دونوں سے پہلے میری کوئی جان پہچان نہیں تھی۔ لیکن جواہر لال کے میرے بھائی ڈاکٹر خان صاحب سے بڑے مراسم تھے۔ کیوں کہ یہ دونوں ایک ہی جگہ انگلینڈ میں رہ چکے تھے۔ اور لندن یونیورسٹی میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے ایک تعارفی خط ان کے نام لکھ دیا تھا۔ جب جلسہ ختم ہوا تو جواہر لال جو چودھری خلیق الزماں کے مہمان تھے مجھے بھی اپنے ہمراہ اپنے میزبان کے گھر لے گئے کھانا کھانے کے بعد میرے اور نہرو کے درمیان افغانستان کے بارے میں بہت سی باتیں ہوئیں۔

لکھنؤ سے میں پھر دہلی چلا آیا۔ جمعہ کے روز مسجد میں مولانا محمد علی سے میری ملاقات ہو گئی۔ محمد علی بہت اچھے انسان تھے اور میرے بڑے مہربان تھے۔

کچھ دنوں کے بعد نادر خاں کی طرف سے کابل کی فتح کا تار موصول ہوا تو ہم نے بڑی خوشی منائی۔ اس خوشی میں لوگوں نے ایک جلوس بشت نگر کے شمالی سرے سے اور دوسرا جلوس بشت نگر کے نچلے سرے سے نکالا۔ یہ دونوں جلوس اتمان زئی میں ایک جگہ اکٹھے ہو گئے اور اس جگہ ایک بڑا عظیم الشان جلسہ ہوا۔ جلسے میں بے شمار قومی نظمیں پڑھی گئیں اور تقریریں بھی ہوئیں اور میں نے بھی اس موقع پر ایک تقریر کی۔ میں نے اپنی تقریر میں پٹھانوں سے کہا کہ "دنیا میں دو ہی راستے ہیں جن پر چل کر قومیں ترقی کر سکتی ہیں ایک مذہب دوسرا قومیت، آج اگر تمھیں علم حاصل نہ ہو تو آنکھیں تو موجود ہیں۔ یورپ اور امریکہ کو دیکھو جن میں مذہب تو نہیں ہے لیکن ان کے اندر قومیت موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آسمان تک جا پہنچے ہیں اور ہم ہیں کہ زمین پر بھی نہیں چل سکتے۔ وہ آباد ہو گئے ہیں اور ہم برباد ہو گئے ہیں۔ ان کی زندگی کو دیکھو اور اپنی زندگی کو بھی دیکھو۔ ہماری اس تباہی و بربادی کی وجہ یہ ہے کہ ہم میں نہ مذہب ہے اور نہ قومیت۔ دنیا میں ایک عظیم انقلاب آ رہا ہے اور تم لوگوں کو اس کی خبر تک نہیں"........

اس جلسے کا لوگوں پر بہت اچھا اثر پڑا اور دوسرے دن چند نوجوان میرے پاس آئے اور انھوں نے مجھے کہا کہ وہ قوم کی خدمت اور اصلاح کے لئے ایک جماعت بنانا چاہتے ہیں اور اسی طرح ہمارے درمیان مصالحت و مشورے شروع ہو گئے۔ ہماری ایک جماعت پہلے ہی موجود تھی "اصلاح الافاغنہ" — یہ جماعت ہمارے صوبے میں تعلیم پھیلانے کا کام کر رہی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ جماعت تو یہی کام کرتی رہی ہے۔ کیوں کہ یہ کام بڑا ضروری تھا۔ لیکن ہماری قوم میں اور بہت سی سوشل کمزوریاں اور عیب ہیں چنانچہ ان کمزوریوں اور خامیوں کو دور کرنے کے لئے ہم نے "خدائی خدمتگار" کی تحریک کی بنیاد رکھی جو ایک سوشل تحریک تھی اس تحریک کا سیاست سے کچھ بھی تعلق نہیں تھا۔ لیکن فرنگیوں کے ظلم و تشدد نے اس کا تعلق سیاست سے بھی پیدا کر دیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہمیں کانگریس سے خود انگریزوں نے یکجا کر دیا ہے۔

بڑے غور و فکر کے بعد ۱۹۲۹ء میں ہم نے یہ جماعت بنائی اور اسے ہم نے "خدائی خدمتگاری" کا نام دے دیا۔ یہ نام بھی اس جماعت کا ہم نے ایک خاص غرض سے رکھا تھا۔ کیوں کہ پٹھانوں میں ہم لوگ خدا کے واسطے اپنی قوم و ملک کی خدمت کا خیال اور جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے اور یہ اس لئے کہ پٹھانوں

کے اندر تشدد بھرا ہوا تھا اور ان کا یہ تشدد غیروں کیلئے نہیں تھا بلکہ اُن کا سارا تشدد اپنی قوم اور اپنے بھائی بندوں ہی کے خلاف تھا جو بھی آدمی ان کا بہت قریبی رشتہ دار ہوتا تھا وہ ان کے تشدد کے ہاتھوں ہمیشہ آگ میں گھرا رہتا تھا اور ان کے تشدد کی ساری آگ اپنے بھائی اور عزیزوں کے اوپر برستی تھی۔ اس کے علاوہ پٹھانوں میں ایسی پارٹی بازی اور پھوٹ تھی کہ اس سے اُن کا گھر برباد تھا۔ علاوہ ازیں انکے رجعت پسندانہ رسم و رواج ان کو تباہ و برباد کر رہے تھے۔ ان میں انتقام کا جذبہ بھی غیر معمولی تھا اور ان میں اچھے اخلاق اور اچھی عادات کا بھی فقدان تھا۔

ان حالات کے پیش نظر صرف "خدائی خدمتگار" کا ممبر بننے کے لئے ہر ممبر کو یہ قسم لینا اور یہ وعدہ کرنا پڑتا تھا: میں "خدائی خدمتگار" ہوں، اور چونکہ خدا کو خدمت کی ضرورت نہیں ہے لہذا خدا کی مخلوق کی خدمت ہی خدا کی خدمت ہے۔ لہذا میں خلق خدا کی خدمت بغیر کسی غرض و مطلب، صرف خدا کے واسطے کروں گا۔"

خدائی خدمتگار کو دوسرا وعدہ یہ کرنا پڑتا تھا: "میں تشدد نہیں کروں گا اور نہ ہی کسی سے انتقام یا بدلہ لوں گا۔ مجھ پر کوئی چاہے کتنا ہی ظلم اور زیادتی کرے گا میں اسے معاف کر دوں گا۔" خدائی خدمتگار" یہ بھی حلف اٹھاتا تھا: میں باہمی پھوٹ، گروہ بندی اور دشمنی و خانہ جنگی سے دور رہوں گا اور ہر ایک پختون کو اپنا بھائی اور دوست سمجھوں گا۔ میں رسم و رواج چھوڑ دوں گا۔ سادہ زندگی بسر کروں گا اور نیک کام کروں گا اور برائیوں سے جان بچاؤں گا۔ اور یہ کہ میں اپنے اندر اچھے اخلاق اور اچھی عادت پیدا کروں گا۔ میں بیکاری کی زندگی نہیں بسر کروں گا۔"

علاوہ ازیں ہر ایک خدائی خدمتگار پر یہ پابندی تھی کہ چاہے وہ امیر ہے یا غریب، دن میں دو گھنٹے جسمانی مشقت سب کو کرنا پڑے گی۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ میں خلافت کانفرنس ہوئی۔ صوبہ سرحد سے ہم لوگ بھی اس میں شمولیت کے لئے گئے۔ کلکتہ میں پشاور کے اور بھی بہت سے لوگ رہتے تھے جو میوہ جات کی تجارت کرتے تھے۔ اس کے بعد دسمبر ۱۹۲۹ء میں لاہور میں کانگریس کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں ہمارے صوبے کے بھی بہت سے لوگ شریک ہوئے۔ میں بھی شریک ہوا۔ اجلاس میں یہ بات دیکھ کر ہم پٹھان لوگوں پر زبردست اثر ہوا کہ یہاں مردوں کی بات تو رہنے دیجئے لڑکیوں نے بھی ملک و ملت کی خدمت کیلئے کمر کس رکھی تھی۔ ہم صوبہ سرحد سے جتنے لوگ بھی وہاں گئے تھے ایک جگہ اکٹھے ہوئے اور اپنے لوگوں کے مابین ہم نے بھی جلسہ کیا اور ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں بھی اپنی قوم اور ملک کی خدمت کرنا چاہیئے۔ یہ جذبہ کانگریس کی یہ کانفرنس دیکھ کر ہی ہمارے اندر پیدا ہوا۔ علاوہ ازیں ہمارے نزدیک یہ امر بھی کافی اہمیت رکھتا تھا کہ کانگریس کے اجلاس میں ہندوستان کی مکمل آزادی کی قرارداد بھی منظور ہوئی تھی۔

ہم لوگ جب لاہور سے اپنے گاؤں پہنچے تو ہم نے کام شروع کر دیا۔ ہم لوگ گاؤں گاؤں پھرتے تھے۔ تقریر کرتے تھے جرگے بناتے تھے، خدمت خلق کے لئے "خدائی خدمتگار" بھرتی کرتے تھے۔ ہماری یہ تحریک بہت جلد سارے صوبے میں پھیل گئی بلکہ ہمارے قبائل میں بھی جا پہنچی اور اتنی ہر دلعزیز ہو گئی کہ جس گاؤں میں بھی ہم جاتے تھے وہاں جرگہ اور خدائی خدمتگار جماعتیں قائم ہو جاتی تھیں۔

چند مہینوں تک تو انگریزوں نے بڑے صبر و تحمل سے ہمارے کام کو دیکھا بھالا۔ اور ہمیں لمبی مہلت دے دی۔ ادھر ان چار مہینوں میں ہم نے بھی دن رات اتنا زیادہ کام کیا کہ

ہماری یہ تحریک سارے صوبے میں پھیل گئی۔ ابھی قریباً تین ماہ کام کرتے ہوئے ہم نے گزارے تھے کہ چیف کمشنر نے میرے نام حکم بھیج دیا کہ "یہ تم نے کیا سلسلہ ملک میں جاری کر رکھا ہے؟ اسے فوراً بند کر دو۔"

میں نے اس حکم کے جواب میں چیف کمشنر صاحب کو یہ لکھا کہ "یہ تو ایک سوشل تحریک ہے، سیاسی نہیں، اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ کام جو ہم کر رہے ہیں ملک کی سرکار کو کرنا چاہیے۔ یہ کام تو حکومت کے کرنے کا ہے، آپ کے کرنے کا ہے، اب اگر آپ کا یا حکومت کا یہ کام ہم کر رہے ہیں تو آپ کو اس کام میں میری مدد اور تعاون کرنا چاہیے۔"

چیف کمشنر نے مجھے کہا "میں مانتا ہوں کہ آج یہ کام سوشل ہے اور اگر تم ان پٹھانوں کو بھی منظم کر لو تو پھر اس کی کیا دلیل اور ضمانت ہے کہ تم انھیں ہمارے خلاف استعمال نہیں کرو گے؟" میں نے ان سے کہا کہ "قوموں کی ضمانت اعتماد پر ہوتی ہے آپ ہم پر اعتماد کیجیے تو ہم آپ پر اعتماد کریں گے ہم آپ کے خلاف کچھ بھی نہیں کرتے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس ملک میں ایک انقلاب آرہا ہے اور انقلاب تو ایک سیلاب ہوتا ہے ہم صرف اتنا کرتے ہیں کہ پٹھانوں کو منظم کرتے ہیں تاکہ وہ اس انقلاب میں ہم سے بہہ جائیں۔"

۱۹۳۰ء میں اتمان زئی میں خدائی خدمتگاروں کا ایک بہت بڑا اجلاس ہوا۔ میں اس جلسے کے بعد پشاور جا رہا تھا تو راستے میں ناکی تھانے کے پاس مجھے گرفتار کر لیا گیا، اور واپس چارسدہ لایا گیا۔ ناکی تھانے کے لوگوں نے جب میری گرفتاری دیکھی تو انھیں بڑا غصہ آیا اور وہ کہنے لگے کہ انگریزوں نے ہماری بے حرمتی کی ہے کہ بادشاہ خان کو ہماری حدود کے اندر گرفتار کیا گیا ہے۔ لہٰذا اپنے اس قہر اور غصے کا جواب ناکی تھانے کے لوگوں نے ایک ایسے شائستہ طریقے سے دیا کہ اس سے میں بہت خوش ہوا، اور وہ یہ کہ انھوں نے خدائی خدمتگاری کا اعلان کر دیا۔ خود بھی سرخ پوش بن گئے اور مجھے بھی انگریزوں کے سامنے جن سے میری جنگ تھی سرخرو کر دیا!

میری گرفتاری کی خبر عوام میں پھیل گئی۔ چارسدہ میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ اپنے قہر اور غصے کا اظہار کرنے کے لیے جمع ہو گئے۔ اس طرح اس دن پشاور میں بھی بہت ساتھی گرفتار کیے گئے تھے۔ اور ہماری ان گرفتاریوں کی وجہ سے قصہ خوانی بازار پشاور میں ایک بہت بڑا ہنگامہ ہوا اور گولیاں برسائی گئیں تھیں جس میں بڑی بھاری تعداد میں لوگ شہید ہو گئے اور ۲۳ اپریل کا دن جس دن یہ واقعہ ہوا تھا ایک عظیم تاریخی اہمیت سے وابستہ ہو گیا۔

گرفتاری کے بعد ہمیں دفعہ ۴۰ کے تحت تین تین سال قید کی سزا دے دی اور اس جگہ سے ہم پنجاب کے گجرات جیل میں بھیج دیے گئے۔ جب ہم جیل خانے میں پہنچے تو وہاں پشاور کے ہمارے دوسرے ساتھیوں علی گل خاں سید لال بادشاہ وغیرہ دوسرے اصحاب کو بھی لایا جا چکا تھا۔ اس جیل خانے میں پنجاب دہلی صوبہ سرحد کے لیڈر سیاسی قیدی تھے۔ ان میں چاہے سکھ ہوں، ہندو ہوں یا مسلمان سب ہی اصحاب نہایت معقول اور سنجیدہ مزاج تھے۔ اس جیل خانے میں میں نے جس قدر مذہبی، علمی اور سیاسی فائدے حاصل کیے اور جو اعلیٰ پر مسرت اور شاندار زندگی گزاری ویسی زندگی مجھے دوسرے کسی جیل خانے میں پھر کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ یہاں عالموں کی جو شائستہ سوسائٹی مجھے ملی تھی ویسی سوسائٹی بھی پھر مجھے کہیں نہیں ملی۔ ڈاکٹر انصاری ڈاکٹر گوپی چند، لالہ شیام لال، رائے زادہ ہنس راج، پنڈت جگت رام ہری انوی، سیف الدین کچلو اور مفتی کفایت اللہ جیسے عالم اس جیل میں ہمارے ساتھ تھے۔

جس وقت ہم لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور اپنے صوبے

سے باہر پنجاب میں لاکر گجرات کے جیل میں بند کر دیا گیا تو اس وقت وہاں فوج پہنچ گئی تھی اور اس نے اتمان زئی کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ سب سے پہلے فوجی جوان خدائی خدمت گاروں کے دفتر پر چڑھ گئے اور دوسری منزل سے جہاں ہمارا دفتر تھا تمام خدائی خدمت گاروں کو نیچے پکی سڑک پر پھینک دیا۔ میرا لڑکا ولی اس وقت چودہ پندرہ سال کا تھا۔ اسکول سے چھٹی ملنے پر دفتر میں آگیا تھا اور دفتر میں وہ خدائی خدمتگاروں کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک گورے نے اسے سنگین مارنی چاہی لیکن ایک صوبے دار نے سنگین کے آگے اپنا ہاتھ پھیلایا اور اسے بچا لیا۔ اس صوبے دار نے ولی کو ہاتھ سے پکڑ کر بڑے آہستہ سے نیچے اتار دیا۔ فوجیوں نے خدائی خدمت گاروں کے دفتر میں آگ لگا دی اور اسے جلا کر خاکستر کر دیا۔ پھر گاؤں کا رخ کیا۔ اور سرخ کپڑے پہننے والے جتنے لوگ تھے وہ سب گرفتار کر لئے گئے۔ اور انھیں بڑی بے دردی سے زدوکوب کیا گیا۔

ہمارے جو ساتھی ہماری ملاقات کو آتے تھے ان کے ذریعے ہمیں اپنے صوبے کے حالات سے آگاہی ہو گئی۔ اب ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہمارے یہ ساتھی واپس اپنے گاؤں میں نہ جائیں، بلکہ یہ لاہور، دہلی اور شملے چلے جائیں اور وہ ان بھائیوں سے جو مسلم لیگ میں ہیں اپنے حالات سے آگاہ کریں اور انھیں کہیں کہ وہ ہماری مدد کریں اور نہیں تو کم از کم دنیا کو ہمارے حالات سے تو باخبر کر دیں۔ ہمارے ساتھی چلے گئے اور دو مہینے بعد واپس پھر گجرات آئے اور جیل میں ہم سے ملاقات کی۔ ملاقات کے دوران انھوں نے ہمیں بتایا کہ مسلم لیگی لیڈر ہماری امداد کے لئے تیار نہ ہوئے۔ کیونکہ ہماری لڑائی انگریزوں سے تھی اور وہ انگریزوں کے ساتھ لوہا لینے کے ناقابل تھے۔

اس وقت ہم کانگریس میں نہیں تھے اور نہ ہی ہماری کانگریس سے کسی قسم کی جان پہچان تھی۔ ایک آدمی جو دریا میں ڈوب رہا ہو، بہا جا رہا ہو، وہ تو ہر ایک بوٹے پر ہاتھ مارتا ہے۔ ہم جب مسلم لیگ سے مایوس ہو گئے تو ہم نے اپنے ان ساتھیوں سے کہا کہ اب تم لوگ جاؤ اور کانگریسی رہنماؤں سے ملو۔ اگر وہ ہماری مدد کریں تو ہم پر ان کا بڑا احسان ہوگا۔ وہ چلے گئے۔ کانگریسی رہنماؤں سے ملے۔ کانگریسی رہنماؤں نے ہمارے ساتھیوں سے کہا کہ اگر ہم لوگ ان کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں شریک ہونا منظور کریں تو وہ ہماری ہر طرح سے مدد کرنے کے لئے تیار ہیں۔

کانگریسی رہنماؤں کا یہ پیغام لے کر ہمارے ساتھی پھر آکر ہمیں ملے اور ہمیں کانگریس کا یہ پیغام پہنچا دیا۔ اب ہم نے اپنے ساتھیوں کو یہ ہدایت کی کہ وہ اپنے صوبے میں جائیں، یہ معاملہ صوبے کے خدائی خدمت گاروں کے جرگے میں پیش کریں۔ وہ چلے گئے انھوں نے جرگہ بلا لیا اور جرگے کے سامنے یہ سب باتیں رکھ دیں۔ اہل جرگہ نے کانگریس کی بات قبول کر لی اور فیصلہ کیا کہ اگر کانگریس کے رہنما ہماری مدد کرتے ہیں تو ہم بھی ان کے ہمنوا ہیں۔ چنانچہ انھوں نے کانگریس میں شرکت کا اعلان کر دیا۔

انگریزوں کو یہ خبر ملی کہ ہم پٹھان لوگ بحیثیت مجموعی کانگریس میں شامل ہو گئے ہیں تو انھوں نے اپنی بے وقوفی کو محسوس کیا اور ایسے ہوش ٹھکانے آئے کہ انھوں نے میرے پاس پیغام بھیجا، "آؤ ہمارے ساتھ صلح کر لو، جو اصلاحات ہم نے ہندوستان کو دی ہیں وہ تم لوگوں کو بھی دے دیتے ہیں اور آئندہ جو کچھ ہندوستان کو دیں گے تمھیں اس سے بھی زیادہ دیں گے۔ لیکن اس شرط پر کہ تم لوگ کانگریس کو چھوڑ دو۔"

میں نے حکومت کو جواب دیا کہ چونکہ تم نے ہم پر اعتبار نہیں کیا ہے۔ اس لئے ہم بھی تم پر اعتبار نہیں کر سکتے ہیں۔

ترکش کا آخری تیر
ٹیپو سلطان



کتاب : ترکش کا آخری تیر

تصنیف : مجاہد حسین

تلخیص : احمد بن علی

یہ اس سازش کی عبرت ناک داستان ہے جس کے تار لندن سے سرنگا پٹم تک پھیلے ہوئے تھے اور جس میں خود ہندوستان کے بعض راجہ اور نواب بھی شریک تھے ۔۔۔۔۔۔ ٹیپو سلطان کی سلطنت خداداد ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی اور دکن کا یہ شہید آزادی انگریزوں کے مقابلے میں ایک آہنی دیوار بنا ہوا تھا ۔۔۔۔۔۔ چنانچہ انگریزوں نے سلطنت میسور کے خلاف تاریخ کی سب سے بڑی سازش کی اور خود ہندوستان کے بعض غداروں کی وجہ سے یہ سازش کامیاب بھی ہو گئی ۔۔۔۔۔۔ ہندوستان کی آخری تلوار ٹوٹ گئی، آخری حصار مسمار کر دیا گیا اور سرینگا پٹم کے قلعے کے نیچے ہندوستان کی زمین ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹیپو کے لہو سے لالہ زار بن گئی ۔۔۔۔۔۔

یہ تلخیص جو شائع کی جا رہی ہے بہت مختصر ہے لیکن اس کے باوجود اس کا مطالعہ قاری کے سامنے ٹیپو سلطان کی جدوجہد آزادی سے بھرپور زندگی کی ایک تصویر ابھار دے گا اور مجھے یقین ہے کہ جیسے ہی قاری کی نگاہوں کے سامنے یہ تصویر آئے گی، اس کی آنکھ میں آنسو آ جائیں گے ۔۔۔۔۔۔

سلامت علی مہدی

"میرے بعد میر صادق، پورنیا اور میر غلام علی کو قتل کر دینا، کیونکہ ان کی نیتوں میں فتور ہے۔"

یہ تھی وہ وصیت جو سلطان حیدر علی والیٔ میسور نے اپنے جانشین سلطان ٹیپو شہیدؒ کو بستر مرگ پر کی۔ سلطان ٹیپوؒ کو ان تینوں نمک حرام وزیروں کی بدولت جن ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا شکار ہونا پڑا، ان کا جائزہ لیا جائے، تو حیدر علی کی گہری سیاسی بصیرت اور فراست کا پتہ چلتا ہے، لیکن حالات نے سلطان ٹیپو شہیدؒ کو اس گراں مایہ نصیحت پر عمل کرنے کی توفیق نہ دی۔ نتیجہ جو کچھ نکلا تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے۔

جدید میسور کے بانی سلطان حیدر علی خاں بہادر کا شمار تاریخ کی ان نادرِ روزگار اور اولوالعزم شخصیتوں میں ہوتا ہے جو گمنامی کے گوشے میں جنم لیتی ہیں، اکثر یتیمی کے سائے میں پلتی ہیں، عسرت و افلاس کی آغوش میں پروان چڑھتی ہیں، گوناگوں مصائب اور انتہائی ناسازگار حالات میں سنِ شباب کو پہنچتی ہیں اور اپنی خداداد صلاحیتوں، محنت اور تگ و دو کی بدولت شہرت و عظمت کی بلندیوں کو چھوتی اور اپنے پیچھے اپنے غیر فانی کارناموں کے نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔

حیدر علی نے ۱۷۲۲ء میں ضلع کولار (میسور) کے ایک غیر معروف قریے میں ایک غریب قریشی خاندان میں آنکھ کھولی۔ عمر کی پانچویں سیڑھی پر قدم رکھا، تو باپ چل بسا۔ ماں نے نہایت ناموافق حالات میں پالا پوسا۔ حیدر علی باقاعدہ کسی مکتب میں تو نہ پڑھ سکا البتہ فنونِ سپہ گری میں جلد ہی مہارت حاصل کر لی اور جب جوان ہوا، تو میسور کی فوج میں بھرتی ہو گیا۔ وہ مضبوط اعضاء اور چاق چوبند جسم کا مالک تھا؛ اس کے ساتھ ساتھ قدرت نے اسے خود اعتمادی اور صبر و استقلال کی دولت سے بھی نوازا تھا؛ چنانچہ ان خداداد صلاحیتوں کے سہارے ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے افواجِ میسور کا سپہ سالارِ اعظم بن گیا۔ اس کے اخلاق اور حسنِ سلوک نے فوج کا دل موہ لیا اور وہ اس کے پسینے کی جگہ اپنا خون چھڑکنے لگی۔ اس کی یہ ہر دلعزیزی میسور کے راجہ کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی۔ اس نے حیدر علی کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ اس کو گرفتار کرنے کے لئے منصوبہ تیار ہوا، امداد کے لئے پڑوس کے

مرہٹہ سردار کو بلایا گیا۔ مگر عین وقت پر راز فاش ہو گیا۔ اپنے بچھائے ہوئے جال میں راجہ خود پھنس گیا۔ حیدر علی چاہتا تو مغلوب مفتوح راجہ کی گردن مار سکتا تھا، مگر اس نے انتہائی عالی ظرفی اور رواداری سے کام لیا اور نہ صرف راجہ کی جان بخش دی بلکہ اس کو تین لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر بھی مرحمت کی۔

اس طرح ۱۷۶۱ء میں حیدر علی برسر اقتدار آیا اور بیس برس کے عرصے میں میسور کو اپنے دور کی ایک عظیم طاقت بنا دیا۔ جس وقت حیدر علی نے تخت پر قدم رکھا، میسور، دارالحکومت (سرنگاپٹم) اور ۳۳ دیہات پر مشتمل (ایک تحصیل کے برابر) چھوٹی سی ریاست تھی جس کے نام سے جنوبی ہند کے علاوہ کوئی واقف نہ تھا، لیکن جب ۱۷۸۲ء میں حیدر علی نے رحلت کی، تو میسور کی حدود ۸۰ ہزار مربع میل رقبے پر محیط تھیں اور اس کی شہرت یورپ اور انگلستان تک پہنچ چکی تھی۔

جن دنوں حیدر علی نے میسور میں عنانِ اقتدار سنبھالی، ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت کا لبادہ اتار کر سیاسی قوت کی حیثیت سے میدان میں آ چکی تھی۔ ۱۷۵۱ء میں ارکاٹ کی فتح اور ۱۷۵۷ء میں معرکۂ پلاسی میں کامیابی نے اس کے دامن حرص کو اور وسیع کر دیا۔ اب وہ پورے ہندوستان کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ انگریزوں کی راہ میں اس وقت تین طاقتیں حائل ہو سکتی تھیں۔

۱۔ سلطان حیدر علی والیٔ میسور

۲۔ نظام حیدر آباد دکن

۳۔ مرہٹے

حیدر علی، انگریزوں کی آنکھوں میں سب سے زیادہ کھٹکتا تھا۔ نظام حیدر آباد نے ابتدا ہی سے فرنگیوں کے ساتھ دوستانہ مراسم استوار کر لیے تھے۔ رہے مرہٹے تو وہ پانی پت کی تیسری لڑائی (۱۷۶۱ء) میں زبردست شکست کے بعد بحیثیت ایک متحدہ

میسور کی ابتدائی دو لڑائیوں میں انگریزوں نے نظام اور مرہٹوں کو اپنے ساتھ ملا لینے کے باوجود بری طرح مار کھائی تھی، میسور کی تیسری جنگ سابقہ شکستوں کا انتقام لینے کے لئے لڑی گئی تھی۔ یہ لڑائی انگریزوں نے بیک وقت دو محاذوں پر لڑی — وہ میدانِ جنگ کے علاوہ ٹیپو کے محلات میں بھی مورچے بنا چکا تھا

قوت کے اپنی اہمیت کھو چکے تھے۔ اس کے برعکس حیدر علی ایک تازہ دم قوت کی صورت میں ابھرا تھا اور انگریزی فتوحات کی راہ میں زبردست رکاوٹ بن گیا تھا۔ انگریزوں نے میسور کی اس ابھرتی ہوئی طاقت کو کچلنے کے لئے مرہٹوں اور حیدر آباد سے گٹھ جوڑ کیا اور حیدر علی کے خلاف بلا وجہ اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس طرح میسور اور انگریزوں کے مابین اُن لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا جو تاریخ میں میسور کی جنگیں کہلاتی ہیں۔ اِن چار جنگوں میں سے دو سلطان حیدر علی کے دورِ حکومت میں لڑی گئیں اور دو سلطان ٹیپوؒ کے زمانۂ حکومت میں۔

میسور کی پہلی جنگ ۱۷۶۷ء اور ۱۷۶۹ء کے درمیان لڑی گئی۔ حیدر علی نے انگریزوں کو پے در پے شکستیں دیں اور وہ پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔ میسور کی پہلی جنگ میں سلطان ۶ ہزار کا لشکر لے کر ۱۳۰ میل کا فاصلہ ۳ دن میں طے کرتے ہوئے مدراس پہنچ گیا۔ انگریزوں نے انتہائی بے بسی کے عالم میں صلح کی درخواست کی۔ اسے حیدر علی کی غلطی کہیئے یا انگریزوں کی ڈپلومیسی سے ناواقفیت، وہ مدراس پر کاری ضرب لگا کر جنوب میں ابھرتی ہوئی اس اجنبی قوت کو ختم کر سکتا تھا، لیکن اس موقعے سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس نے انگریزوں کی درخواست قبول کر لی چنانچہ

مندرجہ ذیل شرائط پر صلح ہوگئی:

۱۔ آئندہ فریقین ایک دوسرے کے حلیف ہوں گے۔

۲۔ فریقین ایک دوسرے کے قیدیوں کو رہا اور مفتوحہ علاقے کو خالی کردیں گے۔

۳۔ نواب ارکاٹ محمد علی والا جاہ کرور کا علاقہ حیدر علی کو دے دیا گیا۔

(معاہدۂ مدراس ۲۹ مارچ ۱۷۶۹ء)

(۲)

میسور کی دوسری جنگ (۱۷۸۰/۸۴ء) اس جنگ کی ابتدا بھی انگریزوں کی طرف سے ہوئی حیدر علی اور اس کے جواں سال شہزادے ٹیپو سلطان نے متعدد معرکوں میں فرنگیوں کے دانت کھٹے کئے۔ یہ جنگ ابھی جاری تھی کہ حیدر علی کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور وہ ۷ دسمبر ۸۲ء کو عالم فانی سے کوچ کر گیا۔ اس کی اس ناگہانی موت پر تبصرہ کرتے ہوئے انگریز مورخ سنکلیر لکھتا ہے:

"حیدر علی کے انتقال کے وقت ہندوستان میں انگریزوں کی حالت نہایت پتلی تھی۔ بنگال پر ناگپور کا راجہ حملہ آور ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ وسطی ہند میں نانا فرنویس کی قیادت میں مرہٹے انگریزوں کے خلاف مصروف جنگ تھے۔ جنوب میں ایک طرف فرانسیسی بیڑہ ان کو تباہ کر رہا تھا۔ دوسری طرف حیدر علی کی فوجوں نے ان کے قدم اکھاڑ دیے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا، انگریز کوئی دم کے مہمان ہیں، مگر حیدر علی کی بے وقت موت سے اُن کے اُکھڑے ہوئے قدم جم گئے۔"

حیدر علی کے انتقال کے بعد اس کا ہونہار فرزند ٹیپو تخت نشین ہوا۔ قدرت نے اسے غیر معمولی دل و دماغ عطا کیا تھا۔ حیدر علی نے اسے درسی تعلیم کے علاوہ فنون سپہ گری کی اعلیٰ تربیت بھی دلوائی تھی، وہ صاحب شمشیر ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ اہل قلم بھی تھا۔ وطن عزیز سے اسے والہانہ عشق تھا، انگریزوں کا وجود ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی برصغیر کی نجات اسی میں سمجھتا تھا کہ انگریزوں کے قدم یہاں نہ جمنے پائیں۔

سلطان ٹیپو نے جنگ جاری رکھی۔ دو سال کی مسلسل معرکہ آرائیوں کے بعد انگریزوں کی ہمت جواب دے گئی اور انھوں نے سلطان کی پیش کردہ تمام شرائط کو قبول کرتے ہوئے معاہدۂ بنگلور (۷ مارچ ۱۷۸۴ء) پر دستخط کردیے۔ شرائط یہ تھیں:

۱۔ دوستانہ مراسم قائم رکھے جائیں گے۔

۲۔ مفتوحہ علاقے خالی اور جنگی قیدیوں کا تبادلہ کیا جائے گا۔

میسور کی تیسری لڑائی ۱۷۸۹/۹۲ء سابقہ دو جنگوں میں انگریزوں نے نظام اور مرہٹوں کو ساتھ ملانے کے باوجود بُری طرح مار کھائی تھی۔ اس کا انتقام لینے کے لئے انھوں نے پھر جنگ چھیڑ دی۔ گزشتہ دونوں لڑائیوں میں انھیں جو تلخ تجربہ ہوا تھا، اس کے پیش نظر اس مرتبہ نظام اور مرہٹوں کو ساتھ ملا کر میدان جنگ میں لڑنے کے ساتھ ساتھ محلاتی سازشوں کا جال بھی پھیلایا، مختلف ہتھکنڈوں اور حربوں سے کام لے کر سلطان کے سپہ سالار اعلیٰ، وزیر اعظم، وزیر مالیات اور کئی دوسرے اہم اُمرا سے ساز باز کرلی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اہل میسور کی وہی تلوار جو پہلی دو جنگوں میں انگریزوں کے دانت کھٹے کر چکی تھی، تیسری جنگ میں کُند ثابت ہوئی۔ وہ شیر میسور جس کی دھاڑ سے فرنگیوں کا پتہ آب آب ہوجاتا تھا چند کی معرکوں کے بعد اپنے دارالحکومت (سرنگاپٹم) میں محصور ہونے اور انتہائی ذلت آمیز شرائط قبول کر لینے پر مجبور ہوگیا ۲۳ فروری ۱۷۹۲ء کو جو رسوا کن معاہدۂ سرنگاپٹم طے پایا، اس کی دو شرائط حسب ذیل تھیں:

۱۔ سلطان متحدہ طاقتوں (انگریزوں، مرہٹوں اور نظام) کو چھ کروڑ روپیہ بطور تاوان جنگ ادا کرے گا جس میں

سے تین کروڑ نقد اور تین کروڑ کے عوض نصف ریاست دے گا۔

۲: تاوانِ جنگ کی ادائیگی تک سلطان اپنے دو بیٹے یرغمال کے طور پر انگریزوں کی تحویل میں دے گا۔

معاہدے کی پابندی کرتے ہوئے سلطان نے اپنے دو شہزادے انگریزوں کے حوالے کر دیے۔ مگر بددیانت کارنوالس (گورنر جنرل) نے بدعہدی کی اور سلطان سے مطالبہ کیا کہ کورگ کے علاقے سے دست بردار ہو جائے ورنہ وہ معاہدے پر دستخط نہیں کرے گا۔ شکست خوردہ سلطان کو ناچار یہ شرط بھی منظور کرنا پڑی۔

(۳)

میسور کی چوتھی جنگ اور سلطان کی شہادت ۱۷۹۹ء۔

بظاہر انگریزوں نے صلح کر لی لیکن درپردہ وہ سلطان کے خلاف تیاریوں میں مصروف رہے۔ وہ اس حقیقت سے باخبر ہو چکے تھے کہ جب تک ٹیپو زندہ اور اس کی ریاست موجود ہے، انگریزی حکومت کی بنیادیں برصغیر میں مستحکم نہیں ہو سکتیں۔ دوسری طرف سلطان بھی سرزمینِ ہند کو فرنگیوں کے وجود سے پاک کر دینے پر تلا ہوا تھا؛ چنانچہ اس نے سلطانِ ترکی، شاہِ افغانستان اور شاہِ فرانس (نپولین اعظم) کے درباروں میں امداد کے لئے سفیر روانہ کئے علاوہ ازیں "ہندوستان ہندوستانیوں کے لئے ہے" کا واسطہ دے کر ملک کے بڑے بڑے راجاؤں اور نوابوں کے نام خطوط بھیجے۔

۱۷۹۸ء میں لارڈ ولزلی کمپنی کے مقبوضات کا گورنر جنرل بن کر آیا، وہ اپنے ساتھ برطانوی وزیر اعظم پٹ کا تیار کردہ ایک منصوبہ بھی لایا۔ اس منصوبے کا مقصد بظاہر پورے ملک میں امن وامان قائم کرنا تھا، لیکن دراصل وہ آزاد ہندوستان کو فرنگی اقتدار کے زیرِ تسلط لانا چاہتا تھا۔ اس منصوبے کو تاریخ میں سب سڈی

> سلطان ٹیپو نے فیصلہ کر لیا تھا کہ انگریزوں کے خلاف وطن کی جنگ آزادی زندگی کی آخری سانس تک جاری رکھی جائے گی۔ ملک کو فرنگیوں کے وجود سے پاک کرنا ان کی زندگی کی آخری تمنا بن چکا تھا۔ انھوں نے پورے ملک کو انگریزوں کے خلاف کھڑا کر لیا تھا لیکن وطن کی تقدیر میں غلامی لکھی تھی، اس لئے پانسہ پلٹ گیا۔

ایری سسٹم SUBSIDIARY کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے اہم نکات مندرجہ ذیل تھے۔

۱: ہندوستانی ریاستیں اپنی فوجیں ختم کر دیں۔ ان کی جگہ انگریزی فوجیں رکھیں۔

۲، انگریزی فوجوں کے مصارف ریاستیں برداشت کریں

۳: خارجی معاملات انگریزوں پر چھوڑ دیں۔

۴، کسی غیر برطانوی فرد کو اپنے ہاں ملازمت نہ دیں۔

ہندوستان کی ریاستوں میں یہ "سعادت" سب سے پہلے حیدرآباد کو حاصل ہوئی۔ اس نے بلا چون وچرا اس پروانۂ غلامی کو منظور کر لیا۔ سلطان ٹیپو کی دوربیں نگاہ نے فوراً بھانپ لیا کہ انگریز اس منصوبے کے ذریعے برصغیر کی موجودہ طاقت کو مفلوج اور بے دست وپا کر دینا چاہتے ہیں؛ چنانچہ انہوں نے بلا تامل اس اسکیم کو ٹھکرا دیا۔ ولزلی کو امید تھی کہ نظام کی طرح ٹیپو بھی اس تجویز کو قبول کر لے گا۔ لیکن جب اسے خلافِ توقع جواب موصول ہوا، تو اس نے سلطان کے خلاف فیصلہ کن جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔

لیکن کارنوالس کی طرح ولزلی نے بھی سلطان کو دلیرانہ دعوتِ مبارزت دینے کے بجائے شیر کو پھانسنے کے لئے دام ہمرنگ

زیں بچھایا۔ اس سازش کی دو کڑیاں تھیں۔ پہلے مرحلے میں سلطان کو باہر سے ملنے والی امداد کی روک تھام۔ دوسرے مرحلے میں سلطان کے درباریوں کو اس کے خلاف آمادہ کرنا۔ پہلے مرحلے میں ولزلی نے مندرجہ ذیل اقدامات کئے:

۱: نظام حیدر آباد کو، جو سب سڈی ایری سسٹم قبول کر چکا تھا، اپنا حلیف بنا کر سلطان کے خلاف کر دیا۔

۲: مرہٹے کو سب سڈی ایری سسٹم کو رد کر چکے تھے مگر انھیں مختلف حربوں سے غیر جانبداری پر رضامند کر لیا۔

۳: والیٔ افغانستان زمان شاہ (احمد شاہ ابدالی کا پوتا) ٹیپو کو امداد کا یقین دلا چکا تھا، بلکہ لشکر لے کر کابل سے چل پڑا تھا۔ ولزلی نے سیاسی جوڑ توڑ کے ذریعے ایران سے کابل پر حملہ کرا دیا۔ ناچار اُسے راستے سے لوٹنا پڑا۔

۴: دوسرے مرحلے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کیلئے کرنل ریڈ (RED) کی قیادت میں سینئر فوجی افسروں پر مشتمل ایک "سازش کمیشن" قائم کیا۔ یہ کمیشن رات دن اپنی زیر زمیں سرگرمیوں میں مصروف رہا اور چند ہی ماہ میں اس نے روپے پیسے، جاگیر اور منصب کا لالچ دے کر سلطنت کے تقریباً تمام بڑے بڑے عہدے داروں کو اندر ہی اندر توڑ لیا۔ ان عہدے داروں کی تفصیل ملاحظہ ہو:

میر صادق علی۔ وزیر اعظم

پورنیا۔ وزیر مال اور محکمہ جاسوسی کا انچارج

بدر الزماں خاں نائطہ۔ وزیر بحری فوج

میر غلام علی لنگڑا۔ وزیر خارجہ

علی رضا۔ وزیر

سید محمد میر آصف۔ چیف سیکریٹری

میر قمر الدین۔ سپہ سالار اعظم

میر معین الدین۔ نائب سپہ سالار

راجہ خاں۔ سلطان کا نو مسلم غلام

میسور کی سابق رانیاں بھی ہندو ریاست کی بحالی کے وعدے پر سلطان کے خلاف سازش میں شریک ہو گئیں۔

اندرونی اور بیرونی طور پر سازش مکمل ہو چکی، تو ولزلی نے جنگ کا بہانہ تراشا اور ٹیپو سلطان پر الزام لگایا کہ "آپ ہمارے خلاف نپولین سے سازباز کر رہے ہیں؟"

اور سلطان کے جواب کا انتظار کئے بغیر ۲۲ فروری ۱۷۹۹ء کو اعلانِ جنگ کر دیا۔

انگریزی فوجیں بیک وقت مدراس، بمبئی اور بنگال سے میسور کی طرف روانہ ہو گئیں۔ ادھر دشمن تیزی سے سلطنتِ خداداد کی طرف بڑھ رہا تھا، اُدھر سازشیوں کے ٹولے نے سلطان کے گرد حصار قائم کر رکھا تھا جو ایک طرف اس تک کوئی صحیح خبر نہ پہنچنے دیتا۔ دوسری جانب اسے مطمئن کرنے میں مصروف تھا کہ ہمارے ہوتے فرنگیوں کی کیا مجال جو سرنگاپٹم کی طرف میلی آنکھ کر کے دیکھ سکیں۔ سلطان کو حقیقت حال کی خبر اس وقت ہوئی جب انگریزی سپاہ سرنگاپٹم کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ تیسری جنگ کے دوران میں وزیر اعظم محمد مہدی جھکری نے اعلانیہ غداری کی تھی۔ اس سے سلطان کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ایک جھکری نہیں، پوری وزارت اس کے خلاف سازشوں میں مصروف ہے، لیکن وہ ان اعیانِ سلطنت کے خلاف کوئی بھی اقدام نہ کر سکا۔ اس لئے کہ اسے خانہ جنگی کا خوف تھا۔ سب سے پہلے جنرل ہارس سرنگاپٹم پہنچا۔ صورتِ حال سخت مخدوش تھی۔ سلطان داخلی اور خارجی دشمنوں میں گھر چکا تھا؛ تاہم اس نے ہمت نہ ہاری۔ لشکر کو مرتب کیا اور اس سے پہلے کہ انگریز شہر میں داخل ہوتے، ان سے جا ٹکرایا۔ ۵ مارچ کو سداسیر کے مقام پر گھمسان کا رن پڑا۔ سلطان کے سپاہی جان پر کھیل گئے اور جنرل ہارس پسپا ہوتے پر مجبور ہو گیا۔ ادھر سلطان جنرل ہارس سے الجھا ہوا تھا، اُدھر جنرل سٹوارٹ

دوسری راہ سے سرنگاپٹم کی طرف بڑھا۔ سلطان نے میر قمرالدین کو اس کی پیش قدمی روکنے کے لئے روانہ کیا اور خود حیدرآبادی اور انگریزی فوجوں سے لڑائی جاری رکھی۔

سلطان کا ستارۂ اقبال رو بہ زوال تھا۔ انگریزوں کی سازشیں رنگ لا رہی تھیں۔ دربار اور میدانِ جنگ میں قدم قدم پر مشیر اسے دھوکہ دے رہے تھے۔ ابھی وہ جنرل ہارس سے معرکہ آرا تھا کہ خبر ملی جنرل اسٹوارٹ نے سرنگاپٹم پر حملہ کر دیا ہے۔ میر قمرالدین نے دشمن کو روکنے کے بجائے راستہ چھوڑ دیا تھا۔ ایسے نازک مرحلے میں سپہ سالارِ اعظم کی کھلی غداری سے بڑے سے بڑے حوصلہ مند انسان کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ لیکن ٹیپو نے خطرات کے سامنے جھکنا سیکھا ہی نہ تھا۔ وہ تیزی سے سرنگاپٹم کو پلٹا۔ ابھی وہ شہر میں داخل ہوا۔ ادھر جنرل ہارس اور میر عالم دیوان حیدرآباد کی افواج نے شہر کو آ گھیرا۔

سرنگاپٹم کا یہ محاصرہ ڈیڑھ ماہ سے زائد عرصے تک جاری رہا۔ اس دوران میں قلعے کے اندر اور باہر سازشیں کام کرتی رہیں۔ بالآخر ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو دن کے ایک بجے انگریزی افواج قلعے کی طرف بڑھیں۔ ٹیپو سلطان دوپہر کا کھانا کھانے بیٹھا ہی تھا کہ فرنگی حملے کی اطلاع ملی۔ فوراً اٹھ کر کھڑا ہوا، ہتھیار سجائے، گھوڑے پر سوار ہوا، محافظوں اور وفاداروں کو ساتھ لیا، اور محل (ڈوڈی دروازہ) سے باہر نکلا۔ میر صادق نے فوراً دشمن کو خبر دے دی کہ سلطان محل سے نکل آیا ہے؛ چنانچہ فرنگیوں نے اپنی بھاری قوت میدان میں جھونک دی۔ سلطان ٹیپو دیر تک فرنگیوں سے لڑتا رہا۔ جب کوئی امدادی دستہ نہ پہنچا تو محل میں داخل ہونے کے لئے پلٹا، لیکن میر صادق نے ڈوڈی دروازہ اس کے نکلتے ہی بند کروا دیا تھا تاکہ دوبارہ قلعہ بند نہ ہو سکے۔ اسی اثنا میں اِلی دروازے پر بھی انگریز قابض ہو چکے تھے۔ سلطان اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کو لے کر انگریزی افواج کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے آگے ڈٹ گیا۔ وہ موت کے نرغے میں آ چکا تھا۔ اس موقع پر ایک افسر نے مشورہ دیا کہ وہ اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دے۔ سلطان نے پلٹ کر غصے سے اس کی طرف دیکھا اور گرج دار آواز میں بولا،

"گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے"

لڑتے لڑتے شام ہو گئی۔ سلطان کے وفادار ساتھی ایک ایک کر کے اس پر نثار ہو گئے۔ اس کا گھوڑا (طاؤس) لہولہان اور چلنے سے عاری ہو گیا۔ خود سلطان کو دو گولیاں لگ چکی تھیں، لیکن وہ زخمی شیر اب بھی پورے جوش و خروش سے دادِ شجاعت دے رہا تھا۔ آخر ایک گولی اس کی کنپٹی میں لگی اور سلطان زندگیٔ جاوداں سے ہمکنار ہو گیا۔

سلطان ٹیپو کی شہادت نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے عالمِ اسلام کے لئے ایک زبردست المیہ تھی۔ یقیناً یہ سب سے قیمتی خون تھا جو اٹھارھویں صدی میں ہندوستان کی آزادی کے تحفظ کے لئے بہا۔ سلطان کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے تاریخِ عالم کے مؤرخین لکھتے ہیں،

"اس کی لاش مقتولوں کے انبار میں پائی گئی۔ جواہرات اور لباس کا کچھ حصہ نکال لیا گیا تھا، مگر تعویذ بدستور اس کے دائیں بازو پر بندھا ہوا تھا۔ اس کو تین گولیاں لگی تھیں۔ دو جسم پر اور ایک کنپٹی میں، مگر چہرہ بگڑا ہوا نہیں تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اطمینان کی نیند سو رہا ہے۔ جسم ابھی تک گرم تھا اور کرنل ولزلی کو جو وہاں موجود تھا، خیال ہوا کہ سلطان ابھی زندہ ہے مگر وہ نبض جو اب تک ہندوستان کی آزادی کے لئے دھڑک رہی تھی ساکت و صامت ہو چکی تھی"

(ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ۔ جلد ۲۲ صفحہ ۱۱۶)

اس خونی ڈرامے میں سلطان کے نمک حرام، ابن الوقت

طالع آزما اور خود غرض وزیروں، مشیروں اور سپہ سالاروں نے جو انتہائی رُسوا کن کردار ادا کیا۔ اس کی چند کڑیاں ملاحظہ ہوں:

سلطان ٹیپو کی کمان میں ایک لاکھ ۸۰ ہزار فوج تھی۔ اس میں سے ۴۴ ہزار سرنگا پٹم میں، باقی مدورے، بنگلور، منگلور، ہوسکوٹہ، مادھوگری، حیدرنگر وغیرہ مختلف چھاؤنیوں میں متعین تھی۔ غدار وزیروں نے سرنگا پٹم کے سوا تمام سالاروں کو احکام بھیج دیئے تھے کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کریں۔ اگر ان قلعوں سے ٹیپو کی فوجیں آجاتیں، تو خود انگریز محصور ہوکر رہ جاتے۔

سرنگا پٹم کے محاصرے کے دوران میں انگریزوں نے دوسرے شہروں کے راستوں کی ناکہ بندی نہیں کی تھی جنگی نقطۂ نظر سے یہ ایک فاش غلطی تھی، مگر سازشیوں نے انھیں یقین دلا دیا تھا کہ بیرونی قلعوں سے کوئی کمک نہیں آسکے گی: چنانچہ انھوں نے اس غلطی کا کوئی تدارک نہ کیا۔

سلطان نے میر غلام علی لنگڑا کو سفیر بنا کر استنبول بھیجا تھا، عثمانی سلطنت کا وزیر اعظم انگریزوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ اس نے ۹ ماہ تک تو سلطان کے سفیر کو باریابی کی اجازت ہی نہ دی۔ اجازت ملی تو سارا منصوبہ طشت از بام ہوگیا۔ انگریزی سفیر نے ترک وزیر اعظم کی وساطت سے غلام علی لنگڑا کو پھانس لیا اور اس نے تمام راز بتا دیئے، بلکہ وہ خفیہ تجاویز بھی ظاہر کردیں جو سلطان نے شاہ فرانس کو لکھی تھیں۔ اس طرح انگریز سلطان کے عزائم سے پوری طرح باخبر ہوگئے، انگریزوں نے ترکی کے علاوہ ایران اور عرب میں بھی سلطان کے خلاف پروپیگنڈہ کیا۔ شریف مکہ بھی ان کے ساتھ مل گیا اور سلطان کے خلاف جہاد کا فتویٰ دے دیا۔

انگریزوں نے آخر مارچ میں سرنگا پٹم کا محاصرہ کیا جو ۴ مئی تک جاری رہا۔ محاصرے کے زمانے ہی میں ۳۰ اپریل اور ۲ مئی کو لیفٹیننٹ جل اور لیفٹیننٹ لارنس نے قلعے کا دورہ کیا۔ مگر سلطان کو اس کی خبر تک نہ ہوئی۔

۴ مئی کو سلطان کے محل سے ڈیوڑھی دروازے کے راستے نکلتے ہی میر صادق نے انگریزوں کو مطلع کردیا تھا۔ چنانچہ اس واقعے کی طرف دریا دولت کی ایک تصویر میں واضح اشارہ موجود ہے کہ میر صادق، سلطان کے سامنے کھڑا ایک ہاتھ سے آداب بجا لا رہا ہے اور پیچھے مڑ کر دوسرے ہاتھ سے انگریزی فوج کو اشارہ کر رہا ہے۔

غداری کی یہ انتہا تھی کہ سرنگا پٹم جیسے مضبوط و مستحکم قلعے کو فتح کرنے کے لئے جس میں ۱۴ ہزار کا لشکر جرار اور خود سلطان موجود تھا صرف ۲۶ انگریز سپاہی فصیل پر چڑھے: چنانچہ میجر بٹسن اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے:

"ڈیڑھ بجے جنرل بیرڈ کی قیادت میں حملہ آور پارٹی دو کالموں میں آگے بڑھی۔ ہر کالم میں ایک افسر اور ۱۲ سپاہی تھے۔ ان کے پیچھے ایک اور کالم تھا۔ فوج کا بڑا حصہ ریزرو رکھا گیا تاکہ فصیل پر قبضہ ہوجانے کے بعد آگے بڑھے۔"

سلطان کے نوسلم مرتد غلام راجہ خاں نے جو انتہائی غیر انسانی طرز عمل اختیار کیا اس کے متعلق میڈوز ٹیلر لکھتا ہے:

"سلطان ٹیپو مئی کی شدید گرمی اور چلچلاتی دھوپ میں ایک بجے سے شام کے سات بجے تک بھوکا پیاسا دست بدست جنگ کرتا رہا۔ اس نے آخری وقت تک شجاعت و مردانگی کا مظاہرہ کیا۔ سخت پیاس کے عالم میں اس نے راجہ خاں سے بار بار پانی مانگا کئی بار تو گڑگڑا کر کہا: "خدا کے لئے پانی کا ایک قطرہ لے دو" مگر چھاگل بھری ہونے کے باوجود غلام نے ایک بوند تک نہ دی سلطان کو یکے بعد دیگرے تین گولیاں لگیں جن سے وہ تشنہ لب ہی شہید ہوگیا۔"

سلطان کے زمانۂ محصوری میں انگریزوں نے رعایا کو اس سے بدظن کرنے کے لئے پوری ریاست میں مشہور کردیا کہ سلطان

"وہابی" ہے سلطان کی مذہبی اصلاحات سے جن نام نہاد پیروں اور مُلّاؤں کے مفادات پر زد پڑی تھی، انھوں نے یہ کہہ کر عوام کو ورغلایا کہ انگریز، سلطان کے مقابلے میں دین کی حفاظت بہتر کر سکتے ہیں۔ انگریزوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ ترکی کے سلطان اور شریف مکّہ کے نام سے فتوی شائع کروائے کہ سلطان کے خلاف ہونا شریعت کی رُو سے جائز ہے۔

سُلطان کی شہادت سے فرنگیوں کو بے انتہا خوشی ہوئی۔

• سلطان کی لاش کو دیکھ کر جنرل ہارس بے ساختہ پکار اُٹھا۔

"آج ہندوستان ہمارا ہے۔"

بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ جنرل ہارس کا یہ نعرۂ انبساط بے جا نہ تھا۔ فتح میسور کی خبر لندن پہنچی، تو تاریخی جشن منایا گیا۔ ۹ فروری ۱۸۰۰ء کو کلکتہ میں ایک شاہانہ جلوس نکالا گیا۔ اب تک انگریزی، فارسی، اُردو اور فرانسیسی زبان میں میسور اور سلطان ٹیپو کے متعلق جس قدر تاریخی کتب منظرِ عام پر آئی ہیں، اُن سب میں سازش کا سرغنہ میر صادق کو قرار دیا گیا ہے۔ لیکن تاریخ میسور کے محقق جناب محمود علی خاں محمود منگلوری نے اپنی تازہ ترین تالیف "سلطان ٹیپو" میں پہلی بار مستند حقائق سے یہ ثابت کیا ہے کہ سازش دراصل سلطان کے ان نوائط وزیروں اور میروں نے تیار کی تھی جو دربار اور فوج کے علاوہ چھوٹے بڑے تمام محکموں پر چھائے ہوئے تھے اور ان کا سرخیل ارکاٹ کے نائط نواب چندا صاحب کا بیٹا علی رضا تھا۔ جسے خود فرانسیسیوں نے حیدر علی کے پاس بھیجا تھا کہ وہ سلطان کی مدد سے اپنی کھوئی ہوئی ریاست حاصل کر سکے۔ محمود منگلوری کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے

"آج سے سولہ سال پیشتر، تاریخ سلطنت خداداد اور اس کے دس سال بعد صحیفۂ ٹیپو سلطان لکھنے اور اس موضوع پر دستیاب زیادہ سے زیادہ کتابیں پڑھنے کے باوجود میرے دل میں یہ خلش رہی کہ سلطنت خداداد کی اصل تباہی کا باعث محض نظام حیدرآباد، میر صادق اور پورنیا کی سازش نہیں، بلکہ کوئی اور گہری سازش تھی جس پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ اتفاق سے ۱۹۵۰ء میں مجھے میسور جانا پڑا۔ وہاں ایک سالہ قیام کے دوران میں میرے ہاتھ ایک چھوٹی سی نئی کتاب لگی۔ یہ میجر سانڈرس کا لکھا ہوا میسور کی چوتھی جنگ کا روزنامچہ تھا۔ اس میں دو خط میری نظر سے گزرے۔ ان میں دوسرا خط اور اس پر لکھے ہوئے ریمارکس پڑھ کر مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ سولہ سال سے جو عقدہ لاینحل تھا، فوراً حل ہو گیا۔ یہ دونوں خط شاہِ فرانس نپولین اعظم کی طرف سے تھے۔ ایک سلطان ٹیپو کے نام اور دوسرا شریف مکّہ کے نام۔ پہلے خط کی عبارت تھی،

"میری اور میری فوج کی دلی خواہش ہے کہ کسی طرح آپ کو برطانیہ کے آہنی پنجے سے نجات دلائی جائے۔ میرا خیال ہے کہ مسقط اور موخا کے راستے آپ تک پہنچوں، لیکن اس سے قبل آپ کے ملک کی سیاسی حالت سے باخبر ہونا ضروری ہے، اسلئے آپ اپنے ایک سربرآوردہ اور قابلِ اعتماد عہدیدار کو سویز یا قاہرہ کے راستے میرے پاس بھیج دیں جس کے ساتھ میں گفتگو کر سکوں۔"

دوسرے خط کا مضمون تھا،

"میں اور میری فوج ظفر موج پہنچ گئی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ تمام ممالک اسلامیہ کو برطانیہ کی غلامی سے چھٹکارا دلاؤں اور خاص طور پر اپنے دوست اور آپ کے دینی بھائی ٹیپو سلطان کو کمک دوں۔ اس لئے میری درخواست ہے کہ آپ دوسرا خط جو ٹیپو سلطان کے نام ہے، اپنے کسی معتبر کے ہاتھ ان تک پہنچا دیں۔"

یہ دونوں خط نپولین نے شریف مکّہ کے نام بھیجے، اُسے خدشہ تھا کہ کوئی فرانسیسی لے کر گیا، تو انگریز اُسے پکڑ لیں گے۔ اس نے شریف مکّہ کو ٹیپو کا دینی بھائی اور ہمدرد خیال کرتے ہوئے اس کی معرفت خط بھیجنا چاہا، مگر اس ہاشمی زادے نے دونوں

خط انگریز پولیٹیکل ایجنٹ (ولسن) مقیم جدہ کے سپرد کر دے۔

ولسن نے ان پر یہ ریمارکس دے:

"شریف مکّہ کے وزیر اوّل شیخ سلیمان اور سیکرٹری اوّل محمّد امین نے ان درج بالا خطوط کی نقلیں میرے منشی کے ذریعے مجھے پہنچائی ہیں۔ دستخط۔ ایس ولسن"

سائمنڈس کے روزنامچے میں حقیقتِ حال دیکھتے ہی میرا خیال فوراً ان اہلِ نوائط کی جانب گیا جو اپنے آپ کو بنی ہاشم کہلاتے تھے اور سلطنت کے ہر محکمے میں دخیل تھے۔

ان میں سے میر غلام علی جھکری (وزیرِ اعظم) علی رضا (وزیر یا بدراقبال خاں (وزیر بحر) سید محمد میر آصف (چیف سیکرٹری) نمایاں ترین تھے۔ یہ سب کے سب ارکاٹ کے نوائط اور نواب کے رشتہ دار تھے اور پانڈیچری یا ارکاٹ سے میسور آئے تھے۔ ان میں سے علی رضا ارکاٹ کی نوابی کا مدعی تھا۔ میر صادق اور غلام علی لنگڑا گو اہلِ نوائط میں سے نہ تھے، تاہم ان کے حامی ضرور تھے۔

انگریز ان لوگوں کی سرشت سے واقف تھے۔ کارنوالس نے انھیں میسور اور ارکاٹ کی گدّیاں دلانے کا وعدہ کر کے ساتھ ملا لیا۔ انھوں نے تیسری جنگ میں سازش کی، مگر ناکام رہے۔ آخر چوتھی جنگ میں وسیع پیمانے پر نہایت گہری سازش تیار کی، اور کامیاب ہو گئے۔

جنرل ہارس اور سلطان کی خط و کتابت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز میسور کی آزادی کو ختم کرنے کے ارادے سے آئے تھے۔ لیکن اہلِ نوائط سلطان کے خون کے پیاسے تھے۔ انھیں خوف تھا کہ سلطان زندہ رہا، تو کہیں ولزلی بھی کارنوالس کی طرح سلطنت اسی کو نہ دے دے۔

انگریز جب قلعے کی فصیل پر قابض ہو گئے اور سلطان کی واپسی کا راستہ روک دیا گیا، تو عوام کو پتہ چلا کہ یہ سب کچھ اہلِ نوائط کی سازش کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے ان غدّاروں اور ان کے حامیوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ میر صادق انھیں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اہلِ نوائط نے کمال ہوشیاری سے پوری سازش کا کرتا دھرتا اسی کو قرار دے دیا۔ علی رضا اور اس کے ساتھی بچ گئے بشن لکھتا ہے:

"سلطان کے وفاداروں نے علی رضا کے چار رشتہ داروں اور محمد درویش کو قتل کر ڈالا، وہ علی رضا کے رشتہ داروں اور تمام اہلِ نوائط کو قتل کرنا چاہتے تھے۔"

بنابریں اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ سازش اور غدّاری کا اصل سرغنہ علی رضا تھا۔ پورنیا، میر صادق اور غلام علی لنگڑا سازش کے ثانوی کردار تھے، جنھوں نے علی رضا کی حمایت میں سلطان سے غدّاری کی۔

ماہِ رمضان المبارک اپنے جلو میں ہزار نعمتیں لے کر آ چکا ہے ــــ یہ وہ افضل و برتر مہینہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی برکتوں اور عنایتوں کی بارش ہر ماہ سے زیادہ ہوتی ہے ــــ یہ مہینہ عبادت و ریاضت کا مہینہ ہے ــــ گناہوں سے توبہ کا مہینہ ایک ایک لمحہ ایک ایک پل ــــ اس مقدس مہینے کا بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مقدس کلام کے نزول کا یہ مہینہ ہمیں سال بھر کے گناہوں سے نجات دلاتا ہے ہمارے لیے جنت کے دروازے کھول دیتا ہے ــــ شیطان مردود کو ہم سے جدا کر دیتا ہے اور قربِ الٰہی کا موقع فراہم کرتا ہے ــــ ایک ماہ کی مسلسل نفس کشی اور عبادت و ریاضت ہمیں تپتا ہوا سونا بنا دیتی ہے ــــ ہر قسم کی گندگیوں، برائیوں سے پاک صاف کر دیتی ہے۔

ماں اور دھرتی ماں

تصنیف : چنگیز آئتماتوف
تلخیص : ستار طاہر



چنگیز آئتماتوف ۱۹۲۸ء میں کرغیزیا میں پیدا ہوا، وہ مذہباً مسلمان ہے اور اس کے کردار بھی مسلمان ہوتے ہیں۔ آئتماتوف ۱۹۵۷ء سے تخلیقی کام کر رہا ہے۔ ۱۹۶۳ء میں اُسے روس کا سب سے بڑا ادبی اعزاز لینن پرائز دیا گیا۔ آج وہ عالمی شہرت کا ناول نگار ہے۔

آئتماتوف سماجی حقیقت نگاری کے مکتبِ فکر کا تخلیقی فن کار ہے۔ اس کا یہ ناول "مدر ارتھ" اس کا سب سے عظیم شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ اس ناول کی زبان اور طرزِ اظہار بڑا مؤثر اور خوب صورت ہے۔ ماں اور مادرِ وطن اس ناول کے دو کردار ہیں۔ ماں اپنے شوہر اور بیٹوں کی قربانی دے کر مادرِ وطن کے لئے اپنا آخری سہارا بھی قربان کرنے پر آمادہ ہے، دھرتی اپنے ان جیالے بیٹوں کی رطب اللسان ہے، جو اس کی آبرو کے لئے اپنا سب کچھ خوشی سے لٹا دیتے ہیں۔ یہ ناول دو ماؤں کی —— المناک، ولولہ بخش، اور حیات سوز داستان ہے جو ہر انسان کی مائیں ہیں —— ایک وہ ماں جو جنم دیتی ہے، اور دوسری وہ ماں جو انسان کو پالتی ہے، اناج دیتی ہے، زندہ رہنا اور عزت سے مرنا سکھاتی ہے۔

سلامت علی مہدی

دھوبی سے دُھلے دُھلائے سفید کپڑوں میں ملبوس بوڑھی تولگنائی کھیت کے کنارے کھڑی ہو گئی۔ آسمان پر سُرمئی بادل تیر رہے تھے۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

"سلام ماں" —— بوڑھی عورت نے دھرتی ماں سے کہا۔

"سلام تولگنائی، اچھی تو ہو، تم تو بوڑھی ہو گئی ہو ——"

"ہاں ماں —— میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ اور ——"

"تولگنائی کیا تو نے اپنے پوتے کو بتا دیا کہ وہ کون ہے —— اب تو وہ جوان ہو گیا ہے"

"ماں —— دھرتی ماں —— میں ڈرتی ہوں، تو جانتی ہے کہ میری داستان کتنی المناک ہے، میں نے کئی بار ارادہ کیا ہے کہ اپنے پوتے، اور سب کو —— اپنی کہانی سُناؤں، مگر پھر ——"

"تولگنائی بیٹھ جا، تُو تھک گئی ہے۔ ہاں بھلا یاد تو کرو، تو سب سے پہلے، میرے پاس کب آئی تھی؟"

تولگنائی دھرتی ماں کی گود میں بیٹھ گئی۔ اور پھر آہستہ آہستہ دھیمے لہجے میں یوں بولنے لگی، جیسے دُھندلے دنوں کی چمکدار یادوں کو کُرید رہی ہو۔

"دھرتی ماں، اب تو مجھے اتنا ہی یاد ہے کہ میں ننھی سی تھی جب کھیتوں میں لائی جاتی تھی۔ پھر میں کچھ بڑی ہوئی، اور تیرے سینے پر بھاگنے دوڑنے لگی، دھرتی ماں، مجھے کبھی اچھے کپڑے پہننے نصیب نہ ہوئے، مگر میں ایک خوبصورت لڑکی تھی، میں اپنے سائے کو دیکھ کر ناچ اٹھا کرتی، اور پہروں آئینے میں اپنا چہرہ تکا کرتی تھی —— اور یہیں تیری گود میں ہی، میں نے سب سے پہلے سیوان کو دیکھا تھا، تب میری عمر سترہ سال تھی۔ فصل کٹ رہی تھی، اور میں لڑکیوں میں تیز طرار سمجھی جاتی تھی۔ غیر ارادی طور پر میرا اور اس کا مقابلہ ہو گیا۔ وہ مجھ سے بہت آگے نکل گیا۔ میں اس کی جیت سے چڑ گئی۔ وہ مجھے خوش کرنے کے لئے پیچھے پلٹ آیا، اور یوں ——

اس لمحے نے ہمارے دلوں کو اپنی مٹھی میں لے لیا ــــــ

"ہم دونوں پو پھٹے سب سے پہلے کھیتوں میں پہنچ جاتے، ایک کو دیر ہوتی تو دوسرا انتظار کرتا۔ ہم دونوں اچھے دنوں کے خواب دیکھتے۔ شام کو کام کرنے کے بعد جب ہم تیرے سینے پر لیٹتے تو، تو ہمیں اپنی آغوش میں لے لیتی، میرے دل کی ایک ایک دھڑکن تجھ سے کہا کرتی، دھرتی ماں، تو ہماری ماں ہے۔ ہم سب کی ماں ہے۔ ہماری ساری خوشیاں تیرے دم سے ہیں ــــ

"دھرتی ماں تیرے سینے پر ہل چلاتے، بیج بوتے، پانی دیتے اور فصل کاٹتے ہوئے ہماری محبت نے نیلے آسمانوں کی رفعتوں کو چھو لیا۔ میری اور سیوان کی شادی ہو گئی۔ ہم نے اپنے ہاتھوں سے ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا۔ اور ہمارے گھر کا آنگن بچوں کے میٹھے اور سُریلے قہقہوں سے گونجنے لگا۔ تین بچے ــــــ تین لڑکے ــــــ قاسم، مصلح بیگ اور نیک، ننھے شریر سکول سے واپس آ کر اپنے والدین کو پڑھاتے۔ میں تو چند دنوں میں اکتا گئی مگر ــــ سیوان پڑھنے لکھنے کے قابل ہو گیا۔ ــــ

"دھرتی ماں، وقت گذرتا گیا۔ خوشی کے زمانے پل بھر میں بیت جاتے ہیں۔ ہمارے بچے جوان ہو گئے۔ قاسم نے کھیتی باڑی کا کام سنبھال لیا۔ مصلح بیگ اُستاد بننا چاہتا تھا۔ اس نے تعلیم جاری رکھی۔ نیک گاؤں کے نوجوانوں کی تنظیم کا معتمد چن لیا گیا۔ اس کا زیادہ وقت تنظیم کے دفتر میں گزرتا، ماں کو اپنے سب بچوں سے پیار ہوتا ہے، مگر وہ ایک بچے کو سب سے زیادہ چاہتی ہے اسی طرح میں مصلح بیگ کو سب سے زیادہ پیار کرتی تھی ــــ

"قاسم کی شادی ہوئی اور ہمارے کنبے میں علیمہ کا اضافہ ہوا۔ علیمہ، جوان، خوب صورت اور تنومند پہاڑی لڑکی تھی۔ وہ محنتی، فرمانبردار، اور متحمل مزاج تھی۔ وہ میرا بڑا خیال رکھتی، اور قاسم کے راستوں میں پھول بکھیرتی رہتی۔ قاسم اور علیمہ کو ایک دوسرے سے بے پناہ محبت تھی ــــ

قاسم کی شادی کے بعد، پہلی بار فصل کٹنے کا دن آیا، ہنستے گاتے ہم نے اناج کاٹا، نئی اور تازہ گندم کی روٹیاں پکائی گئیں، نئے اناج کی پہلی روٹی، دھرتی ماں تو جانتی ہے کہ اس وقت کسان کا دل کتنا مسرور ہوتا ہے جب وہ نئے اناج کی پہلی روٹی کو چکھتا ہے اس کا ذائقہ دنیا کی سب نعمتوں سے زیادہ شیریں ہوتا ہے ــــ

"علیمہ نے گھاس پر دسترخوان بچھایا، نئی اور تازہ روٹی کی خوشبو سے کھیت مہکنے لگا۔ سیوان نے روٹی کے ٹکڑے کئے اور پہلا ٹکڑا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تو لگنائی، تو ماں ہے، اور پہلا حق تیرا ہے ــــ"

گرم روٹی میں مہک تھی، محنتی کسانوں کے ہاتھ کی خوشبو، میرا دل خوشی سے ناچ رہا تھا ــــ اور پھر اسی لمحے نیک نے ساز چھیڑا اور کسان بولیاں گانے لگے بھنگڑہ ناچنے لگے ــــ

اس رات جب ہم اپنے گھروں کو لوٹے تو سیوان نے مجھے روک کر کہا تھا۔ تو لگنائی، ہم نے اپنی زندگیاں بیکار نہیں گذاریں، کل ہم جوان تھے آج ادھیڑ عمر کے ہو چکے ہیں۔ زندگی کے کئی سال بڑی تیزی سے گزر گئے، مگر یہ سال بیکار نہیں گذرے ــــ

"سیوان نے غلط نہیں کہا تھا۔ مصلح بیگ بڑے شہر میں پڑھ رہا تھا۔ قاسم اپنے گھر کے لئے زمین تلاش کر چکا تھا۔ نیک اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ دھرتی ماں ــــ تو سن رہی ہے نا!"

"ہاں تو لگنائی۔ میں سب کچھ سُن رہی ہوں" دھرتی ماں

نے جواب دیا "وقت کے آغاز سے میں سب کچھ دیکھ اور سن رہی ہوں۔ انسان کی ساری کہانی اور تاریخ کتابوں میں نہیں ہے، نہ ساری تاریخ انسان اپنے ذہن میں محفوظ رکھ سکتا ہے۔ انسان کی ساری تاریخ کی امین میں ہوں مگر میں ——— آج کچھ نہ بولوں گی، آج تیری باری ہے ———"

"دھرتی ماں ——— تو پھر تو سنتی جا ——— ہم کھیتوں میں تھے کہ ایک گھوڑا سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا، کسان اس کے ارد گرد جمع ہو گئے، اور پھر اس گھوڑ سوار کے منہ سے ایک لفظ نکلا ——— اور یہ لفظ سارے کھیتوں سارے ملک اور ساری دنیا میں پھیل گیا ——— جنگ ———

دھرتی ماں، تجھے تو پتہ ہے کہ جنگ اور امن کی زندگی میں کتنا بھیانک تضاد ہوتا ہے۔ دشمن تیرے سینے پر چڑھ آیا تھا۔ اور تیرے تحفظ کے لئے تیرے بیٹے ——— میدان میں نکل آئے تھے ———

"چند دن کے بعد، قاسم کو بھی بلاوا آ گیا، دھرتی ماں، وہ بھی کیا احساس تھا، کہ ایک ماں، اپنے بیٹے کی جدائی کا زخم اس لئے خوشی خوشی سہہ رہی تھی، کہ سب کی ماں ——— کے سینے پر دشمن گھاؤ لگا رہا تھا ——— علیمہ کا برا حال تھا۔ رو رو کر آنکھیں سرخ کر لی تھیں میں اسے سمجھاتی کہ علیمہ ——— تیرا شوہر ہی نہیں، بلکہ بہت ساری ماؤں کے بیٹے اور بیویوں کے سہاگ مادر وطن کے تحفظ کے لئے لڑ رہے ہیں۔ اور اس وقت آنسو بہانے کا وقت نہیں ہے، بلکہ دشمن کا مقابلہ کرنے کی گھڑی آ گئی ہے۔

"جب قاسم گھر سے جانے لگا تو سیوان نے اسے روک کر کہا تھا، 'بیٹے ——— میری آنکھوں میں دیکھو' باپ اور بیٹا چند لمحوں تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے 'کیا تم میرا مطلب سمجھ گئے؟' 'ہاں بابا'

قاسم نے جواب دیا تھا، 'میں بہادر کسان کا بہادر بیٹا ہوں'۔

"قاسم کے جانے کے ایک ہفتے بعد مصلح کا خط آیا کہ اسے فوج میں بلوا لیا گیا ہے۔ میں ابھی سنبھل نہ پائی تھی کہ سیوان کو بھی بلاوا آ گیا۔ سیوان نے جاتے وقت مجھے کہا تھا "میں بھی اپنے دو بیٹوں کے پیچھے جا رہا ہوں۔ تو لگتا ہے شاید میں واپس نہ لوٹ سکوں، شاید ہم ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہے ہیں۔ اگر میں نے تم پر کوئی زیادتی کی ہو تو مجھے معاف کر دینا۔ دھرتی ——— ماں تو سن رہی ہے نا! اس کھیت میں ——— تیرے سینے پر کھڑے ہو کر ہماری آنکھیں پہلی بار چار ہوئی تھیں، اور یہیں ہم ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئے۔ سیوان نے کہا تھا ——— تو لگتا ہے، ہم اپنی ماں کے سینے پر کھڑے ہیں جس کی خاطر میں لڑنے جا رہا ہوں، زمین بہت دکھ سہتی ہے۔ مرد جنگ پر جا چکے اور اب گاؤں میں تم ہی سب سے سمجھدار عورت ہو، زمین کو بنجر نہ ہونے دینا، بیج بوتی رہنا۔ اور کبھی آنسو نہ بہانا ———

"میں نے سیوان کی بات کو دل میں بٹھا لیا ——— اور گاؤں کی عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کو لے کر ——— کھیتوں میں نکل آئی، اگر میرا شوہر اور بیٹے تیری آبرو کے لئے دشمن کے سامنے سینہ سپر ہو کر کھڑے تھے تو میں تیری خوشحالی اور سرسبزی کے لئے میدان میں نکل آئی تھی ———

"مصلح بیگ کا خط آیا کہ وہ محاذ پر جا رہا ہے، اور اس کی گاڑی قصبے کے اسٹیشن سے گزرے گی۔ اس نے مجھے اسٹیشن پر ملنے کے لئے کہا تھا۔ علیمہ نے گھر میں چولہا گرم کیا، تاکہ وہ اپنے سپاہی دیور کے لئے کھانا لے جا سکے۔

"جب ہم اسٹیشن پر پہنچیں تو اسٹیشن ویران تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد گاڑی کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ میں اور علیمہ بھاگیں۔ مگر یہ فوجی گاڑی نہیں تھی۔ گاڑیاں آتی جاتی رہیں

مگر وہ گاڑی نہ آئی، جس پر میرا مصلح بیگ سوار تھا۔ رات بیت گئی، اور پھر صبح ایک بار پھر گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ یہ فوجیوں کی گاڑی تھی۔ گاڑی اسٹیشن پر رُکی میں نے ــــ ایک لمحے کے لئے اپنے مصلح بیگ کو دیکھا، 'ماں ــــ ماں ــــ' اس نے مجھے آواز دی میں اندھا دُھند اس ڈبے کے ساتھ بھاگنے لگی، جیسے میں اسے پکڑ ہی تو لوں گی، مگر مجھے ٹھوکر لگی اور میں زمین پر منہ کے بل گر پڑی۔ علیمہ نے بھاگ کر مجھے سہارا دیا کھانے کی پوٹلی اس کے ہاتھوں سے گر چکی تھی، اور ایک ہاتھ میں ایک فوجی ٹوپی تھی۔

'ماں ــــ یہ ٹوپی مُصلح تیرے لئے چھوڑ گیا ہے'

میں نے ٹوپی کو اپنے سینے سے یوں لگایا تھا جیسے وہ میرا مصلح بیگ ہو۔

"ماں ــــ دھرتی ماں ــــ تو سُن رہی ہے نا' میرا شوہر، میرے دو بیٹے جنگ لڑ رہے تھے۔ دشمن کے ناپاک قدم تیرے مقدس سینے سے اکھیڑنے کے لئے' اور پھر ــــ میرے سب سے چھوٹے بیٹے نیک کو بھی بلوا لیا گیا جب وہ محاذ پر گیا تو اس کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی، نیک ــــ میرا معصوم بیٹا، جو جنگ میں لڑتا ہوا کھو گیا ہے، جو نہ زندہ لوگوں میں شمار ہوتا ہے' نہ مردوں میں ــــ

"ایک شام جب میں کھیتوں سے واپس لوٹی تو گاؤں کے بچے، بوڑھے اور عورتیں، میرے گھر کے باہر جمع تھے۔ میری ہمسائی عائشہ آگے بڑھی اور اس نے نرمی سے کہا ــــ تولگنائی علیمہ، صبر کرو ــــ سلیمان اور قاسم جنگ میں کام آگئے ــــ

"علیمہ نے چیخ ماری ــــ اور مجھے یوں محسوس ہُوا، جیسے میں بہری ہو گئی ہوں، علیمہ ــــ اور میں ــــ ہم دونوں بیوہ ہو گئی تھیں، ساس بھی اور بہو بھی۔ ہمارے سورج غروب ہو گئے تھے۔ سات دن تک میں بے حِسی کی کیفیت میں مبتلا رہی۔ ساتویں دن گاؤں کی عورتیں، اور بوڑھے میرے پاس آئے۔ ان کی آوازیں، دھرتی ماں مجھے بلا رہی تھی ــــ ایک بار پھر میں لوگوں کے ساتھ کھیتوں میں آگئی۔ دھرتی ماں ــــ تو مجھے بتا لوگ کیوں ظلم کرتے ہیں؟ ــــ کیا دنیا، جنگوں کے بغیر نہیں رہ سکتی؟"

"تولگنائی ــــ میری بچی" دھرتی ماں نے کہا "تو نے بڑا مشکل سوال پوچھا ہے۔ ماضی میں کئی ایسی قومیں جنگوں میں ختم ہو گئیں کہ ان کا کوئی نام لینے والا بھی نہ رہا ــــ صدیاں گذریں ــــ میں صدیوں تک انسان کا انتظار کرتی رہی ــــ اور انسان جنگوں میں ختم ہو چکا تھا جب بھی جنگ شروع ہوتی ہے۔ میں کہتی ہوں ــــ ایک دوسرے کا خون نہ بہاؤ ــــ میں زمین ہوں ــــ دھرتی ماں ہوں۔ تم سب کے لئے ہوں ــــ مجھے تمھاری محبت اور محنت کی ضرورت ہے۔ ایک دانہ بوؤ، میں تمھیں سو دانے دیتی ہوں ایک شاخ کے بدلے میں، ایک درخت۔ میں گہری، اونچی اور وسیع ہوں۔ مگر لوگ ــــ تولگنائی، ظالم دشمن دھرتی کی آواز بھی نہیں سنتا۔ وہ مظلوم کو مارنے کے لئے، زمین ہتھیانے کے لئے ہر ظلم روا رکھتا ہے۔ اور جب مظلوم اپنی ماں کی حفاظت کے لئے اٹھتا ہے ــــ تو پھر جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے ــــ

چند لمحوں کے لئے گہری خاموشی چھا گئی۔ تولگنائی پھر آہستہ آہستہ بولنے لگی،

"دھرتی ماں، جنگ لگے تین سال ہو گئے۔ سلیمان اور قاسم جنگ میں کام آئے ــــ مگر مصلح بیگ اور نیک ابھی زندہ تھے اور پھر ــــ مصلح بیگ کا خط آیا، دھرتی ماں وہ

خط آج بھی میرے گھر میں ہے۔ میرے بیٹے نے لکھا تھا:
'بہت ہی پیاری ماں! جب کچھ دن گزر جائیں گے تو تم مجھ پر فخر کروگی۔ اب تو تم شاید یہی کہوگی کہ اچھے بیٹے، تم اس روشن اور خوبصورت دنیا کو یوں چھوڑنے پر کس طرح رضامند ہو گئے، ماں، تم میری ماں ہو، اور تمھیں مجھ سے یہ سوال پوچھنے کا حق حاصل ہے۔ مگر میں اس وقت اس کا جواب نہیں دے سکتا ہوں۔ شاید ہماری تاریخ کسی دن تمھیں اس سوال کا جواب دے — ماں، یہ جنگ ہم نے نہیں شروع کی۔ ہم مادرِ وطن کے تحفظ کے لئے لڑ رہے ہیں۔ اگر ہم نے دشمن کو اپنے وطن سے باہر نہ نکالا تو ہم انسان کہلانے کے حقدار نہیں ہیں، ماں، تو جانتی ہے کہ میں استاد بننا چاہتا تھا مگر اس وقت میرے ہاتھوں میں چاک اور قلم کے بجائے بندوق ہے۔ میں ایک بچے کو بھی سبق نہیں دے سکا ہوں مگر مجھے خوشی ہے کہ میں اپنے وطن کے لئے کام کر رہا ہوں، اپنے وطن کے دشمنوں سے لڑ رہا ہوں۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد میں اپنے وطن کی آبرو بچانے کے لئے ایک اہم مشن پر روانہ ہو رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں زندہ واپس نہ لوٹ سکوں گا۔ میں اپنے ہموطنوں، اپنی دھرتی ماں، اپنے وطن کی آبرو کے لئے، اس ساری خوبصورتی کے لئے اس موت کو قبول کرتا ہوں جو میرے وطن میں ہے۔ ماں — میرے لئے آنسو نہ بہانا میری قربانی رائیگاں نہیں جائے گی میرے وطن کے دشمن کو شکست ہوگی —

اچھا ماں — الوداع — میرے گاؤں کی دھرتی ماں کو میرا اسلام کہنا — میں اس کا اچھا بیٹا بننے کے لئے جان دے رہا ہوں — الوداع —!'

"اس وقت گاؤں کے بہت سارے لوگ میرے بیٹے کا خط سن رہے تھے، مگر کسی نے آنسو نہ بہائے سب نے ضبط سے کام لیا۔ میرے بیٹے نے کہا تھا 'ماں آنسو نہ بہانا' — میں چیخنا چاہتی تھی، مگر میں چپ رہی۔ میں اپنے بیٹے کی آخری خواہش سے منہ نہ پھیر سکتی تھی۔"

دھرتی ماں نے لیٹے لیٹے آہ بھری — اور بولی "تو لگنائی، میں مصلح بیگ ایسے بیٹوں کو کیسے بھول سکتی ہوں — وہ میرے لئے، اپنے وطن کے لئے، اپنے وطن کی خوبصورتی، عزت اور آبرو کے لئے لڑا اور قربان ہو گیا۔"

"ہاں — دھرتی ماں — جنگ ختم ہو گئی، میرا شوہر سیوان مارا گیا، میرے بیٹے قاسم، مصلح بیگ مارے گئے، اور نیک لاپتہ قرار پا گیا۔ فاتح سپاہی لوٹنے لگے اور علیمہ انھیں دیکھ دیکھ کر قاسم کو یاد کرتی رہتی، جو اب کبھی لوٹ کر واپس نہ آسکتا تھا۔ علیمہ — اب میری بہو نہ رہی تھی۔ وہ میری بہن، میری بیٹی، اور میری سہیلی بن چکی تھی۔ میں اس کو اداس دیکھ کر سوچا کرتی، یہ ابھی جوان ہے۔ ابھی اس کے دل میں ہزاروں امنگیں ہیں۔ یہ زندگی کس طرح گزارے گی۔ اس کے میکے والے اسے لینے کے لئے آئے تو اس نے کہا 'میں اپنی ماں کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔'

"تین مہینے گذر گئے، اور علیمہ کو چپ لگ گئی۔ وہ پہروں اکیلی بیٹھی رہتی — میری ہمسائی عائشہ نے مجھے بتایا کہ علیمہ لٹ چکی ہے — ایک دھوکے باز گڈریئے نے اسے پھسلا لیا تھا۔ اور اب علیمہ کو علم ہوا ہے کہ وہ گڈریا دھوکے باز اور شادی شدہ تھا۔ میں علیمہ کی حالت کو سمجھ گئی۔ گڈریئے کی بیوفائی نے اس کے دل میں قاسم کی محبت کو اور زیادہ بھڑکا دیا تھا۔ میں سوچتی — وہ اگر گناہگار ہے تو میں اس کی ماں ہوں مگر ندامت نے علیمہ کے لبوں پر قفل لگا دیئے — اور ایک

دن وہ یونہی چپ چاپ اپنے میکے چلی گئی ——

"علیمہ کے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ تنہائی کیا ہوتی ہے۔ میں اس کو یاد کر کے آنسو بہاتی۔ چند ہفتوں کے بعد میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں لاری میں سوار ہو کر —— علیمہ کے گھر چل دی۔ ابھی میں راستے میں ہی تھی کہ میں نے علیمہ کو سڑک پر چلتے ہوئے دیکھا۔ میں نے لاری رکوائی اور بھاگتی ہوئی علیمہ کے پاس پہنچی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ گئیں۔ ایک دوسرے کو چومنے لگیں، ہم ایک ساتھ آنسو بہا رہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ماں —— میں آ گئی —— ماں مجھے معاف کر دو، میں تمھیں چھوڑ کر کبھی نہ جاؤں گی۔ ماں ——

—— ہم دونوں گاؤں لوٹ آئیں ——

"علیمہ کے پیٹ میں گلدرتے کا بچہ تھا۔ علیمہ میری بہو نہ تھی —— وہ میری سہیلی اور بیٹی تھی۔ میں ہر وقت تیار رہتی میں جانتی تھی کہ نزاکت کی گھڑی آنے والی ہے اور پھر وہ رات آ گئی، جس کے اندھیروں نے ایک ماں کو نگل لیا علیمہ کراہ رہی تھی۔ اس کی حالت بہت نازک تھی۔ اس کو سنبھالنا میرے بس کی بات نہ رہی تھی۔ میں نے ہمسائی عایشہ کے بیٹے بیگ کو جگایا۔ گھوڑا گاڑی تیار کی۔ اور اس میں علیمہ کو لاد کر ہسپتال کی طرف چل پڑے۔

"راستہ کیچڑ سے بھرا ہوا تھا۔ رات سیاہ تھی اور ہسپتال بہت دور، دریا کے اس پار تھا۔ علیمہ جانکنی کے عذاب میں مبتلا تھی۔ ایک بار وہ چیخی میں مر رہی ہوں میں مر رہی ہوں —— خدا کے لئے گاڑی روکو ——

"میں نے اسے کمزور بازوؤں میں اٹھایا، بیگ نے سہارا دیا۔ اور اسے سڑک کے کنارے گہری تاریکی میں لٹا دیا۔ علیمہ پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ اور الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔' ماں —— تیرا شکریہ —— تو —— مجھے معاف کر دینا —— اوہ —— قاسم قاسم —— میں ——'

"گہری تاریکی میں اس نے بچے کو جنم دیا۔ بچے کی پہلی چیخ کے ساتھ ہی میرا ذہن گھوم گیا —— گاڑی کی گڑگڑاہٹ، اور پھر کسی کی آواز —— ماں —— چاروں طرف گہری خاموشی تھی۔ ایک لمحے میں ایک انسان مر گیا تھا، اور ایک کو زندگی ملی تھی۔ موت اور زندگی کا یہ تصادم —— میں نے دل میں سوچا تھا —— میں جیوں گی —— اس لئے —— اس ننھے کے لئے —— زندگی کبھی نہیں مرتی —— زندگی کبھی نہیں مرے گی، اور مادرِ وطن کی حفاظت کے لئے —— ہر دور میں جیالے بیٹوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

"جب ہم گاؤں کی طرف لوٹے، تو برف گرنے لگی تھی، ہر چیز سپید ہو رہی تھی، علیمہ کا مردہ اور سپید چہرے والا سر گاڑی کے دھچکوں سے ہل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ جیسے وہ —— برف باری کے اس منظر کو آخری بار دیکھ رہی ہو۔

"دھرتی ماں —— تو بھی ماں ہے، اور میں بھی ہوں —— میرے بیٹے تیری عزت اور تیری آبرو پر قربان ہو گئے' میں نے ننھے کو —— اپنی امیدوں کا مرکز بنا لیا۔ وہ اگر بیمار ہوتا تو میں یوں محسوس کرتی جیسے علیمہ ایک بار پھر مر رہی ہو۔ سیوان، قاسم، مصلح، اور نبک —— پھر جنگ پر جا رہے ہوں ——

"جس دن اس نے پہلی بار اپنی توتلی زبان میں مجھے دادی کہا تو میں نے یوں محسوس کیا، جیسے زندگی کا سارا رس … ری مٹھاس میرے کانوں میں انڈیل دی گئی ہو ——

" اب وہ بڑا ہو چکا ہے۔ وہ کچھ نہیں جانتا کہ اس کا باپ کون ہے۔ اس کی ماں کون ہے۔ وہ مجھے دادی کہتا ہے ــــــ وہ تیری کوکھ سے اناج حاصل کرتا ہے۔ کل اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار فصل کاٹی تھی، نئی فصل۔ گاؤں کے لوگ مجھے کھیتوں میں لے گئے تھے۔ مجھ بڑھی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے ــــــ پھر نئے اناج کی خوشبو سے کھیت مہکنے لگے، نئی گندم کی روٹی پکائی گئی، اور ننھے نے تازہ اور گرم روٹی کے ٹکڑے کئے اور پہلا ٹکڑا میری طرف بڑھا کر کہا تھا۔

" دادی کھاؤ ــــــ پہلا حق تیرا ہے ــــــ

" میں نے روٹی کا ٹکڑا منہ میں ڈالا اور دنیا بھر کی حلاوتیں میرے منہ میں گھل گئیں۔ اس روٹی میں محنتی ہاتھوں اور وطن پر جان دینے والوں کے خون کی مہک رچی ہوئی تھی۔ سینکڑوں انسانوں کے ہاتھوں کی مہک ــــــ ان گنت انسانوں کے خون کی خوشبو ــــــ میرے دل سے آواز نکلی تھی۔

روٹی ــــــ اور محنت امر ہیں اور دھرتی ماں لازوال ہے۔ دھرتی ماں ــــــ فصل کٹ چکی ہے ــــــ اب تو تھکن اُتار رہی ہے۔ ایک میں ہوں، ایک تم ہو ــــــ دو مائیں ــــــ دھرتی ماں ننھا بھی تیرا بیٹا ہے۔ میں ننھے انسان کی کہانی ساری دنیا کے لوگوں کو سنانا چاہتی ہوں ــــــ مگر میری زبان رُک جاتی ہے۔ شاید سورج جو آسمان پر چمکتا اور ساری دنیا کا چکر لگاتا ہے، وہ یہ کہانی سب کو سنائے۔ آسمان پر پانی سے لدے ہوئے بادل ساری دنیا پر برستے ہیں، شاید یہ بادل ــــــ اور بارش کے قطرے لوگوں کو یہ کہانی سنا دیں، دھرتی ماں ــــــ تو ہم سب کی ماں ہے، تو سب کو یہ کہانی سنا دے

" تولگنائی ــــــ " دھرتی ماں نے اسے پیار سے بلایا،

" تو انسان ہے۔ تیری آواز میں جو تاثر ہے، وہ کسی کے بس میں نہیں ــــــ تو ہر چیز سے برتر اور بلند ہے، تیری آواز سب تک پہنچ جائے گی ــــــ تو ہی اپنے پوتے کو یہ داستان سنا ــــــ مگر تو اسے کیا بتائے گی ؟"

" دھرتی ماں ــــــ میں اسے بتاؤں گی کہ وہ کسان ہے ــــــ زمین کا بیٹا ــــــ اور اس کو میں نے اس لئے پالا ہے کہ دھرتی ماں سے پیار کرے، اور اس کے سینے پر فصل بوتا رہے، اور اگر دھرتی ماں کا کوئی دشمن ــــــ اپنے ناپاک قدم اس کے سینے پر رکھنے کی کوشش کرے، تو دشمن سے ٹکرا جائے۔ سیوان، قاسم، مصلح اور نیک کی طرح اپنی جان دیدے اور دشمن کے سامنے ہتھیار نہ پھینکے ــــــ ماں ــــــ میں اسے بتاؤں گی کہ وہ صرف کسان ــــــ اور صرف ــــــ مادرِ وطن کا محافظ ہے " دھرتی ماں چپ رہی ــــــ پھیلی ہوئی وسیع و عریض دھرتی ماں ــــــ مادرِ وطن سوچ رہی تھی، جب تک تولگنائی ایسی مائیں جنم لیتی رہیں گی ــــــ اس کے سینے پر دشمن کبھی اپنے قدم نہ جما سکے گا ــــــ

گہری خاموشی ــــــ جیسے دونوں مائیں ایک دوسرے کے دلوں کے سب راز جانتی ہوں ــــــ

" تولگنائی ــــــ کیا تو جا رہی ہے ــــــ "

" ہاں دھرتی ماں ــــــ میں آج ہی ننھے کو اس کا منصب اور فرض بتاؤں گی ــــــ اگر میں زندہ رہی تو پھر آؤں گی ــــــ الوداع دھرتی ماں ــــــ

" الوداع ــــــ تولگنائی ــــــ الوداع ماں ــــــ"

کج خلقی، بے جا سختی ایسی مذموم صفت ہے کہ جس کے اندر یہ خصلت پائی جائے وہ ہر انسان کی نگاہ میں اپنا وقار، اپنی عزت، اپنا مرتبہ اور ساکھ کو گرا دیتا ہے اور ذلیل و خوار ہو جاتا ہے۔



سفرنامہ ابن بطوطہ

محراب اردو ڈائجسٹ دہلی کتاب نمبر ۲۲۵

مشہور عرب سیاح ابن بطوطہ کا سفرنامہ تاریخ میں انتہائی مستند سمجھا جاتا ہے۔ عربی زبان میں اس سفرنامہ کا نام "رحلہ" ہے۔ اس نے اپنی یہ کتاب بادشاہ مراقش کے حکم سے لکھی تھی اور بادشاہ نے اپنے دور کے ایک مشہور کاتب 'ابن جزائی' کو ابن بطوطہ کے حوالے کر دیا تھا تاکہ ابن بطوطہ اس کو اپنا سفرنامہ سُناتا جائے اور وہ لکھتا رہے ——

ابن بطوطہ کا پورا نام ابو عبداللہ محمد ابن بطوطہ تھا، وہ ۱۳۰۴ میں طنجہ میں پیدا ہوا تھا، ۲۷ سال کی عمر میں اس نے اپنی سیاحت شروع کی۔ اس نے تمام عرب ممالک دیکھے، ایران دیکھا، چین دیکھا اور روس، ترکی ہندوستان، افغانستان و نیز لنکا کے علاوہ بحرِ ہند کے جزائر دیکھے۔ اس نے جنوبی افریقہ کے بعض ممالک بھی دیکھے اس نے اپنی سیاحت کے دوران چار حج بھی کئے، آخری مرتبہ اس نے اسپین، الجیریا، نائجیریا اور مرکزی افریقہ کی سیاحت کی —— اس نے ۲۸ سال تک سیاحت کی اور تقریباً ۷۵ ہزار میل لمبی مسافت طے کی۔ ۱۳۷۸ میں دنیا کے اس سب سے بڑے سیاح کا انتقال ہو گیا ——

اس کا یہ سفرنامہ سب سے پہلے ۱۸۰۸ء میں انگریزی میں شائع کیا گیا لیکن یہ بہت مختصر تھا اس کے بعد ۱۸۵۸ء میں اس کا مکمل انگریزی ترجمہ چار جلدوں میں شائع کیا گیا ——

ابن بطوطہ مراقش سے اسکندریہ گیا تھا، وہاں اس نے دو شادیاں کیں، اس کے حالاتِ زندگی کے بموجب وہ بے حد عالم، فیاض، فضول خرچ اور عیش پرست تھا۔ وہ محمد تغلق کے عہد میں ہندوستان آیا تھا اور آٹھ سال تک دہلی میں مقیم رہا، وہ دہلی کا چیف قاضی بنا دیا گیا تھا۔ یہاں بھی اس نے دو شادیاں کیں —— وہ جس ملک میں بھی گیا وہاں اس نے شادی ضرور کی۔ دہلی میں قیام کے دوران اس کے اخراجات کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر ماہ اپنی تنخواہ کا پانچ گنا مہاجنوں سے قرض لے لیا کرتا تھا، اس کا یہ سارا قرض اس کے چین جانے سے قبل بادشاہ دہلی نے ادا کر دیا تھا۔ چین جاتے ہوئے اس نے جودہ ملایا، انڈونیشیا اور جزائر مالدیپ کی سیاحت کی، ان ممالک میں بھی اس نے کئی شادیاں کیں —— وہ اپنے سفر کے دوران کئی مرتبہ مرتے مرتے بچا اور کئی مرتبہ انتہائی مصائب کا شکار رہا۔

وہ واقعی اپنے وقت کا انتہائی عظیم سیاح تھا —— اس کی یہ کتاب صرف ایک کتاب ہی نہیں اپنے دور کی آدھی دنیا کی ایک انتہائی مستند تاریخ بھی ہے اور مجھے پوری امید ہے کہ قارئین محراب اس سفرنامہ کو بے حد پسند کریں گے۔ کیوں کہ اس سفرنامہ کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف سُنی سُنائی باتیں نہیں لکھی گئی ہیں بلکہ اس میں چشم دید حالات بھی ہیں اور واقعات بھی —— ورنہ ابن بطوطہ کے بارے میں خود اس کا کاتب ابن جزائی یہ نہ لکھتا "وہ بلاشبہ دنیا کا سب سے عظیم سیاح تھا کیوں کہ وہ بالکل سچا تھا"

سفرنامہ کا یہ حصہ صرف ہندوستان سے متعلق ہے۔

—— سلامت علی مہدی

فصل (۱) دریائے سندھ ۷۳۴ھ ہجری کے ماہ محرم الحرام کی پہلی تاریخ تھی کہ ہم دریائے سندھ[1] پر پہنچے۔ اس دریا کو پنجاب بھی کہتے ہیں۔ یہ دریا دنیا کے بہت بڑے دریاؤں میں شمار کیا جاتا ہے۔ گرمی کے موسم میں اس میں طغیانی ہوتی ہے۔ جس طرح مصر کے باشندوں کی زراعت کا مدار نیل[2] کی طغیانی پر ہے۔ اسی طرح اس ملک کے باشندوں کی زندگی بھی اس دریا کی طغیانی پر منحصر ہے۔ یہاں سے سلطان محمد شاہ سلطان بادشاہ ہند و سندھ کی عملداری شروع ہوتی ہے۔ جب ہم اس دریا پر پہنچے تو بادشاہ کے اخبار نویس ہمارے پاس آئے اور ہمارے آنے کی خبر انہوں نے فوراً قطب الملک حاکم ملتان کے پاس بھیجی۔ سندھ کا امیر بادشاہ کی طرف سے ان دنوں میں سرتیز[3] تھا۔ یہ شخص بادشاہ کا غلام اور فوج کا بخشی تھا۔ جب ہم سندھ پر پہنچے تو امیر شہر سیوستان[4] مقیم تھا۔

فصل (۲) ڈاک انتظام سیوستان سے ملتان تک دس دن کا راستہ ہے اور ملتان سے دارالخلافہ دہلی تک پچاس دن کا جو خبر اخبار نویس لکھتے ہیں۔ وہ اس کے پاس ڈاک کے ذریعہ سے پانچ دن میں پہنچ جاتی ہے۔ ڈاک کو اس ملک میں برید[5] کہتے ہیں۔ ڈاک دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک گھوڑے کی دوسری پیادوں کی۔ گھوڑے کی ڈاک کو اولاق کہتے ہیں۔ ہر چار کوس کے بعد گھوڑا بدلتا ہے۔ یہ گھوڑے بادشاہ کی طرف سے رہتے

---

[1] سنسکرت میں 'سندھو' کے معنی دریا کے ہیں، آریہ جب ہندوستان آئے تو انھوں نے سب سے پہلے ایک دریا دیکھا چنانچہ انھوں نے اسے سندھو کہا جو بعد میں سندھ ہو گیا۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے دلچسپ امر یہ ہے کہ سلطنت مغلیہ سے قبل دریائے سندھ کو دریائے پنجاب کہا جاتا تھا۔

[2] دریائے نیل کوہ قمر سے نکلتا ہے، اس کی لمبائی تین ہزار میل ہے۔ مصر میں زراعت کا انحصار اسی دریا کی طغیانی پر ہے۔ وں کہ مصر میں بارش بالکل نہیں ہوتی ہے۔ نیل کی یہ طغیانی جون سے شروع ہوتی ہے اور اگست تک اپنے شباب پر پہنچ جاتی ہے۔

[3] سرتیز کو عماد الملک بھی کہا جاتا ہے، وہ قوم کا ترکمان تھا، بادشاہ کا داماد۔۔ اور فوج کا سپہ سالار بھی تھا۔ وہ بہمنی سلطنت سے ایک جنگ کے دوران میں مارا گیا۔

[4] پاکستان میں سیبی اور جیکب آباد کے علاقہ کو سیوستان کہا جاتا ہے۔

[5] برید ـــــ عربی لفظ ہے اس کے لغوی معنی قاصد کے ہیں، بارہ میل لمبے فاصلہ کو بھی عربی زبان میں برید کہا جاتا ہے۔ ڈاک چوکی کو ترکی میں 'الاغ' اور فارسی میں چپار کہتے ہیں۔

میں یہ وضاحت اس لئے کر رہا ہوں تاکہ قارئین کو عبارت کا مطلب سمجھنے میں آسانی ہو اور ان کی دلچسپی برقرار رہے۔ حاشیہ کی عبارت ضرور پڑھئے، اس سے آپ کی معلومات میں بھی اضافہ ہوگا اور آپ کے علم میں بھی ـــــــ

ـــــــ سلامت علی مہدی

ہیں۔ پیدلوں کی ڈاک کا یہ انتظام ہے کہ ایک میل میں جس کو وہ کروہ[1] کہتے ہیں۔ تین چوکیاں ہرکاروں کی ہوتی ہیں۔ اس چوکی کو داوہ[2] کہتے ہیں۔ ہر ایک تہائی میل کے فاصلے پر ایک گاؤں آباد ہوتا ہے۔ گاؤں کے باہر ہرکاروں کے لئے برجیاں بنی ہوتی ہیں۔ ہر ایک برجی میں ہرکارے کمر کسے بیٹھے رہتے ہیں۔ ہر ایک ہرکارے کے پاس ایک چھڑی دو گز لمبی ہوتی ہے جس کے سرے پر تانبے کے گھنگرو بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب شہر سے ڈاک چلتی ہے تو وہ ایک ہاتھ پر لفافہ رکھ لیتا ہے۔ اور دوسرے ہاتھ میں چھڑی اور تمام طاقت خرچ کرکے دوڑتا ہے۔ دوسرا ہرکارہ اس کے گھنگروؤں کی آواز سن کر تیار ہو بیٹھتا ہے اور لفافہ لے کر فوراً دوڑ پڑتا ہے۔ اس طرح جہاں کہیں خط پہنچانا ہوتا ہے پہنچا دیتے ہیں۔ یہ ڈاک گھوڑوں کی ڈاک سے بھی جلدی جاتی ہے اور کبھی کبھی اسی ڈاک کے ذریعے سے خراسان کے تازہ میوہ جات بھی بادشاہ کے لئے تھالیوں میں پہنچائے جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی کسی سنگین مجرم کو بھی چارپائی پر اٹھا کر اسی طرح چوکی بہ چوکی ہرکارے لے جاتے ہیں جب میں دولت آباد میں تھا تو بادشاہ کے لئے دریائے گنگ کا پانی جو ہندوؤں کے حج یعنی یاترا کی جگہ ہے ڈاک میں بھیجا کرتے تھے۔ دولت آباد دریائے گنگ سے چالیس دن کے فاصلے پر ہے۔ اخبار نویس ہر مسافر کا حال تفصیل وار لکھتے ہیں کہ اس کی صورت ایسی ہے۔ لباس ایسا ہے۔ خادم اور غلام اور جانور اس کے ساتھ اس قدر ہیں۔ اس کے حرکات اور سکنات اس قسم کے ہیں۔ الغرض کوئی بات باقی نہیں چھوڑتے۔

فصل (۳) پردیسیوں کی قدردانی

جب کوئی مسافر شہر ملتان میں پہنچتا ہے (جو ملک سندھ کا دارالخلافہ ہے) تو جب تک کہ بادشاہ کی طرف سے حکم روانگی نہ آ جائے اور اس کی ضیافت کا انتظام نہ ہو جائے اور اس کی مقدار مقرر نہ ہو جائے اس کو وہاں ٹھہرنا پڑتا ہے۔ ہر مسافر کی آؤ بھگت اس کے ساز و سامان اور حرکات و سکنات کے مطابق ہوتی ہے۔ کیونکہ اس وقت تک اس کے حسب و نسب کی خبر بخوبی نہیں ہوتی۔ بادشاہ بن محمد شاہ تغلق پردیسیوں کی تعظیم و تکریم بدرجہ غایت کرتا ہے اور ان سے محبت رکھتا ہے اور بڑے بڑے عہدے ان کو دیتا ہے۔ اس کے بڑے بڑے خواص اور حاجب اور وزیر اور قاضی اور داماد غیر ملک کے باشندے ہیں۔ اس کا حکم ہے کہ پردیسی کو ہمیشہ عزیز کے نام سے پکارا کریں۔ چنانچہ باہر کے لوگ بجائے غریب کے سب عزیز کہلاتے ہیں۔ جو شخص بادشاہ کے سلام کو جاتا ہے اس کے واسطے تحفے لے جاتا ہے اور چونکہ سب کو معلوم ہے کہ بادشاہ ان تحفوں سے دو چند سہ چند

---

[1] 'کروہ' کے معنی 'کوس' کے ہیں۔ کوس کی لمبائی ہندوستان کے مختلف حصوں میں جدا جدا ہے۔ شمالی ہندوستان اور پنجاب میں کوس کی لمبائی [illegible] ہوتی تھی جب کہ گنگا کے کنارے کے علاقے میں ایک کوس کا مطلب دو میل ہوتا تھا۔ بندھیلکھنڈ اور دکن میں ایک کوس، چار میل کا ہوتا تھا۔

[2] 'داوہ' اب بالکل مروج نہیں ہے۔ البتہ ابن بطوطہ نے ڈاک چوکی اور گھنگروؤں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اب بھی ہندوستان کے دیہاتی ڈاک خانوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مسالک الابصار کے مصنف شہاب الدین دمشقی نے بھی جو ابن بطوطہ کا ہم عصر تھا ڈاک کی وہی تفصیل لکھی ہے جو ابن بطوطہ نے بیان کی ہے لیکن اس نے ان نقاروں کا بھی تذکرہ کیا ہے جو کسی بھی نئے آدمی کی آمد کے وقت بجائے جاتے تھے۔ جب وقت یہ نقارے بجائے جاتے تھے تو اندر قلعہ میں بادشاہ کو کسی نئے آدمی کی آمد کی خبر ہو جاتی تھی۔

انعام دیتا ہے۔ اس لئے سندھ کے بعض سوداگروں کا یہ پیشہ ہے کہ وہ ایسے اشخاص کو ہزار ہا دینار قرض کے طور پر دے دیتے ہیں اور اس کے واسطے تحفے تیار کر دیتے ہیں۔ اور خدمتگاروں اور گھوڑوں اور سواری کا انتظام کر دیتے ہیں اور نوکروں کی طرح اس کے سامنے کھڑے رہتے ہیں۔ جب وہ شخص بادشاہ کے سلام سے شرف یاب ہوتا ہے اور انعام پاتا ہے تو وہ ان کا تمام قرضہ ادا کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ سوداگر بہت کچھ نفع حاصل کرتے ہیں۔ میں بھی جب سندھ میں پہنچا تو میں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور سوداگروں سے گھوڑے اور اونٹ اور غلام خریدے اور ایک عراق کے سوداگر سے جس کا نام محمد دوری تھا اور تکریت[1] کا رہنے والا تھا، شہر غزنی میں تیس گھوڑے اور ایک اونٹ جس پر تیروں کے بچھا لدے ہوئے تھے۔ خریدے کیونکہ ایسی چیزیں بادشاہ کو نذر دی جایا کرتی ہیں۔ جب یہ سوداگر خراسان سے واپس آیا تو اس نے مجھ سے اپنا قرضہ طلب کیا اور بہت فائدہ اٹھایا اور میرے سبب سے ایک بڑا تاجر بن گیا۔ یہ شخص مجھے پھر حلب کے شہر میں بھی کئی برس کے بعد ملا۔ اور اگرچہ وہاں کے کافروں[2] نے میرے کپڑے تک چھین لئے تھے۔ لیکن اس نے میرے ساتھ کچھ سلوک نہ کیا۔

فصل (۴) گینڈے کا حال

جب ہم شہر سندھ سے عبور کر کے ایک بانس کے جنگل میں داخل ہوئے جس ہو کر راستہ گذرتا تھا تو ہم نے گینڈا[3] دیکھا۔ یہ حیوان رنگ میں سیاہ بڑے ڈیل ڈول کا ہوتا ہے۔ اس کا سر بہت بڑا ہوتا ہے۔ کسی کا چھوٹا کسی کا بڑا اور اسی لئے یہ مثل مشہور ہے۔ کرکدن سر بے بدن یہ جانور ہاتھی سے چھوٹا ہوتا ہے۔ لیکن اس کا سر ہاتھی کے سر سے کہیں بڑا ہوتا ہے۔ اور دونوں آنکھوں سے برابر فاصلے پر پیشانی پر ایک سینگ ہوتا ہے۔ جس کا طول تین ہاتھ اور موٹائی ایک بالشت ہوتی ہے۔ جب یہ گینڈا جنگل سے نکلا تو ایک سوار اس کے سامنے آ گیا۔ گینڈے نے گھوڑے کے سینگ مارا اور سوار کی ران چیر کر اس کو زمین پر گرا کر جنگل میں گم ہو گیا۔ پھر اس کا پتہ کہیں نہ لگا۔ اس راستے میں عصر کے بعد ایک روز پھر میں نے گینڈا دیکھا وہ گھاس چرتا تھا۔ ہم نے اس کے مارنے کا ارادہ کیا تو وہ بھاگ گیا۔ ایک دفعہ اور میں نے گینڈا دیکھا۔ ہم بادشاہ کی سواری کے ساتھ تھے۔ بانس کے جنگل میں

---

[1] تکریت ——— بغداد کے مضافات میں ایک قصبہ ہے۔

[2] حلب کے کافروں سے غالباً وہ فرنگی جہازی مراد ہیں جو اس زمانے میں کہیں کہیں قابض تھے۔

[3] گینڈے کو کرکدن بھی کہا جاتا تھا۔ گینڈے کے سر کی بڑائی اور سینگ کی لمبائی کے بارے میں یقیناً ابن بطوطہ نے مبالغہ سے کام لیا ہے اس میں شک نہیں کہ اس جانور کا سر اس کے جسم کے تناسب کے اعتبار سے بڑا ہوتا ہے۔ گینڈے دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جس کی صرف ایک سینگ ہوتی ہے اور دوسرا وہ جس کے دو سینگیں ہوتی ہیں۔ پہلی قسم ہندوستان اور افریقہ میں پائی جاتی ہے اور دوسری قسم جاوا اور سماٹرا میں۔ گینڈے کو سرخ رنگ سے نفرت ہے چناں چہ اگر کوئی آدمی سرخ کپڑے پہنے ہوتا ہے تو وہ اس پر حملہ ضرور کرتا ہے۔ یہ جانور سبزی خور ہے اور دلدل کیچڑ میں رہنا پسند کرتا ہے۔ اس کی کھال بھی قیمتی ہوتی ہے اور سینگ بھی ——— کہا جاتا ہے کہ اگر اس کی سینگ کے پیالے میں کوئی زہریلی شے ڈال دی جائے تو یہ پیالا فوراً ٹوٹ جاتا ہے۔

لیکن اب دنیا میں لمبی سینگ والے گینڈوں کی تعداد کم ہو رہی ہے۔

بچے جا رہے تھے اور بادشاہ ہاتھی پر سوار تھے اور میں بھی دوسرے ہاتھی پر تھا۔ سوار اور پیادے گینڈے کو گھیر کر لاتے اور اس کو مار ڈالا اور اس کا سر کاٹ کر کیمپ میں لے آئے۔

فصل (۵) شہر جنانی

ہم دو منزل چلے تھے کہ شہر جنانی[1] آیا۔ یہ شہر وسیع اور خوبصورت ہے۔ دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے۔ اس کا بازار بہت خوشنما ہے اس شہر میں سامرہ کی قوم کے آدمی آباد ہیں اور قدیم سے آباد چلے آتے ہیں۔ مورخ کہتے ہیں کہ جب حجاج بن یوسف کے وقت میں سندھ فتح ہوا تو اس قوم کے بزرگ اس شہر میں بستے تھے۔ شیخ رکن الدین بن شیخ شمس الدین بن شیخ بہاءالحق ذکریا قریشی ملتانی مجھ سے ذکر کرتے تھے کہ ان کے جد[2] محمد ابن قاسم قریشی فاتح سندھ کے اس لشکر میں تھے جو حجاج نے عراق سے بھیجا تھا۔ وہ اسی ملک میں رہ گئے تھے اور پھر ان کی اولاد بڑھ گئی۔ یہ شیخ رکن الدین وہی ہیں جن کی بابت مجھے شیخ برہان الدین اعرج نے شہر اسکندریہ میں کہا تھا کہ تو اُن سے ملے گا۔ سامرہ قوم کے لوگ کسی کے ساتھ نہیں کھاتے اور جب وہ کھاتے ہیں تو کوئی اُن کی طرف دیکھنے نہیں پاتا اور نہ اپنی قوم کے سوا کسی کے ساتھ رشتہ کرتے ہیں۔ اُس زمانے میں ان کا سردار ایک شخص ونار نامی تھا۔ اُس کا حال میں آگے چل کر بیان کروں گا۔

فصل (۶) شہر سیوستان (سیہوان)

شہر جنانی سے چل کر ہم شہر سیوستان[3] میں پہنچے۔ یہ ایک بڑا شہر ہے اور ایسے ریگستان میں واقع ہے جس میں سوا کیکر کے درخت کے اور درخت قائم نہیں۔ اُس کی نہر کے کنارے سوا خربوزوں کے اور کسی چیز کی کاشت نہیں کرتے۔ اس شہر کے لوگ جوار اور مجا بان جس کو مشنگ کہتے ہیں۔ یعنی مٹا کابلی کی روٹی کھاتے ہیں۔ مچھلی اس شہر میں بہت ہوتی ہے اور بھینسوں کی دودھ کی بھی نہایت افراط ہے۔ اس کے باشندے سقنقور[4] یعنی ریگ ماہی بھی کھاتے ہیں۔ یہ جانور پاؤں پر چلتا ہے اور گوہ کے مشابہ ہوتا ہے لیکن

---

[1] جنانی نام کا شہر نہ اب ہے اور نہ آئین اکبری میں ابو الفضل نے اس شہر کا تذکرہ کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ابن بطوطہ کے زمانے میں یہ شہر آباد ہو اور اس کے بعد برباد ہو کر ختم ہو گیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسے دریائے سندھ کی کسی طغیانی نے مٹا دیا ہو۔

[2] ابن بطوطہ کے بیان کے مطابق شیخ بہاء الحق ذکریا ملتانی کے والد محمد بن قاسم کی فوج کے ساتھ ۹۰ھ میں ہندوستان آئے تھے لیکن تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ ان کے دادا کمال الدین قریشی مکہ معظمہ سے خوارزم آئے اور وہاں سے ہندوستان آئے۔

[3] سیہوان نام کا ایک شہر کراچی سے ۱۹۰ میل کے فاصلہ پر اب بھی آباد ہے۔ شہباز قلندر کی خانقاہ اسی شہر میں ہے، کہتے ہیں کہ سکندر اعظم نے اس شہر میں ایک قلعہ بھی بنوایا تھا۔ شہر کے قریب ایک جھیل ہے جو برسات میں بیس میل لمبی اور دس میل چوڑی ہو جاتی ہے۔

[4] سقنقور کو ہندی میں 'بن روہو' کہتے ہیں۔ بہ ریت میں پایا جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جانور 'سانڈہ' کی قسم کا ہوتا ہے۔ اس کا گوشت نیچ قوم کے لوگ کھاتے ہیں مصر میں دریائے نیل کے کنارے بھی یہ جانور پایا جاتا ہے۔

اور میرا اپنا خیال ہے کہ اب یہ جانور ہندوستان میں نہیں پایا جاتا ہے، مسلمانوں کے لئے اس کا گوشت کھانا جائز ہے یا ناجائز یہ میں نہیں کہہ سکتا۔

اس جنگ میں نہیں ہوتی۔ وہاں کے لوگ ریت میں سے کھود کر اس کو نکالتے ہیں اور اس کا پیٹ چیر کر اور آلائش صاف کر کے اس میں بجائے زعفران کے کرکم (ہلدی زرد چوب) بھر دیتے ہیں۔ مجھے اس جانور کو کھاتے دیکھ کر گھن آگئی اور میں نے اسے نہیں کھایا۔ جب ہم اس شہر میں پہنچے تو گرمی نہایت سخت پڑتی تھی۔ میرے ہمراہی ننگے رہتے تھے اور ایک بڑا رومال پانی میں تر کر کے بجائے تہبند کے باندھ لیتے تھے اور دوسرا کندھوں پر ڈال لیتے تھے اور تھوڑی دیر کے بعد جب یہ رومال خشک ہو جاتے تھے تو ان کو پھر تر کر لیتے تھے اور اسی طرح کرتے رہتے تھے۔ اس شہر کا خطیب، امام مسجد جامع شیبانی ہے۔ اس نے مجھے خلیفہ امیر المومنین عمر ابن عبدالعزیز رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا پروانہ دکھایا جو اس کے دادا کو خطیب ہونے کے وقت ملا تھا۔ یہ پروانہ ان کے خاندان میں وراثتاً چلا آتا ہے۔ اسکی پیشانی پر یہ عبارت ہے۔ ھذا ما امر به عبد الله امیر المومنین عمر بن عبد العزیز لفلان۔ اس کی تاریخ تحریر ۹۹ھ ہے اور الحمد للہ وحدہ اس پر لکھا ہوا ہے اور وہ خطیب کہتا تھا کہ یہ الفاظ خود خلیفہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس شہر میں مجھے ایک عمر رسیدہ شیخ محمد بغدادی نام کا ملا اور یہ شیخ عثمان مرندی کی خانقاہ میں رہتا ہے۔ کسی نے مجھ سے کہا کہ اس شیخ کی عمر ایک سو چالیس برس سے زیادہ ہے اور وہ خلیفہ مستعصم باللہ آخر خلفائے عباسیہ کے قتل کے وقت جب کہ اس کو ہلاکو خان بن چنگیز خاں نے ہلاک کر ڈالا تھا، بغداد میں موجود تھا۔ یہ شیخ باوجود اس قدر عمر کے جسم میں قوی ہے۔ اور اچھی طرح سے چلتا پھرتا ہے۔ اس شہر میں قوم سامرہ کا سردار جس کا ذکر میں پہلے کر آیا ہوں، رہتا تھا اور امیر قیصر رومی بھی اسی جگہ رہا کرتا تھا۔ یہ دونوں بادشاہ کے ملازم تھے۔ اور ان کے پاس اٹھارہ سو سوار دوں کی جمعیت رہا کرتی تھی۔ ایک ہندو رتن نامی بھی اس شہر میں رہتا تھا۔ یہ شخص علم سیاق اور کتابت میں استاد تھا۔ کسی امیر کے وسیلے سے بادشاہ تک پہنچ گیا۔ بادشاہ نے اسکی قدر کی اور اس کو اس ملک کا حاکم بنا دیا اور اس کو مراتب عطا کیا یعنی نوبت اور علم رکھنے کی اجازت دی۔ جو بڑے بڑے امیروں کو دی جاتی تھی۔ سیوستان اور اس کے [illegible] جب وہ اپنے شہر میں پہنچا تو دنار اور قیصر کو ایک ہندو کی اطاعت گراں گزری۔ انہوں نے اس کے قتل کا مشورہ کیا۔ اس کے آنے کے چند روز بعد گئے کہا کہ آپ باہر نکل کر اپنا علاقہ دیکھ لیویں۔ ہم بھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ چلا گیا۔ رات کو جب سب ڈیروں میں تھے یکایک شور پڑا کہ کوئی درندہ آگیا۔ اور اس بہانہ سے ان کے آدمیوں نے اس کو قتل کر ڈالا اور شہر میں آکر بادشاہی خزانہ کو جس میں بارہ لاکھ دینار تھے لوٹ لیا اور دس ہزار طلائی ہندی دینار کے ایک لاکھ دینار[2] ہوتے ہیں

---

[1] مستعصم باللہ آخری عباسی خلیفہ تھا۔ سنہ ۶۵۶ھ میں اس کو فتح بغداد کے بعد چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں نے کمبل میں لپیٹ کر گرزوں سے مار ڈالا تھا۔ اس کے انتقال پر بغداد کی عباسی خلافت جو ۵۲۰ سال سے قائم تھی ختم ہو گئی تھی۔

[2] دینار ہندوستان کا ایک قدیم سکہ تھا، اب بھی دینار بعض عرب ممالک میں چلتا ہے۔ یہ سکہ سونے کا ہوتا تھا۔ ہندوستان میں مسلم دور حکومت میں چاندی کے سکے کو 'تنکہ' کہا جاتا تھا جو تقریباً ایک تولے کا ہوتا تھا۔ فرشتہ نے اپنی تاریخ میں اس سکہ کا وزن دو تولہ لکھا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان تمام سکوں کو ختم کیا اور وہ سکے ڈھالے جو آزاد ہندوستان میں نئے اعشاریہ سکوں سے قبل تک چلتے تھے۔

اور ہندی طلائی دینار، مغرب کے ڈھائی دینار طلائی کے مساوی ہوتا ہے اور ونار[1] کو اپنا حاکم مقرر کیا۔ اس نے اپنا لقب ملک فیروز رکھا۔ اور یہ سب خزانہ لشکر پر تقسیم کر دیا۔ لیکن پھر ونار کے دل میں خوف پیدا ہوا کیونکہ اس کا وطن اور قبیلہ وہاں سے دور تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر اپنے قبیلہ کی طرف چلا گیا اور باقی لشکر نے قیصر رومی کو اپنا سردار مقرر کیا۔ اس سانحہ کی خبر سپہ سالار عماد الملک کو ملتان میں پہنچی۔ اس نے لشکر جمع کر کے خشکی اور تری دونوں راستوں سے آگے بڑھنا شروع کیا۔ قیصر بھی اس کے مقابلہ پر آمادہ ہوا۔ جب اس کو شکست ہوئی تو شہر میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ سپہ سالار نے منجنیق ... لگائی اور محاصرہ میں سختی کی۔ چالیس دن بعد قیصر نے امان مانگی لیکن جب قیصر اور اس کا لشکر امان کے وعدے پر باہر آگیا تو سپہ سالار نے ان کے ساتھ دغا کی۔ ان کی جائیداد لوٹ لی اور ان سب کو قتل کر ڈالا۔ ہر روز کسی کی تو گردن مارتا تھا۔ اور کسی کو تلوار سے دو ٹکڑے کرتا تھا اور کسی کی کھال کھنچوا تا تھا اور ان کھالوں میں بھوسہ بھروا کر ان کو شہر کی فصیل پر لٹکاتا جاتا تھا۔ اکثر کا یہی حال کیا۔ ان کی نعشیں لٹکی ہوئی دیکھ کر دل ڈرتا تھا اور خوف آتا تھا۔ ان کی کھوپڑیاں جمع کر کے شہر کے وسط میں ڈھیر لگا دیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد ہی میں اس شہر میں پہنچا اور ایک بڑے مدرسے میں اترا۔ مدرسہ کی چھت پر میں سویا کرتا تھا۔ وہاں سے یہ نعشیں لٹکی ہوئی نظر آتی تھیں۔ جب صبح کو سو کر اٹھتا تھا تو یہ نعشیں دیکھ کر میری طبیعت بگڑ جاتی تھی۔ آخر میں نے اس مدرسے کو چھوڑ دیا اور دوسرے مکان میں جا رہا۔

فصل (۱۰) لاہری بندر

قاضی علاء الملک فصیح الدین خراسانی قاضی ہرات جو ایک فاضل فقیہ تھا کچھ عرصہ پہلے بادشاہ کی ملازمت کے لئے اپنے وطن سے آیا تھا۔ اس کو بادشاہ نے شہر لاہری واقع سندھ مع علاقہ کے جاگیر میں دیدیا تھا۔ وہ بھی سپہ سالار کی مدد کو اپنا لشکر لے کر آیا۔ اس کا اسباب اور باربرداری بندرہ جہازوں میں تھا جو دریائے سندھ میں اپنے ہمراہ لایا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ لاہری جانے کا ارادہ کیا۔ قاضی علاء الملک کے پاس ایک جہاز تھا جس کو اہورہ کہتے تھے۔ جیسے کہ ہمارے ملک میں طریدہ ہوتی ہے۔ ویسا ہی یہ جہاز تھا لیکن لمبا چوڑا زیادہ تھا۔ اس کی نصف کو سیڑھیاں بنا کر اونچا کیا گیا تھا اور تختے لگا کر نشست کی جگہ بنائی گئی تھی۔ قاضی اس پر بیٹھا کرتا تھا اور اس کے نوکر دائیں بائیں اور سامنے بیٹھتے تھے چالیس ملاح اس جہاز کو کھیا کرتے تھے۔ اس جہاز کے ہمراہ چار چھوٹی کشتیاں تھیں۔ دو دائیں طرف۔ دو کشتیوں میں طبل اور نقارہ علم اور سرنائی وغیرہ ہوتے تھے۔ اور دو کشتیوں میں اہل طرب بیٹھتے تھے جب کشتی چلتی تھی کبھی تو نوبت بجائی جاتی تھی اور کبھی مطرب راگ گانے لگتے تھے۔ اور صبح سے لے کر چاشت کے کھانے کے وقت تک گاتے بجاتے چلے جاتے تھے۔ جب کھانا کھانے کا وقت ہوتا تھا اور سب جہاز پہنچ جاتے تھے اور دستر خوان بچھایا جاتا تھا تو جب تک امیر علاء الملک کھانا کھاتے تھے یہ لوگ گایا بجایا کرتے تھے اور سب سے پیچھے خود کھا کر اپنی اپنی کشتیوں

---

[1] 'ونار' غالباً سمہ خاندان کے بادشاہ کو کہا جاتا تھا۔ مشہور مورخ ضیاء برنی نے اس خاندان کے بادشاہ کو 'جام' لکھا ہے۔ فرشتہ نے اس کا لقب 'افرا' لکھا ہے۔ یہ خاندان سندھ پر قابض تھا۔ میرے خیال میں یہ خیال بھی غلط ہے کہ قوم سمہ ہی تھی قوم سومرہ تھی۔ سلطان محمد تغلق نے اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ کیا تھا۔

میں چلے جاتے تھے۔ جب رات ہوتی تھی تو جہاز دریا کے کنارے کھڑے کر دیئے جاتے تھے۔ اور خشکی پر خیمے لگا دیئے جاتے تھے، جس میں امیر علاء الملک شب باش ہوتا تھا۔ جب تمام لشکر رات کا کھانا کھا چکتا تھا اور عشاء کی نماز سے فارغ ہو جاتا تھا تو چوکیدار نوبت بہ نوبت آتے تھے۔ جب ایک چوکیدار اپنی باری ختم کر لیتا تھا تو وہ پکار کر عرض کرتا تھا کہ اے اخوند ملک اتنی رات گزر چکی ہے۔ جب صبح ہوتی تھی تو پھر نوبت اور نقارہ بجنے شروع ہوتے تھے اور صبح کی نماز پڑھ کر کھانا کھاتے تھے اور جہاز چل پڑتے تھے۔ اگر امیر دریا میں چلنا چاہتا تھا تو جہاز میں بیٹھ لیتا تھا۔ اگر خشکی کے راستے جانا منظور ہوتا تھا تو سب سے آگے نوبت اور نقارخانہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد حاجب یعنی پردہ دار اور حاجبوں کے آگے چھ گھوڑے ہوتے تھے جن پر سرنا اور نفیری والے۔ جب کسی گاؤں میں پہنچتے تھے یا کسی اونچی زمین میں پہنچتے تھے تو طبل اور نقارہ بجائے جاتے تھے۔ اور جب دن کے کھانے کا وقت ہوتا تھا تو ٹھہر جاتے تھے۔ میں بھی امیر علاء الملک کے ساتھ پانچ روز رہا۔ پانچویں دن ہم لاہری[۱] کے شہر میں پہنچے۔ یہ شہر بہت خوبصورت سمندر کے کنارے واقع ہے۔ اس کے پاس دریائے سندھ سمندر میں گرتا ہے۔ یہ شہر بڑا بندرگاہ ہے۔ یمن اور فارس کے جہاز اور تاجر بہت آتے ہیں اور اس لئے یہ شہر نہایت مالدار ہے۔ اور اس کا محاصل بھی زیادہ ہے۔ علاء الملک مجھ سے کہتے تھے کہ اس بندرگاہ کا محاصل ساٹھ لاکھ دینار ہے اور امیر علاء الملک کو اس میں سے بیسواں حصہ ملتا ہے یعنی عشر کا نصف اور اسی شرح پر بادشاہ اپنے کارداروں کو علاقے سپرد کیا کرتا تھا۔ ایک روز میں امیر علاء الملک کے ساتھ سیر کرنے گیا شہر سے سات کوس کے فاصلے پر ایک میدان ہے جسکو تارنہ[۲] کہتے ہیں۔ وہاں بے شمار آدمیوں اور حیوانات کی سنگین مورتیاں ثابت اور ٹوٹی پھوٹی پڑی ہوئی ہیں۔ اور غلہ اور گیہوں اور چنا اور مصری وغیرہ بکھرائے ہوئے پڑے ہیں۔ فصیل اور مکانات کی دیواروں کے سامان موجود ہیں۔ کھنڈرات میں کھدے ہوئے پتھر کا ایک گھر ہے اس کے وسط میں ایک چبوترہ ہے جو ایک ہی پتھر سے بنا ہوا ہے۔ اس پر ایک آدمی کا بت ہے اس آدمی کا سر ذرا لمبا ہے اور منہ ایک طرف پھرا ہوا ہے دونوں ہاتھ کمر سے کسے ہوئے ہیں۔ اس جگہ نہایت بدبودار پانی کھڑا ہوا تھا بہت سی دیواروں پر ہندی زبان اور خط کے کتبے ہیں۔ امیر علاء الملک ذکر کرتے تھے کہ اس ملک کے تاریخ داں گمان کرتے ہیں کہ یہ شہر مسخ ہو گیا تھا اور چبوترے پر جو بت

۱؎ لاہری کو زمانۂ ماضی میں لاہوری بندر بھی کہا جاتا تھا۔ اب یہ صرف ایک ساحلی دیہات ہے۔ آئین اکبری میں اس کو بندر لاہری لکھا گیا ہے اور اس بندرگاہ کی آمدنی ایک لاکھ ۳۸ ہزار روپے لکھی گئی ہے۔ اٹھارویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ایک تجارتی کوٹھی بھی وہاں موجود تھی۔ کراچی کی ترقی اس کی تباہی کے بعد ہوئی تھی۔

۲؎ بندر لاہری کے پاس جن کھنڈرات کا تذکرہ ابن بطوطہ نے کیا ہے وہ دیبل کے کھنڈر تھے جو سندھ کا پرانا دارالخلافہ تھا۔ فرشتہ اور ابوالفضل دونوں نے دیبل اور ٹھٹھہ کو ایک ہی شہر لکھا ہے۔ بعض مورخین کہتے ہیں کہ دیبل شہر کراچی کے قریب تھا۔ دیبل کے لغوی معنی مندر کے ہیں۔

۳؎ مسلمان چونکہ بت پرستی کے خلاف ہیں اس لئے انھوں نے اپنے ابتدائی حملوں میں تمام بتوں کو توڑ دیا تھا اور یا مسخ کر دیا تھا۔ بتوں کے مسخ کرنے کے بارے میں بہت سی کہانیاں مشہور ہیں لیکن یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کہانیاں سچی ہیں۔

ہے وہ اس کا بادشاہ تھا۔ چناں چہ اب بھی اس گھر کو راجہ کا محل کہتے ہیں۔ دیواروں کے کتبوں سے یہ پتہ لگتا ہے کہ یہ بربادی تقریباً ایک ہزار سال گزرے ہوئی تھی۔ میں امیر علاء الملک کے پاس پانچ دن ٹھہرا۔ اس نے میری خاطر اور مدارات بدرجہ غایت کی اور میرے لئے زادِ راہ بھی تیار کرایا۔

فصل (۸) بھکر وہاں سے میں بھکر گیا۔ یہ شہر بھی خوبصورت ہے۔ دریائے سندھ کی ایک شاخ اس کے بیچ میں سے گزرتی ہے، جس کا ذکر آگے بھی آوے گا اور اُس شاخ کے وسط میں ایک خانقاہ ہے۔ وہاں مسافروں کو کھانا ملتا ہے۔ اس خانقاہ کو کشلو خاں نے جس کا ذکر آگے بھی آوے گا اپنے ایام حکومت میں تعمیر کیا تھا۔ اس شہر میں میری ملاقات امام عبداللہ حنفی اور قاضی شہر ابو حنیفہ اور شمس الدین محمد شیرازی سے ہوئی۔ شیخ شمس الدین کی عمر ان کے بیان کے مطابق اس وقت ایک سو بیس برس کی تھی۔

فصل (۹) اوچہ بھکر سے چل کر ہم اوچہ کے شہر میں پہنچے۔ یہ شہر دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے اور بڑا شہر ہے۔ بازار بہت عمدہ ہے اور عمارتیں مضبوط ہیں۔ ان دنوں میں اس شہر کا حاکم سید جلال الدین کیچی تھا جو شجاعت اور کرم میں مشہور تھا۔ اس امیر کے ساتھ میری دوستی ہوگئی اور اس کے ساتھ اکثر صحبت ہوتی تھی۔ دہلی میں بھی ہم دونوں ملے اور جب کہ بادشاہ دولت آباد کی طرف تشریف لے گئے اور سید جلال الدین بھی اس کے ساتھ گیا۔ مجھے اجازت دے گیا کہ اگر مجھے ضرورت ہو تو اس کے گاؤں کا محاصل وصول کر کے خرچ کر لیا کروں۔ چناں چہ میں نے پانچ ہزار دینار کے قریب اس میں سے خرچ کیا۔ اس شہر میں میں نے سید جلال الدین حیدری علوی کی زیارت کی اور انھوں نے مجھے اپنا خرقہ عنایت کیا۔ یہ شیخ بزرگان صالحین میں سے تھے اور یہ خرقہ اس وقت تک میرے پاس رہا جب مجھے ہندو ڈاکوؤں نے سمندر میں لوٹ لیا اور اس وقت یہ خرقہ بھی جاتا رہا۔

ا۔ آج کل بھکر صرف اس قلعہ کو کہا جاتا ہے جو روہڑی اور سکھر کے درمیان عین دریائے سندھ کے وسط میں واقع ہے۔ غالباً موجودہ سکھر کا نام ہی ابن بطوطہ کے زمانے میں بھکر ہوگا۔ کیوں کہ سکھر میں ہی خواجہ خضر کی خانقاہ ہے جو کشلو خاں نے بنوائی تھی۔ سکھر آج کے پاکستان کا ایک بڑا شہر ہے۔

۲۔ اوچہ ــــــ اب یہ شہر پاکستان کی ریاست بہاولپور میں ملتان سے ۷۰ میل دور واقع ہے۔ پہلے زمانہ میں پنجاب کے پانچوں دریا اور دریائے سندھ اوچہ کے پاس ہی ملتے تھے اور اب چالیس میل دور مٹھن کوٹ کے قریب ملتے ہیں۔ ایک مورخ کہتا ہے کہ یہ شہر سکندر اعظم نے آباد کیا تھا۔ ناصر الدین قباچہ کے زمانے میں یہ شہر سندھ کی راجدھانی تھا۔

۳۔ سید جلال الدین حیدری علوی غالباً وہی تھے جن کو مخدوم جہانیاں جہان گشت کہا جاتا ہے۔ سکھر ہی آج بھی ان کا مزار موجود ہے۔ ابن بطوطہ جب ان سے ملا تھا تو ان کی عمر ۷۰ سال تھی۔ وہ بڑے پہنچے ہوئے بزرگ تھے، سکھر میں سالانہ ان کا عرس ہوتا ہے جس میں ہزاروں عقیدت مند شریک ہوتے ہیں۔

فصل (۱۰) ملتان

اوچ سے چل کر میں ملتان[1] پہنچا۔ یہ شہر ملک سندھ کا دارالخلافہ ہے اور وہاں کا امیرِ امرا بھی اسی شہر میں رہتا ہے۔ شہر میں پہنچنے سے پہلے دس کوس ورے ایک دریا پر سے عبور کرنا پڑتا ہے۔ یہ دریا بہت چوڑا اور عمیق ہے اور بغیر کشتیوں کے اس پر سے عبور نہیں کر سکتے۔ اس جگہ پر جانے والوں کے احوال کی تحقیقات ہوتی ہے اور اُن کے اسباب کی تلاشی ہوتی ہے۔ اُس زمانے میں اس جگہ ہر ایک تاجر سے ایک چوتھائی مال بطور محصول کے لے لیا کرتے تھے اور ہر گھوڑے پر سات دینار محصول لگتا تھا۔ میرے ہندوستان پہنچنے کے دو برس بعد بادشاہ نے یہ کل محاصل معاف کر دیئے تھے اور جب خلیفہ عباسی سے بیعت کی تو سوا عُشر اور زکوٰۃ یعنی چالیسواں حصہ کے اور کوئی محصول باقی نہ رہا تھا۔ مجھے تلاشی کی بہت فکر تھی کیوں کہ میرا ساز و سامان تو بہت معلوم ہوتا تھا اور اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں سارا بھرم نہ کھل جائے لیکن قطب الملک نے ملتان سے ایک فوج کے افسر کو بھیج دیا تھا اور اُسے ہدایت کر دی تھی کہ میری تلاشی کوئی شخص نہ لے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں نے خداوند تعالیٰ کا شکر کیا۔ اس رات ہم دریا کے کنارے ٹھہر گئے اور علی الصباح میرے پاس دہقان سمرقندی جو ڈاک کا افسر اور بادشاہ کا اخبار نویس تھا، آیا۔ میں نے اس سے ملاقات کی اور اس کے ہمراہ حاکمِ ملتان کے پاس گیا۔ ملتان کا حاکم ان دنوں میں قطب الملک تھا۔ یہ شخص بڑا امیر اور فاضل تھا۔ جب میں اس کے پاس گیا تو میری تعظیم کے لئے اُٹھا اور مصافحہ کر کے مجھے اپنے برابر جگہ دی۔ میں نے ایک غلام اور ایک گھوڑا اور کشمش اور بادام بطور تحفہ کے پیش کئے۔ کشمش اور بادام ان کے ملک میں نہیں ہوتے اور تحفہ کے طور پر دیئے جاتے ہیں اور خراسان سے آتے ہیں۔ یہ امیر ایک بڑے چبوترے پر بیٹھا ہوا تھا جس پر فرش بچھا ہوا تھا اور اس کے پاس شہر کا قاضی سالار نام اور شہر کا خطیب جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا بیٹھے ہوئے تھے اور دائیں بائیں فوج کے افسر تھے اور اس کے سر پر مسلح آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ سامنے سے لشکر گزرتا جاتا تھا۔ اس جگہ بہت سی کمانیں پڑی ہوئی تھیں جو کوئی شخص لشکر میں سے تیر اندازی کا کمال دکھانا چاہتا تھا وہ اپنی طاقت کے مطابق کسی کمان کو ہاتھ میں لے کر کھینچتا تھا اور اگر اپنی سواری کا کمال دکھانا چاہتا تھا تو ایک چھوٹی سی دیوار میں لگا ہوا تھا وہ شخص اپنا گھوڑا دوڑا کر اپنا نیزہ اُس میں لگاتا تھا اور چھوٹی سی دیوار پر ایک انگشتری لٹکی ہوئی تھی۔ سوار اپنا گھوڑا دوڑا کر نیزے کی اَنی میں پرو کر انگشتری لے جاتا تھا اور ایک گیند بھی پڑی ہوئی تھی۔ سوار گھوڑا دوڑا کر اس پر چوگان لگاتا تھا۔ جس قدر کمال کوئی ان کھیلوں میں دکھاتا تھا اسی قدر اس کے عہدے میں ترقی ہوتی تھی۔ جب ہم قطب الملک کے پاس گئے تو اس کو سلام کیا۔ اس نے ہمیں حکم دیا کہ ہم شہر میں شیخ رکن الدین قریشی کے متعلقین کے ساتھ قیام کریں اور

---

[1] ملتان میں کبھی سورج دیوتا کا مندر تھا۔ مندر کے بت کی شکل آدمی کی سی تھی اور اس کی آنکھوں میں جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ قرامطہ نے یہ شہر فتح کر کے یہ بت توڑ ڈالا تھا اور اس کی جگہ ایک مسجد بنوادی تھی۔ اب یہ مسجد بھی نہیں ہے۔ اس شہر میں غیاث الدین تغلق نے اپنے لئے ایک مقبرہ بنوایا تھا لیکن اس میں شاہ رکن عالم دفن ہوئے۔

ان کی یہ عادت تھی کہ بغیر حاکم کی اجازت کے کسی کو اپنے پاس بطور مہمان کے ٹھہرنے نہ دیتے تھے۔ اس شہر میں اور بھی بہت سے بزرگ آئے ہوئے تھے جو بادشاہ کی ملازمت کے لئے دہلی جاتے تھے۔ ان میں سے خداوند زادہ[1] قوام الدین قاضی ترمذ (مع اپنے خاندان اور بیٹوں کے) اور اس کے بھائی عماد الدین و ضیاء الدین و برہان الدین اور مبارک شاہ سمرقند کا ایک رئیس اور ارن بغا بخارا کا ایک رئیس اور ملک زادہ جو خداوند زادہ قوام الدین کا بھانجا تھا اور بدر الدین فصال تھے ان میں سے ہر ایک کے ساتھ اس کے دوست اور خادم اور متعلقین تھے۔ ملتان میں پہنچنے کے بعد بادشاہ کا ایک حاجب پوشنی نام اور ملک محمد ہروی کوتوال آئے۔ وہ خداوند زادہ قوام الدین کے استقبال کے لئے آئے تھے ان کے ساتھ تین غلام تھے ان کو مخدومہ جہاں بادشاہ کی والدہ نے خداوند زادہ کی زوجہ کے استقبال کے واسطے روانہ کیا تھا۔ یہ لوگ خداوند زادہ اور اس کی اولاد کے لئے خلعت بھی لائے تھے۔ میں نے کہا کہ میرا ارادہ اخوند عالم یعنی بادشاہ کی ملازمت کرنے کا ہے۔ بادشاہوں کو یہاں کے لوگ اخوند عالم کہتے ہیں۔ بادشاہ کا یہ حکم تھا کہ اگر کوئی شخص خراسان کی طرف سے آوے اور اس کا ارادہ اس ملک میں ٹھہرنے کا نہ ہو تو اس کو آگے نہ آنے دیں[2]۔ جب میں نے کہا کہ میرا ارادہ اس ملک میں ٹھہرنے کا ہے تو قاضی اور گواہ طلب کئے گئے اور میرے دستخط ایک عہد نامہ پر کرائے گئے۔ میرے ساتھیوں میں سے بعضوں نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور میں نے سفر کی تیاری کی۔ ملتان سے چالیس روز کا راستہ ہے بڑا بڑا آبادی[3] چلی جاتی ہے۔

فصل (۱۱) دسترخوان کی ترتیب

حاجب اور اس کے ساتھیوں نے خداوند زادہ قیام الدین کی ضیافت کا انتظام ملتان سے کر لیا اور میں باورچی ساتھ لئے۔ یہ حاجب ایک منزل آگے چلتا تھا اور منزل پر پہنچنے سے پہلے خداوند زادہ کے لئے انتظام کھانے کا کر چھوڑتا تھا۔ جس قدر اشخاص کا میں نے ذکر کیا وہ علیحدہ علیحدہ خیموں میں ٹھہرتے تھے لیکن کھانا خداوند زادہ کے ساتھ دسترخوان پر کھاتے تھے میں فقط

ع۱ خداوند زادہ ——— فرشتہ نے لکھا ہے کہ اس وقت کی اصطلاح میں خداوند زادہ ان کو کہتے تھے جو سلاطین غور کی اولاد سے ہوتے تھے اور مخدوم زادہ اس کو کہتے تھے جو خلفائے عباسیہ کی اولاد سے ہوتے تھے۔

ع۲ معلوم ہوتا ہے کہ اس بادشاہ کا پردیسیوں کو اعلیٰ اعلیٰ عہدے دینا مصلحت سے خالی نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ لائق لائق آدمی خراسان، ترکستان اور عرب و شام سے آکر اس کی ملازمت کریں۔

ع۳ یہ جملہ مبالغہ سے بھرپور نظر آتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ابن بطوطہ کے زمانہ میں ایک مسافر کو ملتان سے باہر نکلنے کے بعد مسلسل چالیس دن کے سفر کے دوران آبادی ملتی رہی حالاں کہ ایک مورخ مسعودی نے بھی یہ لکھا ہے کہ علاقہ ملتان میں ایک لاکھ بیس ہزار دیہات اور قصبات تھے اور یہاں سینکڑوں نہریں بہتی تھیں۔ آج یہ نہریں بالکل خشک نظر آتی ہیں کیوں کہ ماضی میں جہاں دریائے اس بہتا تھا اب وہاں سے ہٹ چکا ہے اور دریا کا شکم بالکل خشک نظر آتا ہے۔ لیکن بہرحال اس میں شک نہیں کہ یہ علاقہ ایک مانے میں بہت زیادہ آباد ضرور تھا ———

ایک دفعہ اُن کے ساتھ کھانے میں شریک ہوا تھا۔ اس ترتیب سے کھانا لاتے تھے پہلے روٹیاں لاتے تھے جو نہایت پتلی چپاتیاں ہوتی ہیں۔ بکری کو بھون لیتے ہیں اور اس کے چار یا چھ ٹکڑے کرکے ایک ایک آدمی کے سامنے رکھتے جاتے ہیں۔ پھر گھی میں تلی ہوئی روٹیاں لاتے ہیں جس کے جوف میں حلوا صابونیہ بھرا ہوا ہوتا ہے اور ہر ایک ٹکیہ کے اوپر ایک میٹھی روٹی رکھتے تھے جس کو خشتی کہتے ہیں اور اُس کو آٹے اور شکر اور گھی سے بناتے ہیں پھر ایک چیز لاتے ہیں جس کو سموسہ کہتے ہیں اور وہ قیمہ کیا ہوا گوشت ہوتا ہے۔ اس میں بادام اور جائفل اور پستہ اور پیاز اور گرم مصالحہ ڈال کر پتلی چپاتیوں میں لپیٹ دیتے ہیں اور پھر گھی میں تل لیتے ہیں۔ ہر ایک شخص کے سامنے پانچ یا چار سموسے رکھتے ہیں پھر چاول گھی میں پکے ہوئے لاتے ہیں اور اس کے اوپر مُرغ ہوتا ہے۔ پھر لقیمات القاضی لاتے ہیں اس کو ہاشمی بھی کہتے ہیں۔ پھر قاہریہ لاتے ہیں۔ حاجب کھانا شروع کرنے سے پہلے دسترخوان پر کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ اور سب حاضرین بادشاہ کی تعظیم کرتے ہیں اور تعظیم ان کے ملک میں یہ ہے کہ سر کو رکوع کی طرح نیچے جھکاتے ہیں۔ جب یہ کر چکتے ہیں تو دسترخوان پر بیٹھتے ہیں اور کھانا شروع کرنے سے پہلے چاندی اور سونے اور کانچ کے پیالوں میں مصری اور گلاب کا شربت پیتے ہیں۔ جب شربت پی چکتے ہیں تو حاجب بسم اللہ کہتا ہے۔ اس وقت سب بسم اللہ شروع کرتے ہیں۔ کھانا ختم ہونے پر فقاع[1] کے پیالے آتے ہیں اور جب فقاع پی چکتے ہیں تو پان سُپاری آتا ہے۔ جب پان چھالیہ لے چکتے ہیں تو حاجب بسم اللہ کہتا ہے سب اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور جیسی کھانے سے پہلے تعظیم کی تھی اسی طرح پھر کرتے ہیں اور پھر دسترخوان سے اُٹھ کر چلے جاتے ہیں۔

باب ۲۔ ملتان سے دہلی کا سفر

فصل (۱) ابوہر

اوّل شہر جس میں ہم ملتان سے چل کر داخل ہوئے ابوہر[2] تھا اور یہ ہندوستان کے شہروں میں سے پہلا شہر ہے۔ ابوہر ایک چھوٹا اور خوبصورت شہر ہے۔ عمارتیں عمدہ ہیں۔ نہریں اور درخت بھی بہت ہیں۔ ہمارے ملک کے درختوں میں سے سوا بیر کے اور کوئی درخت نہیں ہوتا۔ بیر ہمارے ملک کے بیر سے بڑا اور نہایت شیریں ہوتا ہے اور مازو کے دانہ کی برابر ہوتا ہے۔

---

[1] فقاع کے لغوی معنی زرد رنگ والی چیز کے ہیں۔ شربت انار اور دیگر میووں کا۔ یہ جو مشروب ابن بطوطہ کے زمانہ میں تیار کیا جاتا تھا اس کو فقاع کہتے تھے کیوں کہ اس کا رنگ زرد ہوتا تھا۔ اس میں کچھ ایسی ادویات بھی شامل ہوتی تھیں جو غذا کو بھی ہضم کرادیتی تھیں اور نیند بھی لاتی تھیں۔

[2] ابوہر وہی شہر ہے جو ہندوستان کی تحصیل فاضلکا ضلع فیروزپور میں واقع ہے۔ یہاں ایک پُرانا قلعہ ہے ابن بطوطہ کی آمد سے پہلے ابوہر میں بھی راجپوتوں کا ایک راجہ رانا مل رہتا تھا اس راجہ کی لڑکی سے سالار رجب یعنی فیروز شاہ کے باپ اور سلطان محمد تغلق کے چچا کی شادی ہوئی تھی اور اسی لڑکی کے شکم سے فیروز شاہ تغلق پیدا ہوا تھا۔ ابوہر ایک زمانہ میں بڑا مشہور تھا۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ابن بطوطہ نے یہ کیسے لکھ دیا کہ ابوہر میں پہاڑ ہیں۔ شاید یہاں اس کی یادداشت نے دھوکا دیا۔

فصل (۲) ہندوستان کے میوے

ہندوستان میں ایک میوہ آنبہ[1] ہوتا ہے۔ اُس کا درخت نارنگی کے درخت کے مشابہ ہوتا ہے لیکن اس سے بہت بڑا اور پتے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ سایہ بھی نہایت گھنا ہوتا ہے۔ لیکن جو شخص اس کے سایہ میں سوتا ہے کسلمند ہو جاتا ہے اور اس کا پھل آلو بخارے سے بڑا ہوتا ہے۔ پختہ ہونے سے پہلے سبز ہوتا ہے اور جب گر پڑتا ہے اس میں نمک ڈال کر اچار بناتے ہیں اسی طرح جیسے کہ ہمارے ملک میں لیمو اور کھٹے کا اچار بناتے ہیں۔ ادرک اور مرچ کا بھی اچار بناتے ہیں اور کھانے کے ساتھ کھاتے ہیں اور ہر نوالے کے پیچھے تھوڑا سا اچار کھا لیتے ہیں۔ جب خریف کے موسم میں آنبہ پکتا ہے تو زرد رنگ کا ہو جاتا ہے اور اس کو سیب کی طرح کھاتے ہیں۔ بعض اس کو تراش کر کھاتے ہیں اور بعض چوستے ہیں۔ اس میں شیرینی کے ساتھ کچھ ترشی ہوتی ہے۔ گٹھلی بڑی نکلتی ہے اور گٹھلی کو بوتے ہیں تو درخت ہو جاتا ہے جیسے کہ کھٹے کے بیج بوتے ہیں۔

شکی[2] و برکی (کٹھل[3]) اس کا درخت بڑا ہوتا ہے اور پتے اخروٹ کے پتوں کے مشابہ ہوتے ہیں اور پھل درخت کی جڑ میں لگتا ہے۔ جو پھل زمین کے متصل ہوتا ہے اس کو برکی کہتے ہیں۔ وہ شیرینی میں زیادہ ہوتا ہے اور ذائقہ میں اچھا ہوتا ہے اور جو اوپر لگتا ہے اس کو شکی کہتے ہیں اُس کا پھل بڑے کدو کے مشابہ ہوتا ہے اور چھلکا گائے کی کھال کی مانند ہوتا ہے۔ جب خریف کے موسم میں یہ بہت زرد ہو جاتا ہے تو اس کو توڑتے ہیں اور جب چیرتے ہیں تو ہر ایک دانہ میں سو یا دو سو کوئے کھیروں کی شکل کے نکلتے ہیں اور کویوں کے بیچ میں ایک جھلی زرد رنگ کی ہوتی ہے۔ ہر ایک کوئے میں گٹھلی ہوتی ہے جو باقلہ کے مشابہ ہوتی ہے۔ ان گٹھلیوں کو بھون کر یا پکا کر کھاتے ہیں تو اُس کا مزہ باقلہ کی طرح ہوتا ہے۔ باقلہ اس ملک میں نہیں ہوتا۔ سرخ مٹی میں ان گٹھلیوں کو دبا دیتے ہیں تو دوسرے سال تک رہ سکتے ہیں۔ یہ میوہ ہندوستان کے نہایت عمدہ میووں میں

---

[1] یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ آنبہ یا آم ترکی زبان کا ایک فحش لفظ ہے چنانچہ شمس الدین التمش نے دہلی کا بادشاہ بننے سے قبل جب کہ وہ بدایوں میں حاکم تھا آنبہ کا نام نغزک رکھ دیا تھا لیکن یہ نام نہ چل سکا۔ امیر خسرو نے آم کی تعریف میں جو شعر کہا ہے اس میں بھی آم کو 'نغزک' ہی لکھا ہے۔

[2] امیر خسرو کا یہ مصرع "نغزک دزبرگرا چار نیابی" اس بیان کی تصدیق کرتا ہے حالاں کہ امیر خسرو کا انتقال ابن بطوطہ کے ہندوستان پہنچنے سے ۹ سال قبل ہو چکا تھا۔

[3] ابن بطوطہ نے کٹھل کی تعریف کی ہے لیکن بابر نے اس کی بہت بُرائی کی ہے اس نے تزک بابری میں لکھا ہے کہ یہ پھل بدصورت بھی ہوتا ہے اور بدمزہ بھی حالاں کہ شیریں بہت ہوتا ہے۔ مصنف سیر المتاخرین نے لکھا ہے کہ بنگال اور بہار میں بعض کٹھل اتنا بڑا ہوتا ہے اور اس کا وزن اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی آسانی سے ساتھ اس کو اٹھا بھی نہیں سکتا۔ کٹھل کچا بھی کھایا جاتا ہے اور پکا بھی اور لطف یہ ہے کہ دونوں حالتوں میں بے حد لذیذ ہوتا ہے۔

میں ت ہے۔

تیندو آبنوس کے درخت کا پھل ہے۔ اس کا پھل خوبانی کے برابر ہوتا ہے اور رنگ بھی ویسا ہی ہوتا ہے۔ شیریں بہت ہوتا ہے۔

جمو (جامن) اس کا درخت بڑا ہوتا ہے۔ اس کا پھل زیتون کے پھل کے مشابہ ہوتا ہے۔ لیکن رنگ میں سیاہی مائل ہوتا ہے اور زیتون کی طرح اُس کے اندر ایک گٹھلی ہوتی ہے۔

شیریں نارنج[1] اس ملک میں بکثرت ہوتا ہے۔ لیکن ترش نارنج بہت کم ہوتا ہے۔ ایک قسم کا شیریں ترش بھی ہوتا ہے۔ وہ مجھے بہت خوش ذائقہ معلوم ہوتا تھا اور میں اس کو بہت رغبت سے کھایا کرتا تھا۔

موا[2] اس کا درخت بہت بڑا ہوتا ہے۔ پتے اخروٹ کے پتوں کے مشابہ ہوتے ہیں لیکن سرخی و زردی مائل۔ اس کا پھل بھی چھوٹے آلوبخارے کی مانند ہوتا ہے اور نہایت شیریں ہوتا ہے اور ہر ایک دانہ کے منہ پر ایک اور چھوٹا دانہ ہوتا ہے، جو کشمش کے مشابہ ہوتا ہے اور بیچ میں سے خالی ہوتا ہے اور اس کا ذائقہ انگور کی مانند ہوتا ہے لیکن زیادہ کھانے سے سر میں درد ہو جاتا ہے۔ خشک کیا ہوا مزے میں انجیر کی مانند ہوتا ہے اور میں انجیر کی بجائے اس کو کھایا کرتا تھا۔ انجیر اس ملک میں نہیں ہوتا ہے۔ موے کے منہ پر جو دوسرا دانہ ہوتا ہے اس کو بھی انگور کہتے ہیں۔ انگور ہندوستان میں بہت کم ہوتا ہے۔ دہلی میں اور بعض اور جگہ بھی ہوتا ہے اور موے کے سال میں دو دفعہ پھل لگتے ہیں۔ اس کی گٹھلی کا تیل نکالتے ہیں اور چراغوں میں جلاتے ہیں۔

کسیرا (کسیرو)[3] اس کو زمین سے کھود کر نکالتے ہیں۔ قسطل کے مشابہ ہوتا ہے اور نہایت شیریں ہوتا ہے۔

ہمارے ملک کے پھلوں میں سے انار ہندوستان میں بھی ہوتا ہے اور سال میں دو دفعہ پھل دیتا ہے۔ جزیرہ ذیبۃ المہل (جزائر مالدیپ) میں میں نے دیکھا کہ انار بارہ مہینے پھل دیتا ہے۔

---

[1] شیریں نارنج سے ابن بطوطہ کی مراد سنترے سے ہے۔ اس نے نارنگی کے لئے بھی یہی لفظ استعمال کیا ہے۔ بابر کو بھی ہندوستان کا یہ پھل بہت پسند تھا۔

[2] مہوہ ــــ ابن بطوطہ نے مہوہ کے پھول اور پھل میں کوئی تمیز نہیں کی۔ جس کو وہ انگور سے مشابہ دانہ لکھتا ہے وہ مہوے کا پھول ہوتا ہے۔ اس پھول کے گر جانے کے بعد پھل نکلتا ہے۔ ہندوستان میں ہمیشہ سے مہوے کی شراب بنائی جاتی رہی ہے، بابر نے تزک بابری میں بھی مہوے کی شراب کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے "مہوے کی شراب بدمزہ ہوتی ہے"۔

[3] صاحب مخزن نے کسیرو کی بہت تعریف کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ اس پھل کی جلد بہت بدصورت اور سیاہ ہوتی ہے لیکن اس کا مغز بہت سفید، میٹھا اور خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ کسیرو دہلی کے مضافات اور میرٹھ میں بہت زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ میرٹھ کے کسیرو تو اسی طرح مشہور ہیں جیسے لکھنؤ اور ملیح آباد کے آم۔ جس زمانہ میں کسیرو کی فصل ہوتی ہے میرٹھ آنے والے واپسی کے وقت بطور سوغات یہ عجیب و غریب پھل ضرور لے جاتے ہیں۔

فصل (۳) ہندوستان کے غلّے

ہندوستان میں سال میں دو دفعہ فصل ہوتی ہے۔ جب گرمی میں بارش ہوتی ہے تو خریف کی فصل بوتے ہیں اور ساٹھ دن کے بعد اس کو کاٹ لیتے ہیں۔ خریف کے غلوں میں غلہ ہائے ذیل بھی ہوتے ہیں۔ کندرو[1]، چینہ، شاماخ (یعنی سانوک) جو چینہ سے چھوٹا ہوتا ہے اکثر عابد اور زاہد اور فقیر اور مساکین اس کو کھاتے ہیں۔ خود رو بھی ہوتا ہے۔ ایک ہاتھ میں چھاج لے لیتے ہیں دوسرے ہاتھ میں ایک چھوٹی چھڑی سے درخت کو جھاڑتے ہیں تو سانوک کے دانے چھاج میں گرتے جاتے ہیں اور یہ دانے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ دھوپ میں اس کو خشک کرتے ہیں۔ اور کاٹھ کی اوکھلیوں میں کوٹ کر چھلکا علیحدہ کر لیتے ہیں تو سفید دانہ اندر سے نکلتا ہے بھینس کے دودھ میں اس کی کھیر پکاتے ہیں جو اس کی روٹی کی نسبت زیادہ لذیذ ہوتی ہے میں اکثر کھیر پکا کر کھایا کرتا اور مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔

ماش[2] مٹر کی ایک قسم ہے۔ مونگ یہ ماش کی ایک قسم ہے۔ لیکن شکل میں ذرا لمبی اور رنگ کی سبز ہوتی ہے۔ مونگ اور چاول ملا کر ایک کھانا جس کو کشری (کھچڑی) کہتے ہیں، پکاتے ہیں اور اس کو گھی سے کھاتے ہیں۔ کشری صبح کو بطور نہاری کے کھاتے ہیں جیسے کہ ہمارے ملک میں حریرہ، لوبیا یعنی جولا۔ یہ بھی ایک قسم کا باقلہ ہے۔ موٹھ یہ اناج کندرو کی مانند ہوتا ہے لیکن دانہ اس سے چھوٹا ہوتا ہے اور گھوڑے اور بیلوں کو دانہ کی جگہ دیتے ہیں اور اس کام کے لئے چنا بھی استعمال کرتے ہیں۔ جو ان لوگوں کے نزدیک طاقت کم ہوتی ہے اور چنے اور موٹھ کا دانہ دلتے ہیں۔ اور پھر پانی میں بھگو کر گھوڑے کو کھلاتے ہیں اور گھوڑے کو خوید سبز کاٹ کر کھلاتے ہیں، جس سے وہ موٹے ہو جاتے ہیں۔ پہلے دس دن اس کو گھی پلاتے ہیں۔ بعض تین رطل (یعنی ڈھیڑھ سیر پختہ) اور بعض چار رطل اور اُن دنوں میں اس سے سواری نہیں لیتے۔ پھر ایک ماہ سبز ماش کھلاتے ہیں۔ یہ سب خریف کے اناج تھے۔ خریف کی فصل بونے کے ساٹھ دن بعد زمین میں ربیع کے اناج بونے شروع کرتے ہیں۔ جیسے کہ گندم اور نخود اور مسری اور جو۔ زمین سب اچھی اور زرخیز ہے۔ چناں چہ چاول سال میں تین دفعہ بوتے ہیں اور چاولوں کی پیدائش سب غلوں سے زیادہ ہے۔ تل اور نیشکر بھی خریف کے ساتھ بوتے ہیں۔

---

[1] کدرو ــــ آئین اکبری میں اس غلّہ کا نام کررون اور کدرم لکھا ہے، عوام میں اسے کودون کہا جاتا ہے اس غلّہ کا چھلکا سیاہی مائل سُرخ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اس شخص کے لئے جس نے مفت تعلیم حاصل کی ہو اور اسے کچھ نہ آتا ہو یہ کہا جاتا ہے "اس نے کودون دے کر پڑھا ہے" یعنی اس نے پڑھائی پر کچھ خرچ نہیں کیا ہے۔

[2] فارسی میں مونگ کو ماش کہتے ہیں۔ ہندوستان میں یہ دال بہت ہی پسند کی جاتی تھی اور ہندوستان میں جو مسلمان باہر سے آتے تھے وہ اس دال کو بہت شوق سے کھاتے تھے کیوں کہ ان کے وطن میں یہ دال بہت مہنگی ہوتی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت سے قبل تک یہ دال بہت سستی تھی۔ اس کی کھچڑی آج بھی بہت پسند کی جاتی ہے۔

موجودہ میڈیکل سائنس کی تحقیقات کے بموجب اس دال میں دوسری دالوں کے بہ نسبت زیادہ وٹامن ہوتے ہیں۔

فصل (۴) ابی بکھر[1]

اب ہم سفر کا ذکر کرتے ہیں۔ شہر ابوبہر سے چل کر ہم ایک صحرا میں سے گزرے جس کی مسافت ایک دن کی ہے۔ اس کے کناروں پر بڑے بڑے پہاڑ تھے اور ان دشوار گزار پہاڑوں میں ہندو رہتے ہیں اور اکثر رہزن ہوتے ہیں۔ ہندوؤں میں سے اکثر رعیت ہیں جو بادشاہ کی حمایت میں دیہات میں بستے ہیں۔ ان کا حاکم مسلمان ہوتا ہے اور اس حاکم کا افسر عامل یا جاگیردار ہو[illegible] جاگیر یہ وہ شہر یا گاؤں ہوتا ہے۔ بعض ہندو نافرمان ہوتے ہیں جو بادشاہ سے لڑتے رہتے ہیں اور یہ یا تو رہتے ہیں اور یا رہزنی کرتے ہیں۔ جب ہم ابوبہر سے چلے تو لوگ صبح ہی صبح چل دیئے اور میں اور چند آد[illegible] وہیں رہے اور دوپہر کے بعد وہاں سے چلے۔ ہم بائیس سوار تھے جن میں عربی اور عجمی دونوں تھے۔ ہم پ[illegible] اور دو سواروں نے حملہ کیا۔ میرے ہمراہی سب کے سب اچھے جوان اور بہادر تھے۔ خوب لڑائی ہوئی ہم [illegible] آدمیوں اور ایک سوار کو ان میں سے قتل کیا اور اس کا گھوڑا پکڑ لیا۔ مجھے اور میرے گھوڑے کے تیر[illegible] کے تیر بہت کمزور ہوتے تھے۔ ہم میں سے ایک کا گھوڑا زخمی ہوا۔ اس کو ہم نے اس مقتول کا گھوڑا دے دیا [illegible] کو ذبح کر لیا۔ جو ترک ہمارے ساتھ تھے وہ اس کو کھا گئے اور مقتولوں کے سر کاٹ کر ہم ابی بکر کے قلعہ میں وہاں فصیل پر لٹکا دیئے۔ ابی بکر ہم آدھی رات کو پہنچے اور اس سے سفر کر کے دو دن بعد اجودھن پہنچے۔

فصل (۵) اجودھن[2]

یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ یہ شہر شیخ فریدالدین (بداؤنی) کا ہے۔ [illegible] برہان الدین اسکندری نے چلتے وقت کہا تھا کہ تیری ملاقات شیخ [illegible] سے ہوگی۔ چنانچہ خدا کا شکر ہے کہ میں ان سے ملا۔ وہ بادشاہِ ہند کے پیر ہیں اور اس نے ان کو یہ شہر انعا[illegible] ہوا ہے۔ شیخ پر وہم بدرجہ نہایت غالب ہے، یہاں تک کہ نہ کسی سے مصافحہ کرتے ہیں اور نہ کسی کے قریب ہو[illegible] اگر ان کا کپڑا کسی کے کپڑے سے چھو جاتا ہے تو اس کو دھوتے ہیں۔ میں ان کی خانقاہ میں گیا اور ان سے ملا[illegible] کر کے شیخ برہان الدین کا سلام ان کو پہنچایا۔ یہ سن کر انھوں نے تعجب کیا اور کہا کسی اور کو سلام کہا ہوگا۔ [illegible] دونوں بیٹوں سے میں نے ملاقات کی۔ دونوں عالم و فاضل تھے۔ ایک کا نام معزالدین تھا۔ اور دوسر[illegible]

---

[1] سمجھ میں نہیں آتا کہ ابن بطوطہ نے یہ کس شہر کا تذکرہ کیا ہے کیوں کہ نہ ہندوستان میں اس نام کی کوئی آبادی ہے اور نہ پاکستان میں ——— البتہ پاک پٹن سے چند میل کے فاصلہ پر موضع دیالو میں ایک پرانے بزرگ 'ابوبکر دقاق' کی خانقاہ ہے جہاں چیت کے مہینے میں میلہ ہوتا ہے۔ تذکرۂ اولیا میں بھی کہیں یہ درج نہیں ہے کہ ان بزرگ کا مزار کہاں ہے۔

[2] پاک پٹن کا قدیم نام 'اجودھن' تھا۔ بابا فریدؒ کی خانقاہ کے سبب سے اس کو اکبر بادشاہ کے حکم سے پاک پٹن کہا جانے لگا۔ اس مقام کو بعض لوگ 'پٹن فرید' بھی کہتے ہیں۔ آئینِ اکبری میں اس شہر کو فقط 'پٹن' لکھا گیا ہے۔ یہاں ہر سال محرم کے مہینے میں بابا فریدؒ گنج شکر کے مزار پر عرس ہوتا ہے۔ ور ایک لاکھ سے زائد آدمی آتے ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل زائرین کی تعداد لاکھوں سے بھی بڑھ جاتی تھی لیکن اب ہندوستان سے زائرین نہیں جاتے گو یہاں ان کے ماننے والوں کی تعداد گنی نہیں جا سکتی۔

علاء الدین۔ معز الدین بڑا تھا اور اپنے باپ کی وفات کے بعد سجادہ نشین ہوا تھا۔ ان کے دادا شیخ فرید الدین[1] بداونی کی قبر کی بھی میں نے زیارت کی۔ بداون سنبھل کے علاقے میں ایک شہر ہے۔ جب میں اس شہر سے رخصت ہونے لگا تو مجھے علم الدین نے کہا۔ آپ میرے والد بزرگوار سے ملنے جاویں وہ اس وقت سب سے اونچی چھت پر تھے اور سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے اور ایک بڑا عمامہ باندھا ہوا تھا اور اس کا شملہ ایک طرف لٹکا ہوا تھا۔ انھوں نے میرے واسطے دعا کی اور میرے پاس مصری اور شکر تری ہدیہ بھیجی۔

فصل (۶) ستی کا حال

میں شیخ صاحب کی زیارت سے واپس آ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ لوگ ہمارے خیمہ گاہ کی جانب سے بھاگے ہوئے چلے آتے ہیں۔ اور ان میں بعض ہمارے ساتھی بھی ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ایک ہندو مر گیا تھا اور اس کے جلانے کے واسطے جو چتا بنائی گئی ہے اس میں اس کی عورت بھی ساتھ جلے گی۔ جب وہ دونوں جل چکے تو ہمارے ہمراہی واپس آئے۔ کہتے تھے کہ عورت میت کے ساتھ چمٹ کر جل گئی۔ ایک اور دفعہ میں نے دیکھا کہ ایک ہندو عورت بناؤ سنگار کئے ہوئے گھوڑے پر سوار جاتی تھی اور برہمن اور ان کے بزرگ ہوتے ہیں ساتھ ساتھ تھے۔ چوں کہ بادشاہ کا علاقہ تھا اس لئے بادشاہ کی اجازت بغیر وہ جلا نہ سکتے تھے۔ بادشاہ نے جلانے کی اجازت دے دی اس کے بعد جلایا۔ پھر کچھ مدت کے بعد یہ اتفاق ہوا کہ میں ایک شہر میں تھا جس کے باشندے ہندو تھے اور جس کا نام ابری تھا۔ اس کا حاکم سامرہ قوم کا مسلمان تھا۔ اس کے نواح میں نافرمان ہندو رہتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے رہزنی کی تو امیر ہندو مسلمانوں کو ساتھ لے کر ان سے لڑنے گیا۔ بڑی سخت لڑائی ہوئی اور سات ہندو رعیت مارے گئے۔ ان میں سے تین کی عورتیں تھیں۔ انھوں نے ستی ہونے کا ارادہ کیا۔ ستی ہونا ہندوؤں میں واجب نہیں ہے۔ لیکن جو رانڈیں اپنے خاوند کے ساتھ جل جاتی ہیں ان کا خاندان معزز گنا جاتا ہے اور وہ خود اہل وفا گنی جاتی ہیں۔ اور جو رانڈیں ستی نہیں ہوتیں ان کو موٹے کپڑے پہننے پڑتے ہیں اور طرح طرح کی خواری میں زندگی بسر کرنی پڑتی ہے اور ان کو اہل وفا بھی نہیں سمجھتے۔ لیکن کسی کو ستی ہونے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ جن تین بیواؤں نے ستی ہونے کا ارادہ کیا تھا تو وہ تین دن پہلے گانے بجانے اور کھانے میں مشغول ہو گئیں۔ گویا دنیا سے رخصت ہونے کو تھیں۔ ان کے پاس ہر طرف سے عورتیں آتی تھیں اور چوتھے دن صبح کو ان کے پاس ایک ایک گھوڑا لائے اور ہر ایک بیوہ بناؤ سنگار کر کے اور خوشبو لگا کر اس پر سوار ہوئی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ناریل تھا جس کو اچھالتی جاتی تھی اور بائیں ہاتھ میں آئینہ تھا، جس میں منہ دیکھتی جاتی تھی اور برہمن اس کے گرد جمع تھے اور رشتہ دار اس کے ساتھ تھے۔ آگے آگے نقارے اور نوبت بجتی جاتی تھی۔ ہر ایک ہندو اسے کہتا تھا کہ میرا سلام میرے ماں باپ یا بھائی یا دوست کو کہنا اور وہ کہتی تھی

---

[1] بابا فرید الدین کو ابن بطوطہ نے غلطی سے بداونی کا لکھا ہے، آپ کے والد کابل سے آئے تھے اور ضلع ملتان کے قصبہ کوٹھوال میں آباد ہو گئے تھے۔ سلطان محمد شاہ تغلق آپ کا مرید تھا اور اسی نے آپ کے مزار پر ملک قبول کی معرفت ایک عالی شان گنبد تعمیر کرایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ حیدرآباد کا مشہور شمس الامرائی خاندان بابا صاحب کی اولاد میں سے ہے۔

اچھا اور بہشتی جانی تھی۔ میں بھی اپنے دوستوں کو لے کر اُن کے جلنے کی کیفیت دیکھنے لگا۔ ہم اُن کے ساتھ تین کوس گئے اور ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں پانی بکثرت تھا اور درختوں کے انبوہ سے اندھیرا ہو رہا تھا۔ بیچ میں چار گنبد تھے۔ ہر ایک گنبد میں ایک ایک بُت تھا اور گنبد کے بیچ میں پانی کا حوض تھا۔ اس پر درختوں کے سائے کے سبب سے دھوپ نہ پڑتی تھی۔ تاریکی میں یہ جگہ گویا جہنّم کا ٹکڑا تھا۔ جب یہ عورتیں ان گنبدوں کے پاس پہنچیں تو حوض میں اُتر کر انھوں نے غسل کیا اور حوض میں غوطہ لگایا اور اپنے کپڑے اور زیورات اُتار کر علیحدہ رکھ دیے اور ان کی بجائے ایک موٹی ساڑھی باندھ لی۔ حوض کے پاس ایک نیچی جگہ آگ دہکائی گئی اور جب اس پر سرسوں کا تیل ڈالا گیا تو وہ شعلہ مارنے لگی۔ پندرہ ایک آدمیوں کے ہاتھ میں لکڑی کے گٹھے بندھے ہوئے تھے اور دس ایک آدمی لکڑیوں کے بڑے بڑے کُندے ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔ نقارہ اور نفیری والے بیوہ کے انتظار میں کھڑے تھے۔ آگ کو ایک رضائی کی اوٹ میں کر لیا تھا تاکہ اس عورت کی نظر اُس پر نہ پڑے۔ ان میں سے ایک عورت نے رضائی کو زبردستی ان لوگوں کے ہاتھ سے چھین لیا۔ اور کہا میں جانتی نہیں ہوں کہ یہ آگ ہے مجھے ڈراتے ہو۔ پھر اُس نے آگ کی طرف ڈنڈوت کی اور اپنے تئیں ڈال دیا۔ اُس وقت نقارے اور نفیریاں بجنی شروع ہوئیں۔ لوگوں نے پتلی لکڑیاں جو ہاتھوں میں لئے ہوئے تھے، آگ میں ڈالنی شروع کیں اور اس کے اوپر بڑے بڑے کُندے ڈال دیئے تاکہ وہ عورت حرکت نہ کر سکے۔ حاضرین نے بھی نہایت شور کیا۔ میں یہ دیکھ کر بیہوش ہو گیا اور گھوڑے سے گرنے کو تھا کہ مجھے میرے دوستوں نے سنبھال لیا اور میرا منہ پانی سے دُھلوایا میں وہاں سے لوٹ آیا۔ اسی طرح ہندو اپنے تئیں دریا میں غرق کر دیتے ہیں۔ اکثر ہندو گنگ میں ڈوب جاتے ہیں۔ گنگا کی طرف ہندو حج کے لئے جاتے ہیں اور اپنے مُردوں کی راکھ بھی اس میں ڈالتے ہیں۔ اُن کا گمان ہے کہ اس دریا کا منبع بہشت میں سے ہے۔ جب کوئی شخص اپنے تئیں دریا میں ڈبو دیتا ہے تو حاضرین سے کہہ دیتا ہے کہ میں کسی دنیاوی تکلیف سے یا افلاس کے سبب ایسا نہیں کرتا بلکہ اپنے گُسائی (گُسائیں) کی رضامندی کے لئے کرتا ہوں۔ گُسائیں ان کی زبان میں خدا کا نام ہے۔ جب وہ شخص ڈوب کر مر جاتا ہے تو اس کو نکال کر جلاتے ہیں اور اس کی راکھ دریائے گنگ میں ڈال دیتے ہیں۔

فصل (۷) سرستی

اجودھن سے چل کر ہم سرستی (سرسہ) پہنچے۔ یہ شہر بڑا ہے۔ وہاں چاول بہت ہوتے ہیں اور اچھے بھی ہوتے ہیں اور وہاں سے دہلی بھیجے جاتے ہیں اور اس کا محاصل بھی بہت ہے۔ حاجب شمس الدین بوشنجی نے مجھے تعداد بتلائی تھی، یاد نہیں رہی۔

۱۔ یہ لفظ غالباً 'گُسائیں' ہے جس کے معنی زمین کا مالک ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا مطلب بھگوان ہو۔

۲۔ قدیم تاریخوں میں موجودہ 'سرسہ' کا نام 'سرستی' لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ دریائے سرسوتی کے کنارے واقع ہونے کے سبب سے اس کا اصلی نام سرستی ہی ہو۔ جو لوگ اس کی وجہ تسمیہ راجہ سارس کے نام سے مشہور کرتے ہیں وہ غلط کہتے ہیں پُرانا سرسہ ۱۷۸۳ کے قحط میں برباد ہو گیا تھا اب بھی اس کے کھنڈرات موجودہ شہر کے جنوب مغرب میں نظر آتے ہیں تغلق دورِ حکومت میں یہاں صوبے دار رہتا تھا۔ سرسہ آج بھی آزاد ہندستان کا ایک بڑا خوشحال قصبہ ہے۔

فصل (۸) ہانسی

پھر وہاں سے ہم ہانسی گئے۔ یہ ایک خوبصورت اور مضبوط شہر ہے۔ بڑی بڑی عمارتیں اس میں ہیں۔ اس کی فصیل بھی اونچی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک ہندو راجا تورا نے اس کو بنایا تھا اور سائس راجہ کے متعلق یہ لوگ بہت سی حکایات بیان کرتے ہیں۔ قاضی کمال الدین صدر جہاں قاضی القضاۃ ہندوستان اور سائس کا بھائی قطلو خاں بادشاہ کا اُستاد اور اُن کا بھائی شمس الدین جو ہجرت کر کے مکہ چلا گیا تھا اور وہاں ہی مرگیا تھا۔ اس شہر کے رہنے والے ہیں۔

فصل (۹) مسعود آباد و پالم

پھر ہم دو دن کے بعد مسعود آباد پہنچے۔ یہ شہر دہلی سے دس کوس دور ہے اور وہاں تین دن ٹھہرے۔ ہانسی اور مسعود آباد دونوں ملک ہوشنگ ابن ملک کمال گرگ کی جاگیریں ہیں جب ہم پہنچے تو بادشاہ دارالخلافہ میں نہ تھے اور قنوج کی طرف گئے ہوئے تھے۔ قنوج دہلی سے دس منزل ہے۔ دہلی میں بادشاہ کی والدہ مخدومہ جہاں اور وزیر احمد بن ایاز رومی یعنی خواجہ جہاں موجود تھے۔ وزیر نے ہم میں سے ہر ایک کے لئے اسی کے مذاق اور مرتبہ کے مطابق آدمی استقبال کے لئے بھیجا۔ میرے استقبال کو شیخ بسطامی اور شریف مازندرانی جو پردیسیوں کا حاجب ہے اور فقیہ علاء الدین قنرہ ملتانی آئے۔ وزیر نے ہمارے آنے کی خبر سلطان کو دی اور ڈاک میں بھیجی۔ تیسرے دن اس کے پاس جواب آگیا اور اسی لئے تین دن ہمیں مسعود آباد ٹھہرنا پڑا اور تین دن کے بعد ہمارے استقبال کو قاضی اور فقیہ اور مشائخ اور امرا آئے۔ مصر میں جن لوگوں کو امیر کہتے ہیں اس ملک میں ملک کہتے ہیں اور شیخ ظہیر الدین زنجانی بھی آئے۔ وہ سلطان کے نہایت معزز مقرب ہیں۔ پھر ہم مسعود آباد سے چل کر ایک گاؤں کے قریب ٹھہرے جس کو پالم کہتے ہیں۔ یہ گاؤں سید شریف ناصر الدین مطہر اوہری کی جاگیر میں ہے۔ یہ سید صاحب بادشاہ کے مصاحبوں میں سے ہیں اور بادشاہ کی سخاوت سے انھوں نے بہت کچھ فائدہ حاصل کیا ہے۔

عل ہانسی ضلع حصار کی ایک تحصیل ہے کہتے ہیں کہ اس کو راجہ اننگ پال تور نے آباد کیا تھا۔ ۱۷۸۳ء کے قحط میں یہ بھی بالکل برباد ہو گیا تھا۔ ۱۷۹۵ء میں جارج ٹامس نے اس کو پھر سے آباد کیا اور اس کے قلعے کی مرمت کرا کے اس کو اپنا صدر مقام بنایا۔ ۱۸۰۲ء میں اس پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ یہاں کا قلعہ بڑا مضبوط تھا۔

عل مسعود آباد — اکبر کے دور میں یہ قصبہ بالکل آباد تھا اور یہاں ایک قلعہ بھی تھا۔ اس قصبہ کے کھنڈرات اب بھی دہلی سے بارہ میل کے فاصلے پر نجف گڑھ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہاں کا جاگیردار ہانسی کا بھی جاگیردار تھا اور بادشاہ کا مقرب خاص تھا۔ پالم یہاں سے سات میل دور ایک گاؤں تھا اور اس اعتبار سے اہم تھا کہ دہلی سے سندھ جانے کے لئے یہ مسافروں کی پہلی منزل تھا۔ پالم آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی ذاتی جاگیر تھا اور اس کی آمدنی انگریزوں کی حکومت کے باوجود بادشاہ کو ہی ملتی تھی۔ آج پالم میں ایک بین الاقوامی ہوائی اڈہ ہے اور اب اس کی اہمیت پہلے سے بہت زیادہ بڑھ چکی ہے البتہ زمانۂ ماضی کے کھنڈر اب بھی آنسو بہاتے نظر آتے ہیں اور ان کھنڈروں کو دیکھ کر ماضی کی یاد آجاتی ہے۔

باب ۳ - دہلی

فصل (۱) شہر دہلی اور اُس کی فصیل

دوپہر کے وقت ہم دارالخلافہ دہلی[1] میں پہنچے۔ یہ ایک عظیم الشان شہر ہے اور اس کی عمارات میں خوبصورتی اور مضبوطی دونوں پائی جاتی ہیں۔ اُس کی فصیل ایسی مضبوط ہے کہ دُنیا بھر میں اُس کا نظیر نہیں اور مشرق میں کوئی شہر خواہ اسلامی ہو خواہ غیر اسلامی اس کی عظمت کا نہیں۔ بڑا فراخ شہر ہے اور سب آباد ہے۔ اصل میں چار شہر ہیں جو ایک دوسرے کے متصل واقع ہیں۔ اول دہلی، جو پُرانا ہندوؤں کے وقت کا شہر ہے وہ ۵۸۴ھ ہجری میں فتح ہوا تھا اور دوسرا سیری ہے اس کو دارالخلافہ بھی کہتے ہیں۔ یہ شہر بادشاہ نے غیاث الدین خلیفہ مستنصر العباسی کے پوتے کو دے دیا تھا۔ جب وہ دہلی میں مقیم تھا۔ سلطان علاء الدین اور قطب الدین اسی شہر میں رہتے تھے۔ تیسرا شہر تغلق آباد ہے۔ اس کو بادشاہ کے باپ غیاث الدین تغلق شاہ نے آباد کیا تھا۔ غیاث الدین ایک روز سلطان قطب الدین خلجی کی ملازمت میں کھڑا تھا۔ اس وقت اس نے عرض کی کہ اخوند عالم اس جگہ ایک نیا شہر بنانا چاہیئے۔ بادشاہ نے طنز سے کہا کہ تو بادشاہ ہو جاوے تو یہاں شہر آباد کیجیو۔ جب وہ تقدیرِ خدا سے بادشاہ بن گیا تو اُس نے یہ شہر آباد کیا اور اپنے نام پر اس کا نام تغلق آباد رکھا۔ چوتھا شہر جہاں پناہ ہے۔ اس میں سلطان محمد شاہ تغلق بادشاہ حال رہتا ہے اور اس نے اس شہر کو آباد کیا ہے۔ بادشاہ کا ارادہ تھا کہ چاروں شہروں کو ملا کر ایک فصیل اُن کے گرد بنا دے اور بنائی شروع بھی کی تھی لیکن بہت خرچ دیکھ کر ادھوری چھوڑ دی۔ شہر کی فصیل تمام دنیا میں بے نظیر ہے۔ اس کا عرض گیارہ ہاتھ ہے۔ اس میں کوٹھریاں اور مکانات بنے ہوئے ہیں۔ جس میں چوکیدار اور دروازوں کے محافظ رہتے ہیں اور غلّے کے کھتے بھی جن کو انبار کہتے ہیں فصیل میں بنے ہوئے ہیں۔ منجنیق[2] اور لڑائی کے سامان (اور رعادات[3]) بھی انہی گوداموں میں رکھے جاتے

---

[1] ابن بطوطہ کے زمانے میں دہلی شہر کی آبادی چھ جگہ تھی۔ ایک دہلی رائے پتھورا کی تھی جو قطب مینار کے چاروں طرف تھی۔ یہاں پرتھوی راج کا ایک مضبوط قلعہ بھی تھا۔ دوسری دہلی تغلق آباد میں تھی۔ تیسری دہلی جہاں پناہ اور سیری کے درمیان تھی۔ چوتھی دہلی سیری کے قلعہ کے چاروں طرف تھی جو علاء الدین خلجی نے بنوایا تھا۔ پانچویں دہلی موجودہ پرانے قلعے میں تھی جسے اندرپت کہا جاتا تھا اور چھٹی دہلی فیروز شاہ تغلق نے فیروز شاہ کوٹلا کو مرکز بنا کر آباد کی تھی اس میں موجودہ پرانی دہلی کا بھی کچھ حصہ تھا۔ اس زمانہ میں دہلی کے یہ چھ حصے چالیس میل کے احاطہ میں پھیلے تھے، یہاں ایک ہزار مدرسے، دو ہزار مساجد اور ستر اسپتال تھے۔

[2] اس کے ذریعے حالت جنگ میں آگ کے گولے پھینکے جاتے تھے۔ یہ یونانیوں نے ایجاد کی تھی۔

[3] اس لفظ کے استعمال میں ابن بطوطہ نے غلطی کی ہے اصل میں یہ لفظ "عرادہ" ہے، یہ بھی ایک طرح کی چھوٹی منجنیق تھی جس سے پتھر پھینکے جاتے تھے۔ صلیبی جنگوں کے زمانے میں عربوں نے آتشیں گولے پھینکنے والی منجنیقوں سے ہی یورپ کی فوجوں کو شکست دی تھی اور یروشلم کو ان کے قبضہ سے آزاد کرایا تھا۔

ہیں۔ غلہ بھی ان ہی میں جمع کرتے ہیں۔ یہ غلہ ہر ایک آفت سے محفوظ رہتا ہے اور رنگ بھی نہیں بدلتا۔ میرے سامنے ان گوداموں میں سے چاول نکالے گئے۔ ان کا رنگ اوپر سے سیاہ ہو گیا تھا لیکن مزے میں کچھ فرق نہ آیا تھا۔ مکی یا جوار بھی اس میں سے نکال رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ شاہ بلبن کے وقت میں، جس کو نوّے سال ہوئے ہیں، یہ غلے بھرے گئے تھے۔ فصیل کے اوپر کئی سوار اور پیادے تمام شہر کے گرد گھوم سکتے ہیں۔ شہر کے اندر کی طرف گوداموں میں تابدان ہیں، جن میں سے روشنی پہنچتی ہے۔ اس فصیل کے نیچے کا حصہ پتھر کا بنا ہوا ہے اور اوپر کا حصہ پختہ اینٹوں کا۔ برج تعداد میں بہت اور قریب قریب ہیں۔ اس شہر کے اٹھائیس دروازے ہیں۔ اُن میں سے بعض کا ہم ذکر کرتے ہیں۔ بداؤں دروازہ جو ایک بڑا دروازہ ہے شہر بداؤں کے نام سے مشہور ہے۔ منڈی دروازہ جس کے باہر کھیت ہیں اور گل دروازہ جس کے باغ ہیں اور نجیب دروازہ اور کمال دروازہ کسی شخص کے نام پر ہیں۔ اور غزنی دروازہ جس کے باہر عیدگاہ اور قبرستان ہیں اور پالم دروازہ جو پالم گاؤں کی طرف ہے اور بجالصہ دروازہ جس کے باہر دہلی کے کل قبرستان ہیں۔ قبرستان خوبصورت ہیں۔ ہر ایک قبر پر گنبد نہیں تو محراب ضرور ہوتی ہے اور بیچ میں گل شبو اور رائے بیل وغیرہ قسم قسم کی پھلواری لگی ہوئی ہے۔

فصل (۲) جامع مسجد و لوہے کی لاٹ و مینار

شہر کی جامع مسجد[1] بڑی وسیع ہے۔ اس کی دیواریں، چھتیں اور فرش ہر ایک تراشی ہوئی سفید پتھر کی بنی ہوئی ہے جس کو سیسہ لگا کر جوڑ لگایا گیا ہے اور لکڑی کا اس میں نام نہیں۔ اس مسجد میں تیرہ گنبد ہیں جو پتھر کے ہیں اور منبر بھی پتھر کا ہے۔ چار صحن ہیں اور اس کے وسط میں ایک لاٹ[2] ہے معلوم نہیں کس دھات کی بنی ہوئی ہے۔ کسی نے مجھ سے ذکر کیا تھا کہ ہفت جوش یعنی سات دھاتوں کو جوش دے کر اُن سے یہ لاٹ بنائی گئی ہے۔ کسی نے اس لاٹ میں سے انگل بھر ٹکڑا تراشا ہے وہ جگہ نہایت چکنی ہے۔ لوہا اس پر اثر نہیں کرتا۔ اس کا طول تیس ہاتھ کا ہے

---

[1] اس مسجد کا نام مسجد قوت الاسلام تھا، پہلے اس جگہ پرتھوی راج کا مندر تھا۔ سلطان شہاب الدین غوری نے دہلی فتح کرنے کے بعد اپنے غلام اور سپہ سالار قطب الدین ایبک کی معرفت اس مسجد کی بنیاد رکھوائی۔ پہلے یہ مسجد صرف پانچ در کی تھی لیکن بعد میں ان کی تعداد گیارہ ہو گئی۔ مسجد کی بڑی محراب کی بلندی ۵۳ فٹ ہے۔ ایک زمانے میں اس مسجد کے داخلی دروازے کے قریب راجہ بکرماجیت کا بت پڑا رہتا تھا جو التتمش اجین کی فتح کے بعد مہاکال مندر سے اٹھا لایا تھا۔

[2] ایک مشہور انگریز محقق جنرل کنگھم کی تحقیق کے بموجب یہ لاٹ خالص لوہے کی بنی ہوئی ہے حالاں کہ مشہور یہ ہے کہ یہ لاٹ سات دھاتوں کو ملا کر بنائی گئی تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آج تک اس پر زنگ نہیں آیا۔ ایک روایت کے بموجب یہ راجہ دھاؤ نے بنوائی تھی اور دوسری روایت یہ ہے کہ یہ راجہ اننگ پال نے ایک برہمن کے کہنے سے بنوائی تھی۔

اس لاٹ کے بارے میں ایک کہانی یہ بھی مشہور ہے کہ یہ ایک ناگ کے پھن پر ٹھونکی گئی تھی تاکہ دنیا تمام آفات سے محفوظ رہے۔

جو میں نے اپنی پگڑی سے ناپا تھا۔ مسجد کے مشرقی دروازے کے باہر تانبے کے دو بڑے بڑے بُت پتھر میں جڑے ہوئے پڑے ہیں۔ مسجد میں آنے جانے والے اُن پر پاؤں رکھ کر جاتے ہیں۔ اس مسجد کی جگہ پہلے بُت خانہ تھا۔ جب دہلی فتح ہوئی تو بتخانہ کی جگہ یہ مسجد تیار کی گئی۔ مسجد کے شمالی صحن میں ایک صومعہ (مینار[1]) ہے جس کا نظیر اسلام کے کسی ملک میں نہیں پایا جاتا۔ یہ مینار سُرخ پتھر کا بنا ہوا ہے۔ حالاں کہ مسجد سفید پتھر کی ہے۔ مینار کے پتھروں پر نقش کندہ ہیں اور اس کا اوپر کا چھت خاص سنگ مرمر کا ہے اور لٹو زرِ خالص کے ہیں اور اندر سے اس کا زینہ اس قدر چوڑا ہے کہ اُس پر ہاتھی چڑھ جاتا ہے۔ ایک آدمی نے مجھ سے ذکر کیا تھا کہ جب یہ مینار بنایا جاتا تھا تو میں نے ہاتھیوں کو اس کے اوپر پتھر لے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ مینار کو معزالدین بن ناصرالدین بن التمش نے بنوایا تھا اور قطب الدین خلجی نے ارادہ کیا تھا کہ غربی صحن میں ایک اور مینار بنادے جو اس مینار سے بہت بڑا اور سا اونچا ہو اور ایک تہائی کے قریب اُس نے بنوایا تھا کہ وہ مارا گیا اور سُلطان محمد تغلق نے اس کو پورا کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن پھر فالِ بد سمجھ کر اپنے ارادے سے باز رہا ورنہ یہ مینار دُنیا کے عجائبات میں سے ہوتا۔ وہ اندر سے اس قدر چوڑا ہے کہ تین ہاتھی برابر اُس میں اوپر چڑھ سکتے ہیں۔ اور یہ تہائی اس قدر بلند ہے جس قدر کہ صحن شمالی کا کل مینار۔ میں ایک دفعہ اس پر چڑھا تھا تو میں نے دیکھا کہ شہر کے اونچے اونچے گھر اور فصیل باوجود بلندی کے چھوٹے چھوٹے معلوم ہوتے تھے اور اس کی جڑ میں کھڑے ہوئے آدمی چھوٹے چھوٹے بچے معلوم ہوتے تھے۔ نیچے سے کھڑے ہو کر دیکھنے سے یہ نامکمل مینار بسبب کلانی اور وسعت کے کم اونچا معلوم ہوتا ہے۔ سُلطان قطب الدین خلجی نے ارادہ کیا تھا کہ وہ سیری میں ایک ایسی مسجد بناوے لیکن فقط ایک دیوار اور محراب کے سوا نہ بنا سکا۔ اس نے سفید اور سُرخ اور سبز و سیاہ پتھروں کی تعمیر شروع کی تھی۔ اگر بن جاتی تو ایسی مسجد کسی ملک میں نہ ہوتی۔ سلطان محمد نے اس کے بنانے کا ارادہ کیا تھا اور معماروں اور کاریگروں سے اندازہ کرایا تھا تو معلوم ہوا کہ اُس میں ۳۵ لاکھ روپیہ لگے گا۔ خرچ کثیر دیکھ کر اس نے ارادہ ترک کر دیا۔ لیکن بادشاہ کا ایک مصاحب کہتا تھا کہ فال بد کے سبب سے اُس نے بنانا شروع نہیں کیا۔ کیوں کہ قطبُ الدین اُس کے شروع کرتے ہی مارا گیا تھا۔

فصل (۳) شہر کے حوض شمسی[2] و حوض خاص

شہر دلی کے باہر ایک حوض ہے جو سُلطان شمس الدین التمش کی طرف منسوب ہے

---

[1] یہ مینار سلطان شہاب الدین غوری جس کا اصلی نام معزالدین بن سام تھا، کے حکم سے بننا شروع ہوا تھا ابن بطوطہ نام سے دھوکا کھا گیا اور اس نے یہ لکھ دیا کہ یہ مینار معزالدین کیقباد نے بنوایا تھا۔ اس کی بلندی ۲۳۸ فٹ ہے اور یہ بالکل غلط ہے کہ یہ پتھوی راج نے اپنی لڑکی کے لئے بنوایا تھا تاکہ وہ جمنا کی زیارت کر لیا کرے۔ ساٹھ سال قبل انگریزوں نے اس کی مرمت ضرور کرائی تھی ورنہ اس کی ایک ایک اینٹ میں مسلمان اور صرف مسلمان کا ہاتھ ہے۔

[2] یہ حوض التمش نے بنوایا تھا، کسی زمانہ میں یہ تمام سنگ سُرخ سے بنا ہوا تھا اب بھی برباد ہو جانے کے باوجود یہ ۲۷ بیگھہ پختہ میں پھیلا ہوا ہے۔ اس [illegible] مشہور ہیں۔

اہلِ شہر اُس کا پانی پیتے ہیں اور شہر کی عیدگاہ بھی اسی کے قریب ہے۔ اس میں بارش کا پانی جمع ہوتا ہے۔ طول اس کا دو میل اور عرض ایک میل کے قریب ہے اور اُس کے غربی طرف عیدگاہ کی جانب پتھر کے گھاٹ بنے ہوئے ہیں جو چبوتروں کی شکل میں ہے اور کئی چبوترے نیچے اوپر بنے ہوئے ہیں۔ چبوتروں سے پانی تک سیڑھیاں ہیں اور ہر ایک چبوترے کے کونے پر گنبد بنا ہوا ہے جس میں تماشائی بیٹھ کر سیر کرتے ہیں اور حوض کے وسط میں بھی منقش پتھروں کا گنبد بنا ہوا ہے۔ یہ گنبد دو منزلہ ہے۔ جب تالاب میں پانی بہت ہوتا ہے تو کشتیوں میں بیٹھ کر اس گنبد تک پہنچ سکتے ہیں۔ جب پانی تھوڑا ہوتا ہے تو اکثر آدمی ویسے ہی چلے جاتے ہیں۔ اس کے اندر ایک مسجد ہے۔ اکثر زاہد اور متوکل وہاں جا کر [رہتے ہیں]۔ جب حوض کے کنارے سوکھ جاتے ہیں تو ان میں نیشکر اور ککڑی اور کھیرے اور تربوز اور خربوزے بو دیتے ہیں۔ خربوزہ اس میں چھوٹا لیکن نہایت شیریں ہوتا ہے۔ دہلی اور دارالخلافہ کے درمیان ایک اور حوض ہے، جس کو حوض خاص کہتے ہیں۔ یہ حوض حوضِ شمسی سے بھی بڑا ہے اور اس کے کناروں پر چالیس کے قریب گنبد ہیں۔ اس کے گرد اہلِ طرب رہتے ہیں اور ان کی وجہ سے اسے طرب آباد کہتے ہیں۔ یہاں اہلِ طرب کا ایک بازار ہے جو بہت بڑا ہے اور اس میں ایک مسجد جامع بھی ہے اور سوا اس کے اور مسجدیں بھی ہیں۔ کہتے ہیں گانے بجانے والی عورتیں جو اس محلے میں رہتی ہیں رمضان میں تراویح کی نماز جماعت سے پڑھتی ہیں اور ان کے امام مقرر ہیں۔ عورتیں تعداد میں بہت ہیں اور ڈوم ڈھاڑی بھی بہت ہیں اور میں نے امیر سیف الدین ابن مہنّا کی شادی میں دیکھا کہ جوں ہی اذان ہوئی ہر ایک ڈوم وضو کر کے مصلے بچھا کر نماز پر کھڑا ہو گیا۔

فصل (۴) مزارات

مزارات میں مشہور قبر شیخ الصالح قطب الدین[1] بختیار کاکیؒ[2] کی ہے۔ اس کی قبر کی برکت مشہور ہے اور لوگ اس کی بہت تعظیم کرتے ہیں۔ ان خواجہ صاحب کا نام کاکی اس سبب سے مشہور ہو گیا تھا کہ ان کے پاس جو مقروض اور مفلس آتے تھے اور قرض اور افلاس کی شکایت کرتے تھے۔ یا کوئی ایسا شخص آتا تھا جس کی بیٹی جوان ہوتی تھی اور شادی کا سامان اس کے پاس نہ ہوتا تھا تو خواجہ صاحب اُن کو ایک کاک سونے یا چاندی کی دے دیا کرتے تھے۔ دوسرا مزار فقیہ نور الدین کرمانیؒ کا ہے۔ تیسرا فقیہ علاء الدین کرمانی کا۔ یہ مزار پُر برکت ہے۔ اور نور اس پر برستا ہے اور یہ مکان عیدگاہ کی پشت کی طرف ہے۔ اس جگہ اور بھی بہت

عہ فتوحات فیروزی میں لکھا ہے کہ یہ حوض علاء الدین خلجی نے بنایا تھا۔ البتہ فیروز شاہ تغلق نے اس کو صاف کروایا تھا، فیروز تغلق کا [مقبرہ] بھی اسی تالاب میں ہے۔ مقبرہ اور منہدم حوض اب بھی دہلی سے قطب مینار جانے والی سڑک پر دو میل شمال کی جانب موجود ہے۔

عہ۲ شیخ الصالح حضرت بختیار کاکیؒ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مرید تھے، شیر شاہ سوری نے مزار کے گرد ایک وسیع چار دیواری بنوا دی تھی۔ خاص قبر کی عمارت کچی ہے۔ خانقاہ کی عمارت جو سنگ مرمر کی ہے۔ بادشاہ فرخ سیر نے بنوائی تھی۔ یہاں ہر سال بہت بڑا عرس ہوتا ہے اور دور دور سے زائرین آتے ہیں۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ کے عرس کے زمانے میں ہر زائر پہلے دہلی آتا ہے آپ کے مزار پر حاضری دیتا ہے اور اجمیر جاتا ہے۔

اولیاء کے مزار ہیں۔

فصل (۵) علما و صلحا

علمائے زندہ میں شیخ محمود کیا[۱] ہیں۔ یہ بڑے بزرگ ہیں۔ لوگ مشہور کرتے ہیں کہ ان کو دستِ غیب حاصل ہے کیوں کہ وہ خرچ بہت کرتے ہیں اور کوئی ظاہرا ذریعہ آمدنی کا نہیں معلوم ہوتا۔ ہر مسافر کو روٹی دیتے ہیں اور روپیہ اور اشرفی اور کپڑے تقسیم کرتے ہیں اور اُن سے بہت سی کرامتیں بھی ظاہر ہوئی ہیں اور وہ کرامتیں مشہور ہیں۔ میں نے کئی بار ان کی زیارت کی اور فیض حاصل کیا۔ شیخ

۲ علاء الدین نیلی دوسرے شخص ہیں۔ یہ صاحب شیخ نظام الدین بداونی کے خلیفہ ہیں۔ ہر جمعہ کو وعظ کہتے ہیں۔ بہت سے سامع اُن کے ہاتھ پر توبہ کرتے ہیں اور سر منڈوا کر صاحب وجد ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ یہ صاحب وعظ کرتے تھے۔ میں بھی حاضر تھا۔ قاری نے کلام اللہ کی یہ آیت پڑھی۔ یَا أَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّکُمْ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیمٌ یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ کُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ کُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُکَارَىٰ وَمَا هُمْ بِسُکَارَىٰ وَلَٰکِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِیدٌ۔ شیخ نے اس کو دوبارہ پڑھوایا تو ایک فقیر نے مسجد کے گوشہ سے چیخ ماری۔ شیخ صاحب نے آیت کو پھر پڑھوایا۔ فقیر نے ایک اور چیخ ماری اور مردہ ہو کر گر پڑا۔ میں نے بھی اس کے جنازہ کی نماز پڑھی تیسرے عالم شیخ صدر الدین کہرانی ہیں۔ صائم الدہر اور قائم اللیل ہیں۔ دنیا کو بالکل ترک کیا ہوا ہے۔ لباس ان کا فقط ایک کمبل ہے۔ بادشاہ اور امیر ان کی زیارت کو آتے ہیں۔ مگر وہ اس سے چھپتے پھرتے ہیں۔ ایک دفعہ بادشاہ نے درخواست کی کہ لنگر کے خرچ کے واسطے کچھ دیہات قبول کر لیں لیکن شیخ نے انکار کیا۔ ایک دفعہ بادشاہ زیارت کے لئے آیا اور دس ہزار دینار نظر کئے۔ شیخ نے قبول نہ کئے۔ یہ شیخ تین دن سے پہلے روزہ نہیں کھولتے۔ اُن سے کسی نے عرض کیا کہ اس کا کیا سبب ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جب تک میں مضطر نہیں ہوتا روزہ نہیں کھولتا۔ مضطر کو مردار بھی حلال ہے۔

چوتھے بزرگ امام الصالح یگانۂ عصر فریدِ دھر کمال الدین عبداللہ غازی ہیں۔ آپ شیخ نظام الدین بداونی کی خانقاہ کے پاس ایک غار میں رہتے ہیں۔ میں نے تین دفعہ اس غار میں آپ کی زیارت کی۔ ان کی کرامت جو میں نے دیکھی وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ میرا ایک غلام بھاگ گیا۔ میں نے اس کو ایک ترک کے پاس پایا اور اس کو واپس لینا چاہا۔ شیخ نے منع کیا کہ یہ شخص تیرے لائق نہیں جانے دے۔ اور چوں کہ وہ ترک مجھ سے مصالحت کرنا چاہتا تھا میں نے سو دینار

۱۔ شیخ محمود کیا، کا حال کسی تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ اس زمانے میں شیخ نصیر الدین محمودؒ چراغ دہلی بہت مشہور تھے لیکن ابن بطوطہ نے "کیا" کا لفظ اتنا زیادہ استعمال کیا ہے کہ "شیخ محمود کیا" کو شیخ نصیر الدین محمود سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ شاید یہ کوئی اور بزرگ ہوں گے۔

۲۔ علاء الدین نیلی اودھ کے رہنے والے تھے اور حضرت نظام الدینؒ اولیا کے خلیفہ تھے لیکن خود مرید نہیں کرتے تھے، آپ اکثر فوائد الفوائد پڑھا کرتے تھے۔ آپ کی قبر حوض یاران کے پاس درگاہ حضرت نظام الدینؒ اور محل کوشک کے درمیان میں بنی ہوئی ہے۔

کر غلام اُس کے پاس چھوڑ دیا۔ چھ مہینے کے بعد میں نے سُنا کہ اُس نے اپنے آقا کو قتل کر ڈالا۔ اس کو بادشاہ کے پاس حاضر کرلائے۔ بادشاہ نے اُسے ترک کے بیٹوں کے حوالے کر دیا کہ اپنا قصاص لے لیویں۔ انھوں نے اس کو مار ڈالا۔ یہ کرامت دیکھ کر میں شیخ کا معتقد ہو گیا اور دنیا کو ترک کر کے ان کی ملازمت اختیار کی۔ میں نے دیکھا کہ وہ دس دس دن اور بیس بیس دن کا روزہ رکھتے تھے اور رات کا اکثر حصہ عبادت میں گزارتے تھے اور میں اُس وقت تک جب تک کہ بادشاہ نے مجھے واپس بُلانہ بھیجا اور میں دنیا کو پھر نہ جا لپٹا اُن کی خدمت میں رہا۔ خدا خاتمہ بالخیر کرے۔ اس کی کیفیت آگے چل کر بیان کروں گا۔

باب (۴) دہلی کی تاریخ

فصل (۱) دہلی کی فتح[1]

قاضی القضاۃ علامہ کمال الدین محمد بن برہان الدین الملقب بہ صدر جہاں ذکر کرتے تھے کہ دہلی کی فتح ۵۸۴ھ ہجری میں ہوئی تھی اور مسجد جامع کی محراب میں بھی یہی تاریخ لکھی ہوئی تھی جو میں نے خود پڑھی۔ دہلی کو قطب الدین ایبک[2] نے فتح کیا ہے۔ یہ شخص سلطان شہاب الدین محمد بن سام غوری بادشاہ غزنی و خراسان کا غلام اور اس کی طرف سے سپہ سالاری کا عہدہ رکھتا تھا۔ اور یہ محمد بن غوری سلطان ابراہیم بن سلطان محمود غازی کے ملک پر جس نے ہندوستان کی فتح شروع کی زور سے قابض ہو گیا تھا سلطان شہاب الدین نے قطب الدین کو ایک بڑا لشکر دے کر ہندوستان پر بھیجا۔ اس نے پہلے لاہور کو فتح کیا اور وہاں سکونت اختیار کی۔ وہ ایک عظیم الشان بادشاہ ہو گیا۔ بادشاہ کے مصاحبوں نے ایک دفعہ اس کی چغلی کھائی کہ وہ ہندوستان میں علیحدہ بادشاہت قائم کر کے اطاعت سے باہر ہونا چاہتا ہے۔ یہ خبر قطب الدین کو بھی پہنچ گئی۔ وہ تنہا غزنی میں آیا اور رات کو پہنچا۔ اسی وقت بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے چغلخوروں کو اُس کے آنے کا علم نہ تھا۔ دوسرے روز جب بادشاہ دربار میں بیٹھا قطب الدین چھپ کر تخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ جب سب لوگ بیٹھ گئے بادشاہ نے قطب الدین ایبک کا حال پوچھا۔ جن مصاحبوں نے اس کی چغلی کھائی تھی بول اُٹھے۔ ہمیں تحقیق معلوم ہے کہ وہ خود سر بادشاہ بن بیٹھا ہے۔ بادشاہ نے تخت پر پاؤں مارا اور تالی بجا کر کہا ایبک۔ قطب الدین نے کہا

---

[1] یہاں ابن بطوطہ سے فتح دہلی کی داستان بیان کرنے میں غلطی ہوئی ہے، شہاب الدین غوری نے صرف ترائوڑی، اجمیر اور ہانسی فتح کئے تھے، اس کے واپس ہونے کے بعد قطب الدین ایبک نے دہلی اور میرٹھ فتح کیا تھا۔ دہلی کا پہلا فاتح ایبک ہی ہے۔

[2] یہ روایت بالکل غلط ہے کہ ایبک ترکی زبان میں اس شخص کو کہتے ہیں جس کی چھوٹی انگلی ٹوٹی ہوئی ہو۔ اصل میں یہ لفظ ایبک ہے۔ ایبک نام کے کئی غلام قطب الدین ایبک کی زندگی میں زندہ تھے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی غلام کو بادشاہت نہیں ملی۔ قطب الدین ایبک نے ہی قطب مینار کی تعمیر شروع کی تھی لیکن اسے پورا التمش نے کیا تھا۔ یہ بڑا انصاف پرور اور عبادت گذار بادشاہ تھا۔

حاضر۔ اور باہر نکل آیا اور دربار میں سب کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ چغل خور شرمندہ ہوگئے اور ڈر کر زمین چومنے لگے۔ بادشاہ نے کہا۔ تمہارا قصور اس دفعہ میں نے معاف کیا پھر کبھی ایبک کے خلاف مجھ سے کچھ نہ کہنا۔ قطب الدین کو حکم دیا کہ وہ واپس ہندوستان کو چلا جائے۔ وہ واپس چلا گیا اور شہر دہلی کو فتح کیا اور دوسرے شہر بھی فتح کئے۔ جب سے دہلی برابر اسلام کا دار الخلافہ چلا آیا ہے۔ قطب الدین نے دہلی میں وفات پائی۔

فصل (۲) سلطان شمس الدین التمش

سلطان شمس الدین التمش۔ یہ دہلی کا اول مستقل بادشاہ ہے۔ پہلے یہ قطب الدین کا غلام اور سپہ سالار اور نائب تھا۔ قطب الدین کے مرنے کے بعد مستقل بادشاہ ہوا اور لوگوں سے بیعت لینی شروع کی۔ تمام عالم و فقیہ قاضی وجیہ الدین کاشانی کے ہمراہ آئے اور اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ قاضی اس کے برابر حسب عادت بیٹھ گیا۔ بادشاہ سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ اپنے فرش کا کونہ اٹھا کر اس میں سے ایک نکال کر قاضی کو دیا جس سے معلوم ہوا کہ قطب الدین نے اس کو آزاد کر دیا تھا۔ قاضی اور فقیہوں نے اس کو کہا اور سب نے اس کی بیعت کر لی۔ بیس برس تک اس نے سلطنت کی وہ نیک چلن اور انصاف پرور اور عالم و فاضل تھا۔ انصاف کی جانب اس کی توجہ بدرجہ غایت تھی۔ حکم دیا ہوا تھا کہ جس کسی پر کوئی ظلم ہوا ہو وہ رنگے ہوئے کپڑے پہن کر پھرے تاکہ بادشاہ فوراً اس کو پہچان لے۔ کیونکہ ہندوستان میں عموماً سفید رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں۔ رات کے واسطے یہ تجویز کی تھی کہ اپنے دروازوں کے برجوں پر دو شیر سنگ مرمر کے بنے ہوئے رکھے ہوئے تھے اور ان دونوں کے گلوں میں زنجیریں ڈالی ہوئی تھیں اور زنجیروں میں گھڑیال باندھے ہوئے تھے۔ جب کوئی مظلوم آکر زنجیر ہلاتا تھا تو فوراً بادشاہ کو خبر ہو جاتی تھی اور وہ فوراً اس کے مقدمے کا فیصلہ کرتا تھا۔ لیکن اس پر بھی قانع نہ ہوتا تھا اور کہتا تھا کہ لوگوں پر رات کے وقت ظلم ہوتا ہوگا اور صبح تک دیر ہو جاتی ہے، اس لئے حکم دیا کہ فوراً فریقین کو طلب کر کے فیصلہ کیا جاوے۔

فصل (۳) سلطان رکن الدین

سلطان شمس الدین کے تین بیٹے تھے اور ایک بیٹی۔ اس کا بیٹا رکن الدین اس کی بجائے تخت نشین ہوا۔ اس نے اول اپنے بھائی معز الدین کو جو رضیہ کا حقیقی بھائی تھا اور رکن الدین کی دوسری ماں کے پیٹ سے تھا قتل کروا ڈالا۔ رضیہ ناراض ہوئی۔ بادشاہ نے چاہا کہ اس کو بھی مروا ڈالے۔ بادشاہ ایک روز جمعہ کی نماز کو جامع مسجد میں گیا ہوا تھا۔ رضیہ مظلوموں کی پوشاک پہن کر پرانے بادشاہی محل یعنی دولت خانہ کی چھت کے اوپر کھڑی ہوگئی جو مسجد جامع کے متصل واقع تھا اور لوگوں سے اپنے باپ کے عدل و احسان یاد دلا کر کہا کہ رکن الدین نے میرے

عہ التمش سلطان قطب الدین ایبک کا غلام تھا اور وہ اس کو اس کی خوبصورتی کی وجہ سے التمش کہتا تھا کیونکہ لمتش کے معنی ترکی زبان میں خوبصورت چاند کے ہیں۔ التمش نے سنسکرت زبان کے بھی سکے جاری کئے تھے۔ دہلی کا بادشاہ بننے سے قبل وہ بدایوں کا حاکم تھا۔

بھائی کو مار ڈالا ہے اور مجھے بھی مروانا چاہتا ہے۔ اس پر لوگ برافروختہ ہوئے اور رکن الدین پر یورش کر کے اس کو مسجد میں پکڑ لیا اور رضیہ کے پاس لے آئے۔ اُس نے اپنے بھائی کے قصاص میں اس کو مروا ڈالا۔

فصل (۴) سلطانہ رضیہ

چوں کہ تیسرا بھائی ناصر الدین ابھی صغیر سن تھا۔ اس لئے لشکر اور امیروں نے اُس کو سلطانہ[1] مقرر کیا۔ اس نے چار برس سلطنت کی۔ یہ سلطانہ مردوں کی طرح ہتھیار لگا کر گھوڑے پر سوار ہوا کرتی تھی اور اپنا چہرہ کھلا رکھتی تھی۔ جب اُس پر تہمت لگائی گئی کہ وہ ایک حبشی غلام[2] سے تعلق رکھتی ہے تو لوگوں نے اتفاق کر کے اس کو تخت سے اتار دیا اور اس کے کسی رشتہ دار قریبی کے ساتھ اُس کا نکاح کر دیا اور اس کے بھائی ناصر الدین[3] کو بادشاہ بنا یا جب کہ سلطانہ رضیہ کو تخت سے علیحدہ کیا گیا تو اس کا چھوٹا بھائی بادشاہ بنا اور مدت تک حکومت کرتا رہا۔ تھوڑے دنوں کے بعد رضیہ اور اس کے شوہر نے بغاوت[4] کی اور اپنے غلام اور ساتھی لے کر مقابلہ کے لئے آمادہ ہوئی۔ ناصر الدین اور اس کے نائب بلبن جو اس کے بعد بادشاہ ہوا مقابلہ کیا۔ رضیہ کے لشکر کو شکست ہوئی۔ رضیہ میدان سے بھاگ گئی اور جب وہ تھک گئی اور بھوک اور پیاس نے غلبہ کیا تو ایک زمیندار کو ہل چلاتے ہوئے دیکھا۔ اس سے کھانے کو کچھ مانگا۔ اس نے ایک روٹی کا ٹکڑا دیا وہ کھا کر

---

1. سلطانہ رضیہ پردہ نہیں کرتی تھی اور بہت بہادر تھی، امراء سلطنت اسی لئے اسے بہت پسند کرتے تھے، اس نے اپنے نام کے جو سکے جاری کرائے تھے ان پر اس کا یہ مردانہ نام درج ہے "السلطان الاعظم رضیۃ الدین والدین" وہ رکن الدین کو قتل کر کے تخت پر بیٹھی تھی۔

2. اس حبشی غلام کا نام جمال الدین یاقوت میر آخور تھا۔ تاریخ فرشتہ کے بموجب وہ رضیہ سلطانہ کے بہت قریب تھا اور رضیہ اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتی تھی۔ حد یہ کہ یہ غلام اس کو گھوڑے پر سوار ہونے میں بھی مدد دیا کرتا تھا۔ ان حالات کی وجہ سے امراء میں یہ مشہور ہو گیا کہ یاقوت اور رضیہ سلطانہ میں خفیہ جنسی تعلقات ہیں چنانچہ رضیہ کے خلاف ایک عام ناراضگی پھیل گئی۔ امیروں نے اس کے بعد التونیہ حاکم بھٹنڈہ سے اس کی شادی کر دی اور اس کو تخت سے اُتار دیا۔

3. ناصر الدین بہت کم عمری میں دہلی کے تخت پر بیٹھا تھا۔

4. رضیہ کو اپنی بے عزتی کا انتقام لینا تھا اس لئے اس نے ایک بڑا لشکر جمع کیا اور پھر اس نے اور اس کے شوہر نے بغاوت کر دی۔ بادشاہ دہلی نے رضیہ سلطانہ کا مقابلہ کیا اور رضیہ کو بُری طرح شکست ہو گئی۔ رضیہ ہندوستان کی پہلی سلطان ملکہ تھی اور یہ حقیقت ہے کہ اس کا انجام بہت ہی دردناک ہوا تھا۔ رضیہ کو شکست کیتھل میں ہوئی تھی اس کی قبر دہلی کے محلہ بلبلی خانہ میں آج بھی موجود ہے اور اس جگہ کو 'رجی سجی' کہا جاتا ہے۔

ایک عرصہ تک اس کی قبر پر علاقہ کا ملبہ اور کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا رہا تھا اور قبر بالکل چھپ گئی تھی لیکن بیسویں صدی کے ابتدائی دنوں میں دہلی میونسپلٹی نے یہ کوڑا صاف کرایا پیچھے دو قبریں نکلیں جن میں ایک رضیہ کی تھی اور دوسری غالباً اس کے شوہر کی ——

سو گئی۔ اس وقت وہ مردانہ کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ زمیندار کی نظر اس کی قبا پر جا پڑی جس میں جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ عورت ہے۔ اس کو سوتے ہوئے قتل کر کے اس کے کپڑے اور سامان اُتار لیا اور گھوڑے کو بھگا دیا اور اس کی نعش کو کھیت میں دفن کر کے آپ اُس کا کوئی کپڑا بازار میں بیچنے گیا۔ بازار والوں نے شبہ کیا اور اُس کو کوتوال کے پاس پکڑ کر لائے۔ کوتوال نے زمیندار کو مارپیٹ کی تو اس نے اقبال کیا اور تمام احوال بتا دیا اور اس کی نعش بھی بتا دی۔ نعش کو وہاں سے نکال کر لائے اور غسل اور کفن دے کر اُسی جگہ اُس کو دفن کر دیا اور اس کی قبر پر ایک گنبد بنا دیا۔ اب اس کی قبر زیارت گاہ ہے اور وہ دریائے جمنا کے کنارے پر شہر سے ایک فرسخ (ساڑھے تین میل) ہے۔

فصل (د) سلطان ناصر الدین

اس کے بعد ناصر الدین بالاستقبال بادشاہ ہو گیا اور اس نے بیس برس سلطنت کی۔ یہ بادشاہ نہایت نیک چلن تھا۔ قرآن شریف کی کتابت [illegible] ... مینے اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف شیخ دکھایا۔ خط [illegible] ... غیاث الدین نے اس کو ... ڈالا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔

فصل (۶) سلطان غیاث الدین بلبن

بلبن[1] اپنے آقا کو قتل کر کے خود بادشاہ بن بیٹھا اور بیس برس تک سلطنت کرتا رہا۔ اس سے پہلے بیس برس تک بطور نائب کے بھی کل امور سلطنت اس کے ہاتھ میں تھے۔ یہ بادشاہ منصف مزاج، بردبار اور نہایت نیک چلن تھا اور عالم و فاضل تھا۔ اس نے ایک مکان بنوایا تھا۔ اس کا نام دار الامن رکھا تھا۔ جو مقروض اس میں داخل ہو جاتا تھا اس کا قرضہ ادا کر دیتا تھا۔ اور جو شخص کسی کو قتل کر کے یا کوئی جرم کر کے اس میں داخل ہو جاتا تھا تو مقتول یا مظلوم کے وارثوں کو عوض دے کر ان کو راضی کر دیتا تھا۔ اس بادشاہ کی قبر بھی اسی مکان میں بنائی گئی ہے۔ میں نے اس کی قبر دیکھی ہے۔ اس بادشاہ کی نسبت ایک عجیب حکایت بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بخارا کے بازار میں اس کو ایک فقیر

نے مصنف ... [illegible] ... دونوں قراخت کے شہزادے ... کے وقت غلام بنائے گئے تھے ... ماوراء النہر میں بطور غلام بیچے گئے تھے۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ ... [illegible]

ملا بلبن کا پورا نام غیاث الدین بلبن تھا، وہ بڑا بہادر تھا اس نے ... مغلول حملہ ... جنگ کی اور یہ حقیقت ہے کہ صرف اس کی کوششوں کی وجہ سے منگول دہلی پر قبضہ نہ کر سکے۔

ملا فتوحات فیروز شاہی میں اس مکان کا نام دار الامان لکھا ہوا ہے اور یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ اس میں بادشاہوں کے مزار ہیں۔ فیروز تغلق نے اس عمارت کی مرمت کرائی اور صندل کے کواڑ اس کے دروازے پر چڑھائے۔ آثار الصنادید میں لکھا ہے کہ دہلی میں شکاف کی کوٹھی کے پاس اور مولانا جمالی کی مسجد کے قریب کھنڈرات میں یہ مقبرہ تھا۔ اس کے پتھر اکھڑ کر کچھ لکھنؤ گئے اور کچھ شاہجہان آباد کے مکانات میں لگے۔ اب وہاں فقط چونے کا ڈھیر رہ گیا ہے۔

اس مقبرے کے آس پاس بھی کئی مقبرے تھے لیکن اب سب زمانے کے ہاتھوں برباد ہو چکے ہیں۔

ملا۔ بلبن پستہ قد اور مکرہ اور بدصورت تھا۔ فقیر نے کہا اے ترکک (یعنی ترک لڑکے) گویا حقارت سے نام لیا۔ اس نے کہا۔ حاضر اے اخوند۔ فقیر خوش ہوا۔ اور کہا۔ مجھے یہ انار خرید دے۔ اس نے کہا۔ بہت اچھا۔ اور اپنی جیب سے کچھ پیسے نکالے جو اس کے پاس موجود تھے۔ اور ان کے سوا اور کچھ نہ تھا اور انار خرید کر فقیر کو دے دیا۔ فقیر نے وہ انار لے کر کہا کہ ہم نے تجھے ہندوستان کا ملک بخشا۔ بلبن نے اپنا ہاتھ چوم کر کہا کہ مجھے منظور ہے۔ یہ بات اس کی دل نشین ہو گئی۔ اتفاق سے سلطان شمس الدین التمش نے ایک سوداگر بھیجا کہ بخارا اور ترمذ اور سمرقند میں اس کے لئے غلام خریدے۔ اس نے سو غلام خریدے اور ان میں بلبن بھی تھا۔ جب بادشاہ کے سامنے وہ غلام حاضر کئے گئے تو اس کو سب پسند آگئے مگر بلبن کو اس نے پسند نہ کیا اور کہا کہ میں اس کو نہیں لیتا۔ بلبن نے عرض کی کہ اے اخوند عالم یہ غلام حضور نے کس کے لئے خریدے ہیں۔ بادشاہ نے کہا کہ اپنے لئے۔ بلبن نے عرض کی کہ ننانوے غلام اپنے لئے خریدے ہیں۔ ایک غلام آپ خدا تعالیٰ کے لئے خرید لیجئے۔ التمش ہنسا اور اس کو بھی خرید لیا۔ لیکن چونکہ وہ کم رو تھا اس نے اس کو پانی لانے کا کام دیا۔ نجومیوں نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ تیری اولاد سے تیرا ایک غلام سلطنت لے لے گا اور اس پر غالب ہو جائے گا۔ نجومی ہمیشہ یہی کہتے تھے لیکن بادشاہ نے اپنی نیک بختی اور انصاف پروری کے سبب سے اُن کی باتوں پر توجہ نہ کی۔ آخر انھوں نے بادشاہ بیگم سے کہا۔ اس نے بادشاہ سے کہا تو بادشاہ کے دل پر کچھ اثر ہوا اور نجومیوں کو بُلا کر کہا کہ تم اس شخص کو پہچان سکتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ اس کی بعض علامتیں ہیں اور ہم پہچان لیں گے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ کُل غلام میرے سامنے سے گزریں۔ بادشاہ بیٹھ گیا۔ جماعت جماعت بادشاہ کے سامنے سے گزرتی جاتی تھی اور نجومی دیکھ دیکھ کر کہتے جاتے تھے کہ ان میں وہ شخص نہیں۔ ظہر کا وقت ہو گیا۔ سقوں کی باری ابھی نہیں آئی تھی۔ آپس میں کہنے لگے ہم بھوکے مر گئے اور پیسے جمع کر کے بلبن کو بازار میں روٹیاں لانے کے واسطے بھیج دیا۔ اس کو قریب کے بازار میں روٹی نہ ملی اور وہ دوسرے بازار میں چلا گیا۔ جو ذرا فاصلے پر تھا۔ جب سقوں کی باری آئی اور بلبن واپس نہ آیا تو انھوں نے ایک لڑکے کو کچھ دے کر بلبن کی مشک اور اس کا اسباب اس کے کندھے پر رکھ دیا اور اس کو بلبن کی بجائے پیش کیا۔ جب بلبن کا نام پُکارا گیا تو وہ لڑکا اس کی جگہ محسوب ہو گیا۔ جب جائزہ ہو چکا تو نجومیوں نے اس شخص کو نہ پایا جس کی تلاش کرتے تھے۔ بلبن بعد میں آیا جب کہ کُل سقے پیش ہو چکے تھے۔ کیونکہ تقدیر الٰہی پوری ہونی تھی۔ بلبن نے اپنی لیاقت سے ترقی کی اور وہ سقوں کا امیر ہو گیا اور پھر لشکر میں داخل ہو گیا اور رفتہ رفتہ سردار بن گیا۔ سلطان ناصر الدین نے بادشاہ ہونے سے پہلے اس کا نکاح اپنی بیٹی[1] سے کر دیا اور جب ناصر الدین بادشاہ ہوا تو اس کو اپنا نائب بنا لیا بیس برس تک نیابت کی اور پھر اس نے سلطان ناصر الدین کو قتل کر ڈالا اور خود بادشاہ ہو گیا۔

---

[1] ابن بطوطہ نے غلط لکھا ہے کہ بلبن ناصر الدین کا داماد تھا۔ وہ دراصل شمس الدین التمش کا داماد تھا۔ مورخ بدایونی نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ بادشاہ بننے سے قبل وہ ناصر الدین کا وزیر اعظم بے شک تھا اور اس کے حامی امیروں کی تعداد بادشاہ سے زائد تھی۔

بلبن کے دو بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا خان شہید[1] تھا جو اُس کا ولی عہد تھا اور وہ اپنے باپ کی طرف سے سندھ کا حاکم تھا اور مُلتان میں رہا کرتا تھا۔ وہ تاتاریوں سے لڑکر ایک لڑائی میں شہید ہو گیا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ ایک کیقباد اور دوسرا کیخسرو۔ بلبن کے دوسرے بیٹے کا نام ناصرالدین تھا۔ وہ اپنے باپ کے وقت لکھنوتی اور بنگالہ کا حاکم تھا۔ جب خان شہید مارا گیا تو بلبن نے اس کے بیٹے کیخسرو کو ولی عہد بنایا اور اپنے بیٹے کو نہ بنایا۔ اس ناصرالدین کے بھی ایک بیٹا تھا جو بادشاہ کے پاس رہا کرتا تھا اور اس کا نام معزالدین تھا۔

فصل (۷) سلطان معزالدین کیقباد

رات کے وقت سلطان غیاث الدین بلبن کا انتقال ہوا تھا۔ اس کا بیٹا ناصرالدین (بغراخاں) بنگالہ میں تھا اس لئے اس نے اپنے پوتے کیخسرو[2] کو اپنا ولی عہد بنایا تھا۔ لیکن بادشاہ کا نائب کیخسرو سے رنجش رکھتا تھا۔ اس نے یہ حیلہ کیا کہ بادشاہ کے مرتے ہی کیخسرو کے پاس پہنچا اور اس کی نسبت ہمدردی اور غم خواری ظاہر کی اور اس کو ایک جعلی پروانہ دکھایا جس میں سب امیروں نے کیقباد کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا اتفاق کیا تھا اور یہ کہا کہ مجھے تمہاری جان کا خوف ہے۔ کیخسرو نے کہا کہ پھر کیا کیا جائے۔ نائب نے صلاح دی کہ آپ اسی وقت سندھ چلے جاویں۔ کیخسرو نے کہا کہ شہر کے دروازے بند ہیں۔ نائب نے کہا کہ کنجیاں میرے پاس ہیں میں آپ کو نکلوا دیتا ہوں اور پھر دروازے بند کرلوں گا۔ کیخسرو بہت ممنون ہوا اور راتوں رات ملتان کی طرف بھاگ گیا۔ جب کیخسرو شہر سے باہر نکل گیا تو نائب معزالدین کے پاس گیا اور اس کو جگا کر کہا کہ تمام امیر آپ کی بیعت کے لئے تیار ہیں۔ معزالدین نے کہا کہ میرا چچازاد بھائی ولی عہد ہے میرے ساتھ بیعت کیسے کی جائے گی۔ نائب نے تمام قصہ سنایا اور معزالدین نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ تمام امیروں اور خواص سے راتوں رات بادشاہ کی بیعت کروادی۔ صبح کے دوسرے دن اعلان ہوا۔ اور سب خاص و عام بادشاہ کی بیعت میں داخل ہو گئے۔ پھر معزالدین کے باپ کو اس کی تخت نشینی کی خبر پہنچی تو اس نے کہا کہ حق میرا ہے اور میری زندگی میں میرا بیٹا بادشاہ نہیں ہو سکتا۔

---

[1] بلبن کے اس بیٹے کا نام محمد سلطان خاں شہید تھا۔ وہ خود بھی سخن فہم تھا اور اہل علم کا قدردان تھا۔ امیر خسرو بھی اس کے دربار میں ملازم تھے۔ خان شہید شیخ سعدی کے پاس بطور نذر بہت سا مال ہر سال بھیجا کرتا تھا اور اس نے ایک دفعہ سعدی سے ہندوستان تشریف لانے کی بھی درخواست کی تھی لیکن شیخ نے پیری اور ناتوانی کا عذر کیا اور اپنے چند اشعار بھیج دیئے۔ وہ مُلتان کا صوبے دار تھا۔ ہلاکو خاں کے پوتے ارغون خاں نے حاکم غزنی تیمور خان کو ہندوستان فتح کرنے کے لئے ایک لشکر دیا۔ راوی کے کنارے خان شہید نے حملہ آور فوج کا مقابلہ کیا۔ دشمن کو شکست ہو چکی تھی لیکن شاہزادہ ایک تیر کھا کر گرا اور مر گیا ـــــــ امیر خسرو بھی اس لڑائی میں گرفتار ہو گئے تھے۔

[2] کیقباد کا پورا نام معزالدین کیقباد تھا۔ یہ غلط ہے کہ وہ خان شہید کا بیٹا تھا۔ وہ ناصرالدین بغراخان کا بیٹا تھا۔

[3] کیخسرو کے یہ حالات صرف ابن بطوطہ نے لکھے ہیں کسی اور مورخ نے اس واقعہ کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اگر اس واقعہ میں ذرا سی بھی صداقت ہوتی تو کوئی دوسرا مورخ بھی کچھ نہ کچھ ضرور لکھتا۔

اس نے اپنے لشکر آراستہ کئے اور بڑی جمعیت کے ساتھ ہندوستان پر چلا۔ اس طرف سے نائب نے بادشاہ کو ساتھ لیا اور دریائے گنگا کے کناروں پر بالمقابل شہر کڑا[1] کے قریب دونوں لشکر خیمہ زن ہوئے۔ لڑائی شروع ہونے کو تھی کہ خدا تعالیٰ نے ناصرالدین کے دل میں ڈالا کہ آخر معزالدین تیرا بیٹا ہے اور تیرے بعد بھی وہی بادشاہ ہوگا لوگوں کی خونریزی سے کیا فائدہ۔ بیٹے کے دل میں بھی محبت نے جوش مارا۔ اور آخر دونوں بادشاہ اپنی اپنی کشتیوں میں بیٹھ کر دریا میں ملے۔ بادشاہ نے اپنے باپ کے قدم لئے اور ناصرالدین نے اُسے اُٹھا کر کہا کہ جو میرا حق تھا میں نے تجھے بخشا اور اس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس ملاقات کی بابت شعرا نے بہت قصیدے لکھے ہیں۔ اس ملاقات کا نام لقاء السعدین رکھا گیا۔ پھر بادشاہ اپنے باپ کو دہلی میں[2] لے گیا۔ اس کا باپ اس کو تخت پر بٹھا کر آپ اس کے سامنے کھڑا ہوا۔ پھر ناصرالدین واپس بنگالہ کو چلا گیا اور کچھ برس حکومت کر کے مر گیا۔ وہاں اس کی اولاد باقی رہی۔ اُن میں سے ایک بیٹا غیاث الدین بہادر تھا۔ جس کو سلطان غیاث الدین نے قید کر لیا تھا۔ لیکن سلطان محمد تغلق نے اُس کو اپنے باپ کی وفات کے بعد چھوڑ دیا تھا۔ معزالدین نے چار سال تک سلطنت کی جس کا ہر دن عید اور ہر رات شب برات تھی۔ یہ بادشاہ سخی اور کریم تھا۔ اس کے دیکھنے والوں میں سے بعض اشخاص سے میری ملاقات ہوئی وہ اُس کے حلم اور انسانیت اور سخاوت کی بہت تعریف کرتے تھے۔ اس نے جامع مسجد دہلی کا مینار بنوایا تھا جس کا نظیر دنیا میں نہیں ہے۔ عیاشی اور شراب خواری کی کثرت سے اُس کی ایک جانب فالج ہوگئی تھی۔ طبیبوں نے ہرچند علاج کیا۔ کچھ فائدہ نہ ہوا۔ جب بادشاہ اس طرح عاجز ہوگیا تو اس کے نائب جلال الدین فیروز نے اس سے بغاوت کی اور شہر سے باہر نکل کر قبہ جیشانی کے قریب جو ٹیلا ہے اس پر خیمہ زن ہوا۔ معزالدین نے اپنے میروں کو اس کی لڑائی کے لئے بھیجا۔ جو امیر جاتا تھا فیروز کے ساتھ مل جاتا تھا اور اس کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا تھا۔ پھر جلال الدین نے شہر میں داخل ہوکر محل شاہی کا محاصرہ کیا۔ بادشاہ بھوک سے مرنے لگا۔ ایک شخص مجھ سے ذکر کرتا تھا کہ اس کے ہمسایوں میں ایک شریف کا گھر تھا۔ وہ اس کے پاس کھانا بھیجتا رہا۔ پھر لشکر نے محل میں داخل ہوکر اُس کو مار ڈالا جس کا ذکر ہم عنقریب کریں گے۔ اس کے بعد جلال الدین بادشاہ ہوا۔ . . . .

1۔ کڑا نام کا شہر اب بھی الہ آباد سے ۴۲ میل دور دریائے گنگا کے کنارے موجود ہے اور شاید اس کی آبادی پچاس ہزار ہے۔ الہ آباد میں اکبر کا قلعہ بننے سے قبل علاقہ کا صوبے دار کڑاہ میں رہا کرتا تھا۔ آصف الدولہ نواب لکھنؤ اس شہر کے مکانات کے لئے بہت پتھر لکھنو لے گیا تھا۔ پہلے یہاں کا بنا ہوا کاغذ بہت مشہور تھا اور اب یہاں کے کمبل مشہور ہیں۔

2۔ ناصرالدین بغرا کا اپنے بادشاہ بیٹے کے ساتھ دہلی جانا کسی تاریخ سے ثابت نہیں ہے۔ یہ داستان صرف ابن بطوطہ نے بیان کی ہے۔ وہ کڑہ سے ہی اپنے بیٹے کی بادشاہت تسلیم کر کے اور اس کو نصیحتیں کر کے بنگال واپس چلا گیا تھا جہاں کچھ عرصے تک اس نے حکومت کی۔

کہا جاتا ہے کہ ناصرالدین بغرا بنگال میں بڑا ہر دل عزیز تھا۔

فصل (۸) جلال الدین فیروز

یہ بادشاہ بڑا بُردبار اور فاضل تھا اس کی بُردباری ہی اس کی موت کا باعث ہوئی۔ جب یہ بادشاہ مستقل ہو گیا تو اس نے ایک محل اپنے نام پر بنوایا جو سلطان محمد تغلق نے بعدہٗ اپنے داماد عماد ابن مُغیثی کو دے دیا تھا۔ اس بادشاہ کے ایک بیٹا تھا، جس کا نام رکن الدین تھا۔ اور ایک بھتیجا تھا جس کا نام علاء الدین تھا اور وہ اس کا داماد بھی تھا۔ بادشاہ نے اس کو کڑا مانک پور کا حاکم مقرر کر دیا تھا۔ یہ علاقہ ہندوستان میں نہایت سرسبز اور زرخیز سمجھا جاتا ہے۔ گیہوں اور چاول اور شکر وہاں بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ کپڑا بھی بہت بیش قیمت تیار رہتا ہے اور دہلی میں فروخت کے لئے آتا ہے۔ یہ شہر کڑا دہلی سے اٹھارہ منزل ہے۔ علاء الدین کی عورت اس کو ہمیشہ تکلیف دیا کرتی تھی۔ وہ اس کی شکایت اپنے چچا سے کرتا رہا۔ آخر اسی سبب سے ان کے دلوں میں فرق آ گیا۔ علاء الدین ایک بہادر اور جری اور صاحبِ ارادہ شخص تھا لیکن اس کے پاس روپیہ نہ تھا۔ ایک دفعہ اس نے دیوگیر پر حملہ کیا۔ یہ شہر مالوہ اور مرہٹوں کے ملک کا دارالخلافہ تھا۔ وہاں کا راجہ اُن دنوں میں ہندوستان کے تمام راجاؤں میں سب سے بڑا سمجھا جاتا تھا۔ راستہ میں چلا جاتا تھا کہ علاء الدین کے گھوڑے کا پاؤں ایک جگہ زمین میں دھنس گیا اور اس میں سے ٹُن کی آواز نکلی۔ علاء الدین نے وہ جگہ کھدوائی وہاں سے بے شمار دفینہ برآمد ہوا۔ وہ اس نے سب فوج میں تقسیم کر دیا۔ پھر وہاں سے دیوگیر کی طرف روانہ ہوا تو راجہ نے بغیر لڑائی کے اطاعت منظور کر لی اور بہت سا روپیہ دے کر اس کو رخصت کیا۔ علاء الدین کڑہ میں واپس آیا تو بادشاہ کے پاس اُس نے وہ لُوٹ نہ بھیجی۔ اہل دربار نے بادشاہ کو افروختہ کیا۔ بادشاہ نے اس کو بُلا بھیجا۔ وہ نہ گیا۔ بادشاہ نے خود آنے اور اس کے لے جانے کا ارادہ کیا۔ کیوں کہ وہ اس کو اپنے بیٹوں سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ بادشاہ لشکر اور سفر کا سامان درست کر کے کڑے کی طرف روانہ ہوا اور دریا کے کنارے جس جگہ معزالدین خیمہ زن ہوا تھا، جا کر اُترا اور کشتی میں بیٹھ کر اپنے بھتیجے کی طرف چلا۔ دوسری طرف سے علاء الدین اپنی کشتی میں بیٹھ کر آیا۔ اُس نے اپنے نوکروں کو اشارہ کر دیا تھا کہ جس وقت میں بادشاہ سے گلے لگ کر ملوں تو تم بادشاہ کا کام تمام کر دینا۔ چناں چہ اُنھوں نے ایسا ہی کیا۔ بادشاہ کا کچھ لشکر تو علاء الدین کے ساتھ مل گیا۔ اور کچھ دہلی کی طرف واپس بھاگ گیا۔ یہاں آ کر انھوں نے بادشاہ کے بیٹے رکن الدین کو اپنا بادشاہ بنایا اور جب وہ اُن کو ساتھ لے کر علاء الدین کے مقابلے کے واسطے آگے بڑھا تو وہ بھی علاء الدین کے لشکر میں جا ملے۔ رکن الدین سندھ کی طرف بھاگ گیا۔

۱؎ فرشتہ نے لکھا ہے کہ جلال الدین خلجی کی لڑکی بہت خوبصورت تھی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ بہت بد مزاج بھی تھی۔ علاء الدین خلجی سے اس کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے۔ کہا جاتا ہے کہ باپ نے ہمیشہ اپنے داماد کی ہی طرف داری کی اور کبھی بیٹی کا ساتھ نہیں دیا کیوں کہ وہ اپنے داماد سے جو اس کا سگا بھتیجا بھی تھا بہت ہی زیادہ محبت بھی کرتا تھا لیکن علاء الدین نے اپنے چچا کو بڑا دھوکا دیا، اس نے اس کو بڑی بے دردی سے قتل کیا اور پھر اس نے دہلی کی بادشاہت پر قبضہ کر لیا۔ علاء الدین خلجی اپنے وقت کا بہت زبردست بادشاہ گذرا ہے۔

(۹) سُلطان علاء الدین محمد شاہ

علاء الدین دارالخلافہ میں داخل ہوا اور اس نے بیس برس تک سلطنت کی۔ وہ بہت اچھے بادشاہوں میں گنا جاتا ہے اور اہلِ ہند اب تک اس کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ خود امورِ حکومت کو انجام دیتا تھا اور ہر روز نرخ وغیرہ کی بابت دریافت کرلیتا تھا اور محتسب سے رپورٹ لیتا تھا۔ محتسب کو اس ملک میں رئیس کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اُس نے محتسب سے دریافت کیا کہ گوشت کے گراں ہونے کا کیا سبب ہے۔ اس نے کہا کہ گائے اور بکری پر زکوٰۃ (یعنی محصول) لی جاتی ہے۔ بادشاہ نے اُسی روز سے کُل محصول اس قسم کے معاف کردیئے اور سوداگروں کو بُلاکر راس المال اپنے خزانے سے دیا اور کہا کہ اس کی گائے اور بکریاں خرید لاؤ اور ان کو بیچ کر قیمت خزانہ میں داخل کرو۔ اور اُن کی کچھ اُجرت مقرر کردی۔ اسی طرح سے جو کپڑا دولت آباد سے آتا تھا اس کا انتظام کیا۔ ایک دفعہ غلّہ بہت گراں ہوگیا تو اس نے سرکاری گودام کھلوادیئے اور نرخ سستا ہوگیا۔ بادشاہ نے ایک واجبی نرخ مقرر کردیا کہ اس کے مطابق خرید و فروخت کرو۔ غلّہ والوں نے بیچنے سے انکار کیا۔ بادشاہ نے اپنا گودام کھول دیا اور اس کے بیچنے کی بالکل ممانعت کردی اور خود چھ مہینے تک بیچتا رہا۔ جب ذخیرے والوں نے دیکھا کہ اب ان کا غلّہ بگڑا جاتا ہے اور بیچا نہ گیا تو انھوں نے بادشاہ سے رجوع کی۔ بادشاہ نے ایک ایسا نرخ مقرر کردیا جو پہلے سے زیادہ سستا تھا اور ان کو مجبوراً منظور کرنا پڑا۔ یہ بادشاہ نہ توجمعہ کے روز سوار ہوکر باہر نکلتا تھا اور نہ عید کے روز اور نہ کسی اور روز۔ اس کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ اس کا ایک بھتیجا تھا سلیمان نام۔ علاء الدین اس سے بہت محبت رکھتا تھا۔ ایک دن بادشاہ شکار کو گیا اور وہ بھی ساتھ گیا۔ اس نے ارادہ کیا کہ میں بادشاہ کے ساتھ وہی سلوک کروں کہ جو اُس نے اپنے چچا جلال الدین کے ساتھ کیا تھا۔ جب ناشتہ کھانے کے لئے کسی جگہ ٹھہرے تو سلیمان نے بادشاہ کے ایک تیر لگایا۔ بادشاہ گر پڑا اور اس پر اُس کے کسی غلام نے اپنی ڈھال دی۔ سلیمان آیا کہ اس کا کام تمام کردے غلاموں نے کہا کہ وہ مرچکا ہے۔ وہ ان کا کہنا سچ مان کر فوراً دارالخلافہ کی طرف چل پڑا اور حرم میں داخل ہونے لگا۔ اتنے میں بادشاہ غشی سے ہوش میں آگیا تو تمام لشکر اس کے گرد جمع ہوگیا۔ اس کا بھتیجا بھاگ گیا۔ اس کو پکڑ کر لائے اور بادشاہ نے اس کو قتل کروا ڈالا۔ اور پھر کبھی سوار ہوکر باہر نہ نکلا۔

ابن بطوطہ کا یہ سفرنامہ نامکمل شائع کیا گیا ہے۔ مکمل سفرنامہ کافی طویل ہے، اس کی تلخیص سے اس کے مطالعہ کا لُطف جاتا رہتا اس لئے ہم نے اس کی تلخیص نہیں کی —— مکمل سفرنامہ محراب عنقریب کتابی صورت میں شائع کر رہا ہے۔

قارئین محراب سے یہ بھی گذارش ہے کہ وہ سفرنامہ ابن بطوطہ کے مطالعے کے دوران حاشیے کی عبارت ضرور پڑھیں —— اور —— مکمل کتاب کے لئے اپنا آرڈر بھی روانہ کردیں۔
ادارہ محراب نے ابھی اس کتاب کی قیمت نہیں مقرر کی ہے۔

MEHRAAB Urdu Digest Delhi-6 1971

…gistered with the Registrar of Newspapers at R. No. 21763/71 Regd. No. D. 836

جاسوسی ماہوار رسالہ

جاسوس محل

مصنف : سلامت علی مہدی

قیمت : دو روپے

ضخامت : ۱۹۴ صفحات



جاسوس محل اردو بازار دہلی ۶